ماہنامہ
چراغِ راہ
کراچی
بہ ادارت: نعیم صدیقی
9 JAN 1955
جنوری ۱۹۵۵ء
ترتیب
سوزِ بہار:
موج و حباب:
شمارہ
جلد
قیمت فی پرچہ ۔۔۔ آٹھ آنے
دفتر ماہنامہ چراغِ راہ، کراچی

ایک یونٹ

ادارہ ———

آئیڈیل ہونے کے لحاظ سے دیکھیں تو کسی ملک کے لئے سب سے خوش آئند ریاستی ڈھانچہ وحدانی طرز کا ہو سکتا ہے۔ پاکستان میں بھی بہت سے لوگ اس آئیڈیل اور معیاری طرز سے دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اگر اس تک نہ پہنچا جا سکے ——— اور ملک کے دو خطوں میں بٹے ہونے کی وجہ سے جن میں ہزار میل کا فاصلہ ہے ——— یہاں تک پہنچنا عملاً مشکل ہے ——— تو پھر آئیڈیل ہونے کے لحاظ سے یہ تجویز بہت ہی خوش آئند ہے کہ مغربی پاکستان ایک علاقائی نظم کے تحت آجائے اور صوبوں کی حد بندیاں ختم ہو جائیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مرکزی نظام زیادہ قابل قدر ہے، چنانچہ دوسرے لوگوں سے بہت پہلے پاکستان کے علماء کی کنونشن نے مرکزی نظام کے حق میں فیصلہ دیا تھا اور صوبوں کا وجود محض انتظامی ضرورت کے لئے گوارا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ پس جو لوگ اسلام کو معیار بنا کر سوچتے ہیں ان کے لئے اس سے زیادہ اچھی بات کیا ہو گی کہ پورا پاکستان بغیر کسی تقسیم کے ایک ہی ملک اور ایک ہی صوبہ ہو، اور یہ اگر نہ ہو سکے تو صوبوں کی تعداد کم ہو کر دو تک آجائے۔

لیکن کسی چیز کا آئیڈیل ہونا اور بات ہے اور عملاً اس سے کم تر کسی صورت کا اختیار کرنا بجائے خود بہت سے عوامل کا تابع ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں صوبوں کی تقسیم جس عملی ضرورت سے چلی آرہی ہے وہ زبانوں اور رسوم و رواج کے اس حقیقی فرق سے پیدا ہوئی ہے جس کے موجود ہوتے ہوئے انتظامی حد بندیوں کو توڑ دینا بالکل ہی اچھے نتائج دے سکتا ہے۔ اگر حقیقی فروق و اختلاف کے اسباب کو رفع کر کے وحدت کی طرف بڑھایا جائے تو وحدت صحیح معنوں میں وحدت ثابت ہوتی ہے، بخلاف اس کے اگر حقیقی فروق و اختلافات کا ازالہ کئے بغیر وحدت کی طرف متجانس عناصر کو لے کر راسخ کر دیا جائے تو بالعموم اچھے سے اچھے خواب پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایسے کام ہمیشہ عوام کی تعلیم و تربیت کے طے شدہ منصوبوں کے ساتھ تدریجاً کئے جانے کے ہوتے ہیں۔ انہیں اگر محض جوش و خروش سے اچانک سر کر ڈالا جائے تو کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ اصل توقعات پوری ہو جائیں۔

آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنانے کے آئیڈیل کی طرف بڑھنے کے سلسلے میں عملی صورت حالات کیا ہے؟

پہلی حقیقت یہ قابل توجہ ہے کہ اس طرح کی تبدیلیاں لانے کے داعی ہمیشہ سالوں پہلے سے ذہنی میدان میں تحریک شروع کرتے ہیں۔ مختلف پہلوؤں سے خیالات بناتے ہیں، بحثیں چھڑتی ہیں، ردعمل نمودار ہوتا ہے، مشکلات سامنے آتی ہیں، اعتراضات اٹھتے ہیں، تا آنکہ اجتماعی ذہن کسی تبدیلی کے لئے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال خود تحریک پاکستان میں ملتی ہے۔ اقبال نے ایک خیال دیا، چوہدری برکت علی مرحوم نے اسے سیاسی تصور میں ڈھالا، پھر اخبارات میں اس پر بحثیں ہوئیں، پھر وہ ایک مستقل موضوع فکر بنا، پھر قائداعظم مرحوم نے اسے ایک تحریک کی شکل دی، اور بالآخر مسلمان عوام کی منظم جدوجہد نے اسے واقعیت تک پہنچا دیا۔ لیکن مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنانے کے سلسلے میں اگر ہم لٹریچر اور صحافت کے میدان میں اب تک کے کام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے اس کی مخلصانہ دعوت صرف روزنامہ "کوہستان" کی طرف سے سامنے آتی ہے۔ دوسری طرف منکرین حدیث کا ادارہ بھی اسے ایک آمری نظام کی اسکیم کا ایک ضروری جزو بنا کے پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ عوام میں اس سلسلے کی کوئی تحریک اور بحث موجود نہیں تھی۔ یکایک دستوریہ توڑنے کا اعلان ہوا اور مغربی پاکستان کو ایک یونٹ میں بدلنے کی انقلابی سی اسکیم سامنے آگئی۔

ہنگامی حالات کی فضا اور گورنر جنرل کے کامل اختیار اور نئی نامزد وزارت کے بعد شور کے ساتھ جب اس تجویز کو اوپر سے میدان میں ڈال دیا گیا تو سب سے پہلے برسر اقتدار گروہ ہی کے وہ مختلف صوبوں میں سے اس پر آمین بالجہر کہتے نکل آئے اور پھر خاص خاص اخبارات جو اسی درخت کے ساتھ لگے ہوئے تھے اس کے قصیدہ خواں بنے، پھر اختلاف کرنے والوں کو دبانے کی مثالیں جب عبرت کے لئے قائم کر دی گئیں تو آہستہ آہستہ دل کے کمزور اور فکر کے کچے اور اصول کے ڈھیلے لوگ اس تجویز کے ہاتھوں پر بیعت کرتے گئے ۔ اخبارات نے بھی ہنگامی حالات "کا موسم دیکھ کر یہی مناسب سمجھا کہ رائے عام میں خلل نہ ڈالیں اور صرف ایک ہی پہلو سامنے لائیں جو مزاج یار کو پسند ہے ۔ چند روز مسلسل اس کیفیت کو دیکھ کر عام تاثر یہ ہونے لگا کہ رائے عام اب بن چکی ہے لہٰذا علمی وجوہ سے اختلاف رکھنے والوں نے بھی جو اس تجویز کو ایک آئیڈیل کی حیثیت سے اچھا سمجھتے تھے، اسے عملاً بھی قابل عمل تسلیم کر لیا ۔ یعنی رائے عام کے تقاضے سے حکمرانوں کے ہاں تجویز نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس کے الٹ حکمرانوں نے تجویز پیدا کی اور پھر اس پر جمہور کے خیالات کے چند کمانڈروں کے ذریعہ رائے عام کا منظر پیدا کر لیا ۔ ورنہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان میں جا کر نہ کسی نے اس مسئلے کو چھیڑا ہے، نہ کوئی تقریریں ہوئی ہیں، نہ جلسے ہوئے ہیں، نہ ریزولیوشن کرنے کی ضرورت سمجھی گئی ہے چنانچہ عام لوگوں میں جا کر پوچھئے تو نہ وہ اس تجویز کو جانتے ہیں نہ اس کے لئے کوئی جذبات رکھتے ہیں ۔

ہم جب یہ دعویٰ کریں تو لازماً سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ تجویز اوپر کی فضا میں کیسے پیدا ہو گئی؟ —— اور یاد رہے کہ یہ وہی تجویز ہے کہ جسے جب میاں افتخار الدین صاحب نے پیش کیا تھا تو خود حکمران پارٹی کی صفوں میں اور اس کے حامی اخبارات کے حلقوں میں غم و غصہ کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا، یہ اگلا ہوا نوالہ نگلنے پر لوگ تیار کیسے ہو گئے؟ اس سوال کا جواب بھی سن لیجئے ۔ اس سہ ماہی میں حالات کو تہ و بالا کر دینے والے جو بڑے بڑے واقعات ہوئے ہیں ان کے پس منظر میں دو دھڑوں کی کشمکش اقتدار انتہائی افسوسناک حد تک کارفرما ہے ۔ اس کشمکش میں پروڈا کی تنسیخ اور گورنر جنرل کے اختیارات کی قطع و برید ہوا، دوسری طرف سے ہنگامی حالات کا اعلان اور دستوریہ کو معطل کرنے کا اقدام ۔ یہ سب کچھ ٹھیک اس انداز سے ہوا ہے کہ ایک نے تاش کا پتہ زور سے پٹخ کر کہا کہ "وہ مار لیا ہے"، دوسری طرف سے ہاتھ اونچا اٹھا کے کارڈ پر کارڈ مارا جاتا ہے اور آواز آتی ہے کہ "وہ چال ہے تو اس کا جواب یہ چال ہے"۔ اس کھیل میں چھوٹے میاں لوگ تو خیر چھوٹے میاں تھے ہی، بڑے سے بڑے میاں صاحبان بھی سبحان اللہ ہو کر رہ گئے ۔

ہنگامی حالات کا کسی قوم پر مسلط کرنا اور اسے دستوری اور جمہوری زندگی سے محروم کر دینا کوئی خوش آئند چیز تو نہیں ہو سکتی ۔ ایسے کام ان لوگوں کی طرف سے ہوا کرتے ہیں جنہوں نے دوسری طرف کوئی عظیم الشان خدمت بھی سر انجام دی ہو ۔ مثلاً مصطفیٰ کمال کی غداری ترکیہ نے سہی لیکن اس کمال کا کارنامے کے عوض جس نے ترکیہ کو کم سے کم غیروں کے تسلط سے تو نکال دیا گیا اور جمال ناصر کی آمریت کا جوا مصر نے اٹھایا، لیکن اس جمال کا کارنامہ کے عوض جس نے اسے برطانیہ سے خلاصی دلائی ۔ اسی طرح ہنگامی حالات اور غیر دستوری سیاست کی کڑوی گولی کے اوپر اگر کسی خدمت کی شکر نہیں لپیٹی جا سکتی تھی تو کم سے کم قوم کو اس کے نگل لینے کے بعد تو گولی کو کوئی میٹھی چیز دینی چاہیئے ورنہ ہو سکتا ہے کہ معدہ استفراغ ہو جائے ۔ اس ضرورت سے مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنا دینے کا انقلابی عزم پیش کر دیا گیا ۔ اب لوگ یہ بات سن سکتے ہیں کہ ان پر ہنگامی حالات چھائے رہیں، ان کی دستوریہ توپ دم کر دی جائے ۔ ان کا اسلامی دستور کا خواب پریشان ہو جائے اور ایک یونٹ بنانے کی خدمت انجام دینے کے بعد کوئی لوگ بیٹھ کر جمہوری دستور بنا ڈالیں اور بے جا ٹھونس دیں ۔

مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنانے کے لئے اگر واقعی رائے عام موجود تھی یا عوام کے مسلم لیگی نمائندے ایسا کرنا چاہتے تھے تو کسی نے ان کو نہیں روکا تھا کہ وہ جمہوری طریق سے اس تجویز کو زیر بحث لاتے اور اس کے لئے رائے عامہ کی حمایت حاصل کر کے حسب منشا فیصلہ حاصل کر لیں ۔ لیکن دستوریہ کے

پہلے پارلیمانی تجربہ کے حق میں ہے ۔ اندیشہ صرف یہی ہے کہ ایک اچھا اور مطلوب کام اگر غلط ہاتھوں نے غلط زمانے سے کر ڈالا تو اس اچھے کام کے نتائج مشکل ہی سے اچھے ہو سکیں گے ۔ ہم اختلاف نہیں رکھتے ، صرف مشورہ دیتے ہیں کہ ہمارے کارپرداز ملک کی خیر و فلاح کے لئے کوئی قدم اٹھائیں تو ٹھیک طریق سے اٹھائیں ۔ باقی ہنگامی حالات میں ماننا نہ ماننا آپ کے اختیار تمیزی پر منحصر ہے ۔

جمہوری دستور

ہمارے ملک کی دستور کی کہانی بڑی دردناک ہے ۔ خصوصاً جب ہم پڑوسی ملک کو دیکھتے ہیں کہ اس کی اور ہماری آزادی ایک ہی تاریخ سے اور ایک ہی ڈھنگ سے شروع ہوئی ۔ لیکن وہ دستور بنا کر اسے نافذ کر کے اپنے شہریوں کو ایک نصب العین ، ایک شاہراہ عمل اور ایک شہری مرتبہ عطا کر چکا ہے ۔ لیکن یہاں یہ حال ہے کہ ساڑھے سات سال گزر گئے اور ہمارا نہ کوئی دستور ہے ۔ نہ شہری حقوق ہیں ، نہ کوئی نصب العین متعین ہے ، نہ شاہراہ عمل ۔ ہم لوگ سابق غلامی کے آسمان سے گر کر آج ہنگامی حالات کی کھجور میں اٹکے ہوئے ہیں اور یہ کھجور مسلسل اونچی ہو کر اسی آسمان کی طرف جا رہی ہے ۔

ہنگامی حالات کا اعلان تو لوگوں کو تسلی دلائی گئی کہ اب حاکمیت تمہاری طرف پلٹائی جاتی ہے ۔ اصل حکمران تم ہو ، تم اپنے نمائندے از سر نو انتخاب کرو گے اور وہ تمہارے لئے تمہاری مرضی کا دستور بنائیں گے ۔

چند ہی دن گزرے تھے کہ لاہور کے ایک جمہوریت نواز روزنامے نے اپنی معلومات کی گہرائی کی شان دکھاتے ہوئے یہ تجویز رکھی کہ مناسب یہ ہوگا کہ چند افراد کو نامزد کر کے ان سے دستور بنوا لیا جائے ۔ پھر فلاں صاحب نے جمہوری دستور کا تصور پیش کیا کہ جیسے موجودہ حکومت بنا ڈالے اور کام چلا دیا جائے ۔ یہ باتیں چھڑیں تو لوگوں کے ذہن میں "جمہوری دستور" کے اس فتنہ کی یاد تازہ ہو گئی جس کا نعرہ ۱۹۵۳ء میں بلند ہوا تھا ۔ لیکن اس وقت تک چونکہ ملک میں کسی نہ کسی درجہ کی جمہوریت باقی تھی لہذا عوام کی ناپسندیدگی کی فضا نے ختم کر دیا ۔ خود اس جمہوری دستور کے پس منظر میں جائیے تو آپ کو مرکزی سیکرٹریٹ میں پرورش پایا ہوا ایک قرآنی تصور بہ دستور ہاتھ آئے گا ۔ اس تصور کا منشا یہ ہے کہ حاکم ریاست ہی سب کچھ ہو ، ایک اس کی مجلس شوریٰ (کونسل) ہو ، بس یہ طاقت جو کچھ چاہے کرے ، کسی کو چیں بیں کا حق نہ دیا جائے ، بلکہ چیں بیں کے امکانات کو روکنے کے لئے پہلے سے ساری پارٹیوں کو کولہو میں پیل دیا جائے ۔ پھر بھی اگر کوئی بولے تو اس کی گردن اتار دی جائے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی نظریہ کا یہ جنین مراتب میں دیا پل رہا ہے ۔ اگر اس نے پایا تو پھر اس ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات دیکھ لیجئے گا ۔

بہرحال کہا جا رہا ہے کہ ایک نیا بنایا دستور اوپر سے نازل کر دیا جائے گا اور وہ کنٹرولڈ ڈیموکریسی کے تصور پر مبنی ہوگا ۔ اسلام میں چونکہ ہمیشہ زندگی کا دستور اصل عرش سے لکھا لکھایا نازل ہوتا رہا ہے ، لہذا ایک اسلامی مملکت کی امتیازی شان دوسروں کے مقابل میں یہی ہو سکتی ہے کہ اس کے حکمران ظل اللہ بنیں اور بام اقتدار کے مناروں پر سے دستور اتاریں اور مطالبہ کریں کہ ایمان لاؤ اس پر اور بیعت کرو ہمارے ہاتھ پر ۔ رہی کنٹرولڈ ڈیموکریسی کی اصطلاح ، سو یہ اتنی مبہم ہے کہ اب اس کے پیش کرنے والوں کی طرف سے اس کی شرح و تفسیر کا کام شروع ہوگا ۔ یہ بتایا گیا ہے کہ جمہوریت کا برطانوی ڈھانچہ یہاں عوام کی نااہلیت کی وجہ سے ناکام ہو گیا ہے ، لہذا اب امریکی ڈھانچہ اختیار کرنا زیر نظر ہے ۔ قطع نظر اس سے کہ عوام کے مقابلے میں حکمران حضرات نے اہلیت کا ثبوت کس حد تک پیش کیا ہے ، اگر عوام کی نااہلیت نے برطانوی ڈھانچے کو کامیاب نہیں چلنے دیا تو امریکی ڈھانچہ اس سے زیادہ مضبوط رائے عامہ اور اس سے زیادہ گہرا عوامی شعور چاہتا ہے جتنا کہ برطانوی ڈھانچے کے

خونیں سیل

نعیم صدیقی

کلیمؑ و طور کی اے سرزمیں! سُنے تو کہوں
تمام عالمِ اسلام کو امیدیں تھیں
نظامِ حق تری گودی میں پلنے والا ہے!
ترے افق سے وہ سورج نکلنے والا ہے!
یہ منجمد سا اندھیرا پگھلنے والا ہے!
تری فضا سے اخوت کا اک پیام اٹھا
ہر ایک فتنہ اسی مے سے بھر کے جام اٹھا
ہمارے سامنے اک سیلِ ازدحام اٹھا
یہ عین ظن تھا کہ مغرب کے سامری کے خلاف
عصا لیے ہوئے اسلام کا نظام اٹھا
مگر یہ ملتِ اسلام کا نصیبہ ہے!
ٹپک رہا ہے اس امیدِ زخم خوردہ سے خوں!
کلیمؑ و طور کی اے سرزمیں! سُنے تو کہوں؟
نہیں نہیں! ــــ تری توہین ہو گئی مجھ سے
خطا معاف کہ انساں خطا کا پُتلا ہے
کہ یادِ ماضیِ زریں کی کھو گئی مجھ سے
تو انبیا کی زمیں! تری شان اعلیٰ ہے
تو وہ زمیں ہے کہ جس پر جفا کے پتلوں نے
سنہرے تخت خدا ان کے کل بچھائے تھے
تری فضاؤں میں یوسفؑ کے پاک دامن پر
عجیب داغ زلیخاؤں نے لگائے تھے
انہی ذلیل زلیخاؤں کے اشارے پر
کسی نے سالوں اسیری کے دکھ اٹھائے تھے
تری ہی بزم میں یعقوبؑ کے جگر گوشے[1]
جوا اٹھائے ہوئے بندگی کا آئے تھے
ہزار ہا متحرک سے ڈھانچ مٹی کے
جنہوں نے جینے کو تن داؤں میں لگائے تھے
گواہی دیتی ہے اب بھی یہ عظمتِ اہرام
کہ کس نے ان کے یہ سنگِ گراں اٹھائے تھے
خرابے بولیں کہ تعمیر کر گئے تھے وہ کیا
کھنڈر بتائیں کہ کتنے محل بنائے تھے
وہ چھٹیں جن سے کہ چمڑی ادھڑ گئی ساری!
انہوں نے چام کے ہر روز کوڑے کھائے تھے
ترے قدیم خداؤں نے ان کا خوں لے کر
چراغ مصر کی تہذیب کے جلائے تھے
انہی کنیزوں کی عصمت کا لے کے لقمہ وہ

[1] مراد بنی اسرائیل

شراب عیش کے ہر شب کو خم لنڈھائے تھے
پھر انقلاب کے خطرے کو روکنے کے لئے
جگر کے ٹکڑے بھی اس قوم کے چلے تھے

یہ تیرے باغ کے مالی کی شانِ گل چینی
ہزاروں بِن کھلے غنچوں پہ قہر ڈھائے تھے

تری فضاؤں میں سینا کا پھر پیام اٹھا
کرم کے پھر یہاں بادل امڈ کے آئے تھے

وہ ایک موسیٰؑ عمرانؑ، دوسرا ہارونؑ
جنہوں نے جذبے جوانوں میں پھر جگائے تھے

ترے خداؤں کے دربارِ کبریائی میں
دلیلیں دی تھیں، بڑے معجزے دکھائے تھے
تری فضاؤں کو دعوت یہ ہضم ہو نہ سکی

عدو وہ ٹھہرے جو ایمان حق پہ لائے تھے
ترے خداؤں نے دیں دھمکیاں انہیں پیہم
ہزار جال تھے سازش کے جو بچھائے تھے
انہیں نکال کے چھوڑا گھروں سے بالآخر
عصا کر اپنے تعاقب میں پھر لگائے تھے
تو ایسی خاک ہے اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی
کہ تیرے ذہنوں نے سنگیں مزاج پائے تھے

یہ تیرا ماضیِ خونریز نگاہ میں نہ رہا
خطا ہوئی ہے مجھے ارضِ کلیمؑ میں نے کہا
خطا معاف کہ انسان خطا کا پتلا ہے
فراعنہ کی زمیں! اے فراعنہ کی زمیں!
فراعنہ کی زمیں! تو اگر سنے تو کہوں؟

یہ جو ہے ہو تری تاریخِ عہدِ پارینہ
نہ جانے کس طرح اہرام سے نکل آئی
یہ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے حرف بہ حرف
نئے زمانے میں بس بھیس کچھ بدل آئی!

دکھائی جاتی ہے تمثیل، پردہ اٹھتا ہے
مناظر آتے ہیں آ کر گزرتے جاتے ہیں

یہ کیا کہ روشنیاں ہوگئیں ذرا مدھم
یہ کون آیا دھندلکے ہیں؟ — ہاں احسن بنا
یہ اپنے دور کی ہے ایک آیتِ اسلام
تمام بزم پہ اک احترام سا چھایا
وہ لے کے ہاتھ میں قرآن کہہ رہا ہے "اٹھو!
اٹھو کہ دینِ اخوت کا بول ہو بالا
اٹھو کہ ٹوٹ گرے سامراج کی زنجیر
ہو تار تار یہ مکرِ فرنگ کا جالا!
اٹھو کہ ظلمت و باطل سے پھر ظہور کرے
وہ صبحِ وادیٔ فاراں! وہ جلوۂ سینا!
اٹھو کتابِ الٰہی کی شمع لے کے اٹھو!

"...............

ارے یہ کیا ہوا؟ یہ کیا ہوا؟ یہ کیسے ہوا؟
گرا وہ پیکرِ تقویٰ! سنبھل سنبھل کے گرا
یہ کس لعین کے ہاتھوں سے چل گئی گولی؟
نقاب پوش یہ قاتل کہاں سے آیا تھا؟
یہ بند کالی سی گاڑی کدھر سے آ نکلی؟
کدھر گئی ہے؟ دھندلکے میں کچھ پتہ نہ چلا

شہیدِ عشق کے خوں کی وہ دھار بہنے لگی
جہاں بھی قطرہ گرا، شعلہ اک سُلگنے لگا
یہ کھیل دیکھ کے مبہوت ہیں تماشائی
گرایا جاتا ہے پردہ! اندھیرا پھیل گیا

تمام بزم میں سرگوشیاں سی ہوتی ہیں
تماشا گاہ کے پردے میں پھر ہوئی جُنبش
جو باقی ہے وہ کہانی بھی لائی جاتی ہے
وہ دیکھو، سامنے فاروقِ مصر کا دربار
جہاں زمانے کی گردن جھکائی جاتی ہے
سلام ہوتے ہیں ذلّت بھرے طریقوں سے
یہاں پہ دین کی غیرت لٹائی جاتی ہے
نچوڑا جاتا ہے کتنی جوانیوں سے جو رس
شراب اس کی یہاں پر لنڈھائی جاتی ہے
لگائی جاتی ہے یاں سے جو آگ لگتی ہے
جو آگ لگتی ہے یاں سے بجھائی جاتی ہے
مگر ــــ! مگر یہ تزلزل سا آ گیا کیسا؟
اُلٹ کے مسندِ زرّیں گرائی جاتی ہے
وہ آ گئے ہیں مشیّت کے کچھ فرستادے
بساطِ شاہی کی یکدم اٹھائی جاتی ہے
وہ تاج جس کی خدائی کا دور دورہ تھا
اسی کو دیکھو، کہ ٹھوکر لگائی جاتی ہے
غبار اُڑتا ہے اور اس میں رُوحِ شیخِ شہیدؒ
کسی خیال میں گم سم سی پائی جاتی ہے

وہ پردہ، پیچھے کو آہستہ سے سرکنے لگا!

یہ "انقلاب" کا منظر بھی ہو گیا اوجھل
ہے انتظار نظر کو نئے مناظر کا
تماشا گھر کی فضا ہے ابھی بڑی بوجھل
ذرا سے وقفے میں لو! ایک باب اور کھلا

وہ بینڈ بجنے لگا! وہ فضائیں تھرائیں
عَلَم لئے ہوئے اقدام کر رہے ہیں جنود
وہ تیرے نیل کی موجوں نے لی ہے انگڑائی
وہ ٹوٹتا ہے معاً سینکڑوں برس کا جمود
یہ حریّت کی سحر کی حسین شعاعیں ہیں
سحر کا وادیٔ سینا میں پھر ہوا ہے ورود
قریب آن لگی ہے وہی گھڑی شاید
ہزار سال سے ملّت کا جو رہی مقصود
مگر ــــ یہ دیکھو، یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہو گا؟
یہ انقلاب کی محفل میں سازشِ مردود؟
اسے، یہ بچھنے لگی پھر سے مسندِ فرعون
یہ تیرے ماضیٔ زرّیں کی ہو رہی ہے نمود
ہوا وہ یوسفؑ و موسیٰؑ کے پیروؤں پہ [illegible]
ہے جن کے دم سے تمنّا کی ہر کلی کی کشود
وہ دیکھو آہنی زنجیریں آئیں حرکت میں
وہ ہو رہا ہے عدالت میں ملزموں کا ورود
جو مدّعی ہے وہی بن گیا ہے خود قاضی
یہاں پہ ایک ہوئی اصل شاہد و مشہود
یہ کھیل ختم ہوا سارا نصف ساعت میں
سزائے موت سُناتے ہیں تیرے اہلِ جنود

وہ ایک "ساحرِ انگلیس" دور سے بولا
کہ ہونا چاہیے تحریک۔ دین کو نابود
جہان بھر کے مسلمان لپٹتے ہیں اس پہ
ہر ایک سمت ہے اک اضطرابِ لامحدود
مگر یہ تیرے "ابوالہول" سخت پتھر ہیں
اب ان کے سامنے ہر احتجاج ہے بے سود
اب انتقام سیاست کی قتل گاہوں میں
وہ جو ہیں گرتی ہیں، تختے بچھائے جاتے ہیں
خدا کا نام جو لیتے رہے اس [illegible] میں
قصور وار نہ تھے، پھانسی چڑھائے جاتے ہیں
انہی شہیدوں میں شامل [illegible] بھی
چراغ جس کی نظر کے جلائے جاتے ہیں
یہ کن کے لاشوں کا قیمہ بکھیرا جاتا ہے
یہ کس کے خون کے چھینٹے اڑائے جاتے ہیں
یہ کون لوگ اٹھائے گئے ہیں موت کے گھاٹ
یہ کون موت کی نیندوں سلائے جاتے ہیں
[illegible] کو بھی لا کے ڈالا گیا ہے زنداں میں
وہ عمر قید کے نالے چڑھائے جاتے ہیں
یہ دیکھ ملتِ کعبہ کے اپنے ہاتھوں سے
غلافِ کعبہ کے پرزے اٹھائے جاتے ہیں
فرنگیوں کو مبارک ہو، صد مبارک ہو
کہ ان کی راہ سے کانٹے ہٹائے جاتے ہیں
یہودیوں کو مبارک ہو، صد مبارک ہو
کہ [illegible] کو لگائے جاتے ہیں

تو ایسی خاک ہے اس پر بھی خوں سے مس نہ ہوئی
تری فضا میں یہ محشر اٹھائے جاتے ہیں
یہ کون لال ہے تیرا، لہو میں ہاتھ رنگے؟
یہ جس کی آنکھوں میں انگاروں کی دمک بھی ہے
یہ کس کا خون ہے؟ یہ کس لیے بہایا گیا؟
کہ جس میں سوزِ اخوت کی اک جھلک بھی ہے
یہ بےگناہوں کا خوں! اپنی آرزوؤں کا خون
کہ جس میں ذوقِ شہادت کی اک مہک بھی ہے
یہ کون پیکرِ خونخوار ہے؟ بتا تو سہی!
کہ جس سے لرزہ براندام خود فلک بھی ہے
وہ سرخ آندھی اٹھی، چھا گئی فضاؤں پر
وہ سارا منظرِ پرہول اس میں ڈوب گیا
فراعنہ کی زمیں! تو اگر سنے تو کہوں؟
ابھی اٹھے گا پھر اک بار پردۂ اخفا
ابھی کچھ اور بھی آگے چلے گی یہ تمثیل!
ابھی کہانی کا اک باب اور آئے گا
جو اہلِ حق ہیں وہ موجوں سے پار اتریں گے
جو ظلم و جور کا لشکر ہے ڈوب جائے گا
کلیجہ تھام لے اب، اے فراعنہ کی زمیں!
زمانہ منظرِ انجام اب دکھائے گا!
حساب لے گی مشیت جفا شعاروں سے
ضرور خونِ شہیدوں کا رنگ لائے گا
ہے چند لمحوں کا وقفہ فراعنہ کی زمیں!
فراعنہ کی زمیں! تو اگر سنے تو کہوں؟

اُس نے فرمایا

جس کا ہر قول و فعل سند اور حجت ہے !

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس روایت کے ذمہ دار ہیں کہ :-

میں ایک روز نبی صلعم کے پیچھے پیچھے تھا کہ آپ نے فرمایا " اے لڑکے! چند باتیں میں تجھے سکھاتا ہوں، اللہ کو یاد رکھ، وہ تجھے یاد رکھے گا ۔۔۔ اس پر اپنی نظر جمائے رکھ، تو اُسے اپنے سامنے پائے گا ۔۔۔ جب تو کچھ مانگے تو اللہ ہی سے مانگ ۔۔۔ اور جب تو مدد کے لئے پکارے تو اللہ ہی کو پکار ! ۔ اور خوب جان لے کہ اگر تمام کے تمام لوگ تجھے کوئی فائدہ پہنچانے پر متفق ہو جائیں تو بھی بجز اس کے کہ جو کچھ اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے قطعاً کوئی فائدہ تجھے نہیں پہنچا سکتے۔ اور خوب سمجھ لے کہ اگر وہ تجھے کوئی نقصان پہنچانے کا متفقہ فیصلہ کر لیں تو بھی بجز اس کے کہ جو کچھ اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے، ہرگز کوئی نقصان تجھے نہیں پہنچا سکتے ! ۔۔۔ قلم (قسمت نویسی کرکے) اٹھا لئے گئے، اور (تقدیر کے) رجسٹروں کی روشنائی خشک ہو چکی !"

اسباق

- یہ روایت بتاتی ہے کہ آں حضور تحریک اسلامی کے کارکنوں میں ایک اصول پرستانہ اور مجاہدانہ کیریکٹر پیدا کرنے کا کتنا اہتمام فرماتے تھے۔
- مومن کی ساری سرگرمیوں کا دارومدار تعلق باللہ پر ہے ۔
- جو کوئی اللہ کی طرف مائل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے ۔
- آدمی کا نفع نقصان تمام تر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، ان کٹھ پتلیوں کے ہاتھ میں نہیں جن کی چلت پھرت مرعوب کر لیتی ہے ۔
- ایک حق پرست کو نہ ماسوائے حاکم کی بندگی کرنی چاہئے، نہ اس سے خوف کھانا چاہئے ۔
- نفع اور نقصان، آرام اور تکلیف میں سے جو حصہ آدمی کو ملنے والا ہے وہ تو قطعی طور پر طے ہے، لہذا اسے اندیشۂ سود و زیاں سے بالاتر ہو کر سچائی کی راہ پر گامزن ہو جانا چاہئے ۔

کیا یہ تعلیم قرآن سے کوئی تضاد رکھتی ہے ؟
کیا ایمان و حکمت کے ان جواہر پاروں کو مٹی میں ملا دینا چاہئے ؟

دوسری قسط

مکتوبِ بنگالہ

اسعد گیلانی بنام نعیم صدیقی

اب میں آپ کو یہاں کے حالات ذرا منضبط انداز میں بتاتا ہوں۔

مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل دور مشرق میں واقع ہے۔ اس کی شکل کسی ایسے تخیلی جانور سے ملتی جلتی ہے جس کا جسم بکری کا، سر انسان کا اور پیچھے کی ایک ٹانگ کنگرو کی طرح ہو۔ ۔ ۔ اس شکل میں سر میں سے دماغ غائب ہے۔ پچھلے دھڑ میں دم اور ایک ٹانگ غائب ہے، انسانی منہ کھلا ہوا ہے اور ناک کسی　　　سے کم لمبی نہیں ہے۔ یہ اس خطہ زمین کی تمثیلی شکل ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے پاکستان کا یہ بازو اپنے دوسرے بازو سے بہت کچھ مختلف ہے۔ پاکستان کے اس صوبے کا رقبہ پنجاب سے بھی ۱۰،۱۵۰ (۲۵ ہزار مربع میل کم یعنی ۵۴،۵۰۳ ہزار مربع میل ہے اور آبادی پورے مغربی پاکستان سے زیادہ یعنی ۴۲،۰۹۹،۲۱۰۰۰ ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں پہاڑی سلسلہ کی ایک پٹی سی چلی گئی ہے۔ باقی سارا علاقہ میدانی ہے۔ یہ سارا صوبہ دریائے گنگا اور دریائے برہم پترا کی زرخیز مٹی سے وجود میں آیا ہے آبادی سخت گنجان ہے۔ اوسط آبادی ۷۰۵ افراد فی مربع میل ہے اور بعض اضلاع کا اوسط ۱۵۰۰ افراد فی مربع میل تک ہے۔ مشرقی پاکستان کا صدر مقام ڈھاکہ پاکستان میں تیسرا بڑا شہر ہے جس کی آبادی ۴۰۰۰۰۰ ۹ ہے۔ بادل کے اعتبار سے بھی یہ صوبہ پاکستان بھر میں درجہ اول پر ہے۔ یہاں سلہٹ میں سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے اور ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں نسبتاً کم۔ صوبہ کا انتہائی مشرقی حصہ نشیب میں واقع ہے جس کی وجہ سے بارشوں میں یہ علاقہ سیلابوں کی زد میں آجاتا ہے جیسے کہ آج کل یہ بلا ہر طرف پھیل رہی ہے۔ اور جماعت کے دس ریلیف کیمپ امداد پہنچانے میں مصروف ہیں۔

مشرقی پاکستان عرض البلد میں ۲۰،۴۷ سے ۳۰، ۲۶ شمالی اور طول البلد میں ۸۸ درجہ سے ۳۰ ، ۹۲ درجہ میں واقع ہے۔ یہاں نو مشہور دریا ہیں جو سارا سال بہتے ہیں اور بارشوں میں طوفان ڈھاتے ہیں۔ دریائے گنگا اور برہم پترا سب سے بڑے ہیں۔ باقی تستا، رحنا میگنا، پدما، مواتر ائی، مدھومتی اور کرنا فلی یہاں کے مشہور دریا ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ندی نالے تو جسم میں شریانوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ صوبہ ۱۷ اضلاع پر مشتمل ہے۔ ڈھاکہ، نواکھالی، میمن سنگھ، پبنہ، چٹاگانگ، رنگ پور، دیناج پور، بوگرہ، سلہٹ، جیسور، راجشاہی، چٹاگانگ ہل ٹریکٹ، کشتیا، فرید پور، کھلنا، ٹپرا اور باقر گنج۔ یہاں بارش کی کثرت کی وجہ سے درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے زمین کا سینہ بھرا پڑا ہے۔ جنگلات میں چٹاگانگ کی پہاڑیوں کے جنگلات، سندربن اور مادھوپور جنگل قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں کی پیداوار میں پٹ سن چاول، تیل کے بیج، کھانڈ اور چائے زیادہ اہم ہیں۔ پٹ سن یہاں کی سب سے بڑی پیداوار ہے۔ چائے کی پیداوار میں بھی اس کی حیثیت دنیا میں چوتھے نمبر پر ہے۔ مختلف پیداواروں کے اعتبار سے اس صوبے کی پیداوار کا درجہ پاکستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں حسبِ ذیل ہے:-

پیداوار	درجہ
پٹ سن	۱

چاول	۱	(چاول کا یہ درجہ قسم کے لحاظ سے نہیں بلکہ کثرت کے لحاظ سے ہے)
پٹ	۵	
گنّا	۳	
کپاس	۴	
چنا	۳	
تیل کے بیج	۳	
جوار	۵	
باجرا	۴	

یہ عجیب اتفاق ہے کہ پانی کے اعتبار سے پاکستان کا ایک بازو کثرت آب اور دوسرا قلت آب کا مریض ہے اور ان دونوں صورتوں نے دونوں حصوں کی معاشی حالت پر بہت اثر ڈالا ہے۔ اگر کسی صورت ممکن ہوتا کہ دونوں بازوؤں کو گز دو گز نیا خمیر اٹھایا جاتا تو دونوں حصوں میں ایک طبعی توازن آجاتا۔ موجودہ حالات میں بھی ملک کے حکمران اگر فہم و تدبر رکھتے اور تدبیر و جہانبانی سے کوئی علاقہ رکھتے اور اپنی صلاحیتیں ملک میں جمہوریت کا قلع قمع اور اسلام کی مزاحمت کرنے کی بجائے ملک کے طبعی وسائل کو مناسب طور پر استعمال کرنے کی تدابیر پر صرف کرتے تو ان جغرافیائی حالات سے ترقی اور قوت اور سربلندی و خوش حالی کے بہت سے اسباب پیدا ہو سکتے تھے۔ اس صوبے کے لئے دریائے برہم پترا سب سے زیادہ طوفانی دریا ہے اور پانی کی کثرت کی وجہ سے سیلابوں اور فصلوں کی تباہی، آبادیوں کی بربادی اور جان و مال کے اتلاف کا سبب بنتا ہے بلکہ اس پر پل کی تعمیر نہ ہونے کی وجہ سے اس نے شمالی حصے کو مشرقی حصہ سے قطع کر رکھا ہے اور اکثر پانی کی کثرت سے جب گھاٹ ناقابل استعمال ہو جاتے ہیں اور دونوں جانب کی ریلوے لائن متاثر ہو جاتی ہے تو دونوں طرف آمد و رفت تک بند ہو جاتی ہے۔ یہ دریا جھیل مانسرور سے نکلتا ہے جو تبت میں تقریباً ۲۲ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس جھیل سے دریائے ستلج، دریائے سندھ اور دریائے میگنا نکلتے ہیں جن میں سے دریائے ستلج اور دریائے سندھ مغربی پاکستان کی طرف جاتے ہیں اور دریائے برہم پترا اور میگنا مشرقی پاکستان میں سے گزرتے ہیں۔ اگر ہماری حکومت تبت کی حکومت سے گفت و شنید کے ذریعہ برہم پترا کے منبع پر بھاری بند باندھ دے تو ایک طرف مشرقی پاکستان پانی کے اس عذاب سے محفوظ ہو کر اس کی آبی حالت اعتدال پر آجائے گی، دوسری طرف مغربی پاکستان کے ستلج اور سندھ میں پانی کے اضافہ سے وہاں قلت آب کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔ اس طرح اگر وسیع پیمانے پر یہاں جنگلات اور درختوں کی کٹائی کا کام کیا جائے تو اس سے ہزاروں ایکڑ زمین قابل کاشت نکل آئے گی۔ دوسری طرف درختوں کی کمی کی وجہ سے یہاں بارش کے تناسب میں کمی واقع ہوگی۔ تیسرے یہاں کے موسموں پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ چوتھے فرنیچر اور عمارتوں کے لئے بہت سی لکڑی نکل آئے گی۔ پانچویں بڑے وسیع پیمانے پر یہاں کوئلہ بنایا جا سکے گا جس کی کمی یہاں شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن جو حکومت مغربی پاکستان میں نہروں کو پختہ کر کے پنجاب کے زرخیز ترین علاقوں کو مسلسل سیم کی بیماری میں مبتلا ہونے سے نہ بچا سکے اس سے ایسی اسکیموں پر غور کی کیا امید ہو سکتی ہے یہاں تو پٹ سن کی پیداوار کو اس لئے حکماً روکا جا رہا ہے کہ ملک سے باہر ہم کوئی گاہک نہیں پیدا کر سکے اور ملک کے اندر اس کی کھپت اور مصنوعات تیار کرنے کے لئے ہمارے پاس ذرائع نہیں۔

یہاں اشیاء کی مہنگائی سے کہیں بڑھ کر بے روزگاری اور قلت زر کی شکایت ہے۔ یہاں کی پیداوری حالت کے مقابلہ میں عوام کی قوت خرید نہایت

پست ہے اور یہ قوتِ خرید کی پستی ہی ہے کہ یہاں کی مقامی صنعتوں کو فروغ نہیں ہو رہا۔ حکومت کی بے تدبیری کا یہ عالم ہے کہ ایک طرف یہاں دو روپے گز سے کم کوئی کپڑا نہیں تھا اور دوسری طرف گزشتہ فصل کے موقع پر کسانوں نے ڈیڑھ اور دو روپے من تک دھان فروخت کئے۔ ظاہر ہے اگر ایک کسان اپنی چھ ماہ کی محنت کا نتیجہ ایک من تول کر دینے کے باوجود ایک گز کپڑا نہ حاصل کر سکے تو وہ اپنے خاندان کے ساتھ زندگی کا ایک سال کیسے گزار سکتا ہے جب کہ اسے اسی اناج سے لگان دینا ہے۔ سال بھر کھانا ہے، کپڑا خریدنا ہے اور زندگی کی دوسری سب ضروریات کو اس اناج کے ذریعہ پورا کرنا ہے ۔

یہ زراعتی صوبہ ہے اور اس کی معیشت کا انحصار زراعت یعنی کسان کی محنت پر ہے لیکن یہی طبقہ سب سے زیادہ خستہ حال ہے۔ بارش کے طوفان اور تیز دھوپ میں وہ ایک تہبند اور سر پر پتوں کے ایک ہیٹ نما ٹوکرے کے ساتھ مسلسل محنت کرتا ہے اور گھٹنوں سے اونچے پانی میں ہل چلاتا ہے اور فرصت کے اوقات میں تالابوں اور ندیوں کے کنارے مچھلی پکڑتا نظر آتا ہے ۔

یہاں کی معیشت کا اہم ترین جزو "ہاٹ" ہیں۔ ہاٹ ایک طرح کے دیہی میلے ہیں جو بنگال کے پورے صوبہ میں جگہ جگہ لگتے ہیں۔ شہروں میں بھی قصبوں میں بھی، دیہاتوں میں بھی، ان میلوں میں کسان اپنی اپنی دیہی پیداوار لے کر آتے اور فروخت کرتے ہیں اور قصبوں اور شہروں کے دکاندار بھی ان میں حصہ لیتے ہیں۔ ان میلوں میں کسان اپنی دیہی پیداوار فروخت کر کے اپنی ضرورت کی اشیاء خریدتے ہیں۔ چنانچہ گوشت، پھل، سبزیاں، کپڑا، مچھلی، بانس کی ٹوکریاں، چاول، گڑ، مرغیاں، انڈے، دودھ، بکریاں، صابن اور ہر قسم کی ضرورت کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ یہاں بالعموم ہاٹ سے خرید و فروخت کا زیادہ رواج ہے یہ ہاٹ ہفتہ میں دو بار، تین بار، ہر ہر جگہ لگتے ہیں۔ لوگ اپنی ضرورت کی اشیاء کی خرید انہیں ہاٹوں میں کرتے ہیں اور روزانہ کی خرید و فروخت کا رواج چھوٹے قصبوں میں ذرا کم ہے۔ یہ ہاٹ دیہی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔

بنگال میں اسمگلنگ نے بھی یہاں کی معیشت میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ شہروں میں باقاعدہ ایسے جتھے موجود ہیں جو کسٹم کے افسران اور بارڈر پولیس سے سازباز کر کے باقاعدہ اس فنِ شریف کو بطور پیشے کے اپنائے ہوئے ہیں۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جن کا پیشہ ہی اسمگلنگ ہے اور وہ اسے اس باقاعدگی سے انجام دیتے ہیں جس طرح کوئی دکاندار اپنے کاروبار کو انجام دیتا ہے۔ یہ لوگ پاکستان کا مال بھارت میں اور وہاں کا مال پاکستان میں اسمگل کرتے ہیں۔ کسٹم اور بارڈر کے عملے سے ان کے معاملات متعین اور مقرر ہیں اس لئے وہ دھڑلے سے پاکستان کی معیشت کو گھن کی طرح لگے ہوئے ہیں۔ اس پیشے میں زیادہ تر بہار کے مہاجر مبتلا ہیں اس لئے کہ ان کے پرانے گھر بھارت میں موجود ہیں اور ان کے دونوں ملکوں میں ٹھکانے کے اڈے موجود ہیں۔ خود ہمارے محلے میں میرے ہمسائے میں ایسے دس پندرہ آدمیوں کا ایک جتھا اس کاروبار میں مصروف ہے یہ لوگ اخلاقی لحاظ سے گھٹیا اور تیسرے درجہ کے لوگ ہیں۔ چونکہ حکومت کے عمال کی کارکردگی کو رشوت نے گھن کی طرح کھا لیا ہے۔ اور اخلاق سے عاری ہونے کی وجہ سے ان کے نزدیک اپنا ذاتی مفاد ہی معبودِ برحق ہے جس کی پرستش ان کے نزدیک عبادت ہے اس لئے وہ ملک و ملت کے مفاد سے لاپرواہ ہو کر اپنی جیبیں بھرنے میں مصروف ہیں۔ بنگال کے سینکڑوں میل لمبے بارڈر پر ہر جگہ یہ کام ہزاروں افراد کے ذریعہ ہوتا ہے اور اس کی روک تھام اس کے سوا کسی صورت ممکن نہیں ہے کہ حکومت اپنے عمال کی اصلاح کرے اور اس میں مبتلا مجرموں کو سخت ترین پبلک سزائیں دے۔

بنگال کی ۴,۱۹,۲۱,۰۰۰ کی آبادی میں [illegible],۰۰,۰۰۰ بہار کے مہاجر ہیں۔ یہ مقامی باشندوں سے اتنا ہی تعصب رکھتے ہیں جتنا مقامی باشندے [illegible] بنگالی [illegible] طرح [illegible] دونوں [illegible] تھوڑے سے [illegible] اگرچہ ان کے لباس اور غذا ایسے کہ مقامی باشندوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن بہاری لوگ

ے اخلاق و کردار سے مقامی باشندے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں ۔ انتہا یہ ہے کہ بنگال کے مقامی باشندے ہر برائی کا سرچشمہ ان بہاریوں کو سمجھتے ہیں اور ہر
شخص جو غیر بنگالی ہے اور جس سے وہ کسی نہ کسی پہلو سے نالاں ہیں وہ ان کے نزدیک بہاری ہوتا ہے ۔
ایک چیز جو نمایاں نظر آتی ہے وہ بنگالی باشندوں کی بہاریوں کے مقابلے میں اخلاقی لحاظ سے ایک حد تک برتری ہے ۔ یہ لوگ اتنے بگڑے
ہوئے (CORRUPTED) نہیں ہیں جتنے باہر سے ہجرت کر کے آئے ہوئے لوگ ہیں ۔ اگرچہ مستثنیات ہر جگہ موجود ہوتی ہیں ۔ دینی اعتبار سے
یہ بنگالی بہاریوں کے مقابلے میں زیادہ دیندار اور اسلام پسند ہیں اور پارٹی بازی گروہ بندی اور فکری انتشار میں نسبتاً کم مبتلا ہیں ۔
معاشرتی لحاظ سے اس صوبہ کے لوگ پاکستان کے دوسرے بازو کے مقابلے میں کچھ مختلف ہیں ۔ یہاں پردہ کا رواج وہاں کی نسبت زیادہ ہے اور
مغربی پاکستان سے آنے والا شخص جو چیز فوری طور پر محسوس کرتا ہے وہ شہروں کے بازاروں میں عورتوں کی چہل پہل کا فقدان ہے ۔ یہاں پورے اسلوب زینت
سے مسلح خواتین بازاروں میں نظر نہیں آتیں جیسی وہاں کراچی اور لاہور میں نظر آتی ہیں ۔ یہاں پردے اور شرم و حیا کا احساس کافی گہرا اور شدید ہے ۔ پچھلے
دنوں سیلاب کی تباہ کاریوں کا جائزہ لینے کے سلسلے میں جماعت اسلامی کا وفد جب "کاشے بندہ" کا دورہ کرنے کے لئے گیا تو میں نے وہاں یہ دیکھا
کہ تباہ حال، برباد اور گھر بار لٹا دینے کے باوجود دیہاتی خواتین جماعت کی امدادی کشتی سے امداد لینے کے لئے آنے سے گریز کرتی تھیں ۔ جہاں گھروں
میں کوئی مرد یا بچہ نہ تھا وہاں خواتین نے امداد کے مقابلے میں سامنے نہ آنے کو ترجیح دی اور ہمیں دیہات کے بڑے افراد کی معرفت ان گھروں میں امداد کا
سامان دینا پڑا ۔ ایسے دردناک حالات میں یہ صورت حال شرم و حیا اور حفظ ناموس کا ایک اونچا معیار پیش کرنے والی تھی ۔ پھر دیانت اور اخلاق کے
مظاہرے بھی ہوئے ۔ جب کسی دیہات میں بعض افراد نے اپنے اپنے گھروں میں کمر تک پانی میں غرق ہونے کے باوجود یہ کہہ کر امداد لینے سے انکار کیا کہ ابھی
ہمارے پاس کچھ کھانے پینے کا سامان ہے اور ہم مستحق نہیں ہیں ۔ البتہ گاؤں کے فلاں فلاں خاندان یا بیوائیں امداد کی مستحق ہیں ، اس معیار اخلاق و ایثار
نے ہمارے حوصلوں کو اس قوم کی طرف سے بہت بلند کیا ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ قوم اپنے امراء کی ماری ہوئی ہے ۔ اگر اوپر سے امانت و دیانت اور شرافت
و پاکیزگی کا کوئی مظاہرہ ہو جائے تو پھر نیچے سے اصلاح کا دھارا اس قوت سے پھوٹے گا کہ انشاء اللہ یہ قوم اپنے عہد رفتہ کو پا کر رہے گی ۔
یہاں کی غذا دال بھات ہے یعنی چاول اور دال ۔ مسور کی دال خصوصی اہمیت رکھتی ہے اس لئے کہ اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اسے
پانی کی حد تک پتلا کیا جا سکے ۔ اس بنیادی غذا کے ساتھ دوسری چیزوں کا اضافہ صرف آمدنی اور امارت کے اظہار کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جاتا
ہے ۔ لیکن یہ دونوں چیزیں تو دسترخوان کے بنیادی اجزاء ہیں جن کے بغیر بنگال میں کوئی دسترخوان نہیں لگایا جاتا ۔ روغنیات میں اوپر سے نیچے
تک صرف تیل استعمال ہوتا ہے اور گھی کا استعمال تقریباً ناپید ہے ۔ اسی لئے یہاں گھی اول تو ملتا ہی نہیں اور اگر کہیں سے ڈھونڈ نکالا جائے تو
بالعموم ساڑھے آٹھ روپے سیر سے کم نہیں ملتا ۔ بنگالی دسترخوان پر بالعموم انتہائی سستا قسم کا چاول ہوتا ہے جو موٹا ہوتا ہے اور اس میں ایک عجیب
قسم کی بو ہوتی ہے ۔ پانی کی طرح پتلی دال کا بڑا پیالہ ہوتا ہے جو ابلے ہوئے خشک چاولوں کو نگلنے کے قابل بناتا ہے ۔ لیموں یا کوئی اور کھٹی چیز
ہوتی ہے ۔ نمک ہوتا ہے جو ابلے ہوئے چاولوں پر چھڑکا جاتا ہے ۔ ساتھ ہی کبھی کچے کیلوں کا سالن یا گوشت یا مچھلی کا شوربہ ہوتا ہے ۔ یہ متوسط درجہ
کی غذا ہے ۔ غریب دیہاتی رات کے بچے ہوئے ابلے چاولوں میں رات ہی پانی ڈال دیتے ہیں اور صبح ان چاولوں کو بطور ناشتہ استعمال کرتے ہیں
یہاں کا معروف دیہاتی ناشتہ ہے جسے "پنتا بھات" کہا جاتا ہے ۔ اکثر غریب خاندان کئی کئی وقت ابلے اور بھنے ہوئے چاول جن کو "موری" اور "چوڑا"
کہتے ہیں کھا کر گزارہ کرتے ہیں ۔ یہاں خوراک میں مچھلی ایک اہم اور محبوب جزو ہے جو ہر جگہ تالابوں، ندیوں، بہتے پانی کے نالوں، دھان کے کھیتوں
اور دریاؤں میں سے پکڑی جاتی ہے ۔ انتہائی چھوٹی مچھلی سے لے کر جو مونگ پھلی کے برابر ہوتی ہے کئی کئی سیر کی مچھلی استعمال ہوتی ہے لیکن چونکہ

مچھلی سمندر کی نہیں ہوتی اس لئے اتنی بڑی سائز کی نہیں ہوتی جو کراچی کی ٹی مارکیٹ میں نظر آتی ہے۔ مچھلی کی بیسیوں اقسام ہیں جن میں رو ہو اور ہلسہ بہترین سمجھی جاتی ہیں۔

یہاں کے دیہی اور قصباتی مکانات اکثر بانس کی کھپچیوں کے ہوتے ہیں جن کی چھتیں بڑی بڑی لمبی گھاس کے مخروطی چھپروں (THA: TCHES) سے ڈھکی جاتی ہیں۔ چھپریاں کی خصوصی پیداوار ہے۔ یہاں کی معاشرت میں مغربی حصے کے مقابلے میں صفائی کم ہے جو شاید پانی اور سبزے کی کثرت کی وجہ سے ہے۔ دیہات بالعموم گھنے درختوں کے جھنڈوں میں بنائے جاتے ہیں جو پنجاب کی طرح سینکڑوں گھروں پر مشتمل نہیں ہوتے بلکہ چند گھر مل کر دیہات بن جاتے ہیں۔ بالعموم لوگوں نے اپنے اپنے کھیتوں میں مل جل کر مکانات بنا رکھے ہیں۔ مکانات کے گرد اکثر بانس کے جھنڈ اور نوکیلے پتوں کے پودوں کی باڑھ ہوتی ہے۔ انہیں بانس کے درختوں، کیلے کے پودوں، پپیتے اور ناریل کے درختوں اور مختلف قسم کی بیلوں کے اندر گھرے ہوئے دو چند مکانات ہوتے ہیں جو مل کر ایک "باڑی" بناتے ہیں۔ یہاں سلام علیک کے بعد اکثر یہی سوال پہلے آتا ہے "اپنر باڑی کتھے؟"

یہاں مکانات کی تعمیر کا معیار بہت پست ہے۔ اس کی وجہ غربت بھی ہے اور موسمی حالات بھی ہیں۔ چونکہ بارش انتہائی کثرت سے اور شدید ہوتی ہے اور اس طرح بارانی طوفان اور آندھیوں کے جھکڑ بھی چلتے ہیں اس لئے مکانات ایسی جگہوں پر بنائے جاتے ہیں جہاں بانس کے لچکدار درختوں کے جھنڈ انہیں آندھی کی شدت اور بارش کے طوفان سے ایک حد تک روک سکیں۔ شہروں میں مکانات پختہ تو ہوتے ہیں لیکن کئی کئی منزل کے بنانے کی بجائے بالعموم ایک یا دو منزل کے بنائے جاتے ہیں۔ مکانات کی کرسی اونچی رکھی جاتی ہے تاکہ مکانوں کے اندر سیل نہ پیدا ہو۔ اس کے باوجود بارش کے دنوں میں مکانوں کے اندر سیل ایک لازمی سی چیز ہوتی ہے۔

لنگی اور بنیائن یا قمیص یہاں کا عام لباس ہے۔ سر اور پاؤں سے ننگے رہنے کا یہاں بہت رواج ہے۔ بس یہی لباس بنگال کے عوام کی نمائندگی کرتا ہے۔ شہروں میں کچھ ترقی کرکے یہ لباس قمیص اور پتلون ہوگیا ہے یا کہیں کہیں شیروانی کا اضافہ بھی نظر آتا ہے۔

یہاں آبادی کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص دور کھلے کھیتوں میں جا کر کھڑا ہو اور اپنے چاروں طرف دیکھے تو اسے اپنے حدِ نظر کے دائرہ افق میں کم از کم سات آٹھ دیہات نظر آ جائیں گے جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بسے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ انتہائی گنجان آبادی کا صوبہ ہے۔ پاکستان کے ڈنگ اکلا سا لوٹے اور ناک نقشہ میں خفیف سی وہ جھلک موجود ہے جو مشرق بعید کی طرف بڑھتے چلے جانے سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہاں ہر جانور، چیز چھوٹی اور ہر بے جان چیز بڑی ہے۔ سبزیاں بہت بڑی بڑی خصوصاً بھنڈی تو ایک ایک بالشت سے زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یا تو زمین کی زرخیزی کے لئے یا رواج سبزیوں کے پک جانے تک انہیں بیلوں یا پودوں سے نہیں اتارا جاتا۔ چنانچہ یہ سبزیاں پودوں اور بیلوں پر ہی اتنی پک جاتی ہیں کہ پھر انہیں چولہوں پر پکانا ممکن نہیں رہتا۔ یہاں مویشی بھی چھوٹے چھوٹے ہیں خصوصاً بکریاں اور گائیں تو بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ بکریوں کی شکل و شباہت ہرنوں سے ملتی جلتی ہے۔ اسی طرح کا بھرا بھرا گٹھا ہوا لیکن سبک جسم، اسی طرح چھوٹے چھوٹے سینگ اور چھوٹی سی دم اور تقریباً اسی طرح کا رنگ اور آنکھیں۔ یہاں بھینسیں بہت کم ہیں بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بھینس یہاں کا جانور نہیں ہے۔ شاذ کہیں کوئی نظر آ جاتی ہے اور جو ہوتی ہے تو حسب معمول بہت بھدی اور بدصورت بلکہ اپنی روایتی بدصورتی سے بھی زیادہ بدصورت۔ سیدھے لمبے لمبے سینگ جو قدرت نے گول کی بجائے غالباً اس لئے لمبے کر دیئے ہیں کہ جھاڑ جھنکاڑ اور بانس کے جھنڈوں میں نہ پھنس جائیں۔ بچھڑے بھی چھوٹے ہوتے ہیں جو پانی میں تیرنا خوب جانتے ہیں۔ چنانچہ ایک چھوٹی سی ندی میں میں نے

ایک بچھڑے کو خود دیکھا کہ وہ پھدک پھدک کر اور اچھل اچھل کر پانی کو پار کر رہا تھا - یہاں کے سانپ بھی پانی میں تیرنا خوب جانتے ہیں چنانچہ گاڑی اور اسٹیمر میں جاتے ہوئے کئی بار یہ نظارہ دیکھنے میں آیا کہ زرد رنگ کے موٹے موٹے سانپ اپنی گردن پانی سے باہر نکالے اطمینان سے تیرتے چلے جا رہے تھے - اسی طرح ایک مکان جو کرایہ کے لئے دیکھنے گئے جو کئی دن سے خالی پڑا تھا تو جس طرح حسب معمول اس کے در و دیوار پر پورا گلستان اُگا ہوا تھا اسی طرح اس کے کنوئیں میں ایک سانپ بھی گردن نکالے تیر رہا تھا جسے ہمارے رفیق نے بڑی سی اینٹ کا نشانہ بنا دیا -

یہاں کے پھلوں میں ہر قسم کے کیلے بڑی افراط سے پائے جاتے ہیں لیکن بہت گھٹیا قسم کے یا تو یہاں کی آب و ہوا بہتر کیلے پیدا ہی نہیں کرتی یا اس کا کسی نے تجربہ ہی نہیں کیا - بہر حال تمام اقسام کی اکثریت بدمزہ، پھیکی اور بے لطف ہے - البتہ نرائن گنج کے کیلے اچھے ہوتے ہیں آم بھی اتنی کثرت سے اتنے گھٹیا کہیں اور ملنا دشوار ہیں - کھٹے، پھیکے، نمکین اور بدمزہ - صرف لنگڑا آم ذرا بہتر قسم ہے لیکن وہ چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں میسر نہیں آتا - صرف بڑے شہروں میں مل سکتا ہے - دیکھنے میں اتنے بھلے اور کھانے میں اتنے بُرے آم [illegible] آج تک میں نے کہیں نہ دیکھے تھے - چنانچہ ایک دو بار کی غلطی کے بعد پھر ہمت نہیں ہو سکی - یہاں کا بہترین پھل انناس ہے جسے تراشنا بذات خود ایک فن ہے - اور اگر آپ کو میں بھجوانے کی ہمت کروں تو امریکی امداد کی طرح ساتھ ہی ایک تراشنے کا ماہر بھیجنا پڑے اس لئے نہیں بھجوا سکتا - اس پھل سے آپ اچھی طرح متعارف ہوں گے لیکن اس کی کثرت سے آپ کو واسطہ نہ پڑا ہو گا - یہ پھل اپنی شکل و صورت کے لحاظ سے شریفہ کی طرح کا ہوتا ہے - اس کا چھلکا بہت موٹا موٹا تراشا جاتا ہے - پھر اس کی بے شمار آنکھیں ہوتی ہیں جو اتنی ہی احتیاط اور بے دردی سے نکال دی جاتی ہیں جس طرح غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال دی تھیں - اس لئے کہ یہ بے بصر آنکھیں ہوتی ہیں - ان کی تہ میں انناس کا بیج ہوتا ہے جس کے ارد گرد تیزابی مادہ ہوتا ہے جسے اگر نکال نہ دیا جائے تو یہ تیزابی مادہ منہ زخمی کر دیتا ہے - ڈاب یعنی کچے ناریل بھی یہاں فروخت ہوتے ہیں جن کا لوگ پانی پیتے ہیں ان کے علاوہ معمولی قسم کے امرود بھی پائے جاتے ہیں - مکئی کے بھٹے یہاں بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں اور بازاروں میں کثرت سے بھون کر فروخت کئے جاتے ہیں - ایک پھل کٹھل ہے جو تربوز کے برابر بڑا ہوتا ہے - اوپر سے کانٹے دار موٹی کھال - اس کے اندر سے موٹے موٹے کھجور کی طرح بیج نما دانے نکلتے ہیں جن کو کھایا جاتا ہے لیکن ان کی شکل و صورت بہت بدنما اور بھونڈی بلکہ کراہت سی ہوتی ہے - اس لئے ہر اجنبی ان کو کھانے کی ہمت نہیں کر سکتا - یہ پھل یہاں کی آبادی میں بہت مقبول ہے بلکہ "کٹھل اور موری" کو ملا کر کھانا دیہاتی بنگالیوں کے لئے ایک پر لطف تفریح کہا جاتا ہے -

یہاں کی سیاسی حالت سے قطع نظر سیاسی زمین بہت کچھ امید افزا ہے - اس لئے کہ یہاں کے لوگ ایسے سیاست باز نہیں ہیں - جیسے مغربی پاکستان میں ہیں - اسی طرح یہاں صوبہ گیر مقبولیت رکھنے والی کوئی شخصیت نہیں ہے اور خصوصاً وہ جماعت جس نے پاکستان میں مسلمانوں کے اخلاق، سیاست، جمہوریت، شرافت، ملکی وقار، قومی خودداری، ملی حمیت کو تباہ و برباد کر کے اسے ہر لحاظ سے ایک نادار قوم بنا دیا ہے اس جماعت کا یہاں سے جنازہ اُٹھ گیا ہے - اگرچہ اس کی جگہ لینے کے لئے کچھ اس سے بھی بدتر عناصر سر اٹھا رہے ہیں لیکن ان عناصر میں ابھی وہ قوت نہیں ہے کہ صوبہ کے عوام کو متحد، منظم اور مطمئن کر سکیں - بنگال سے مسلم لیگ کا جنازہ نکلنے میں مسلم لیگ کی بدکرداریوں کا زیادہ ہاتھ تھا - اور اس کے مخالف عناصر کی مقبولیت کا کم - یہاں مسلم لیگ کی بڑی بڑی اہم شخصیتیں اور مدت سے صوبے کی سیاست پر چھائے ہوئے ارباب اقتدار صرف اس لئے ہار گئے کہ ان کا تعلق اس مسلم لیگ سے تھا جس کے مظالم اور بے حیائی نے یہاں کے عوام کو گزشتہ چھ سال سے کچلا، پیسا، روندا اور تباہ و برباد کیا تھا اور ان کے مقابلے میں غیر معروف، معمولی، جاہل، اُجڈ اور بے سرو سامان لوگ اس لئے جیت گئے کہ وہ

مسلم لیگ کے امیدوار نہ تھے، یہاں مسلم لیگ اپنی طبعی موت مری ہے، وہ مدقوق تھی، مفلوج تھی، مبروص تھی، مجذوم تھی اور اس کی رگ رگ سے بدکرداری کا زہر پھوٹ رہا تھا۔ اس حالت سے اس متعفن لاش سے کون شریف آدمی چپکا رہ سکتا تھا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے اسے دفن کر دیا۔

لیکن چونکہ مشرقی پاکستان کے عوام اپنی سادہ روی اور افتادِ طبع کے باعث سیاسی لحاظ سے ہرجائی پن کے عادی نہیں اس لیئے جب تک مسلم لیگ نے ان کو پے بہ پے ڈنک نہیں مارے وہ اس کے مظالم سہہ کر بھی خاموش رہے لیکن جب صورتِ حال برداشت سے باہر ہو گئی تو عوام میں اس کے خلاف نفرت کا وہ شدید جذبہ ابھرا جس کے نتیجے میں آدمی (کہیں بھی) ANYWHERE کا نعرہ لگا کر اپنے مبغوض کے ہر مخالف کو اپنا دوست سمجھ لیا کرتا ہے ورنہ متحدہ محاذ کی بھی سیاسی گراونڈ کا یہ عالم تھا کہ اس میں بھانت بھانت کے طرزِ فکر کے لوگ جمع ہو گئے تھے اور فضل حق کی شخصیت کے سوا ایک بھی صوبہ گیر شخصیت نہ تھی۔ چنانچہ اس بھان متی نے اپنی محنت و کوشش سے اس کنبے کو جوڑا لیکن یہ جوڑ بالکل عارضی سا تھا اس لئے کہ رنگ برنگ کے طرزِ فکر نے اندر ہی اندر زور کرنا شروع کر دیا جن میں کیمونسٹ منظم ہونے کی وجہ سے زیادہ باقر ثابت ہوئے اور چوں کہ وہ بنیادی طور پر ہمیشہ سے پاکستان کے مخالف رہے ہیں اس لئے بھی کہ روس مخالف رہا ہے۔ اس لئے بھی کہ تقسیم ملک کی وجہ سے انہیں کام کی مشکلات درپیش ہو گئیں اور اس لئے بھی کہ پاکستان کی کیمونسٹ پارٹی ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی کے تحت ہے اس کی نگرانی میں، اس کی معرفت ہدایات اور امداد حاصل کرتی ہے۔ چنانچہ متحدہ محاذ کی کامیابی کے بعد فضل حق اور مولانا بھاشانی کے گرد کیمونسٹوں کا گھیٹا اس بات پر گواہ ہے کہ ان کے اثرات نے ان دونوں لیڈروں کو جو زبان کے لحاظ سے لیڈر لیکن فکری اور ذہنی اعتبار سے ایک عام بنگالی سے کسی صورت اونچا نہیں سوچ سکتے انہیں پوری طرح دوسروں کے ہاتھوں کا کھلونا بنا کر رکھ دیا تھا۔

متحدہ محاذ کا غبارہ پھٹ جانے کے بعد یہاں کا سیاسی میدان پھر بنجر پڑا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں اشتراکیوں کے اثرات ہیں اس لئے کہ ان کو ایک طرف برما، دوسری طرف چٹا گانگ کی پہاڑیوں اور تیسری طرف بھارت کی سرحدوں سے کارکنوں، ہدایات، لٹریچر اور ہر قسم کی خارجی امداد ملتی رہتی ہے لیکن ان کے اثرات نے ابھی صرف اتنا کام کیا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں خصوصاً کالجوں کے طلباء اور پروفیسروں کے ذہن کو ایک حد تک معاشی مسائل کے گورکھ دھندے میں الجھا دیا۔ اس کے لئے اس صوبے کے عوام کی معاشی ابتری کھاد کا کام کرتی ہے گویا کیمونسٹوں کے لئے زمین ہموار کرنے کا یہ کام مسلم لیگ بہ نفسِ نفیس پہلے ہی انجام دے چکی ہے۔

۹۲ الف کے بعد متحدہ محاذ کی سب اتحادی جماعتیں شل پڑی ہیں۔ کرشک سرمک پارٹی، خلافتِ ربانی پارٹی، نظامِ اسلام پارٹی، عوامی لیگ، کیمونسٹ پارٹی سب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ سہانے موسم میں تو خوب قلا بازیاں لگا سکتے ہیں لیکن جب ذرا آندھی آ جائے۔ جب کچھ اولے برس جائیں، جب موسم ذرا تند ہو جائے یا جب حدت ذرا جھلسانے لگے تو پھر حشراتِ الارض کے لئے زمین کی سطح جگہ نہیں رہتی اور وہ روپوش ہو جاتے ہیں۔ ایسے برے موسم کے لئے ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ چنانچہ ضلع دیناج پور کے سیکریٹری متحدہ محاذ سے جب گفتگو ہوئی اور ان کے سامنے جماعت کا نصب العین پیش کیا گیا تو انہوں نے بڑی حسرت سے کہا "ہمارے سامنے کوئی پروگرام نہیں، ہمیں کچھ پتہ نہیں، ہم کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا" اور ان کے ان الفاظ میں اس شخص کے جذبات کی جھلک بالکل نمایاں تھی جو ازخود رفتگی سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو اور ایسے کسی کنارے کی تلاش ہو جو پیاسا ہو لیکن پانی کو جانتا نہ ہو جو طالب ہو لیکن مطلوب کے حلیہ اور خدوخال سے ناواقف ہو۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ فضل الحق صاحب کی سیاسیات سے علیحدگی کے بعد اب آپ کس کے بارے میں توقع رکھتے ہیں کہ اسے پارٹی

بیٹھ رہا جائے گا اور کون اس کی جگہ لے سکتا ہے تو انہوں نے بتایا کہ "کوئی نہیں"۔

غرض یہ ہے حالت اس گٹھ جوڑ کی جس نے یہاں ۹۵ فی صدی نشستوں پر قبضہ کر کے مسلم لیگ کو صوبہ بدر کر دیا تھا۔ دراصل اس نے مسلم لیگ کو تو صوبہ بدر کر دیا تھا لیکن خود اس کی جگہ نہیں لے سکا۔

اب مرکزی حکومت اپنی عنایات خسروانہ سے اپنا دامنِ شفقت پھیلا کر بنگال کے روٹھے ہوئے عوام کو منانے کی فکر کر رہی ہے۔ کہیں صنعتی ترقی کے لئے امداد کے اعلان ہیں، کہیں زرعی ترقی کے لئے اسکیموں کے اعلان ہیں۔ کہیں صوبے میں امن و چین کی بنسی بجنے کا نغمہ ہے۔ کہیں اپنے حریفوں سے سیاسیات سے پیشگی دست برداری حاصل کی جا رہی ہے۔ کہیں کمیونسٹوں کے ساتھ اسلام پسند عناصر کو ملا کر انہیں بیک جنبشِ لب پاکستان کے لئے خطرہ نمبر ایک بیان فرمایا جا رہا ہے۔ کہیں سیلاب زدگان کی امداد کے لئے چلتے چلتے اعلانات کر کے اپنی لگاوٹ اور ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ کہیں پارلیمنٹ میں مشرقی پاکستان میں دفعہ ۹۲ الف کے قصیدے پڑھے جا رہے ہیں۔ اور کہیں سرویسز کو شہ کارا جا رہا ہے کہ تم عوام کے ساتھ جو چاہو کر گزرو۔ حکومت تمہارے ہر فعل کی پشت پناہی کرے گی اور اس طرح انہیں آئندہ ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ کے حق میں استعمال کرنے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ وہ دھاری اسلحہ ہے اور اس کے الٹا چل جانے کا نتیجہ پچھلے انتخابات میں حکومت دیکھ چکی ہے۔ مانا کہ یہ اسلحہ پنجاب کی نوکر شاہی فضا میں چل جاتا ہے لیکن نعیم صاحب! کیا آپ بزعم خود آقایان ولی نعمت کو میری یہ بات پہنچا سکتے ہیں کہ اب آپ کی دھاندلیوں سے منظم نیکی نہ متاثر ہو گی، نہ مرعوب ہو گی، اور نہ پسپا ہو گی بلکہ وہ آگے بڑھے گی اور آپ اس کا راستہ روک نہ سکیں گے بلکہ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اس غنڈے کو بھی یہ بات پہنچا دوں کہ جو دس روپے روز پر بوگس ووٹ ڈالنے کا ٹھیکہ لیتا ہے کہ اب اگر تو دھاندلی کرنے کے لئے آئے گا، اب اگر تو اسلام کے خلاف سازش کرنے کے لئے آئے گا۔ اب اگر تو ضمیر فروشی کر کے ابھرتے ہوئے اسلام کی راہ کا روڑا بنے گا۔ اب اگر تو رشوت کی ہڈی منہ میں لے کر کاٹنے دوڑے گا تو اسلام کے لئے جینے والے تیرا منہ نہیں تکتے رہیں گے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ان دونوں روٹھے ہوؤں کو منانے کا کام ہو رہا ہے۔ لیکن عوام روٹھ جائیں تو ان کو دور سے روٹی پھینک کر نہیں منایا جا سکتا۔ ان کے سامنے آکر، ان کے پاس بیٹھ کر، ان کی شکایات سن کر، ان کا دکھ درد بٹا کر، ان میں گھل مل کر، ان کے ساتھ مل بیٹھنے سے منایا جا سکتا ہے اور افسوس کہ ہماری قیادت کو انگریز جاتے ہوئے صرف یہی ایک کام ہے جو سکھا کر نہیں گیا۔ اور اس کام کے تصور سے ہمارے مرکز کے بڑے بڑوں کا زہرہ آب ہوتا ہے اور اگر کبھی موقع آ جائے تو عوام کے سامنے جانے کے خوف سے وہ اپنے سیلونوں میں بیٹھے بیٹھے صلوٰۃ عوری ملک کی نیت باندھ لیتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلم لیگ کے لئے اب یہاں کوئی جگہ نہیں چاہے مرکز سے زور لگا دو جگائے اس لئے کہ یہاں مسلم لیگ بہاریوں کی جماعت سمجھی جاتی ہے۔ اور بہاری غیر ملکی بنگال کے سینے پر بوجھ اور قابلِ نفرت سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ منفی جذبہ ہے۔ مثبت یہ ہے کہ مسلم لیگ مفاد پرستوں کی جماعت ہے۔ اس نے گزشتہ سات سال میں ملک کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ اس کے پاس کوئی پروگرام اس کے سوا نہیں ہے کہ کسی صورت وزارتوں، سفارتوں اور عہدوں سے چپکا رہا جا سکے۔ کمیونسٹ پارٹی خلافِ قانون ہونے کی وجہ سے زیرِ زمین چلی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس کی ظاہری اور مخفیانہ سرگرمیاں بھی مزید کم ہو گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ خانہ خالی ہے اور کسی بھی دینی سیاست کی آمد کا منتظر ہے۔
سیاسی سرگرمیوں کے لحاظ سے یہاں کے باشندے پنجاب کے باشندوں سے بالکل مختلف واقع ہوئے ہیں۔ پنجاب جس پر تین ماہ کے

مارشل لاء نے گویاں برسائیں اور کسی غیر ملکی فوجی تسلط کا مکمل نقشہ پیش کر دیا اس قدر خون بہنے کے باوجود پھر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اس لئے کہ وہاں سیاسی جرأت کی کمی نہیں ہے۔ یہاں وہ چیز نہیں ہے۔ یہاں دفعہ ۹۲ الف نے خوف وہراس کی فضا پیدا کر دی ہے اور عوام میں ایک بیچارگی، درماندگی اور بے بسی کا سا احساس ابھر آیا ہے۔ یہاں انسانوں کی رگوں میں خون اس تیز رفتاری سے حرکت نہیں کرتا جس تیز رفتاری سے وہاں حرکت کرتا ہے۔ آج بنگال کی رگوں میں مقصدیت، اصول پسندی اور منظم پروگرام کا تازہ خون ڈالنے کی ضرورت ہے۔ یہ اگر ہو جائے تو یہ بیمار نیم دوبارہ جی اٹھے گا اور پولنگ کے موقع پر اپنی رائے کا بے لاگ اظہار کر دے گا۔ اس لئے کہ اسے کرائے پر چڑھنے یا بک جانے کی بیماری مغرب کے صوبوں کی طرح شدید نہیں ہے۔ یہاں ہوس اقتدار اتنی دوروں پر نہیں جیسی کچھ آپ کے مغرب میں پائی جاتی ہے۔

اب میں آپ کو یہاں تحریک اسلامی کا کچھ حال سناتا ہوں۔

تحریک اسلامی ہر مسلمان کے ایمان سے براہ راست تعلق رکھنے کے باوجود پاکستان کے اس صوبہ میں اندر سے ابھرنے کی بجائے باہر سے آئی ہے۔ اگرچہ اس کی دعوت کی جڑیں پاکستان کے مطالبہ میں ہی کسی نہ کسی رنگ میں محسوس یا غیر محسوس طور پر موجود تھیں لیکن شعوری طور پر تحریک اسلامی یہاں اجنبی کی طرح داخل ہوئی ہے اس لئے کہ تحریک کی زبان اردو تھی اور اس کا سارا بنیادی لٹریچر اردو میں تھا اور سوئے اتفاق سے بنگال لسانی لحاظ سے بنگالی کے سوا اور کسی زبان سے زیادہ متاثر نہیں ہوا جس کی وجہ سے تحریک اور بنگال کے درمیان زبان کا حجاب پیدا ہو گیا اور تحریک کے لئے کچھ عرصہ تقریباً یہ صورت حال رہی کہ۔ ؏

زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

چنانچہ اسی تذبذب و حجاب نے تحریک کے کام کو مغرب کے مقابلے میں مشرق میں پیچھے کر دیا۔ حالانکہ یہاں کا مسلمان سادہ دل ہے سیاست باز نہیں ہے۔ زیادہ اسلام پسند ہے۔ جس طرح یہاں سورج پہلے نکلتا ہے یہاں تحریک کی صبح بھی جلد طلوع ہو کر رہتی لیکن اسی لسانی فرق نے تحریک کے اقدام کو روکے رکھا اور بنگالی رفتار کی کمی کے سبب سے زبان کے حجاب کو پھاڑ کر بنگال کے دل میں داخل ہونے کا موقع ایک عرصہ تک تحریک کو میسر نہ آیا اس طرح مغرب و مشرق میں تحریک کے کام کا توازن مساوی طور پر قائم نہ رہ سکا۔

اس کمی کو تحریک نے ذرا تاخیر سے محسوس کیا اور اس تاخیر کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا مطالبہ کرتے ہی گویا ارباب اقتدار کی بھڑوں کا چھتہ چھڑ گیا اور تحریک کے لئے ایسے ہنگامی سے حالات پیدا ہوتے رہے کہ ایسے اطمینان اور سنجیدگی سے اپنے کام کی تنظیم، توسیع اور تدبیر کا موقع فراہم ہونا مشکل ہو گیا۔ یہاں پوری طرح کام تو جماعتی وفد کے دورے کے بعد ہی شروع ہوا جب چوہدری علی احمد خاں صاحب کو جماعت نے یہاں متعین کیا۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں جماعت کی عمر صرف دو سال ہے۔ اس دو سال میں جو کچھ یہاں کام ہوا ہے دراصل وہی وہ سونا ہے جو یہاں خزانوں کی دریافت کی امید دلاتا ہے۔

اس صوبہ میں [illegible] ارکان ہیں اور ہزار سے زائد متفقین ہیں۔ ڈھاکہ، چٹاگانگ اور بوگرہ میں جماعتیں قائم ہیں اور اٹھارہ مقامات پر حلقہ ہائے متفقین ہیں جن میں رنگ پور، پابنی پور، دیناج پور، سید پور، سراج گنج، بوگرہ، نلفاماری، [illegible]، باریسال، گائے بندھا، لال منیرہاٹ، نوگاؤں، راجشاہی اور مینا بٹ اس وقت مجھے یاد ہیں۔ یہ حلقہ ہائے متفقین دن بدن آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کے اجتماعات باقاعدگی سے ہفتہ وار منعقد ہوتے ہیں۔ ان میں بیشتر کے اپنے دفاتر ہیں۔ دار المطالعے ہیں، مکتبے ہیں، شعبہ ہائے نشر و اشاعت اور شعبہ ہائے خدمت خلق ہیں۔ سید پور میں جماعت کا

ایک شفاخانہ گزشتہ کئی ماہ سے چل رہا ہے۔ پاربتی پور میں شفاخانہ کی اسکیم زیرِ عمل ہے۔ گائے بندھا میں سیلاب زدگان کے لئے ریلیف کیمپ اور فری ڈسپنسری ہے۔ ڈھاکہ میں سیلاب کی وجہ سے شہر میں گندگی، غلاظت اور تعفن نے بیماری کا خطرہ پیدا کر دیا تو جماعت نے صحت و صفائی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ چنانچہ وہاں جماعت کے کارکن بیلچے اور برش اور جھاڑو اور فنائل لے کر شہر کی نالیاں، سڑکیں اور متعفن مقامات صاف کرنے کے لئے نکل رہے ہیں۔ اس وقت جماعت کے دس ریلیف کیمپ مشرقی پاکستان کے طول و عرض میں کام کر رہے ہیں۔ جو ڈھاکہ منشی گنج، سراج گنج، نارائن گنج، فرید پور، گائے باندھا، چاند پور، ٹانگیل، مانک گنج اور برہمن باڑیہ پر مشتمل ہیں۔ اور جی جیوٹ مل کے فسادات کے بعد جماعت ایک بڑے پیمانے پر ریلیف کا کام کر چکی ہے۔ یوں تحریک یہاں آگے بڑھ رہی ہے۔ بنگال کے رفقاء میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ بڑی سنجیدگی اور غور و فکر سے تحریک کا جائزہ لیتے ہیں اور زبان کے بُعد کے باوجود ذوق و شوق سے جماعت کی دعوت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو وسعت مطالعہ لٹریچر کے لئے اردو سیکھ رہے ہیں۔ جماعت کا بنیادی لٹریچر تیزی سے بنگالہ میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ اب تک تقریباً اٹھارہ کتب اور پمفلٹ ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ڈھاکہ میں بنگلہ دارالاشاعت بھی قائم ہے۔ اس وقت بنگلہ کے دو ہفتہ وار اخبارات "کھلا" "توحید" اور ڈھاکہ سے "نیا زمانہ" جماعت کے ساتھ تعاون اور تعلق کی پالیسی پر چل رہے ہیں۔ ڈھاکہ کا مقامی اردو اور بنگلہ پریس بھی معاندانہ نہیں بلکہ ہمدردانہ رویّہ رکھتا ہے۔ کوشش ہو رہی ہے کہ ڈھاکہ سے جماعت کا ایک ہفتہ وار اخبار نکل آئے۔

یہاں اسلام کا معاشی حل اور کمیونزم کے مسائل وہ ہی اہم سوالات ہیں جن کا جگہ جگہ چرچا ہے۔ جگہ جگہ سے یہ سوالات سامنے آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خانہ خالی کو کمیونزم کا دیو گھیرنے کی کوشش میں ہے۔ چنانچہ یہاں کی پہلی ضرورت بنگلہ اور انگلش میں ایسے لٹریچر کی فراہمی ہے جو یہاں ذہین طبقہ میں تحریک کے نقطہ نظر سے ان مسائل کا حل پیش کر سکے اور افسوس کہ ہمارے لٹریچر کا ایسا حصہ ابھی تک بنگلہ میں ترجمہ نہیں ہو سکا۔ چوہدری علی احمد خاں صاحب اللہ دو کتابیں انگلش میں لکھ رہے ہیں:

1 THEOCRACY, SECULARISM AND ISLAM

2. MARXIAN TRINITARIANISM

میں نے ان کتابوں کے مسودے دیکھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتابیں یہاں کے لئے بڑا کام دیں گی اور کارکنوں کے لئے خاصا مواد فراہم کر دیں گی اور یہاں کے ذہین طبقہ کے ذہنی اشکالات کا حل بھی بڑی حد تک پیش کر دیں گی۔ اسی طرح "سود حصہ اول و دوم"، "اشتراکیت اور اسلام"، "قومی ملکیت" جیسی کتابیں انگلش اور بنگلہ میں ترجمہ ہو جائیں تو پھر یہ فکری روڑ یہاں کے ذہین افراد کے ذہنوں کو تحریک کے بیج کے لئے پوری طرح ہموار کر دے گا۔

یہاں کی دوسری ضرورت بنگالی زبان جاننے والے کارکنوں کی ایک ٹیم ہے جو اپنے شب و روز، اپنا سب کچھ اس کام میں جھونکیں بجلی کی طرح یہاں تڑپتے پھریں اور عوام تک جماعت کی دعوت پہنچا دیں۔ اس کے لئے میرے نزدیک مناسب ترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ چند نہایت اچھے کارکنوں کے ایک گروپ کو سب سے پہلے بنگلہ سکھائی جائے۔ انہیں بنگلہ بول چال، یہاں کے آداب نشست و برخاست سے پوری طرح واقف کیا جائے اور پھر انہیں مناسب ہدایات کے ساتھ ایک TARGET دے کر چھوڑ دیا جائے جو دعوت کو پہنچائیں اور بنگلہ لٹریچر کو پھیلائیں۔ تیسری طرف بنگلہ کا دارالاشاعت زیادہ سرعت سے لٹریچر کا ترجمہ شروع کر دے۔ دوسری زبانوں کے ترجمہ کی رفتار چاہے سست رہے لیکن بنگلہ ترجمہ کی رفتار تو جھٹ طیارے سے بھی زیادہ تیز ہونا ضروری ہے چونکہ یہ ہمارے ملک کا ایک اکثریتی علاقہ ہے جس کو ہماری توجہ

کے جزو جزو سے واقف ہونا چاہیئے اور اسی رفتار اور تدریج سے جس سے مغرب کا حصہ واقف ہو رہا ہے۔ بلکہ جماعت کا ہر بیان، ہر خبر اور ہر اعلان اردو کے ساتھ بنگلہ میں بھی بیک وقت ملک کے پریس کو بھیجا جائے تاکہ جماعت کی دعوت، پالیسی جدوجہد اور رفتار سے ملک کے دونوں حصے یکساں طور پر آگاہ بھی ہوں اور وہ ان سے مساوی طور پر متاثر بھی ہوں۔ اسی صورت میں تحریک ایک آل پاکستان جماعت کی حیثیت سے آگے بڑھ سکتی ہے۔

آپ میرے بارے میں بھی کچھ جاننا چاہیں گے۔

اغلب یہ ہے کہ میں یہاں ایک سال کے لئے آیا ہوں۔ ایسی ہی کچھ انڈرسٹینڈنگ مجھے دی گئی تھی۔ ویسے ہمارے گھر والے تو کیلنڈر کا ایک ایک دن گن گن کر گزار رہے ہیں۔ پروگرام کے مطابق مجھے پہلے چھ ماہ شمالی بنگال میں حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم کا کام کرنا ہے اور بقیہ چھ ماہ ڈھاکہ یا چاٹگانگ میں گزارنا ہیں۔ شمالی بنگال میں میرا کام یہ ہے کہ اپنے اردگرد کے حلقہ ہائے متفقین کا دورہ کر کے عمومی طور پر ان کی تنظیمی حالت کو بہتر بناؤں اور کام کو آگے بڑھاؤں اور خصوصی طور پر کسی ایک حلقہ میں کچھ دن رہ کر وہاں کے حلقے کے جوڑ جوڑ کو درست کرنے، منظم کرنے، وسعت دینے، انفرادی اور اجتماعی تربیت دینے، کام کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے تقسیم کار کرنے، لائبریریوں، دارالمطالعوں، مکتبوں اور بیت المالوں کو دفتری لحاظ سے باقاعدہ اور درست کرنے اور ایک ایک کارکن کی مرداً فرداً اصلاح و ترقی میں مدد دینے کا کام کروں۔ ان کو رابطۂ عوام کے طریقوں سے مختلف مہمات کے ذریعہ آگاہ کروں اور عملی مظاہرے سے ان کی جھجک دور کروں۔ مقامی بااثر لوگوں اور اداروں کو جماعت کے حق میں متاثر کروں۔ اور مقامی طور پر جماعت کی پوزیشن کو واضح، متعارف اور مضبوط کروں۔ اس مقصد کے لئے پاربتی پور رہائش کے لئے موزوں ترین جگہ ہے۔ چنانچہ یہیں قیام کیا ہے چونکہ یہاں سے مختلف مقامات کو آنے جانے میں سہولت ہوتی ہے۔

اس وقت میں پاربتی پور کے حلقہ کا کام ختم کر چکا ہوں اور سید پور میں ابتداء کر دی ہے۔ سید پور کے بعد رنگ پور جاؤں گا اور چونکہ رنگ پور میں کام بہت وسیع الاطراف ہے اس لئے وہاں مجھے دوسرے حلقوں کی نسبت زیادہ دن ٹھہرنا ہوگا۔ میں نے کام کے لئے یہاں آ کر سب سے زیادہ اہم چیز جو اپنے لئے مفید پائی ہے وہ میری ذاتی تربیت ہے۔ میری ذات کے کتنے گوشے تھے جو خود میری نظر سے پوشیدہ تھے جن کی اصلاح کی، تطہیر کی، تکمیل کی ضرورت تھی جن پر میں کبھی توجہ نہ دے سکا تھا۔ اور اللہ کا بڑا رحم و کرم ہے کہ اس نے مجھے اس طرف توجہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

یہی کچھ یہاں کے حالات ہیں جن کا میں نے سرسری جائزہ لیا ہے تاکہ آپ جو مجھ سے سینکڑوں میل دور بیٹھ کر دوسری ہی نوعیت کے حالات سے دوچار ہیں آگاہ ہو جائیں۔ مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ اس طرز کا خط طویل ہو ہی جائے گا اور یہی تو تاخیر نامہ کا سبب بن گیا تھا۔

ایک بات جسے بیان کئے بغیر میں یہ خط ختم نہیں کر سکتا وہ یہاں آ کر رفقاء کے خلوص و یگانگت اور بے لوث جذبۂ محبت کا احساس ہے۔ مشرقی کا یہ صوبہ جو حقیقتاً مغرب کے صوبوں سے ہر لحاظ سے ایک علیحدہ شان رکھتا ہے اور زبان و لباس و غذا سے لے کر زندگی کے سارے ہی طور طریقے دوسرے ڈھب کے رکھتا ہے کیوں دنیا کے ایک ایسے ملک کا صوبہ بنا ہوا ہے جس کا دوسرا بازو اس سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر پڑا ہے۔ اس عقدہ کو میرے رفقاء کے اس خلوص و محبت نے حل کیا جس نے احباب سے بھائی

اور فاصلے کی ساری شفقتوں کو دور کر دیا۔ آخر وہ کون سی چیز ہے جو ان کو اس قدر میرے قریب کرتی ہے اور مجھے ان کی طرف کھینچتی ہے۔ ان میں سے کسی نے مجھے اس سے پہلے نہ دیکھا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے جس کا معاشرتی یا خاندانی رشتہ میرے ساتھ رہا ہو لیکن وہ کیا چیز ہے جو ان کے اور میرے چہرے کو ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کھلا دیتی ہے۔ اور ہمیں ایک نظر میں اتنا قریب کر دیتی ہے جس طرح کہکشاں کے تارے ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں۔ یہ وہ رشتہ اسلام ہی ہے جو سب رشتوں پر حاوی ہے۔ اس رشتے نے مائلنے انسانوں کو اجنبی انسانوں سے جوڑ دکھایا ہے یہ رشتہ کتنا روح افزا، طمانیت بخش اور طاقتور ہے۔ اس رشتے کی قوت کے بل پر پاکستان کے دونوں بازوؤں کو ایک دوسرے میں پیوست دیکھتا ہوں۔ اور محسوس کرتا ہوں کہ اگر ہم ایک مقصد رکھتے ہیں، ایک منزل کے مسافر ہیں تو کائنات کے اس وسیع سفر میں شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی بحثیں وہ تنگ زاوئے ہیں جو کسی مردِ خدا کے ایک قدم کی وسعت کو بھی سمیٹ نہیں سکتے اس لئے کہ یہاں مقصد کے ساتھ رشتے مضبوط اور کمزور رہتے ہیں اور لگن کے ساتھ فاصلے کم و بیش ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مقصد اور لگن اللہ کے بندوں کو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے گئے تھے اور کسی فاصلے کی دوری اور کسی رشتے کی کشش ان کے قدم روک نہ سکی تھی۔

میں اپنے گھر میں آپ کی ننھی بچی کا اکثر ذکر کرتا ہوں جس نے مجھے بے تکان کئی نظمیں تتلا تتلا کر سنا دی تھیں اور اپنے لڑکے فاروق کے سامنے اسے بطور مثال پیش کیا کرتا ہوں کہ جسے چھ سال کی عمر کے باوجود اب تک ؏

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

یاد نہیں ہے۔

آپ کے نئے نوید کے رسالہ کا کیا حال ہے جس کے وہ کاتب بھی ہیں اور اڈیٹر بھی۔ کیا وہ بھی کہیں کاغذ کی قلت کا شکار تو نہیں ہو گیا۔

اس طویل خط کا محرک خالد صدیقی صاحب کا یہ ارشاد بھی تھا کہ چراغِ راہ کے لئے مکتوب مشرقی پاکستان بھیجو تا کہ ہم تمہارے خطوط کے اختصار کی تلافی کر سکیں۔ آپ کا اعلان "تسنیم" میں دیکھا تھا کہ آپ چکوال جا رہے ہیں۔ کیا واقعی آپ گئے تھے یا تربیت کی وجہ سے نہ جا سکے آپ کی حالت جاننے کے لئے بیتاب ہوں۔

یتیم صاحب، نقی علی صاحب، فقیر حسین صاحب، عبدالوحید خان صاحب، ملک غلام علی صاحب اور دوسرے رفقاء کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

آپ کا رفیق
اسعد گیلانی

کسی خط کے جواب میں

نعیم صدیقی

اے دوست! اے دوستدار دوست!! تمہاری مصروفیات نے نہ جانے کیسے تمہیں خط لکھنے کی مہلت دی۔ بہرحال اس خط نے دوستی کی تمام پرانی یادگاروں کو نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر آراستہ کر دیا۔

تم جیسا فاضل ادیب واقعی ناقدریٔ زمانہ کا شکار ہے اور اس پر دل کڑھتا ہے، مگر تمہارے دوست کچھ کر نہیں سکتے۔ لوگوں کی ذہنی سطح کا بلند کرنا ہمارے بس میں نہیں، ان کے ذوق کی تنگ دامانیوں کا کوئی مداوا نہیں۔ تمہیں تا قیامت کی طرح مستقبل کے لئے صبر سے لکھتے رہنا ہوگا، اور داد و ستائش کے کبھی منت کش نہیں ہو سکو گے!

میں اس معاملے میں اللہ کے فضل سے کچھ زیادہ خوش نصیب نکلا، میری قدر افزائی میری توقعات سے بڑھ کر ہو رہی ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ میرے قدردانوں کا ایک عظیم حلقہ پیدا ہو گیا ہے۔ بات چھڑی تو جی چاہتا ہے کہ تمہیں اس حلقہ کی سرگرمیوں سے باخبر کر دوں!

یہ حلقہ — اور منظم حلقہ — بہت سے عالی دماغ، ادیب نواز اور سرگرم عمل افراد پر مشتمل ہے، اور بڑے صرف کثیر کے ساتھ انہماک سے کام میں مصروف ہے۔ میرے خاص قدردان لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اس کام میں بالکل وقف کر دیا کہ میری نگارشات، بلکہ تقاریر کے ایک ایک لفظ کا، اور میری زندگی کی تمام سرگرمیوں کا ریکارڈ رکھیں اور ہر پہلو سے تحقیق کرتے جائیں کہ ہی کوئی خوش نصیب شاعر یا ادیب یا صاحب قلم گزرا ہو گا جس کی زندگی میں اس امر کا اہتمام ہو جائے کہ ایک طرف اس کی سوانح حیات تفصیل سے مرتب کی جائے اور دوسری طرف اس کے علمی و فکری، شعری و ادبی اور سیاسی و تمدنی خدمات پر ساتھ کے ساتھ ریسرچ ہوتی رہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کا خوش نصیب آدمی ہونے کے لحاظ سے میں ہی پہلا شخص ہوں۔

میرے قدردانوں نے کام کا دائرہ اتنا وسیع بنا لیا ہے کہ تقسیم کار ناگزیر ہو گئی ہے، چنانچہ الگ الگ موزوں افراد ہیں جنہوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ایک ایک شعبہ کا انتخاب کر لیا ہے۔

میرے کچھ قدردان وہ ہیں جو میری ہر تصنیف اور مقالے، نظم اور افسانے اور میرے قلم سے نکلی ہوئی ہر تحریر کو شائع ہوتے ہی اولین موقع پر مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ دو دو تین تین بار پڑھتے ہیں، پہلے سرسری طور پر پڑھتے ہیں، پھر غور و فکر کے ساتھ پڑھتے ہیں، پھر ضروری اجزاء کو نشان زد کرتے ہیں، پھر ان کے خود بخود نکالے ہوئے معانی کا کوئی جز تو مدتوں تک زد کی دسترس سے باہر رہ جاتا ہے۔ پھر ایک دوسرے سے مدد لے کر الفاظ میں معانی کو ڈھونڈتے ہیں، ضرورت ہو تو خاص خاص اونچے دماغوں کا مشورہ بھی لیتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ ماہرین قانون کو عبارات دکھاتے ہیں، کچھ اور ملحوظ رہ جائے تو بسا اوقات میری تحریروں کو عدالتوں میں جا پیش کرتے ہیں اور وہاں سے ان کی قدر و قیمت مشخص کراتے ہیں۔

میرے کچھ دوسرے قدردان ہیں جو پوری توجہ رکھتے ہیں کہ میں کب کہاں کوئی تقریر کرتا ہوں، یا کوئی خطبہ دیتا ہوں، یہ بچارے میری خاطر تمام اخباری اعلانات اور اشتہارات دیکھتے رہتے ہیں، پھر جونہی ان کو علم ہو جاتا ہے تو اپنا وقت صرف کر کے، کبھی کرایہ کے پیسے ادا کر کے اور

کبھی پیدل چلنے کی زحمت اٹھا کر، اور کبھی سائیکل بازی میں ٹانگیں تھکا کر ہانپتے ہانپتے موقع پر آ موجود ہوتے ہیں۔ میرا ایک ایک لفظ غور سے سنتے ہیں، جس کلمے میں ذرہ بھر بھی علمی و ادبی قدر و قیمت ہوتی ہے اسے محفوظ کرتے ہیں تاکہ انسانیت کی یہ قیمتی امانت ضائع نہ ہونے پائے۔ کئی کئی آدمی میرے خطاب کو قلمبند کرتے ہیں جب جلسے ختم ہوتے ہیں تو یہ "نوٹس" ۔۔۔ کسی اونچے دماغ کے سامنے جمع ہوتے ہیں جو تقابل کرکے صحیح ترین عبارت کو متعین کرتا ہے۔ پھر میری تقریر یا گفتگو کے ایک ایک لفظ پہ موشگافیاں ہوتی ہیں۔ میرے دوست! کتنا بڑا ریسرچ ورک ہے۔ اتنا تو شیکسپیئر اور اقبال جیسے لوگوں کے کارناموں پر بھی نہیں کیا گیا۔

میرے قدر دانوں کا ایک اور گروپ بھی ہے۔ اس نے صرف میرے مکاتیب کی ریسرچ کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ میں جتنے خطوط لکھتا ہوں اور جتنے خطوط میرے نام آتے ہیں ان سب کو یہ محققین مختلف تدبیریں لڑا کر حاصل کرتے ہیں۔ خط و کتابت کے اس جائزے کے ذریعے وہ میرے حلقۂ احباب و اعزہ کے بارے میں تحقیق کی داد دیتے ہیں، میرے تمام معاملات، حساب کتاب، مصروفیات، عادات و خصائل کے بارے میں بھی قیمتی معلومات اخذ کرکے محفوظ کرتے ہیں۔ جن خطوط کی اہمیت زیادہ ہو ان کی نقول محفوظ رکھ لیتے ہیں، اس سے بھی زیادہ اہمیت پائیں تو عکسی فوٹو لے لیتے ہیں۔ تحقیق کا یہ شعبہ میری سوانح کے بہت سے ابواب اسی طریق سے مرتب کر رہا ہے۔

ان قدر دانوں کی ایک خاصی تعداد اور ہے۔ یہ لوگ باری باری ہمہ وقت میری قیامگاہ کے ماحول میں موجود رہتے ہیں۔ چائے خانوں پر، کسی نائی کی دکان پر، کسی بزاز ہی کے پہلو میں میرا کوئی نہ کوئی قدردان ہر وقت بیٹھا ملتا ہے۔ اس کی نگاہ صرف یہ جائزہ لیتی ہے کہ میں کس طرف کو جاتا ہوں۔ کس بس میں نکلتا ہوں، کس کی معیت میں راستہ چلتا ہوں اور کس نمبر کی بس میں بیٹھتا ہوں۔ یہ محسنین قوم و ادب درحقیقت میری تفصیلی سوانح مرتب کر رہے ہیں اور میری روزمرہ زندگی کا نقشہ تیار کر رہے ہیں۔ مجھے جب ان کی خدمات کا علم ہوتا ہے تو اپنی بے حقیقتی پر شرمسار ہو کے رہ جاتا ہوں کہ مجھے زمانے نے کیوں اتنی سرفرازی کا مستحق سمجھا ہے، ع

من آنم کہ من دانم!

اس گروپ کے بعض افراد وہ ہیں کہ جو میری زندگی کے ان خاص محدود وقفوں کا جائزہ لینے کے ذمہ دار ہیں جو میں مسجد میں گزارتا ہوں۔ ان بچاروں کو میری خاطر پنجوقتہ نماز پڑھنی پڑتی ہے۔ یہ ہر نماز پر میری حاضری لگاتے ہیں، میں نہ آؤں تو اداس ہو جاتے ہیں اور تحقیق کرتے ہیں کہ میں کدھر گیا۔ یا مجھے کیا صورت پیش آگئی ہے۔ یہ تاکتے رہتے ہیں کہ میں کب آیا، کس صف میں کس جانب کھڑا ہوا، کب مسجد سے نکلا، کس سے علیک سلیک کی، کس سے ہنسا بولا، کس سے ہاتھ ملایا، کس سے باتیں کرنے لگا، کون لوگ مسجد سے نکلنے کے بعد مجھ سے ملے اور کیوں ملے۔ یہ سب اس لئے کیا جا رہا ہے تاکہ میری سوانح حیات کا کوئی جزو ساقط نہ ہونے پائے۔

میرے قدر دانوں میں سے کچھ بیچارے اور زیادہ مشقت اٹھاتے ہیں۔ یہ میرے ہر سفر کے بارے میں معلومات جمع کرتے ہیں۔ میں جس جگہ سے روانہ ہوتا ہوں اور جس جگہ جا کے پہنچتا ہوں، دونوں طرف انتظام کیا جاتا ہے کہ تمام ضروری باتیں جن سے میری زندگی کے حالات پر روشنی پڑتی ہو اور جن سے میری علمی و ادبی نگارشات اور میری فکر کا کوئی گوشہ سمجھا جا سکتا ہو، محفوظ ہو جائیں۔ اس معاملے میں اتنی باریکی سے کام کیا جا رہا ہے کہ میں جس ٹکٹ سے سفر کرتا ہوں اس کا نمبر بھی ریکارڈ کر دیا جاتا ہے تاکہ بعد میں میری زندگی یا میری نگارشات کا کوئی اہم جزو اگر اسی ٹکٹ نمبر کے ذریعے قابل فہم ہوتا ہو تو آنے والی نسلوں کو کوئی دقت نہ ہونے پائے۔ واللہ حیرت ہے کہ میری قوم کے ان ذہین ادب نواز لوگوں نے مجھے کتنی اہمیت دی ہے!

دوست! تم حیران ہوگے کہ میرے بارے میں اتنی بڑی تحقیقی مہم جاری ہے اور تمہیں اس کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا۔ حیرانی کی کوئی بات نہیں، ملک بھر میں کسی کو بھی کانوں کان اس کی خبر نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ میرے ان قدر دانوں کی طبیعتیں حد درجہ بے لوث واقع ہوئی ہیں۔ یہ نہ صرف یہ کہ اپنے کام کا اشتہار دے کر داد نہیں لینا چاہتے، بلکہ بے لوثی میں یہ اتنا مبالغہ کر رہے ہیں کہ اپنے آپ کو مخفی رکھتے ہیں اور اپنے کام کو اخفا رکھتے ہیں۔ عام لوگوں اور ادبی حلقوں کو تو کیا، خود مجھے تک یہ آگاہ نہیں کرتے کہ کیا کام میرے بارے میں ہو رہا ہے۔ کیریکٹر ہو تو ایسا!

اور یہ سن کر تم اور بھی حیران ہوگے کہ میرے ان قدر دانوں کو اتنے بڑے کام کے لئے سرمایہ و وسائل میری ادب نواز اور علم پرور حکومت اپنے خزانے سے فراہم کرتی ہے۔ ان کو میرے کام میں ریسرچ کرنے کے لئے فکرِ معاش سے بالکل آزاد کر دیا گیا ہے۔ دوست! یہ ہوتی ہیں آزادی کی برکات! اپنی قوم کی اپنی حکومت ہو تو وہ اپنے ذہین اور تخلیقی کام کرنے والوں کو اس طرح اہمیت دیتی ہے! حکومت بھی اتنی بے لوث ہے کہ اپنے اس کارنامے کا کوئی ڈھنڈورا نہیں پیٹتی۔ خاموش خدمت کے اصول پر کام کر رہی ہے۔

لو! اب تم یہ داستان سن کر ذرا دل ہی دل میں جلو! بھائی خدا شکر خوروں کو شکر دے تو کسی کے جلنے سے کیا ہوتا ہے۔ مگر نہیں دوست! جلو نہیں، میں تمہیں خوش خبری دیتا ہوں کہ ضرور تمہارے کارناموں اور تمہاری زندگی پر بھی اس طرح ریسرچ ورک ہو رہا ہوگا۔ اور جس طرح مجھے خود مدتوں تک خبر نہ ہو سکی تھی، تم بھی بے خبری میں پڑے ہوگے۔ تم خود سوچو! کہ تم جیسے اونچے ادیب و مفکر کے مقابلے میں میرے کام میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ میرے ہی لئے اتنا کچھ ہو رہا ہے۔ تمہارے لئے بھی ہو رہا ہوگا۔ لہٰذا حاسدانہ جذبات کو تھوک دو، اور بالکل سیدھے دوستوں کی طرح سوچو!

ہاں! اپنے کسی قدر دان سے مڈبھیڑ ہوگئی تو میں تمہارے بارے میں کچھ معلومات لینے کی کوشش کروں گا۔ زیادہ کڑھو نہیں، قوم قدر ناشناس نہیں۔ حکومت بے ہنر نہیں ہے، زمانہ سنگ دل نہیں ہے۔ تمہیں غالب کے سے ابتلا میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔!

ایک اور بات! دیکھو، اگر پہلے سے تمہارے معاملے میں غفلت رہی بھی ہو تو میرا یہ خط جب میرے قدر دانوں کے ادارہ ہائے تحقیق سے گزرے گا تو تمہارے بارے میں لازماً خاص کاوش کی جائے گی، اور انشاء اللہ فوراً تمہارے قدر شناس بھی پیدا ہو جائیں گے!

اب تو خوش ہو ناں! اچھا الوداع!

بقیہ استفسارات برمہ

بھی اس سے اور نفور کرتی ہے، پھر یہ ہمارے نظریہ [illegible] ہمارے پورے تقوٰے میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ لیکن میرا رجحان یہ ہے کہ جس چیز کو کسی دنیوی سبب سے ہم ترک کرنا ضروری سمجھتے ہوں۔ اسے وضاحت کے ساتھ اسی سبب کے تحت اپنے لئے ممنوع ٹھہرائیں۔ یہ مناسب نہیں کہ خواہ مخواہ ایک شرعی سببِ ممانعت پیدا کیا جائے۔ جہاں تک ناخنوں کے رنگ کا تعلق، لانے والی تہذیب کی نوعیت کا تعلق ہے وہ شئے بالکل واضح ہے لیکن اس کے شرعاً اور اصولاً ایک ملعون تہذیب ہونے کے باوجود جس طرح ہم اور بہت سے امور کو ہر صورت میں اخذ کر لیتے ہیں جبکہ ان کو کوئی مفسدہ موجود نہ ہو۔ اسی طرح اگر عورتوں نے زیبائش و آرائش کے سلسلے میں کچھ اجزا اخذ کر لئے ہوں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

میں پھر کہتا ہوں کہ یہ محض ایک کم علم آدمی کی محض رائے ہے جو عام مطالعہ پر مبنی ہے۔ باقاعدہ شرعی حکم لگانا کسی عالم و مفتی کا کام ہے۔

چلتے چلتے میں یہ بھی واضح کر دوں کہ خود میرے گھر میں ناخنوں کو رنگنے کا معمول ایک دن کے لئے بھی اختیار نہیں کیا گیا، اور نہ ذاتی طور پر [illegible]
[illegible]

پہلی قسط

جیل کا نظامِ مسیحائی

نعیم صدیقی

(دورِ زنداں کے واقعات و تاثرات روزنامچہ کی شکل میں مرتب پڑے ہیں۔ اس میں سے
کچھ اقتباسات اخذ کر کے عنوانِ بالا کے تحت جمع کرنے سے یہ مضمون تشکیل پذیر ہوا ہے)

۱۷ اپریل ڈیوڑھی سے ہمیں گنتی گھر کے میدان میں پہنچا دیا گیا اور یہاں دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ طبّی ملاحظہ کے لئے روک لیا گیا نقشہ میدانِ حشر کا سا تھا۔ کبھی دو دو کی لائینوں میں بٹھایا جاتا، کبھی چار چار کی قطاروں، کبھی نام پکارے جاتے، کبھی اِدھر کی قطار سے نکال کے اُدھر کی لائن میں اور کبھی اُدھر کی لائن سے اِدھر کی قطار میں منتقل کیا جاتا۔ بھوک، پیاس، دھوپ، اضطراب اور نامعلوم مستقبل — قیامت کی گھڑی تھی۔ بڑی دیر اسی تعطل میں رہنے کے بعد دیکھا کہ میدانِ حشر کے لوازم آرہے ہیں۔ میز کرسی بچھ گئی، اور اس پر ایک صاحب شخصیت ہستی آ بیٹھیں۔ ایک طرف اسپرنگدار میزان لگ گئی۔ ساتھ ہی ایک طرح کا تختہ دار سجا دیا گیا۔ اب باری باری پیشی شروع ہوئی۔ اعمال تو نہیں، البتہ جسم تولے جانے تھے لیکن میزان صرف ہاتھی کے دکھانے کے دانت بن کر رہ گئی تھی، لہٰذا وزن کا خانہ کاغذات میں اُس معیار کے مطابق پُر کیا جا رہا تھا جو مختلف قد و قامت کے لوگوں کے لئے مقرر ہے۔ دوسرا مرحلہ اُس تختہ دار پر کھڑے ہو کر قد کا ماپ درج کرانے کا تھا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے اس منزل میں عبدالوحید خاں پیش پیش رہے۔ عمر میں پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ میرا قد ۵ فٹ پونے آٹھ انچ ہے۔ تیسرا مرحلہ جسم کے وہ خاص شناختی نشانات درج کرانے کا تھا۔ مجھے خاص طور پر اس مرحلے کی فکر ہوئی، کیوں کہ اپنے جسم پر کسی طرح کے نشانات کی مجھے پہلے سے کوئی تحقیق نہ تھی۔ آخر بڑی جستجو کے بعد ایک "تل" اور ایک "وزار" جلنے کا نشان دریافت کیا۔ وزن کے خانے دیکھے تو معلوم ہوا کہ میرا وزن (غالباً) ۱۹۱ پونڈ اور چراغ دین صاحب کا ۱۱۶ پونڈ درج ہے۔ واقعہ میں تو معاملہ برعکس تھا۔ لیکن چونکہ وہاں قد کے حساب سے معیاری وزن کا اندراج ہو رہا تھا۔ اس لئے اُن کا وزن مجھے مل گیا اور میرا وزن اُن کو۔ بہر حال جیل کے اولین "ملاحظہ" کے لحاظ سے میں اُس معیاری صحت سے آراستہ ہو گیا تھا جسے عمر کے کسی ایک لمحے بھی حاصل نہ کر سکا تھا۔ اب فرض کیجئے کہ بعد میں مجھے کسی مقدمے میں سزا دے دی جاتی تو جیل کے کوئی بھی ڈاکٹر صاحب پروٹے کاغذات مجھے ایک صحت مند قیدی قرار دے کر میرے ذمے اپنی مشقت ڈلوا سکتے تھے جو ۱۹۲ پونڈ وزن رکھنے والے کسی قیدی کے لئے کی جا سکتی ہے۔ حالانکہ میرا وزن ۱۹۳۴ء اور ۱۹۴۱ء میں دو بارہ دیکھنے پر ۱۱۰ پونڈ نکلا تھا، اور اب یہ اور کم ہی ہوا ہوگا۔ بڑھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اس کے بعد ایک اور "انقلابی" کو دیکھا کہ وہ چیچک کی ٹیکیں لئے لوگوں کے درپے ہیں، لیکن وہ کرتے کیا ہیں کہ ایک پن سے، اور کبھی ایک تنکے سے جلد کو ذرا سا چھیڑ کر اوپر دوا کا ایک قطرہ لگا دیتے ہیں۔ یہ سماں دیکھ کر بعض سمجھدار لوگوں نے اس "مذاق" کو گوارا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ "انقلابی" (ایک قیدی کمپونڈر) صاحب فرماتے ہیں کہ فکر نہ کیجئے یہ دوائی وغیرہ نہیں ہے۔ محض ایک حکم کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ (کاغذات کے لحاظ سے اُس روز خدا جانے کتنی ٹیکیں خرچ ہو گئی ہوں گی)

۲۹؍ اپریل: گلے کا معائنہ کرانے کے لئے ہسپتال جانا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں بھیڑ تھی۔ کمپونڈر صاحب کے پاس جا بیٹھا۔ ایک قیدی آیا اور ڈاکٹر کی چٹ کمپونڈر کو دی۔ کمپونڈر نے ایک بوتل میں سے محلول پیالی میں انڈیلا اور پینے کی ایک خوراک قیدی کے سامنے رکھ دی۔ قیدی نے حیران ہو کر دوا کی طرف دیکھا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے تو کہا تھا کہ یہ دوائی سفید (دودھ کی طرح) سی ہوگی، لیکن یہ تو کچھ اور ہے۔ میں نہیں پیوں گا۔ کمپونڈر صاحب نے غور سے اس کی طرف دیکھنے کے لئے عینک کے اوپر کے خلاء میں سے ایک نگاہ خاص ڈالی اور کہا کہ "ارے بھائی میاں! جانتے ہو! ——— یہ دوائی زیادہ اچھی ہے، سفید دوائی میں کیا رکھا ہے"۔ یہ ارشاد سنتے ہی قیدی دوائی چھوڑ کر چل دیا۔ پیچھے سے کمپونڈر صاحب نے آواز دی اور کہا "کہ ٹھہرو تو! اچھا ادھر آؤ، لو وہی سفید دوائی پی لو (بوتل میں سے انڈیلتے ہوئے) ہمارا کیا ہے، بھائی! وہ دوا جو میں نے دی تھی وہ زیادہ اچھی تھی، مگر تم سفید ہی لو!"

میں اس ڈرامے کو بڑے انہماک سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ ہیں وہ حالات جن میں اپنے آپ کو فِٹ کرنا ہے!

۳۰؍ اپریل، جمعرات:۔ گرمی شدت کی ہے۔ آج طبیعت میں غیر معمولی اضمحلال تھا۔ نہانا معمول میں داخل ہے، لیکن آج تذبذب تھا کہ نہانے سے کہیں کوئی تکلیف نہ ہو جائے۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ نہانا اضمحلال کو ختم کرنے کا ذریعہ بن جائے اور طبیعت کھل جائے۔ چنانچہ دوپہر کی "بندش" سے قبل نل پر جا کر غسل کر لیا۔ مہلت آزادی ختم ہو رہی تھی لہذا جلدی جلدی گیلے کپڑے کو سامنے "مشقت بارک" کے جنگلے پر پھیلایا اور صدیق نمبردار کے زیرِ حکم اپنے دونوں ساتھیوں سمیت تالے میں بند ہو گیا۔ نہانے سے طبیعت بجائے شگفتگی کا رنگ اختیار کرنے کے کچھ زیادہ گرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر میں ہلکا ہلکا بخار لگنے لگا۔ کوٹھڑی میں بندش کی گھٹن اور گرمی کی شدت جو بعد دوپہر دھوپ اندر آکر حملہ آور ہونے کی وجہ سے برابر بڑھ رہی تھی۔ مزید اضطراب پیدا کرنے کا موجب بن گئی۔ اس کا ازالہ کرنے کے لئے ساتھیوں سے بات چیت میں اپنے آپ کو مشغول کیا۔ کھانے کی طرف طبیعت راغب نہیں تھی۔ لیکن باہر سے خاص کھانا آ جانے کی وجہ سے (غالباً فقیر صاحب یا کوثر صاحب کی ملاقات تھی) کچھ نہ کچھ کھا لیا۔ اور یہ کھانے کے چند نوالے جیسے مزید تکلیف کا پیغام بن کر معدے میں پہنچے۔ اب باقاعدہ بخار ہو چکا تھا۔ اور ادھر دھوپ آگے اور آگے، اور آگے بڑھتے ہوئے کوٹھڑی کی پوری فضا کو تپ میں مبتلا کر رہی تھی۔ سر میں شدید درد تھا اور ... معمول میں بھی!

جیل میں گویا بیماری کے اولیں تجربے کا آغاز ہو گیا تھا!

بخار کا مقابلہ کرنے کے لئے گفتگو، اور مسلسل گفتگو کا سلسلہ دیر تک جاری رہا، غالباً کوثر صاحب سے ان کے خاص اندازِ ترنم میں کچھ نہ کچھ سنا بھی گیا۔ مغرب کے بعد بخار خاصا تیز ہو گیا۔ اب خور و خوض ہونے لگا کہ بیمار پڑ گیا ہے۔ پوری طرح یہاں کے سسٹم سے آگاہی بھی نہ تھی کہ کوٹھڑی میں بند پڑے ہوئے مریض کی تکلیف اگر بڑھ جائے تو اس کے لئے کیا کیا جاتا ہے۔ اتنے میں پہرے والا نمبردار حسبِ معمول آیا اور "کتنے جوان؟" کا بار بار ہونے والا سوال اس نے جنگلے پر سے مارا۔ ساتھیوں میں سے کسی نے "تین جوان" کا تیار بہ تیار جواب "ایسے کو تیسا" کے انداز سے دے کر نمبردار کو روک لیا۔ اس کو بتایا گیا کہ ایک "جوان" بیمار پڑ گیا ہے، اب کیا کیا جائے۔ اس نے کہا کہ دن کو ہیڈ وارڈر سے کہا ہوتا تو کوئی انتظام ہو سکتا تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ رات گزارو، صبح دیکھا جائے گا ——— اور وہ آگے بڑھ گیا۔ میرے دونوں ساتھی نبض پر ہاتھ رکھ کر بار بار دیکھتے اور متفکر تھے کہ بخار تیز ہے۔ ادھر مجھے یہ اندیشہ بھی ہوا کہ گزشتہ سال کے آخر میں مجھے پہلے "ٹائیفائڈ" کا حملہ ہو چکا ہے۔ کہیں خدانخواستہ ایسی ہی صورت دوبارہ نہ ہو جائے۔ نیز تشویش یہ بھی تھی کہ کہیں قلب متاثر نہ ہو جائے۔ نمبردار دوبارہ آیا تو پھر

اس سے گفتگو کی گئی۔ بالآخر وہ مان گیا کہ میں "ڈیوڑھی" میں رپورٹ کر دیتا ہوں، وہاں سے "چڑی (چڑیا) آجائے گی"۔ دراصل معمول یہ ہے کہ رات کو کسی قیدی کی بیماری کی اطلاع ملنے پر بالعموم بغیر مرض اور حالاتِ مریض کو معلوم کئے، علمِ غیب کے بل پر ایک مقررہ پڑیا بھیج دی جاتی ہے۔ اس قسم کی "اندھی پڑیا" سے کیا توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں۔ ساتھیوں نے اصرار کیا کہ یا تو ڈاکٹر کو بلوایا جائے یا مجھے ہسپتال منتقل کیا جائے۔ نمبردار چلا گیا اور اس نے جیل کے انسانی ٹیلیفونی نظام (یعنی ایک پہرہ دار دوسرے کو دور سے پکار کر کہتا ہے کہ سیاست خانے میں فلاں ولد فلاں بیمار ہے، رپورٹ کر دو، پھر دوسرا تیسرے کو پکارتا ہے اور اسی طرح رپورٹ ڈیوڑھی پر جا پہنچتی ہے۔) کے ذریعے پیغام بھیج دیا۔ انتظار کیا گیا، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے بعد بخار کی شدت کی وجہ سے میں نیم بیہوشی کی حالت میں رہا۔ نفیر حسین صاحب متعدد بار اُٹھ کے میرے سر اور کندھوں کو دباتے رہے، مگر مجھ پر زیادہ تر غنودگی اور ہذیان کی کیفیت طاری رہی۔

اور یہ رات بھی گزر گئی!

۸ مئی جمعہ: صبح بخار کسی قدر ہلکا تو ہوا، مگر فرو نہیں ہوا۔ دوسری کوٹھڑیوں میں بند ہونے والے ساتھی عبدالوحید خاں صاحب، غلام علی صاحب، سید نقی علی صاحب، چراغ دین صاحب، عبدالمجید قریشی صاحب صبح تالے کھلتے ہی ملے، رات کی داستان سُنی اور سب نے رفیقانہ محبت کے ساتھ عیادت کی۔ سورج ذرا اونچا ہوا تو باہر پیپل کے ایک درخت کے نیچے مجھے کمبل بچھا دیا گیا اور اپنا تکیہ ڈال کر میں پڑ رہا۔ آس پاس کے بعض آدمیوں نے بھی آ آ کر حال پوچھا۔ انہی میں سے ایک لال دین بھی تھا۔ لال دین نے خاص احترام اور محبت کے ساتھ مجھ سے بیماری کی کیفیت سنی، بدن کا ٹوٹنا، گلے کی خرابی، سر اور کندھوں کا درد، یہ ساری کیفیات سن کر اُس نے مشورہ دیا کہ میں اُس سے مالش کرا لوں تو طبیعت ہلکی پھلکی ہو جائے گی۔ چنانچہ اُس نے کافی وقت صرف کر کے بازوؤں، ٹانگوں اور گردن کی مالش کی۔ اس کے نتیجے میں واقعی افاقہ محسوس ہوا۔ اُس نے شام کو پھر مالش کرنے کے لئے پہلے ہی سے کہہ دیا۔

لال دین تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے گرفتار شدگان میں اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس کی اصل فطرت صالحانہ ہے۔ لیکن تعلیم کی کمی اور دین سے ناواقفیت نے اُسے اس کے مقام سے بہت نیچے ڈال دیا ہے۔ اس کے خلاف آتشزنی وغیرہ کے الزامات میں مارشل لا کی عدالت کے سامنے مقدمہ چل رہا ہے۔ بیچارا اپنی داستان سناتا رہا۔ جو کچھ اُس نے کیا ہے وہ بھی سنا دیا اور جو کچھ نہیں کیا اس کا بھی ذکر کیا۔ اسے پریشانی صرف ایک اپنی بوڑھی ماں کے بارے میں تھی۔ قید بھگتنے کے لئے وہ مضبوط جذبات رکھتا ہے۔

مالش کے بعد کچھ دیر میں کمبل پر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ بندش کا وقت ہو گیا۔ اب گویا مجھے تنور میں داخل ہونا تھا۔ اس تنور کے تصور سے، اور اس میں گزری ہوئی گزشتہ رات کے تصور سے جیسے بخار کی ایک نئی لہر بدن میں اُٹھنے لگی۔ لیکن راہِ نجات کوئی نہ تھی! مجبوراً دوپہر کے وہ سنگین گھنٹے اندر گزارنے۔ پھر جب تالے کھلے تو دوبارہ لال دین کو مالش کی تکلیف دی۔ لیکن اندازہ یہ ہوا کہ بخار پھر اسی شدت سے بڑھا چلا جا رہا ہے۔ بیچارگی و لاچاری آنے والی رات سے ڈر کر ہیڈ وارڈر کے پاس پہنچا۔ اُسے حال بتایا کہ مجھے ہسپتال بھجوانے کا انتظام کیا جائے۔ اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ڈاکٹر جب راؤنڈ پر آیا تھا تو اُس وقت کیوں نہ اُس سے کہا، اب ہسپتال بھجوانا میرے اختیار میں نہیں۔ میں نے جواب میں بتایا کہ ڈاکٹر اگرچہ سیاست خانے کے دوسرے وارڈ میں بھی گیا ہے تو میں نے اسے دیکھا اور میں لیٹے لیٹے منتظر رہا کہ وہ واپس نکلے تو اُس سے کہوں، لیکن وہ کسی اور طرف سے نکل گیا اور سامنے نہیں آیا۔ گزشتہ رات مجھے تقریباً ۱۰۳ درجے کا بخار رہ چکا تھا۔ اور آج بھی اپنے وقت پر اگر یہ بڑھ گیا تو جو صورت بھی پیش آئے گی

اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ لہٰذا کم سے کم یہ ہو سکتا ہے کہ ہسپتال یا ڈیوڑھی میں پرچہ بھیج کر اجازت لے لی جائے۔ پھر وہ کہنے لگا کہ میرے پاس کوئی آدمی بھیجنے کے لئے اب نہیں ہے۔ میں ساتھ جانے والے کسی آدمی کے انتظار میں رہا۔ اس کے پاس کے چبوترے پر بخار اور نقاہت کی وجہ سے لیٹ گیا لیٹتے ہی حالت نیم غنودگی کی سی طاری ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اس حالت پر ہمارے قانونی ہیڈ وارڈر کو رحم آگیا ہو۔ ایک نمبردار کو بلا کر میرے ساتھ جانے کے لئے کہا۔ مجھے اٹھایا گیا۔ میں نے توجہ دلائی کہ ساتھ مجھے ایک پرچہ ڈاکٹر کے نام لکھ کر دیجئے لیکن ہیڈ وارڈر صاحب نے اسے بھی اپنے اختیار سے باہر بتایا۔ مجبوراً شدید بخار اور نقاہت کی حالت میں ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔

ہسپتال پہنچ کر نمبردار نے مجھے برآمدے کے بنچ پر بٹھایا اور خود کمپونڈر سے (ڈاکٹر کوئی موجود نہیں تھا) میرے بارے میں رپورٹ کر دی۔ لیکن کمپونڈر نے جواب دیا کہ ہیڈ وارڈر کا پرچہ دکھاؤ، ورنہ میں ڈاکٹر کے حکم کے بغیر داخل نہیں کر سکتا۔ اور ڈاکٹر کام ختم کر کے جا چکے تھے میں نے نمبردار سے کہا کہ تم جاؤ اور یا تو ہیڈ وارڈر سے پرچہ لاؤ، یا مجھے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ یا اسسٹنٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ (جس کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ گھنٹی گھر میں ہسپتال کے بالکل قریب موجود ہیں) کے سامنے پیش کرو میں خود بات کر لوں گا۔ لیکن نمبردار نے صاف انکار کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر جسمانی تکلیف کے ساتھ چند لمحوں کا جو ذہنی کرب میں نے بھگتا ہے اس کی مثالیں میری سابق زندگی میں کم ہی ہوں گی۔ میں نے اپنے آپ کو بے بس ہی محسوس نہیں کیا، بلکہ جیسے بھیڑیوں اور لگڑ بگڑوں کے رحم و کرم پر پایا۔ اور میں سوچتا رہ گیا کہ کیا جیل میں معمولاً انسانیت کا حشر یہی ہوتا ہے، یا خاص مارشل لاء کے گرفتار شدگان کے لئے اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے، یا پھر کیا ہم جماعت اسلامی کے کارکنوں پر قصداً یہ تجربے کئے جا رہے ہیں؟ ان میں سے جو صورت بھی ہو، افسوس ناک ہے!

لیکن کیا یہ بدسلوکی، یہ تشدد، یہ تذلیل واقعی ہمارے صبر کی ڈھالوں کو توڑ کر ہمارے ایمانوں کو اپنا شکار بنائے جائے گی؟ — یہ ایک ایسا سوال تھا کہ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے سوا اور کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اپنے بل بوتے پر اور محض اپنی حقیر سی قوتوں کے سہارے (مگر ایسا کیا ہے!) آدمی دعوے تو بڑے سے بڑے کر سکتا ہے مگر ان دعووں پر پورا اترنا سوائے اللہ تعالیٰ کی نصرت کے ممکن نہیں!

اسی اضطراب کی حالت میں ۱۰۲ ڈگری کے بخار میں مبتلا گھنٹی گھر کے پاس پہنچا تو کچھ فاصلے پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب میز کرسی پر کام کرتے دکھائی دیئے۔ میں نے پھر نمبردار کو توجہ دلائی کہ تم جاؤ اور معاملے کی رپورٹ کرو، یا مجھے جانے دو، مگر اُس نے اصرار کیا کہ میں واپس چلوں۔ چار و ناچار آگے بڑھے۔ اب ہی چاہتا تھا کہ قانون پرست ہیڈ وارڈر کو اس کی بداخلاقی کا احساس دلاؤں کہ تم نے میرے کہنے کے باوجود پرچہ ساتھ نہ بھیج کر مجھ پر کتنا ظلم کیا ہے کہ مجھے بخار کی حالت میں مفت کی آمد و رفت میں ڈالا۔ قریب گئے، تو ہمارے اسسٹنٹ نقوی صاحب نظر پڑے۔ اُن سے ہیڈ وارڈر کے روبرو میں نے سارا معاملہ بیان کیا۔ انہوں نے بھی غالباً کچھ نہ کچھ احساس ضرور کیا اور پھر ہیڈ وارڈر سے یہ کہا بھی کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، کیوں نہ پرچہ دیا گیا، جب کہ ایک آدمی بخار میں مبتلا تھا۔ بہرحال نقوی صاحب نے فوراً خود پرچہ لکھا اور نمبردار کے ساتھ مجھے پھر روانہ کیا۔ اور میرا مختصر سا بستہ (دری تکیہ وغیرہ) بھی ساتھ بھجوا دیا۔

اسی شدید بخار کی حالت میں وہی فاصلہ میں سہار ہٹ کرتا ہوا ہسپتال پہنچا۔ نمبردار نے مجھے لے جا کے برآمدے میں چھوڑا اور

سی اپنڈیج کمپونڈر سے کھوالنے کی۔ کمپونڈر کے حکم سے میں نے بستر وغیرہ اٹھایا اور پہلے بالکل سامنے کی بیرک (جو مریضوں کا اصل وارڈ ہے) کے دروازے پر کھڑا کیا، پھر وہاں سے دوسرے وارڈ کی طرف رُخ کرنا پڑا۔ یہ وارڈ "منتظرین" کا وارڈ تھا، اس میں ہر مریض کو داخلے سے پہلے ٹھہرایا جاتا ہے۔ ایک طرح کا کورنٹین ہُوا۔ بیرک کا دروازہ چونکہ مقفل تھا، لہذا یہاں بھی ہسپتال کے کلیہ پر دار وارڈ کے انتظار میں رہنا پڑا۔ اِس عجیب چکر میں پڑ کر بخار کچھ کچھ بھول سا گیا۔ خدا خدا کر کے بیرک کا دروازہ کھلا۔ اندر داخل ہوئے، ایک آہنی چارپائی کُل پڑا رہا۔ کچھ دیر کے بعد کمپونڈر صاحب (جو قیدیوں میں سے ہی تھے اور ٹریننگ لے رہے تھے) آئے اور نام پتے کا اندراج کیا۔

بیرک کے ساتھیوں کو کھانا میرے آنے سے پہلے مل چکا تھا۔ اتفاق سے یہاں جیل کے واقف نوجوان بھی موجود تھے۔ انہوں نے کھانے کے مسئلے پر استفسار کیا۔ میں نے بتایا کہ کھانا وغیرہ تو میرے پاس نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں جب تک کسی کو باقاعدہ داخل نہ کر لیا جائے اور مریضوں کے وارڈ میں نہ بھیج دیا جائے، اس کے لئے کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ اس طرح کا وقفہ بالعموم کئی گھنٹے کا ہوتا ہے۔ یہ سُن کر کچھ پریشانی ہوئی۔ لیکن وہیں سے پڑوسیوں میں سے کسی نے چاول دے دیئے اور اس طرح مسئلہ حل ہُوا۔

مغرب کے وقت ایم، او صاحب تشریف لائے اور بنگلے کے باہر ہی سے کھڑے ہو کر مختلف نو واردوں کو انٹرویو دیا۔ میں بھی گیا اور اپنی حالت بتائی، انہوں نے سرسری طور سے نبض دیکھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ اب مجھے فوراً باقاعدہ داخل کر لیں گے۔ لیکن وہ چلے گئے۔ مجھے حیرت تھی کہ آج دوسرے روز سے مجھے تیز بخار ہے، لیکن یہاں ٹمپریچر لینے کا بھی کوئی اہتمام نہیں کیا جا رہا۔ ایم او صاحب کے جانے کے بعد کمپونڈر صاحب نے بتایا کہ وہ انگلی کی پور سے ذرا سا خون لیں گے تاکہ کیمیاوی معائنہ کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے شیشے کی ایک پلیٹ لی اور اُس پر تھوک ڈال کر قمیض کے دامن سے اسے خوب ملا۔ اب گویا پلیٹ ڈِس انفکٹ ہو کر تیار تھی۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ پھر انہوں نے ایک نشتر نکالا اور میری انگلی ہاتھوں میں لینے لگے۔ مگر میں نے توجہ دلائی کہ خدارا نشتر کو اسپرٹ سے صاف تو کر لیجئے۔ میرے متوجہ کرنے پر الماری کھول کر انہوں نے اسپرٹ کی شیشی نکال کر دیکھی تو وہ خالی ملی۔ انہوں نے فرش پر لگا ہُوا ڈالی روئی کا ایک میلا سا پھاہا اٹھایا اور اسے مَس کر کے فرمایا کہ ابھی اس میں اسپرٹ کی نم باقی ہے، اور اسی گندے اور میلے پھاہے سے نشتر صاف کر لیا۔ مجبوراً انگلی ان کے حوالے کی اور ضرورت سے کم مقدار کے خون میں سے چند قطرے ان کو دے دیئے۔ یہ قطرے اُسی تھوک سے صاف کی ہوئی پلیٹ پر پھیلا دیئے گئے۔

یہ سب کچھ جو ہو رہا تھا میرے لئے جہاں پریشان کن تھا، وہاں دلچسپ اس لحاظ سے تھا کہ جیل کی زندگی کے عجیب و غریب گوشے سامنے آ رہے تھے۔ چنانچہ اسی دلچسپی کی وجہ سے ان واقعات کا نقش ذہن میں اتنا گہرا ہے کہ کمپونڈر، اس کی پلیٹ، اس کے نشتر، اس کے ہاتھوں، اس کی حرکات وغیرہ کو میں ساری عمر نہیں بھول سکتا۔ ان چیزوں کا تصور ہمیشہ تازہ رہے گا۔ یہ نقشہ بتاتا ہے کہ میرے ملک کے حکمران عنصر کے دماغ، احساسِ ذمہ داری، حُسنِ انتظام اور اجتماعی اخلاق کا معیار کتنا اونچا ہے۔

اِس شفاخانہ "حیوانات" میں حالات کتنے ہی تکلیف دہ کیوں نہ تھے، اپنی دھوپ سے تپ جانے والی کوٹھڑی میں بند ہوتے ہی میں یہ سمجھا کہ جیسے میں جنت میں ہوں۔ اِس "جنت" میں میں نے اِس تنور کو بالکل اس طرح بُھلا دیا، جیسے آخرت کی جنت میں جا کر اہلِ ایمان دنیوی زندگی کے سخت سے سخت ابتلاء کو بھول جائیں گے۔

رات آئی اور تھکے ہوئے مریض کو اس نے گہری نیند کی آغوش میں لے لیا

۱۴ مئی ہفتہ ۔ صبح ہوئی، نماز ادا کی، رات اگرچہ بخار رہا، لیکن گذشتہ رات جیسی حالت نہ تھی، اور صبح کو درجۂ حرارت
کم ہوگیا تھا، لیکن حد درجہ کی کمزوری اور معدے کی سوزش کی وجہ سے کوئی چیز پینے کی خواہش محسوس ہوئی —— چائے، شربت،
—— مگر یہ جیل تھا اور جیل کا ہسپتال تھا۔ سوائے اس کے کہ خون کے گھونٹ پیئے جائیں، یہاں اور کوئی انتظام نہ تھا۔ یہاں
ہمدردی نہ تھی، یہاں احساسِ فرض نہ تھا، یہاں جذباتِ شرافت نہ تھے —— لہٰذا کوئی شکایت بھی نہ تھی چارپائی پر پڑے رہے۔

تالا کھلا تو باہر کی تازہ ہوا میں سانس لینے اور صبح کے سورج کی زندگی بخش روشنی اور فضا میں بکھرے ہوئے جمالِ فطرت کو
آنکھوں میں جذب کرنے کو جی چاہا۔ تھوڑی دیر گھوما پھرا، یہاں تک کہ کمپونڈر نے آواز دے کر سب کو بلایا کہ اپنے اپنے بستروں
پر آجاؤ، ایم او آرہے ہیں۔ ایم او صاحب نے پہلے تو مریضوں کے وارڈ کا معائنہ کیا، پھر خاصی دیر کے بعد ہماری بیرک کے نصیب
ایم او صاحب نے نئے مریضوں کو خاص طور پر دیکھا۔ مجھ سے بھی حال پوچھا۔ بیچارے شریف آدمی تھے، میرے بارے میں حکم دیا کہ
داخل کر لیا جائے۔ چنانچہ جلد ہی بستر اٹھا کر میں مریضوں کے وارڈ میں جا پہنچا۔ کمپونڈروں میں ایک سید لڑکا بھی تھا۔ اس نے
بہتر پلنگ دلوایا۔ بہتر سے مراد یہ کہ وہ جالی دار دروازے کے سامنے تھا۔ نیز پنکھے کی ہوا کا ایک آدھ بھولا بھٹکا جھونکا ادھر
پہنچ سکتا تھا۔

جگہ متعین ہوجانے کے بعد حکم ہوا کہ اسٹور میں جا کر اپنے کپڑے داخل کرا دیئے جائیں اور وہاں سے ہسپتال کے کپڑے
لے لئے جائیں۔ اسٹور کیپر صاحب نے کپڑے نکالے۔ یہ نہایت ردی اور چوڑی سرخ دھاری والے کھدر سے بنے ہوئے تھے۔
قمیص بش شرٹ کے انداز پر سامنے سے کٹی ہوئی تھی اور اوپر سے نیچے تک دو ایک جگہ تاگے کے بند لگے تھے۔ پاجامہ جو ساتھ دیا
تو ایک تو وہ ازاربند کے بغیر تھا، دوسرے خطرناک ترین موقع سے پھٹا ہوا۔ میں نے اس پاجامے کے بارے میں عذر کیا کہ
پلیدی ہوگی اور اس پاجامے میں نماز نہیں ہوگی۔ اسٹور کیپر نے بتایا کہ تمام کے تمام پاجاموں کا یہی حال ہے۔ اور اس نے
کہا کہ اسے لے جاؤ، عنقریب مرمت کا انتظام ہو جائے گا۔ میں نے جب بار بار معذرت کی تو اس نے از راہِ عنایتِ خاص
اپنا پاجامہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ قمیص بہرحال میں نے اپنا داخل کرا دیا اور ہسپتال کا لے کر پہن لیا۔ یہ قمیص پہن کر
ایک نئی صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ باہر آنے پر جی چاہتا کہ ہر سامنے آنے والے سے کہہ دوں کہ "صورت بہ بیں حالم مپرس"۔ پھر
گدا، کمبل اور تکیہ بھی جمع کرانا پڑا۔ عوض میں مجھے اوڑھنے اور بچھانے کو کمبل ملے اور ان کے اوپر ڈالنے کے لئے ایک چادر۔ میں
نے جب اسٹور کیپر کو توجہ دلائی کہ لوہے کی چارپائی پر کمبل ڈالنے سے کیا ہوگا۔ تو اس نے بطورِ خاص دری بھی مجھے دے دی۔
جب تکیے کا مطالبہ کیا تو چونکہ اسٹور میں تکیہ کوئی موجود نہیں تھا، اس بیچارے نے میرا تکیہ بھی دے دیا۔ اس سروسامان کو لے کر
جب میں وارڈ میں واپس پہنچا تو پہلے تو وہی سید کمپونڈر معترض ہوا کہ دری تکیہ رکھنے کی اجازت نہیں، لیکن پھر خود ہی کہنے لگا
دری کو چادر کے نیچے رکھو۔ بلکہ اس نے خود ساتھ ہو کر بستر ایک خاص ڈیزائن سے بچھوایا۔

۹:۰۰ بجے دو تین قیدی کمپونڈر لکڑی کے خانہ دار ٹرے میں دواؤں کی چھ بوتلیں لئے داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ دوا پلانے
کی جو المونیم کی پیالی تھی، وہ اگر پاکستان کے کسی عجائب خانہ میں رکھوا دی جائے تو ملک کی ایک حقیقی خدمت ہو سکے۔ میرا قلم کتنا ہی
لکھتا جائے، مگر مشکل ہے کہ میں اس کا نقشہ پیش کر سکتا ہوں۔ اس پیالی کی شان ایک تو یہ تھی کہ اس کا کنارہ پوری گولائی میں جابجا

رنا ہوا تھا اور رکابی کی لمبی لمبی نوکیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں، دوسری تعریف اس کی یہ تھی کہ اس میں گوناگوں مرکبات نے اپنا رنگ تہ بہ تہ
س کے اندر چڑھا چڑھا کر اسے مٹی کی پیالی کا ہم شکل بنا دیا تھا۔ گویا اس پیالی نے اپنے اندر پڑنے والی تمام دواؤں کا تاریخی ریکارڈ محفوظ رکھا
ہُوا تھا اور اس کے اندر کیمیاوی تحقیقات کے لئے بڑا وسیع میدان موجود تھا۔

اب دوائیں پلانے کا معرکہ شروع ہوتا ہے۔ کمپونڈر لوگ کوئی ایک بوتل اٹھاتے اور ایک مریض کو دوا پلاتے، پھر اسی پیالی میں فوراً ہی
کوئی دوسرا مرکب انڈیلتے اور دوسرے کو پلاتے، علیٰ ہٰذا القیاس دق کے مریض کو، ٹائیفائڈ کے اور پیچش کے مریض کو بغیر پیالی کو دھوئے
عجیب عجیب رنگوں اور ذائقوں کے مرکبات سے مستفید کرتے چلے گئے۔ یہاں تھیوری غالباً یہ زیر تجربہ ہے کہ مختلف امراض کے مریضوں کے
اندر اگر تبادلۂ جراثیم کیا جائے تو گوناگوں بیماریوں کے جراثیم باہم دگر لڑ مر کے از خود ختم ہو جائیں گے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب اس آزمائش
سے مجھے بھی گزرنا ہے۔ کیا کوئی راہِ نجات ہے؟ —— اور کمپونڈروں کا گروپ میرے سرہانے بھی آپہنچا۔ ایک صاحب نے بوتل میں سے
پیالی میں کوئی مرکب انڈیلا اور میرے سامنے پیش کر دیا۔ میں نے آہستگی سے درخواست کی کہ مجھے اس پیالی میں نہ پلایئے، میں اپنا گلاس دیتا
ہوں۔ چنانچہ وہ بھری بھرائی پیالی مجھ سے آگے کے کسی مریض کو دے دی گئی۔ میں نے گلاس میں دوا ڈلوا لی۔ مگر پینے سے پہلے میں نے
ایک سوال اور بھی اُٹھا دیا۔ میں نے پوچھا کہ ابھی تو میرا نہ ٹمپریچر لیا گیا ہے، نہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے دیکھا ہے، تو بغیر تشخیص کے یہ دوا کیسے تجویز ہو
گئی؟ کیا میں اسے یونہی پی جاؤں؟ —— سید نوجوان نے بڑی لجاجت سے کہا کہ آپ یہ دوا پی لیں، فائدہ دے گی۔ اور میں سقراط کے سے
جذبے کے ساتھ اسے پی گیا۔ بعد میں پلوڈرین کی ایک گولی بھی مل گئی اور وہ بھی اندر اتار دی۔

میں یہ دلچسپ تماشا دیکھتا رہا کہ بعض مریض جب ایک دوا پینے سے انکار کر دیتے کہ فضول ہے تو کمپونڈر صاحبان جھٹ سے دوسری بوتل میں سے
دوسری دوا ڈال کے دے دیتے۔ چھ بوتلوں کی یہ "نئی بایوکیمیسٹری" مطالعے کی ایک نئے مدرسۂ فکر و عمل کی ایجاد تھی جو سنٹرل جیل لاہور میں قائم تھا۔

حیرت ہوئی کہ مریضوں کو بھی اسی طرح دوپہر کو بند کر دیا جاتا ہے جس طرح جیل کے تمام دوسرے قیدی مقفل دروازوں کے پیچھے دھکیل دیئے
جاتے ہیں۔ لیکن یہاں بہرحال وہ حال نہیں تھا۔ ایک تو بیرک کھلی اور صاف ستھری جس میں بہت سے دروازے اور بہت سی کھڑکیاں تھیں اور بہت سی
تازہ ہوا کو جذب کر سکتے تھے۔ مزید برآں یہ کہ پنکھے کی ہوا بھی تھی۔ چھت پر تین پنکھے لگے تھے۔ ایک بند تھا، دو چلتے تھے۔ دو میں سے ایک صحیح و سالم
تھا۔ دوسرا تین پنکھڑیوں والا تو تھا مگر ان میں سے ایک ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے دائرۂ اثر کے بالکل محیط پر میرا پلنگ واقع تھا۔

دن کا بقیہ حصہ اس نئی دنیا کا جائزہ لینے اور یہاں کے ساتھیوں سے تعارف پیدا کرنے میں گزرا۔

میرا کھانا ہسپتال کی طرف سے آج بھی نہیں ملا۔ معلوم ہوا کہ داخلے کے بعد سے تو ابھی راشن کے حساب میں میرا نام شامل ہوا ہے۔ اب
کل سے میرے حصے کے دودھ چاول آئیں گے تو مجھے کھانا ملنا شروع ہوگا۔ آج بھی ساتھیوں کی "ہمدردی" کے بل پر وقت گزاری کرنی پڑی۔

(باقی آئندہ)

موج و حباب

زکی زاکانی

نہ ہوگا نالۂ غم سے فروغِ آگہی پیدا
کہ ضبطِ اشک سے ہوتی ہے دل میں روشنی پیدا

بہارِ زندگی تابندہ تر ہے سوزِ پیہم سے
ابھی تک حسنِ مہر و ماہ میں ہے تازگی پیدا

مرے خونِ جگر سے رنگ ہے گلزارِ ہستی میں
مرے سازِ طلب سے ہے نوائے زندگی پیدا

تجھے ترکِ جنوں کے مشوروں کا شکریہ، لیکن
انہی باتوں سے ہو جاتا ہے جوشِ بیخودی پیدا

غنیمت ہے یہ آوازِ شکستِ آرزو، ورنہ
کہاں ہوتی ہے ترکِ سوزِ غم سے زندگی پیدا

مری دیوانگی کو تم سے کچھ نسبت نہیں، لیکن
جو تم چاہو تو ہو سکتا ہے ربطِ باہمی پیدا

تری تابندگی سے سوز و سازِ آرزو مجھ میں!
مرے حسنِ نظر سے تجھ میں شانِ دلبری پیدا

سکونِ دل شرابِ عیش میں مت ڈھونڈھ زاکانی
کہ ہوتا ہے مئے غم سے سرورِ سرمدی پیدا

فیروز نظر

کب تک یونہی رہے گا ہر اک گل فسردہ لب
اے میرے گلستاں کی بہارو جواب دو

گھٹتے رہیں گے کیا یونہی دن رات تا کجا
خاموش کیوں ہو راہ گزارو جواب دو

کیا زندگی پہ کچھ بھی نہیں ہم کو اختیار
اے زندگی نواز سہارو جواب دو

دیتے رہیں گے تا کجے ہم کو نئے فریب
یہ چارہ سازِ درد کے مارو جواب دو

کیوں ہو گیا اداس تمہیں دیکھ کر نظر
اب کچھ تو خوش نصیب نظارو جواب دو

شوق اثری ملسیانوی

نہ غم مستقل ہے نہ دائم خوشی ہے
مری زندگی بھی عجب زندگی ہے
وُہی ہے زمانہ کی گردش وہی ہے
گلہ کچھ نہیں، میری قسمت بُری ہے
دُھواں بن کے سینے میں گھٹتی رہی ہے
غریبوں کی فریاد، کس نے سُنی ہے
مریضِ محبت کی حالت بُری ہے
اب آؤ نہ آؤ، تمہاری خوشی ہے
تڑپتے ہوئے بدنصیبوں کی قسمت
جو دن کٹ گیا ہے تو رات آگئی ہے
دھڑکنے لگا دل، لرزنے لگا دل،
کبھی یوں بھی شاخِ نشیمن ہلی ہے
پلٹنا پڑا ہے وہاں سے بھی مجھ کو
جہاں میری منزل قریب آگئی ہے
نہیں فائدہ تیرے رونے سے شبنم!
گُلوں کے مقدّر ہی میں ابتری ہے
مبارک انہیں شوق جو ہنس رہے ہیں
میں کیوں کر ہنسوں میرے دل کو لگی ہے

ہر ذہن کو ہموار سا پایا میں نے
اخلاص کی قوت کو اچھا پایا میں نے
سوچا کہ فقط دوست ہی انسان نہیں
دشمن کو بھی سینے سے لگایا میں نے
شوق اثری ملسیانوی

محمود عالم

تمہارا رخصتِ سفر بھی کہنا حسین نعرے! حسین پرچم!
مسافرانِ سحر کی پلکیں یقینِ محکم! اجیاد سہیم

ڈوبتے تارے فلک پہ ٹمٹماتے رہ گئے
تیرگی کی لاش پر آنسو بہاتے رہ گئے
کاروانِ صبح آگے دم بدم بڑھتا گیا
اہلِ ظلمت راہ میں کانٹے بچھاتے رہ گئے

کوشش قدری

سکوتِ دل میں پایا ہے تمہی کو جلوہ گر برسوں
تمہاری جستجو کی ہے پسِ نورِ سحر برسوں
نگاہِ آرزوئے دل اٹھی ہے سوئے در برسوں
مری آہِ سحرگاہی نے ڈھونڈا ہے اثر برسوں
سرِ منزل پہنچ کر کاروانِ شوق لٹتا ہے
فریبِ آرزو کو ہم نے مانا راہبر برسوں
یہ آنکھیں آہ! جن میں حسرتِ جلوہ تڑپتی ہے
رہے وہ ان میں پنہاں صورتِ برق و شرر برسوں

ابن محمود

زخمی ہُوا ہے دل کسی تیر نگاہ کا کیا جانئے کہ بھید ہے کیا اپنی چاہ کا
میں معترف ہوں اپنی خطا کا گناہ کا پر دیکھئے بھی نادیدہ، کی نگاہ کا
حسرت سے دیکھنے کے سوا اور بس ہی کیا کوئی مقام بھی تو نہیں اپنی آہ کا

اے کاش کوئی منزلِ جاناں کا دے پتہ
محتاج قافلہ ہے کسی سربراہ کا

انوار ظہوری

یہ کس کی آہ سے چرخِ کہن میں آگ لگی — کہ مہر و ماہ کی ہر انجمن میں آگ لگی!!
محل خلوص و محبت کے جل بجھے یکسر — یہ کیسے سینۂ اہلِ وطن میں آگ لگی
سلگ رہی ہے ابھی کلیوں کے سینے میں — وہ آگ جس سے بہارِ چمن میں آگ لگی
چلی بہار کی آغوش سے جو موجِ سموم — خزاں سے پہلے گل و نسترن میں آگ لگی
یہ کس کی مستیٔ چشم و ادا کے پرتو سے — دلِ جواں میں شرابِ کہن میں آگ لگی
فسانۂ شعلۂ رخ کا زباں پہ جب آیا — کسی کے عارض و چشم و دہن میں آگ لگی
یہ انقلاب ہے یا انقلاب کا ماتم — بہار آئی تو میرے وطن میں آگ لگی
ہوا لئے کہ آتشِ غم سے سلگ اٹھا ماحول — یہ کس غضب کی دلِ اہلِ فن میں آگ لگی
نشاط و کیف کے طوفاں اٹھے ہوئے تھے ندیم — چراغِ آہ سے جب انجمن میں آگ لگی
بھڑک اٹھا جو کبھی شعلۂ تر دامن — ہمیں خبر نہ ہوئی پیرہن میں آگ لگی
چراغ دیر و حرم سے جلا ہے دامنِ شیخ — اسی کی لو سے دلِ برہمن میں آگ لگی
روش روش سے ہوئے نفرتوں کے شعلے بلند — مگر نہ کارگہِ اہرمن میں آگ لگی
معاملاتِ جنوں ہو سکے تو طے کر لو! — نہ بجھ سکے گی کبھی پھر جو من میں آگ لگی

ہمیں رہا نہ عدو سے کوئی گلہ انوار
جو دیکھی اپنوں کے ہاتھوں وطن میں آگ لگی

افضل یزدانی

ہر ایک نغمہ مرا نغمۂ بہارِ وطن!! — پسندِ خاطرِ ملک و ملل ہے میرا سخن
ہمیں ذلیل سمجھتے ہیں عقل کے دشمن — ہمارے خون سے پیشانیٔ وطن روشن
سنبھل سنبھل کے رہِ شوق میں اٹھاؤ قدم — کہ رہنماؤں کی صورت میں ہیں یہاں رہزن
ہزار بار حذر اس چمن کے سائے سے — کہ جس چمن کے ہوں مالی ہی خود تہی دامن
ابھی وطن کے لئے بے وطن ہوئے ہیں ہم — اسی وطن کو بنا کر رہیں گے اپنا وطن
ہمارے سامنے لوحِ جبیں پہ [illegible]!!! — ہمارا انجمِ مقدر ہے آج جلوہ فگن
خدا کا شکر کہ ہیں [illegible] — وطن کی راہِ وفا میں قلندرانِ وطن

بدلنے والا ہے۔ افضل نظامِ چنگیزی
مجاہدوں کی جبینوں پہ آ گئی ہے شکن

خلش

ذرا سی دیر باقی ہے کہ ہنگامِ اذاں ہوگا
جانے ملتفت رندوں پہ کب پیرِ مغاں ہوگا
ہمارے سجدہ ہائے شوق تو معیارِ طاعت ہیں
جبیں رکھ دیں گے جس جا پر وہیں پر آستاں ہوگا
یہی جو سست گامی رہبرانِ راہِ منزل کی
نہ گردِ کارواں ہوگی نہ کوئی کارواں ہوگا
تمہارے دم سے قائم ہیں بہاریں لالہ و گل کی
نہ ہو گے تم تو پھر کیا خاک جشنِ گلستاں ہوگا
زباں آمادۂ گفتار لیکن دل یہ کہتا ہے
مری روداد غم سن کر وہ شاید بدگماں ہوگا
ابھی ہے دل فقط شکوہ سرائے بے رخی لیکن
ابھی کیا ہے ابھی تو امتحاں در امتحاں ہوگا

ابو محمود

کیا کہوں دل کی لگن، دل کی لگن سے پوچھو
بر سرِ شمع پتنگے کی جلن سے پوچھو
فصلِ گل آ بھی چکی، بادِ بہاری بھی چلی
کوئی غنچہ بھی کھلا؟ سرو سمن سے پوچھو

سید رضوان بریلوی

گماں غلط ہے کہ بربریت کو فرصتِ رہزنی ملے گی
یقین رکھ کاروانِ آدم کو منزلِ آدمی ملے گی
اُتر تو جا دردِ غم کی تہ میں ہنسی ملے گی خوشی ملے گی
جہاں جہاں تیرگی ہے طاری وہیں وہیں روشنی ملے گی
جدھر جدھر بھی نظر اُٹھا و اُدھر اُدھر برہمی ملے گی
قدم قدم پر نئے حوادث کی آگ بھڑکی ہوئی ملے گی
نکھر رہا ہے نیا زمانہ - اُبھر رہی ہیں نئی شعاعیں
بھٹک رہے تھے جو ظلمتوں میں انہیں کو اب روشنی ملے گی
بجا کہ اُترے ہوئے ہیں چہرے غریب نادار بیکسوں کے
مگر جو اس راکھ کو کریدو تو آگ دبکی ہوئی ملے گی
ترے ہی احساس کی ہے پستی تری نظر کی کمی ہے ورنہ
جو چیز ساحل پہ ڈھونڈتا ہے وہ چیز طوفاں میں ہی ملے گی
رہِ طلب میں ذرا نہ ٹھٹکو - رہِ طلب میں ذرا نہ جھجکو
رہِ طلب میں ہر ایک ٹھوکر پہ اک نئی زندگی ملے گی
خوشا کہ اب وہ بھی جدو جہدِ حیات میں لے رہے ہیں حصّہ
جو آج تک یہ سمجھ رہے تھے کہ بھیک میں زندگی ملے گی
اُمید رکھو نہ رہنماؤں سے اس مقامِ جنوں میں کوئی
نگاہِ منزل شناس ہر ہر قدم پہ بھٹکی ہوئی ملے گی
عجب زمانہ عجب ہوا ہے سکوں کا نام و نشاں نہیں ہے
کہیں جو قدرے خوشی ملی بھی تو غم میں ڈوبی ہوئی ملے گی
رہِ محبت میں دل کی جانب ایک لمحہ بھی ہو نہ غافل
یہی ترا راہبر بنے گا، تجھے یہیں روشنی ملے گی
خزاں کے دورِ ستم سے گھبرا کے اس قدر نا اُمید کیوں ہے
ملے گی رضواں ابھی چمن میں بہار گاتی ہوئی ملے گی،

عزیز الحسن عزیز

مقامِ شرم ہے یہ رنگِ گلستان کے لئے
دیا بہار کو میں نے لہو خزاں کے لئے
غبار سے بھی وہ کمتر ہیں اس جہاں کے لئے
جو خاک چھانتے پھرتے ہیں خاکداں کے لئے
مرقّع جب میں بنا چشمِ دو جہاں کے لئے
مرے خیال نے نقشے کہاں کہاں کے لئے
وہ احتیاط و خموشی سے پا گیا سب کچھ
میں ڈھونڈتا ہی رہا لفظ رازداں کے لئے
ہے انقلاب — جو پروردۂ بہاراں تھے
دُعائیں مانگ رہے ہیں وہی خزاں کے لئے
ہُوا نہ آہ بجز خاک، خاک بھی حاصل
عزیز مل گئے ہم خاک میں جہاں کے لئے

شبنم سبحانی

شعلۂ غم تپاں تپاں ہے آج — اک جہنم کدہ جہاں ہے آج
تختۂ دار ہی کے سایے میں — رحمتِ عمرِ جاوداں ہے آج
لاکھ خنجر بدست آئیں وہ — میرا عزمِ عمل جواں ہے آج
موت ہے ساحلِ سکوں پرور — زندگی موجِ بیکراں ہے آج
تختۂ دار پھر رنگا جھنے — سوئے منزل کوئی رواں ہے آج
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — حیف اب پھر سے فغاں ہے آج

رات کتنی دراز ہے شبنم
کتنا جامع غمِ جہاں ہے آج

ناشر حجازی

شہنشوں کے لئے روزِ احتساب آیا
نئے ہی رنگ سے اب دورِ انقلاب آیا
بہارِ خلد کا عنوان ہے حسنِ صبحِ وطن
چھٹیں ہیں ظلمتیں وہ دورِ انکتاب آیا
جہانِ فکر و نظر میں تغیرات ہوئے
تخیلات کی دنیا میں انقلاب آیا
شراب و شاہد و نغمہ کی محفلیں اجڑیں!
عمل کی قوتیں سے کہ جہاں شباب آیا
حضورِ قلب سے ناشر جو التجائیں کیں!
فلک سے رحمتِ باری لئے جواب آیا

سید عارف حسین عارف

وہ نغمہ سنجِ بہاراں تو گلستاں میں نہیں
کہوں میں کیسے چمن پنجۂ خزاں میں نہیں
نصیب جس سے ہو موسیٰ کو حق کا نظارہ!
وہ نور آج مری چشمِ خونچکاں میں نہیں
قفس کا بندِ گراں جل کے خاک ہو جا کیسے!
اے عندلیب! وہ شعلے تری فغاں میں نہیں
قدم ہیں سست، قویٰ مضمحل، عزائم سرد
عجب کہ ذوقِ سفر اہلِ کارواں میں نہیں
زباں پہ آج بھی ہے لا الٰہ الا اللہ
مگر وہ سوز تو عارف دلِ تپاں میں نہیں

بشیر فوق

تمہیں اہلِ وطن سے کیوں تغافل کا ہوا شکوہ — چراغوں نے کبھی پوچھا ہے پروانوں پہ کیا گزری
تقاضائے صنوبر بُت شکن ہے حرم پر جو ستم ٹوٹے — کبھی بھی سُنا اس نے صنم خانوں پہ کیا گزری
بجز شق ہو گئے زندوں کے جب یہ خبر آئی — خود ساقی کے ہاتھوں اپنے میخانوں پہ کیا گزری
ہمیں غم راندنِ اپنے سیہ خانے اجڑنے کا — انہیں غم ہے تو یہ ان کے پرستانوں پہ کیا گزری
ہمیشہ کے جفا پیشہ، وفا ناآشنا ہو تم! — تجھے کیسے خبر ہو میرے ارمانوں پہ کیا گزری

بجا ہے کفر سامانیِ صنم خانوں میں ہوتی
الٰہی اپنے گھر میں دیکھ ایمانوں پہ کیا گزری

استفسارات

دستوریہ، اسلامی دستور اور جماعت اسلامی

مجھے[1] آپ سے چند ضروری گزارشات کے متعلق عرض کرنا تھا اگر بارِ خاطر نہ ہوں تو آپ مجھے یا اپنے رسالہ میں ضرور تحریر فرمائیں آپ کی عین نوازش ہوگی۔

۱۔ کیا پاکستانی آئین ساز اسمبلی کا منظور شدہ آئین اسلامی آئین ہے۔

۲۔ اگر ایسا آئین اسلامی ہے تو پھر آپ لوگوں کا ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک یہ کہنا بلکہ احتجاج کرنا کہ یہ غیر اسلامی آئین ہے اور یہ لوگ قطعاً اسلامی آئین نہیں چاہتے۔ وہ غلط تھا۔

۳۔ آئین ساز اسمبلی آپ کے خیال میں کب نمائندہ اسمبلی ہوتی۔ کیا آپ کے اعلانات جو پہلے شائع ہو چکے ہیں انھیں یک قلم غلط تصور کر لیا جائے۔

۴۔ کیا آپ کے براہ راست انتخابات کے قد آدم پوسٹر غلط تھے۔

۵۔ آپ نے آئین ساز اسمبلی کا منظور شدہ آئین کب سے اسلامی آئین تصور کیا ہے۔ اس کی دلائل و براہین سے تسلی کریں۔

●

آپ کے سوالات میں اگرچہ طلبِ حقیقت کے بجائے بظاہر اعتراض کی اسپرٹ کارفرما معلوم ہوتی ہے (خدا کرے کہ یہ اندازہ غلط نکلے) تاہم یہ امر موجبِ مسرت ہوا کہ آپ نے اپنے طبقے کی روایات کے خلاف پہلی مرتبہ ہمیں براہِ راست ہم سے سمجھنے کی کوشش کی تو ہی ؟ آپ لوگوں نے ہمیں ہمیشہ دور ہی دور سے غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی رنگین عینکیں لگا لگا کر دیکھا ہے اور پھر عجیب و غریب تصورات خود ہی خود پیدا کر لئے۔ خیالات کا اختلاف انسانی زندگی کا ایک فطری تقاضا ہے لیکن نہ ایسا کہ یہ میل جول، افہام و تفہیم اور تحقیق و جائزہ کے دروازے بند کرنے کا موجب بن جائے۔ ہاں جب نوبت آ پہنچتی ہے تو اختلاف فطری حدود سے آگے نکل کر تعصب کی مکروہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تعصب کا عمل ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اہل حقیقت کو سمجھنے کی طرف آنے نہیں دیتا، دوسروں کے متعلق غلط سے غلط رپورٹ بھی اگر ایسی آتی ہے جو ان کے بارے میں ایک بُری رائے قائم کرنے میں مددے اُسے یہ فوراً باور کرا دیتا ہے۔ تعصب کا نتیجہ ایک اندھی اور شل بدگمانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ذاتی طور پر آپ پر ہی تعصب کا الزام رکھ رہا ہوں، بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ جس طبقے سے آپ کا تعلق ہے اس کی عام روش مختلف زاویۂ نظر رکھنے والوں کے لئے بہت تنگ واقع ہے۔ آپ نے اس روش سے انحراف کر کے بہتر صورت اختیار فرمائی ہے۔

---

[1] یہ لیڈر کلاس سے متعلق رکھنے والے ایک صاحب کا سوالنامہ ہے!

آپ کے سوالات کے جواب ترتیب وار درج ذیل ہیں -

(۱) اس سلسلے میں ایک بات خوب اچھی طرح پہلے سمجھ لینے کی ہے - وہ یہ کہ ہمارا معاشرہ ایک عملی تحول سے گزر رہا ہے - اپنے اجتماعی نظام کے لحاظ سے یہ اسلامی بنیادوں سے اکھڑ چکا ہے، اب اسلامی قدریں بس وہ ہے کہ انفرادی اور گھریلو زندگیوں میں باقی ہیں اور وہ بھی اجتماعی ماحول کی ناسازگاری کی وجہ سے بالکل مرجھائی ہوئی ملتی ہیں۔ اجتماعی نظام اسلام سے آزاد، بلکہ اس کے لئے تباہ کن بن کے کام کر رہا ہے - ایسے نظام کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے لئے اسلام سے آزاد ہو کر سوچنے اور کام کر سکنے والے کارپردازوں کا ضرورت مند ہو اور انہی کی مانگ مجھے عملی ضرورت کی اس مانگ نے گزشتہ چند قرنوں میں ایک خاص قیادت کو ابھار دیا ہے - ذہنی تعمیر کے سارے ادارے سیاسی ذہن بنانے والی تمام طاقتیں، اور معیار انتخاب کو معین کرنے والے سارے عوامل یکسو ہو کر ایسی ہی قیادت کو آگے لانے میں مصروف رہے ہیں - ان مؤثرات نے اسلامی ذہن و سیرت رکھنے والے لوگوں کو آہستہ آہستہ پچھلی صفوں میں جا ڈالا ہے اور اب اجتماعی نظام کے لئے ناکارہ ہو کر کہیں دور پڑے اللہ اللہ کرتے ملتے ہیں۔ ہمارے معاشرہ کی عملی اور اجتماعی رہنمائی کی باگ ڈور اب تک جن ہاتھوں میں رہی ہے وہ برابر ہمیں سیکولرزم اور مغربیت کی طرف کھینچے لئے چلے جا رہے ہیں -

معاشرے کے اس عملی نقشے کے باوجود دوسری طرف ایک حقیقت یہ بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ ذہن و فکر کے لحاظ سے ہمارے معاشرے کا عام احساس یہ ہے کہ ہماری موجودہ زندگی اسلامی زندگی بہرحال نہیں ہے، اسے پوری قوم کتاب و سنت کے تقاضوں اور اسلامی تاریخ کی پیش کردہ تصویر سے صریحاً ہٹا ہوا پاتی ہے اس کے نتیجے میں ایک اضطراب رونما ہوتا ہے - یہ اضطراب دو ہی صورتوں میں زائل ہو سکتا ہے ایک یہ کہ لوگ عقلی اور اعتقادی اور شعوری طور پر اسلام کو الوداع کہیں اور سیدھی سیدھی طرح اس راستے پر شرح صدر کے ساتھ چل کھڑے ہوں جو عملاً پچھلی تاریخ کے دوران میں بن گیا ہے۔ اور جس کی طرف انہیں مسٹر کلاس کھینچ لے جانے پر بضد ہے - دوسری یہ کہ اپنے فیصلے اور ارادے سے وہ اس غیر اسلامی راستے کو چھوڑ کر اسلامی نظریات کی ہیئت اجتماعی کی بنیاد بنائیں اور تعمیر نو کا آغاز کریں - خوش قسمتی سے، بہت سارے وجوہ و اسباب کے تحت پاکستانی ملت کا اجتماعی ارادہ اسی دوسری طرف مائل ہوا ہے - اسی اجتماعی ارادے نے درحقیقت مسلم لیگ کی تحریک چلائی تھی، اسی نے پاکستان بنایا اور اب یہی ہے جو اسلامی دستور کا تقاضا کر رہا ہے -

پیچیدگی یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایک طرف معاشرہ کے فعال اور مؤثر اور ہمہ گیر ادارات اسلام سے آزاد ہو کر چل رہے ہیں اور دوسری طرف قوم کا ارادہ اجتماعی ہے جو اس عملی صورت حالات کو بدلنا چاہتا ہے۔ ان دو متضاد عوامل تاریخی کا ظہور دو مختلف طاقتوں کی صورت میں ہو رہا ہے۔ ایک طرف کارفرما طاقت ہے جو سیکولرزم کی طرف کھینچتی ہے، دوسری طرف رائے عام کی طاقت ہے جو اسلام کا احیاء چاہتی ہے۔ بیک وقت ان دو طاقتوں کا حالات پر اثر انداز ہونا دو تاریخی عوامل میں کش مکش پیدا کر دیتا ہے - اس کشمکش کی وجہ سے پہلی چیز یہ لازم ہو جاتی ہے کہ کارفرما طاقت سے قوم کو اپنے رجحانات کے مطابق جو کام لینا ہو وہ اس کے لئے رائے عام کا دباؤ ڈالے - دوسری چیز یہ ناگزیر ہو جاتی ہے کہ جب بھی معاملات طے ہوں تو دونوں طاقتوں اور دونوں عوامل کے درمیان کسی نہ کسی نقطۂ تصفیہ (COMPROMISING POINT) پر جا کر طے ہوں - اور ان دونوں چیزوں کی بنا پر تیسری چیز خود بخود یہ سامنے آ جاتی ہے کہ بحالات موجودہ یہاں ایک "اسلامی دستور" (جو اسلام کے نہایت اہم بنیادی اور کم از کم تقاضے پورے کر دے) تو بن سکتا ہے - لیکن ایک مثالی اور معیاری اسلامی دستور پہلے ہی قدم پر نہیں بن سکتا - بلکہ بن بھی جائے تو اسے چلانے کے لئے جن طاقتوں اور جن اسباب کی ضرورت ہے ان کی نہ ہونے کی وجہ سے چل

نہیں سکتا۔

معیاری اور مثالی دستور تو جب ہی بنے گا۔ حکومت کے نظم و نسق کی تمام مشینری، پورا پارلیمنٹری سسٹم، نیچے سے اوپر تک ساری قیادت، عدالتی نظم، دفاعی انتظامات اور دوسرے تمام شعبوں اور اداروں کا پورا نقشہ بدل جائے گا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے بحالات موجودہ جن معنوں میں اسلامی دستور بن سکتا ہے اور چل سکتا ہے، اور مطلوب ہے وہ صرف اس قدر ہیں کہ ان کم سے کم اصولوں اور قدروں کو دستور میں شامل کر لیا جائے جن کے بغیر اسلامی دستور کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری اسلامی آئیڈیالوجی۔ خدا کی حاکمیت، کتاب و سنت کا قانون پالیسی اور نظم و نسق کے تمام امور میں معیار فیصلہ ہونا معیشت اور معاشرت کے لئے اسلامی اصولوں کا بنائے تعمیر ہونا۔ سیاست و تمدن کے آئندہ نقشہ میں اپنی صحیح جگہ پا لے۔ یا یوں کہئے کہ ایک ایسا دستور بن سکے جس کے تحت کام کرنے والی حکومت اسلامی آئیڈیالوجی کی آبیاری اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر کی ذمہ دار قرار پائے اور اس کے ہاتھوں کم سے کم مدت میں وہ تمام تبدیلیاں رونما ہو جائیں جن کے ہو جانے کے بعد یہاں ایک مکمل اور معیاری اسلامی دستور پوری طرح چل سکے۔

چنانچہ جماعت اسلامی کا پہلا چار نکاتی مطالبہ جس کے جواب میں قرارداد مقاصد پاس ہوئی تھی۔ اور دوسرا نو نکاتی مطالبہ جس کو تسلیم کرتے ہوئے رہنما اصول دوسری دستوری رپورٹ میں طے پائے ہیں، دونوں حقائق کے اسی مطالعہ و اندازہ کے تحت مرتب ہوئے تھے۔

اب بنیادی اصولوں کی جو دوسری رپورٹ سامنے ہے۔ اس میں اسلامی آئیڈیالوجی کو سیاست و تمدن کی بنیاد کی حیثیت سے لے لیا گیا ہے اور اسلام کے ان بنیادی دستوری تقاضوں کو بھی (کم سے کم اصولاً) جذب کر لیا گیا ہے جن کے ہوتے ہوئے ایک دستور کو غیر اسلامی اور کافرانہ قرار دینے کی جرأت کوئی محتاط مسلمان نہیں کر سکتا۔ پیش نظر مسودہ دستور کے تحت اگر کسی بھی مخلص طاقت کو کام کرنے کا موقع ملے تو وہ اگر پورے کا پورا اسلام عملاً نافذ کر دینا چاہے تو اس کے راستے میں کوئی دستوری رکاوٹ حائل نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کم سے کم تر کے معیار کے لحاظ سے ہم اسلامی دستور قرار دیتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف اس مسودہ دستور میں پائے جانے والے رخنوں اور تضادوں سے ہم نے کبھی اپنی آنکھیں بند نہیں کیں جو کسی غیر مخلص طاقت کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اسلام کے خلاف بھی جو کارروائیاں کرنا چاہے جاری رکھ سکے۔ البتہ ان رخنوں اور تضادوں کی بنا پر مسودہ کو رد کر دینے اور مبالغہ آمیز طریق پر غیر اسلامی قرار دینے کی بجائے زیادہ معقول روش ہم نے یہ سمجھی ہے کہ رائے عام کے دباؤ سے اصلاح کی کوشش مزید جاری رکھی جائے، پھر بھی کسر رہ جائے تو ضروری چیزوں کو انتخابی پروگرام میں لے کر ترمیم دستور کی عملی صورت اختیار کی جائے۔

حالات کش مکش (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) کے پیش نظر اس مسودہ دستور کو (جس میں چند بڑے اور گھناؤنے نقائص موجود ہیں) قبول کرنا ٹھیک ویسی ہی پوزیشن رکھتا ہے جیسی آپ حضرات نے اپنے معیاری تصور پاکستان سے کسی قدر پیچھے ہٹ کر ۳ جون کے اعلان کے موجودہ پاکستان کو قبول کرتے ہوئے اختیار کی تھی۔ ایک مخالف طاقت کا جب بھی کسی معاملے میں سامنا ہوتا ہے تو یا تو کسی انقلاب کے ذریعے اسے کلیتاً ختم کر کے اپنی مرضی کے عین مطابق کوئی صورت پیدا کی جاتی ہے۔ یا اگر آئینی جدوجہد کا معاملہ ہو تو کوئی نہ کوئی نقطۂ تصفیہ (Compromise point) تلاش کرنا پڑتا ہے۔ مخالف طاقت یوں سوچتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ فلاں حد تک پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور اقدام کرنے والی طاقت یوں سوچتی ہے کہ ہم کم سے کم اتنے پر راضی ہو سکتے ہیں۔ سیاسیات میں یہ مجنونانہ روش کوئی بھی اختیار نہیں کر سکتا کہ یا تو مطلوب سو فیصدی اور معیاری حد تک حاصل ہو، یا جو کچھ ملتا ہے اسے رد کر دیا جائے۔ کسی کو اس حماقت کی توقع اگر اپنے آپ سے نہیں ہو سکتی

تو دوسروں سے بھی نہیں کرنی چاہیے۔

ہم نے اس مسودۂ دستور کی حیثیت آج یکایک اپنی پوزیشن بدل کر کسی نئی صورت میں متعین نہیں کر ڈالی بلکہ اس کے اپنی اولین شکل میں آتے ہی اپنا نقطۂ نظر سامنے رکھ دیا جو آج بھی ٹھیک وہی ہے جو اس وقت تھا۔

سب سے پہلے اس مسودہ پر پاکستان کے نمائندہ علماء نے ۱۱ جنوری تا ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ایک کنونشن منعقد کرکے مکمل تبصرہ کیا اور اپنی طرف سے ترامیم بھی تجویز کر دیں۔ اسی تبصرے اور ترامیم کی روشنی میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جو اسلامی جماعت کی طرف سے مذکورہ بالا کنونشن میں شریک تھے، ۳۰ جنوری ۱۹۵۳ء کو موچی دروازہ کے باہر جلسۂ عام میں ایک تقریر کی اور اس رپورٹ کے روشن اور قابلِ اصلاح پہلوؤں کو لوگوں پر واضح کیا۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں علماء کے تبصرہ و ترامیم اور مولانا مودودی کی اس تقریر کو ادارۂ چراغ راہ نے ایک ضمیمۂ خاص کے طور پر شائع بھی کیا۔ آپ اسے ملاحظہ فرما کر دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارا اولین ردِ عمل کیا تھا۔

اس کے فوراً ہی بعد قادیانی مسئلہ پر ڈائرکٹ ایکشن شروع ہو گیا اور مولانا مودودی اور جماعت کے دوسرے بہت سے نمایاں افراد گرفتار کر لیے گئے لیکن ان گرفتاریوں کے بعد نئی امارت نے اپنے بیانات میں اور نئی مجلس شوریٰ نے اپنی متعدد قراردادوں میں اس دستوری مسودہ کے بارے میں اظہارِ رائے کیا۔ اور ہر مرتبہ وہی پوزیشن اختیار کی گئی جو پہلے روز سے چلی آ رہی تھی۔ نومبر ۱۹۵۳ء میں جب ہماری رہائیاں عمل میں آئیں تو پھر فوراً نومبر میں ہی ہماری مجلسِ شوریٰ کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ اس میں پھر ایک قرارداد کے ذریعے جماعت کے موقف کے مطابق اظہارِ رائے کیا گیا۔ پھر خود راقم الحروف نے ترجمان القرآن کی ادارت کا چارج لیتے ہی "اشارات" میں مسودہ دستور کو زیرِ بحث لا کر اس کے دونوں پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ یہ سلسلہ دو تین شماروں میں مسلسل جاری رہا ہے۔ اسے آپ پڑھیں اور خود رائے قائم کریں۔

۲۔ آپ کے سوال کا یہ جزو کہ "۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک یہ کہنا بلکہ احتجاج کرنا کہ یہ غیر اسلامی آئین ہے" بہت ہی عجیب معلوم ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں کوئی آئین نہیں بنایا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں صرف قراردادِ مقاصد سامنے آئی تھی جسے ہم نے اجتماعی مطالبہ کے مطابق پا کر قبول کر لیا تھا اور اسے کبھی غیر اسلامی نہیں کہا، نہ اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ۱۹۴۹ء میں دستور موجود نہیں تھا۔ ۱۹۵۰ء بھی خالی گزرا۔ ۱۹۵۰ء میں پہلی دستوری رپورٹ سامنے آتی ہے۔ اسے ہم نے بھی اور دوسرے عناصر نے بھی ناقابلِ قبول قرار دیا اور وہ مسترد ہو گئی۔ پھر ۱۹۵۲ء میں دوسری رپورٹ سامنے آئی اس کے سامنے آتے ہی اچھے پہلوؤں کا خیر مقدم کیا گیا اور نقائص کی اصلاح کی مہم شروع کر دی گئی۔ سمجھ میں نہیں آ سکا کہ ۱۹۴۷ء سے آج تک کون سے آئین کو ہم غیر اسلامی کہہ رہے تھے اور اب یکایک کسی سے ساز باز کرکے اسی غیر اسلامی آئین کو ہم نے اسلامی کہنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کے یہ تاثرات ایسے اخبارات کے مطالعہ کا نتیجہ تو نہیں ہیں جو یوں چاہے کتنے ہی باوقار، با اصول اور معیاری ہوں لیکن خصوصیت سے جماعت اسلامی کے متعلق وہ بازاری پروپیگنڈا کرنا عین اپنا اخلاقی فرض اور جمہوری حق سمجھتے ہیں۔ ہم غیر اسلامی اس دستور کو کہتے تھے اور کہتے ہیں جس پر اب تک کام چل رہا ہے یعنی ۱۹۳۵ء کا ایکٹ بشمول انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ۔ رہا ہماری دستوریہ کا بنایا ہوا مسودۂ دستور، تو وہ ۱۹۵۲ء کے خاتمہ پر سامنے آیا ہے اور اس کے بارے میں جب سے اب تک ایک ہی تاثر ہم نے پیش کیا ہے۔ اس کی شہادت ہمارے بیانات، قراردادوں، تقاریر اور اہم مضامین کا وہ ریکارڈ دے سکتا ہے۔ جو مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ آپ جیسے پڑھے لکھے قسم کے آدمی سے ایسی بات سن کر حیرت

ہوتی کہ کیا آپ لوگ واقعی اس طرح کی معلومات کو سے کر ان پیمانے قائم کرتے اور فیصلے دیتے ہیں!

ہاں سوال کا یہ جزو کہ "یہ لوگ قطعاً اسلامی آئین نہیں چاہتے" اس کی تصدیق کروں گا کہ یہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے، اور اب بھی کہتے ہیں۔ کیوں؟ اس کے چند ٹھوس وجوہ ہیں:۔

اول۔ جس طبقے کے ہاتھ میں اقتدار اور نمائندگی اور دستور سازی کے مناصب چلے آ رہے ہیں (افراد کی بحث کو درکنار رکھ کر) اس کے ذہن اور مزاج کی پرانی ساخت اور اس ساخت میں کسی تبدیلی کا ثبوت بہم نہ پہنچانا موجب تشویش ہے۔

دوم۔ اس کی طرف سے اسلامی دستور کے مطالبے کا جواب جن دلائل سے، جن اعتراضات سے، پروپیگنڈے کی جن مکروہ صورتوں سے اور تشدد کی جن تدبیروں سے از اول تا آخر دیا جاتا رہا ہے وہ شبہات کو بڑھانے کا سبب ہیں۔

سوم۔ اس طبقے کی طرف سے خیالات کے تضاد کا مظاہرہ۔ کہ کبھی کچھ کہنا، کبھی کچھ ارشاد فرمانا کسی بزرگ کا کوئی رائے دینا، کسی دوسرے کا کوئی اور بیان داغ دینا، بلکہ ایک ہی شخص کا ایک موقع پر ایک طرح کی بات کہنا، دوسرے موقع پر دوسری ہانک دینا بھی بدگمانی پیدا کرتا ہے۔

چہارم۔ تقریروں میں اسلام پر احسانات فرمانے کے بعد، بلکہ قرارداد مقاصد اور رہنما اصول پاس کرنے کے بعد ایسے عملی اقدامات پہلے سے زیادہ زور شور سے کرنا جو اسلام سے صریحاً متصادم ہوں ایک اور سبب اضطراب ہے۔

پنجم۔ خود دستور سازی کے کام میں بار بار اس کی گنجائشیں نکالنے کی کوشش کرنا، بار بار ایسی سازشیں کرنا کہ کسی طرح جو کچھ طے ہو گیا ہے اس سے گردن چھڑائی جا سکے۔ بلکہ اس ارادہ بد کے لئے ملک و قوم کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے اور بڑی سے بڑی مصیبت میں مبتلا کر دینے تک آمادہ ہو جانا ــــ بھی اعتماد قائم ہونے میں سخت رکاوٹ ہے۔

ششم۔ ایک طرف دستور میں اسلامی تقاضوں کو شامل کرنا، اور دوسری طرف ملک کے فعال اسلامی عناصر اور تنظیموں کو کچلنے اور تنگ کرنے کی تدبیریں اختیار کرنا بھی بے چینی میں اضافہ کرتا ہے۔

ان وجوہ کے تحت ہم نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ یہ طبقہ اپنی مرضی سے از خود تو کبھی بھی اسلامی دستور بنانے کے لئے تیار نہیں ہے، اس لئے ہم نے قوم کو شروع سے اب تک چوکنا رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اندیشے اور شبہات ہم نے قوم کے سامنے اس لئے نہیں رکھے کہ بس اب مایوس ہو کے ان لوگوں سے روٹھ جاؤ اور یہ جو کچھ کام کریں اس پر بیزاری اور بددلی کا اظہار کر کے بیٹھ رہو، بلکہ یہ اس لئے پیش کئے ہیں کہ قوم "سپردم بتو مایۂ خویش را" کے طریق پر اپنے معاملات اپنے بزرگوں کے حوالے کر کے سو نہ رہے کہ یہ اب جو کچھ کریں گے وہ اپنے شاندار نعروں اور اپنی ساحرانہ تقریروں کے مطابق کریں گے، بلکہ وہ خود جاگتی رہے، دستور سازی کے کام پر نگاہ رکھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ آگے بڑھ کر منظم رائے عام کے ذریعے دباؤ ڈالے تاکہ یہ ارادۂ اجتماعی سے انحراف کی جرأت نہ کر سکیں۔ ہم نے لوگوں کو مغالطہ کا درس نہیں دیا بلکہ اولوالعزم ہونے کا سبق پڑھایا ہے۔ یوں اگر کام نہ کیا جاتا اور قوم ان کے تحریک پاکستان والے اسلامی نعروں پر تکیہ کر کے سو رہتی تو نہ جانے یہ کہاں جا سر نکالتے۔

۲۔ جمہوری معیار کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو انگریز جس تدبیر سے آزادی ہمیں سونپ گئے ہیں اس کے تحت یہ دستور یہ نمائندہ قرار پائی ہے۔ نہ

ہ اس سوال کو ہم اس استفسار کے وقت سے [illegible] حیثیت سے [illegible] سندھ چیف کورٹ میں دائر ہے، یعنی ہم دستور یہ کی مستقل حیثیت پر بات کر رہے ہیں نہ کہ ان حالات پر جو گورنر جنرل کے فرمان کے وقت خاص طور پر پیدا ہو گئے تھے۔ ان حالات کے بارے میں تو ہم عدالت کے فیصلے تک کوئی رائے نہیں دے سکتے۔

پارلیمنٹ، نہ وزارت، نہ انتظامی مناصب پر فائز ہونے والے اکابر! ان میں سے کسی کو قوم نے ایک ساورن حیثیت اختیار کرکے آزادی کی فضا میں
منتخب نہیں کیا۔ بلکہ یہ سارا آرہے کا آوا ہمیں ورثہ میں ملا ہے۔ جمہوری معیار کو درکنار رکھ کر خالص قانونی [illegible] حیثیت دیکھی جائے تو آئین
(ایکٹ ۱۹۳۵ء، انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ) کی رو سے یہ سب عملاً بااختیار اور نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر گورنر جنرل، پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو
بااختیار اور نمائندہ مانا جائے گا تو اسی بنیاد پر دستور ساز کی بھی ویسی ہی نمائندہ اور ساورن حیثیت ماننی پڑے گی جیسی آئین نے طے کر دی ہے، دستور ساز ایک
مکمل آئینی ڈھانچے (SET.UP) کا جزوِ اعظم ہے۔ سارا ڈھانچہ قبول ہے تو جزوِ اعظم کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ اس جزوِ اعظم کو کسی دلیل سے مسترد
کیجئے تو وہی دلیل سارے ڈھانچے کو مسترد کر دینے کا موجب ہوگی۔ یہ لیگل پوزیشن نہ مانئے تو اس ملک کا اب تک کا کیا کرایا بالکل بے معنی قرار
پاسکے گا۔ اسے بامعنی رکھنا ہے تو یہ پوزیشن ماننی پڑے گی۔

یہ پیچیدہ پوزیشن جس میں پیشرو حکومت ہمیں ڈال گئی ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کا سیدھا سیدھا عملی راستہ وہ ہے جس کو
ہمارے سامنے انڈیا نے اختیار کیا اور وہ اس پیچیدگی سے باہر آگیا۔ یعنی دستور ساز جتنی جلدی ممکن ہو اپنا کام ختم کرے اور نئے انتخابات
ہوں جن کے ذریعے قوم ساورن حیثیت کے ساتھ جمہوری لحاظ سے صحیح نمائندے چھانٹے اور وہ نئے دستور کے تحت کام شروع کریں۔
یہی راستہ ہمارے سامنے تھا اور ہم دستور ساز پر زور ڈالتے رہے کہ وہ جلد کام ختم کرے اور رخصت ہو مگر اوپر کے طبقہ نے ہمیشہ اڑنگے لگائے
اور کام میں التوا پیدا کرنے کی تدبیریں اختیار کیں، تاکہ ساورنٹی قوم کی طرف منتقل نہ ہو، اور نمائندہ جمہوری حکومت قائم نہ ہو سکے۔ اور یہ حضرات
ساورنٹی کی امانت کو قبضے میں رکھ کر زیادہ سے زیادہ مدت اسی پیچیدہ پوزیشن میں اسے ڈالے رکھیں۔

دستور ساز توڑنے کا جو مطالبہ جماعت اسلامی نے کیا تھا اس کے بارے میں پھر یہ گمان ہوتا ہے کہ ہماری فاسد صحافت کے شعبدوں سے
متاثر ہو کر آپ ایک شبہ پیش فرما رہے ہیں۔ بعض اخبارات نے گزشتہ دنوں پے در پے یہ بات پبلک میں پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ جیسے
جماعت اسلامی بالکل کل تک دستور ساز توڑنے کا مطالبہ کر رہی تھی اور آج لیکایک کسی سے کوئی معاملہ طے کر کے اس دستور ساز کی حمایت پر اُتر
آئی ہے۔

اب ہم سے سنئے کہ امر واقعہ کیا ہے؟

یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کا ہے کہ جماعت کی طرف سے ایک (SLOGAN) ان لفظوں میں سامنے آیا تھا "نئی دستور ساز! نئی قیادت"!
اس کی توضیح کے طور پر یہ بات کہی گئی تھی کہ یہ دستور ساز چونکہ ملک کے واضح عوامی تقاضے کے علی الرغم مطلوبہ قرارداد مقاصد پاس کرنے سے
گریز کر رہی ہے اور دستور سازی کا کام معرض التوا میں ڈالے ہوئے ہے اس لئے اب یا تو یہ اسلامی خطوط پر ایک قرارداد مقاصد پاس
کر دیجئے، ورنہ ایوان خالی کر دے۔ یعنی نمائندگی کا یہ مفہوم سامنے رکھا گیا تھا کہ اگر دستور ساز ادارہ اجتماعی اور عوامی تقاضوں سے انحراف کرتا ہے
تو وہ نمائندہ نہیں رہ سکتی۔ (اس صورت میں بھی مطالبہ یہ تھا کہ وہ رائے عام کے مطالبے پر خود مستعفی ہو جائے نہ کہ کوئی اور طاقت بیرونی
ادارے کو برطرف کر دے) اس سلوگن کے ذریعے جس مقصد کے لئے ہم نے دباؤ ڈالنا چاہا تھا وہ بہت تھوڑے وقفے میں پورا ہو گیا۔ یعنی
مارچ ۱۹۴۹ء میں مطلوبہ قرارداد مقاصد پاس کر دی گئی۔ اس واقعہ نے از خود ہمارے سلوگن کو ختم کر دیا بلکہ خود ہم نے اسے واپس لے لیا!
بہرحال یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کا ہے جب کہ کوئی قدِ آدم پوسٹر آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء گزرا۔ ۱۹۵۱ء گزرا، ۱۹۵۲ء
گزرا، ۱۹۵۳ء گزرا، لیکن ان اخبار نویسوں کو اور آپ کو کبھی خیال نہ آیا کہ جماعت اسلامی نے دستور ساز کی نمائندگی کی نفی کی ہے

اور کسی کو جماعت کے سیدھے اصولی پن کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ آج یکایک چھ سال کے بعد جب کہ ۱۹۵۴ء خاتمے کے قریب آ لگا ہے یہ انکشاف کیسے ہو گیا کہ ہم نے ایک بات کہتے کہتے خود ہی اس کی تردید شروع کر دی!

جس دستوریہ کی قراردادِ مقاصد ہم نے قبول کر لی جس کی دوسری دستوری رپورٹ کی باستثنا اس کے "قابلِ اصلاح پہلوؤں کے" قبول کر لیا۔ اس کی نمائندگی کی نفی کرنا چہ معنی دارد؟ ایسا اگر ہمیں کرنا ہوتا تو مارچ ۱۹۴۹ء میں کرتے جب کہ "دستوریہ توڑ دو" کا ایک نعرہ وار طوفان متحدہ محاذ نے اٹھایا تھا۔ اس وقت ہم نے اس نعرے کی شدید مخالفت کی ہے۔ جس پر مجلسِ شوریٰ کا مارچ کا ریزولیوشن تو گواہ ہے ہی — آپ کے بہت سے بااصول اور معیاری اخبارات کے فائل گواہ ہیں۔ خصوصاً نوائے وقت کا فائل اٹھا کر دیکھئے کہ اس کے عالی دماغ مدیر صاحب ان دنوں خود دستوریہ توڑ دو کے نعرے کے خلاف زور دکھا رہے تھے اور انہوں نے جماعت اسلامی کے موقف کو تحسین کے پھول برسا برسا کر سراہا ہے لیکن اس کے چھ ہی ماہ بعد جب دوسری مرتبہ یہ نعرہ اٹھوایا گیا ہے تو اگرچہ اس کا زور مارچ کے مقابلے میں بہت کم تھا لیکن اس کے پیچھے چونکہ ایک خاص محاذ بن چکا تھا لہٰذا انہی بااصول حضرات نے اس کی تائید میں اپنی پوری قوت لگا دی۔ جماعت اسلامی نے دوبارہ مارچ کی پوزیشن کو من وعن دوہرا دیا۔ اور ان بااصول حضرات سے تعاون نہیں کیا۔ اس پر پروپیگنڈہ کے میدان میں ہمارے خلاف جھوٹ کے ہتھیاروں سے "جہادِ مقدس" شروع ہو گیا کہ جماعت اسلامی نے ابھی راتوں رات اپنی پوزیشن بدل لی ہے۔ دستوریہ کو غیر نمائندہ کہتے کہتے اب چھ سال کے بعد یکایک اس نے اس کی حمایت کا علم اٹھا لیا ہے۔ افسوس ہے اگر ہمارے ملک کے نمایاں حضرات بھی اس ادارۂ تعلیم بالغاں سے اپنی معلوماتِ عامہ حاصل کرتے ہوں۔

ہمارے کوئی اعلانات ایسے نہیں ہیں جنہیں "یک قلم غلط تصور کرنے" کی تکلیف آپ کو برداشت کرنی پڑے۔

۵۔ یہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد کے پاس ہوتے ہی، جو پہلی مجلسِ شوریٰ لاہور میں (اپریل ۱۹۴۹ء) منعقد ہوئی تھی اس نے اس قرارداد کو اس کی اساسی اہمیت کے ساتھ ایک طویل قرارداد میں قبول کیا تھا۔ پھر دوسری دستوری رپورٹ کے سامنے آنے پر جنوری ۱۹۵۳ء میں علماء کے متفقہ فیصلے میں (جس میں جماعتِ اسلامی کا نقطۂ نظر بھی جملہ علماء کے ساتھ ہم آہنگ تھا) اس کے روشن پہلوؤں کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس کے بعد پے درپے ہمارے جتنے بیانات، ریزولیوشن، خطابات اور مقالات دستوری مسئلے پر سامنے آتے رہے ہیں ان سب میں ہم نے یہی بات کہی ہے کہ اس مسودے میں چونکہ اصولاً اسلام کی آئیڈیالوجی اور اس کے ضروری عملی تقاضے شامل کر لئے گئے ہیں۔ لہٰذا اسے ہم اسلامی دستور قرار دیتے ہیں، لیکن اس میں جو افسوسناک رخنے اور تضاد پائے جاتے ہیں ان کی اصلاح ہونا ضروری ہے۔ گویا ہماری رائے مسودہ دستور کے سامنے آنے کے وقت سے یہ تھی اور اب تک یہ ہے۔

یہ تھا جواب آپ کے سوالات کا!

اب براہِ کرم ایک دو باتیں عرض کرنے کا مجھے بھی موقع دیجئے۔ پہلی دریافت طلب چیز ہے کہ آیا آپ اور آپ کے ہم خیال حضرات کا اصل جھگڑا دستوریہ کی نمائندگی اور عدمِ نمائندگی کا ہے یا آپ کی اصل ضرورت ایک اچھا معیاری دستور ہے؟ اگر آپ کا اصل مطلوب ایک اچھا دستور ہے تو کیا آپ نے مسودۂ دستور کا خود بھی کبھی تجزیہ فرمایا ہے اور قوم کے سامنے کم سے کم اتنی تصریح کے ساتھ قرارداد، بیانات، تقاریر اور لٹریچر کے ذریعہ اسلامی اور جمہوری اور منطقی تقاضوں کے لحاظ سے یہ واضح کیا کہ اس کے کون کون سے پہلو قابلِ قبول ہیں [illegible] قابلِ ترمیم [illegible] چاہتے ہیں اور وہ [illegible] اور ہمارے

سے ناقابلِ برداشت ہیں اس تکلف میں آپ حضرات کبھی نہیں پڑے۔ آپ نے ہمیشہ ابہام کی حالت قائم رکھ کر مختلف نعرے بلند کئے ہیں اس راستے پر اگر آپ چلتے تو موجودہ مسودہ میں دو چار، پانچ، دس دفعات ایسی آپ نکال دیتے کہ ان میں تغیر و تبدیل ہونا چاہیے اور اس کے لئے جدوجہد کرتے۔ اب آپ اس راستے سے ہٹ کر دستوریہ کی نمائندگی و عدم نمائندگی کے سوال پر جا ٹھہرے ہیں۔ یہ بات ہے تو دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ دستوریہ کی عدم نمائندگی کا اولین انکشاف آپ پر کس زمانے میں ہوا۔ یہ غیر نمائندہ تھی تو پہلے دن سے تھی۔ کیا آپ نے اس کے وجود کا اعلان ہوتے ہی صدائے احتجاج بلند فرما دی تھی؟ پھر جب اس کا پہلا اجلاس ہوا تھا تو دوسرا موقع آیا تھا کہ اس کی نمائندگی کی نفی کی آواز اٹھائی جاتی۔ پھر قرارداد مقاصد پاس ہونے کا موقع تیسرا اہم موقع تھا کہ اسکو توڑوانے کی مہم شروع کی جاتی، پھر پہلی دستوری رپورٹ اور بنیادی حقوق کی رپورٹ پیش ہونے کا موقع تھا کہ اس وقت ایجی ٹیشن شروع کیا جاتا۔ پھر دوسری رپورٹ کے آنے پر ایک اور موقع ابھرا پھر اس رپورٹ کی خواندگی ہوئی تو ایک اور ایک موقع آیا، لیکن ان سارے مواقع پر آپ حضرات چپ سادھے پڑے رہے قوم کا روپیہ صرف ہوتا رہا، قوتیں کھپتی رہیں، دستوری مسائل پر عوامی میدان میں جدوجہد جاری رہی لیکن آپ نے کبھی قوم کو دستوریہ کی عدم نمائندگی سے آگاہ نہ فرمایا۔ اب یکایک مارچ ۱۹۵۴ء میں آپ پر پہلی مرتبہ یہ راز کھلتا ہے۔ کہ یہ دستوریہ غیر نمائندہ ہے اور عین اس وقت کھلتا ہے کہ جب کہ دستور سازی کا کام آخری مرحلوں پر آ پہنچا ہے۔ اور ملک کے لئے نمائندہ حکومت حاصل کرنے میں بہت تھوڑا عرصۂ انتظار کاٹنا باقی رہ جاتا ہے۔ ہو سکے تو زحمت فرما کر اس پوزیشن کو ہمیں ذرا سمجھا دیجئے۔

یہ بھی وضاحت فرما دیجئے کہ دستوریہ اگر خود اپنے آپ کو توڑنے والی نہ ہو، بلکہ کوئی دوسری طاقت آئین اور لیگل پوزیشن سے بالاتر ہو کر اسے توڑ ڈالے اور پھر ضرورت کے تحت موجودہ دستوریہ کے بنائے ہوئے دستور سے زیادہ غیر اسلامی، زیادہ غیر جمہوری اور زیادہ غیر معقول جمہوری دستور غیر معین عرصے کے لئے آپ پر مسلط ہو جائے تو آپ اس تغیر و تبدل سے کچھ کمائیں گے یا اس میں کچھ اور بھی کھو بیٹھیں گے! ایک صورت یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح "ایک دستور فوراً" نافذ ہو گیا ہوتا اور آپ آئینی اور جمہوری زندگی حاصل کر کے اسے مزید در مزید اصلاح لانے کی کوشش کرتے رہتے اور دوسری یہ ہو سکتی ہے کہ آئینی اور جمہوری زندگی نامعلوم مدت کے لیے پیچھے جا پڑے۔!

دوسرا دریافت طلب اور بڑا اہم مسئلہ یہ ہے کہ آپ حضرات موجودہ مسودۂ دستور کے غیر اسلامی ہونے کا واسطہ کچھ اس طرح دلاتے ہیں کہ جیسے آپ خود کوئی بڑا معیاری اسلامی دستور قوم کو عطا فرمانا چاہتے ہیں۔ اپنے اس حسن ظن کو آپ کے سامنے پیش کر کے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے اپنے دستوری تصورات کیا ہیں؟ کب ان تصورات کو آپ نے قوم کے سامنے رکھا ہے؟ کوئی آئیڈیالوجی؟ کوئی اصول؟ کوئی تفاصیل؟ کوئی خاکۂ دستور؟ کوئی لٹریچر؟ کچھ تو سامنے لائیے کہ یہ یہ کچھ کام ہم نے اپنے "معیاری اسلامی دستور" کے تصور کو پیش کرنے کے لئے اب تک کیا ہے۔ نشان دہی کیجئے کہ گزشتہ سات برس میں (اپنا لیگی دور بھی سامنے رکھئے اور عوامی لیگ کا دور بھی) آپ نے دستور کے مسئلے میں اپنا ذہن قوم کے سامنے کس کس طرح واضح کیا ہے؟ اس سلسلے میں کوئی مطالبہ قوم کو کر دیا ہے؟ کوئی سلوگن پیدا کیا ہے؟ کوئی تحریک چلائی ہے؟ دستوریہ کے کام پر کوئی تفصیلی تنقید و تبصرہ کیا ہے؟ اس کے اچھے اور برے پہلو چھانٹ کر کسی معیاری فیصلہ پر پہنچے ہیں۔

پھر کیا لوگ صرف اتنی سی بات کو سن کے آپ کا دامن تھام لیتے کہ یہ دستوریہ غیر نمائندہ ہے اور اس کا بنایا ہوا دستور غیر اسلامی ہے لہٰذا اسے بھاڑ میں جھونک کر آنکھوں پر پٹیاں باندھے ہوئے آگے چل پڑو۔

میں اس بات کے لئے عاجزانہ انداز سے معافی چاہتا ہوں کہ ان آخری سطور میں میرا لہجہ درشت ہو گیا ہے۔ اور شاید اوپر بھی کہیں کہیں کوئی بات ذرا زور کے ساتھ کہہ دی ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے لئے میرے دل میں کوئی بے احترامی موجود نہیں ہے۔

مجھے خوشی ہوگی کہ آپ الگ اس بات سے مجھے آگاہ کریں کہ اپنے سوالات کے بارے میں کس حد تک آپ مطمئن ہوئے ہیں اور آپ کا طرز فکر کچھ بدل سکا ہے، اور کن اجزاء کے بارے میں مزید استدلال کی ضرورت باقی ہے۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا!

ہاں! یہ بھی عرض کردوں کہ یہ ساری گفتگو ہنگامی حالات کے پیدا کردہ اثرات سے بالکل قطع نظر کرکے کی گئی ہے۔ ورنہ اگر دستوریہ عملاً ٹوٹ جائے تو یہ سوال بالکل الگ ہے کہ اس کے بعد ہماری روش کیا ہونی چاہیے یا کیا ہوسکتی ہے۔

اُخروی جزا و سزا کی حقیقت

سوال: یہ مسلمان کا ایمان ہے کہ روز قیامت بُرے اعمال کی پوری پوری سزا ملے گی لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت کی سزا کا فائدہ کیا ہوگا، کیوں کہ سزا دینا بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ بلکہ مجرم کو آئندہ کے لئے باز رکھنے کی کوشش کرنا اور دوسروں کو عبرت اور خوف دلانا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اب اگر قیامت کے بعد ایک ایسا نظام قائم ہونا چاہیے۔ جس میں اچھے بُرے اعمال کرنے کا کوئی چانس CHANCE نہیں ہوگا۔ تو اس وقت سزا دینے کا آخر کیا فائدہ ہوگا۔ اس دنیا میں قاتل کو سزائے موت اسی لئے ہی تو دی جاتی ہے تاکہ اس قسم کے جرم نہ ہوسکیں۔ اور قاتل کا یہ انجام دیکھ کر دوسرے عبرت پکڑیں۔ اور جب اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آجاتا ہے کہ کسی کے ہاتھ سے اتفاقیہ یا غلطی سے موت واقع ہوجاتی ہے تو ایسے مجرم سزائے موت سے بچ جاتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ سزا دینا خود کوئی مقصد نہیں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ جرائم کی روک تھام۔ اسی لئے تو اس شخص کو سزا ہی نہیں دی جاتی جس کے متعلق ثابت ہوجاتا ہے کہ اس سے اتفاقیہ طور پر گولی چل جانے سے موت واقع ہوگئی ہے۔ اور نہ یہ شخص جرائم پیشہ ہے۔ نہ اس کی مقتول سے کوئی دشمنی تھی۔ تو قیامت کے بعد جب آئندہ کے لئے اصلاح کرنے اور عبرت دلانے کا کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ تو اس وقت کی سزا میں کونسی حکمت ہے۔

جواب:

آپ نے دنیوی عدالتوں کی سزا کی ضرورت اور مقاصد پر اخروی سزا کو قیاس کرکے جو سوال پیدا کیا ہے۔ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ دراصل اسلامی فلسفہ حقیقت کے لحاظ سے آخروی دائمی زندگی ہی ہماری اصل زندگی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں موجودہ عارضی اور امتحانی زندگی میں اس لئے ڈالا ہے کہ ہم اپنے آزاد ارادہ و اختیار کے ساتھ، اپنی سمجھ بوجھ اور قوت فیصلہ کا استعمال کرکے یہاں جس اٹھان پر اپنی فکر و عملی زندگی کو اٹھائیں اور جیسی جیسی صلاحیتوں کا ثبوت عمل کے میدان میں پیش کردیں ٹھیک اسی کے مطابق ہمارے لئے دائمی آخروی زندگی کی نوعیت طے کی جائے۔ یہاں ہم ایک امتحان کے کمرے میں پرچہ اور جیسے جیسے پرچے مرتب کرکے ممتحن کے سامنے رکھدیں گے۔ انہی کے مطابق ہمیں پاس یا فیل ہوکر کسی خاص مقام عزت یا درجۂ ذلت کو حاصل کرنا ہے۔ یہاں ہمیں بیج بونے ہیں، اور وہاں ان کا حاصل لینا ہے۔ اخروی سزا نہ تو عام معنوں میں انتقامی کارروائی ہے، نہ مجرمین کی اصلاح کی تدبیر، بلکہ اعمال کے نتائج کی نوعیت رکھتی ہے۔ جس طرح کسی شخص کو اندرائن کی کاشت کرنے پر نظام طبعی یہ سزا دینے میں کوئی رعایت نہیں کرتا کہ اس کی پرورش کی ہوئی تمام کی تمام بیلوں پر کڑوا پھل آئے، اس طرح عدالت آخرت کا اخلاقی قانون کسی کے لگائے ہوئے تخم کے درختوں پر آم کا پھل لگانے کا روادار نہیں ہے۔

رہا مجرم کو اصلاح کا موقع دینے کا سوال تو اس کے لئے خود اس مہلت امتحان کی آخری گھڑی تک آدمی پر اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے اور اپنے

غلطیوں کو کاٹ کر نئے پرچے مرتب کرنے کی گنجائش بالکل کھلی ہے۔ انبیاء اور صلحاء کے ذریعے آدمی کو دعوتِ اصلاح دیئے جاتے رہنے کا انتظام موجود ہے۔ نظامِ انفس و آفاق میں باطل سے ہٹا کر راہِ راست کی طرف لانے والی آیات کے چراغ ذرے ذرے کی ہر سمت پر روشن ہیں۔ مشیت کے پیدا کردہ حوادث میں تنبیہات اور تہدیدات کے کھلے اور روشن پہلو موجود ہیں۔

یہ سارا نظام اسی لئے ہے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میرے لئے تو اصلاح کا کوئی موقع رکھا ہی نہیں گیا تھا، اب مجھ پر ایک اٹل عذاب کی سزا کیوں مسلط کی جا رہی ہے۔

آپ نے جو مثال دی ہے وہ اخروی سزا کے سلسلے میں بھی قابلِ لحاظ ہے۔ یعنی جس طرح کسی کے ہاتھوں بلا نیتِ بد کسی کی جان چلی جاتی ہے یا کسی کا کوئی نقصان ہو جاتا ہے اور اس پر دنیوی عدالتیں اس جرم کی پوری پوری سزا نافذ نہیں کرتیں، اسی طرح یقیناً اللہ تعالیٰ کی عدالت میں نوعیت اور ارادہ دل اور داخلی رجحانات کا پورا پورا ریکارڈ پڑھا جائے گا اور اسی ریکارڈ کی روشنی میں اعمال کی ظاہری اشکال کی حیثیت معین ہوگی۔ چنانچہ بظاہر کتنے ہی اعمال نیک سمجھے جاتے ہیں لیکن فسادِ نیت کی وجہ سے وہ وہاں جرائم کی فہرست میں داخل ہوں گے اور کتنی ہی غلطیاں ہیں کہ جو وہاں نیت کی پاکیزگی کی وجہ سے جرائم کی فہرست سے قلمزد کر دی جائیں گی۔ اس معاملے میں دنیا کی عدالتیں تو بہت کوتاہ ہیں، عدالتِ آخرت کی نگاہ سے تو ظاہر و باطن کا کوئی گوشہ مخفی نہ رہے گا۔

اب وہ اعتراض باقی نہیں رہتا جو اس مثال کو پیش کر کے آپ نے اٹھایا تھا۔

وضو اور ناخنوں کا پالش

سوال: "میرے ساتھ کی کئی لڑکیوں نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ کیونکس نیل پالش (NAIL POLISH) لگانے سے نماز ہو جاتی ہے؟ میرا کہنا ہے نہیں ہوتی، اور کچھ کا کہنا ہے کہ ہو جاتی ہے۔ آپ بتایئے کیا درست ہے۔ میرے کہنے کی دلیل یہ ہے کہ اس سے ناخن پر ایک خول چڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے وضو میں اتنا حصہ خشک رہتا ہے۔ اور پانی پہنچ نہیں پاتا۔ لیکن دوسروں کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔"

جواب:

محترمہ و عزیزہ! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ میں اتفاقاً لاہور گیا تو آپ کا خط وہاں پڑا ملا۔ سوال کا جواب دینے میں جو ذمہ داری ہے، اس کی وجہ سے بہت تذبذب محسوس کر رہا ہوں۔ خصوصاً اس وجہ کہ میری رائے جسے میں رائے ہی کہہ سکتا ہوں، اس معاملے میں جداگانہ نوعیت کی ہے۔ میں (NAIL POLISH) کے معاملے کو اس پر قیاس کرتا ہوں کہ فرض کیجئے کہ اعضائے وضو میں کسی مقام پر تیل، ویسلین، مرہم یا TAPE لگائی گئی ہو۔ اس کے اوپر سے پانی گزر جائے گا، اندر نفوذ نہیں کر سکے گا، لیکن اس کے باوجود وضو ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح ناخنوں کے رنگ کا معاملہ ہے، رنگ کا خول اگر ناخنوں کی پاکیزگی کی حالت میں چڑھایا گیا تھا۔ تو اب وہ جزوِ بدن ہو گیا ہے۔ اب پاکی اور ناپاکی کا سوال جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے اس خول کی اوپر کی سطح کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ اب تو جو آلائش لگے گی وہ بھی اس کی سطح پر لگے گی۔ اور دھونا بھی لازم ہوگا تو اسی سطح کو دھونا لازم ہوگا۔

ناخنوں کے رنگ کے خلاف درحقیقت ہمارے دلوں میں نفرت کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ تحفہ ہمیں اس تہذیب سے ملا ہے جو اپنی مجموعی ہیئت کے لحاظ سے فسق و فجور کی تہذیب ہے، اور پھر اس مسئلے میں IMPORT اور EXPORT کے توازنِ مفید کی خواہش بغیر شعوری طور پر

مجھے ہے حکمِ اذاں ــــــ

انسان کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ بدن اور روح، نفس اور ضمیر، ظاہر اور باطن کی کشمکش کا مسئلہ ہے۔ اسی کشمکش کے نتیجے پر اس دنیا کے اندر انسان کی قلبی طمانیت اور آخرت میں اس کی نجات کا انحصار ہے۔

جیلانی۔ بی، اے

کے بیشتر افسانوں کا موضوع زندگی کی اس فیصلہ کن کشمکش کے کوائف ہیں۔ وہ محض تفریحِ اوقات کے لئے نہیں لکھتا۔ وہ اپنے افسانوں کی بنیاد زندگی کے فلسفے پر اٹھاتا ہے اور اپنے قاری کے ذہن کو چپکے چپکے زندگی کے بنیادی مسائل کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے

جیلانی۔ بی اے

کے افسانوں کا پہلا مجموعہ

اذان

اور

دوسرے افسانے

حسین و دل افروز ــــــ قیمت: تین روپے

مکتبہ چراغِ راہ، کراچی

شاخ : بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

راگ مشین کا
باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

جہان تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود!
چراغِ راہ
اشاعتِ خاص
بیادگار مولانا مسعود عالم ندوی
مرتبہ: نعیم صدیقی
محمد عاصم
قیمت
۲/- روپے
مارچ ۱۹۵۵ء
شمارہ ۳ ـــــ جلد
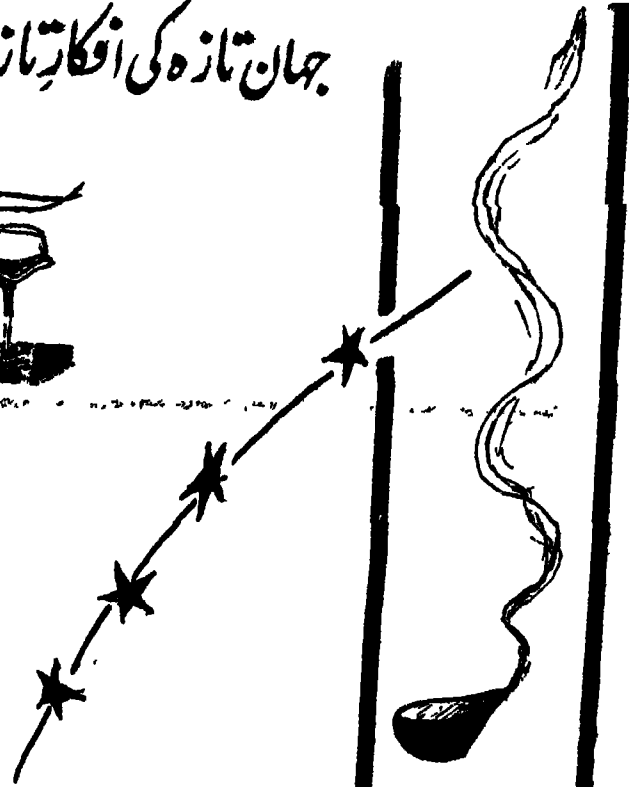
مندرجات

سوانح اور شخصیات کا مطالعہ:

علمی و فکری کارنامے:

منظومات:

خطوط

بخدمت جناب:

ایک لفظی تصویر

نعیم صدیقی

حلیہ، لباس، اطوار بالکل سادہ! لیکن سراپا سے ایک صاحبِ عظمت شخصیت کا اظہار!

قامت اوسط سے کچھ کم ——— قیمت اوسط سے بہت زیادہ!

جسم، کم جگہ گھیرنے والا! روح آفاق گیر!

مختصر سا لمبوترا چہرا، لیکن وجاہت غیر معمولی!

آنکھیں چھوٹی! ——— نگاہ و دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی!

ناک پتلی ——— مگر اونچی رہنے والی!

ہونٹ باریک، غنچوں کی سی ہنستی ہوئی مسکراہٹ سے اکثر مزین!

ڈاڑھی گھنی اور لمبی، لیکن چہرے کے متناسب!

بال بالکل سیاہ، چہرے کی رنگت کو نمایاں کرنے والے!

ظاہری رنگ گندمی! باطنی رنگ "صبغۃ اللہ"!

ابروؤں کی محرابیں خوب ابھری ہوئی! ——— ان محرابوں کے نیچے پلکوں کی صفیں کبھی قیام میں، کبھی سجدہ میں!

زبان میں لکنت ——— پھر بھی حق گوئی میں رواں!

پاؤں میں کبھی چپل، کبھی دیسی جوتی، کبھی بوٹ!

سر پہ گاہے ٹوپی، گاہے حاجیوں کا سا رومال!

بالعموم ہلکے تنگ پاجامے کا استعمال ——— کبھی کبھی مکان پر تہمد باندھنا!

سردیوں میں کبھی روئی دار بنڈی اور کبھی نہرو کٹ واسکٹ زیب بدن!

گھر سے نکلنے اور مجلس میں بیٹھنے کی صورت میں پابندی سے شیروانی کا استعمال ——— کبھی کھدر کی کبھی مشینی کپڑے کی!

کپڑوں کا رنگ ہمیشہ سفید یا صوفیانہ ——— مثلاً خاکی، شتری، چاکلیٹی، بادامی وغیرہ!

کبھی کبھی اونچی آواز میں قہقہہ ——— آ.....آ.....آ..... کے صوتی تسلسل سے!

بھول، ندامت، بیزاری، ذہنی کوفت، قلبی کرب کا اظہار تیزی سے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر!

قطع کلام کی اجازت لینے یا کسی کو مداخلت بے جا سے روکنے کے لئے بغیر منہ سے کچھ کہے انگلیاں جوڑ کر ہاتھ آگے بڑھانا اور چہرے سے کراہت کا اظہار!

قبول و اعتراف کے لئے کبھی کبھی ہلکی آواز میں بس، ہاں ..... ہاں ..... ہاں ..... بس تسلسل سے کہنا!

تردید کے لئے خاص انداز ... آں ..... آں ..... آں ... کہنا اور ساتھ ہی ہاتھ کے اشارہ سے روکنا!

[illegible] ——— اپنے قریب کی جگہ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کا اشارہ!

[illegible]

حوچ باچار

قافلے کی متاعِ گراں بہا مسعودؒ !

نعیمہ صدیقی

می کا مرنا اس آسمان کے نیچے کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، کوئی اچنبھے کی بات نہیں، بچے مرتے ہیں، بوڑھے مرتے ہیں، جوان مرتے ہیں، قصبے اور گاؤں میں ہر آن زندگی کے ہاتھوں سے خراج وصول کرتی ملتی ہے "گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت" لیکن جینے والے ہیں اور کئی قسموں کے مرنے والے ہیں۔ زندگی کے ڈھنگ بھی گونا گوں ہیں اور موت کے انداز بھی رنگا رنگ ہیں۔ ایک وہ جو زمانے سے زندگی کی بھیک مانگتے مانگتے جیتے ہیں اور بھیک مانگتے مانگتے ختم ہو جاتے ہیں جو زمانے سے لڑتے لڑتے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کرتے ہیں مرتے ہیں تو اس شان سے مرتے ہیں کہ زندہ تر ہو جاتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ کیڑوں مکوڑوں کی طرح مرتے ہیں اور تاریخ کا کارواں نداز کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ اپنے نفس کو تلوار بنا کر کسی اصول و مقصد کے لئے جہاد کرتے ہوئے قوتوں کا سارا خزانہ نچوڑ بعد سقراط کی طرح موت کے زہر کا پیالہ ہنستے مسکراتے پیتے ہیں اور سچائی کے محاذ پر دم توڑتے ہیں تو تاریخ ان کے کارناموں کی میراث دامن ہے، ان کی عظیم روحوں کے مزار اپنے سینوں میں بناتی ہے اور ان کی یادوں کے داغ دل میں لئے وقت کی وادیوں میں ارتقا کے مراحل ہے ——— اور داغوں کے یہ دیئے قیامت تک اجالا کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مرنے والا ہے جو ہم سے مارچ ۱۹۷۴ء میں جدا جس کی یاد کے داغوں کے دیئے آج ہم روشن کر رہے ہیں۔

●

ہڈیوں کا ایک کمزور ڈھانچ! ——— کمزور پھیپھڑے اور نازک اعصاب! ——— جسمانی قوتوں کی تھوڑی سی پونجی سے اس کی ایمان کی قوت م لیا ہے کہ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ متاعِ بدن کے لحاظ سے یہ بے سروسامان ہستی ناسازگار ماحول کے طوفانوں سے مردانہ وار لڑتے ہوئے ، ایک ایک گھڑی گزار گئی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ کش مکش! ہر آن کش مکش! باطل نظریات سے کش مکش! فاسد اخلاق سے کش مکش! گار کلچر سے کش مکش! مغربی تمدن و سیاست سے کش مکش! کہیں سر جھکائے بغیر، کہیں شکست مانے بغیر، کہیں سمجھوتہ کئے بغیر!

ایک طرف علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف! دوسری طرف گفتگوئیں اور ملاقاتیں! تیسری طرف انتہائی باقاعدہ خط و کتابت! کام! ہر لحظہ ٹھوس کام! بامقصد کام!

فکر، نہایت گہری فکر! جذبہ، نہایت زوردار جذبہ! کردار، نہایت مضبوط کردار!

ایسے آدمی روز روز نہیں پیدا ہوتے، اور ایسے آدمی جب حلقۂ یاراں سے اٹھ جاتے ہیں تو ایسا خلا رہ جاتا ہے جو مدتوں میں پُر نہیں ہوتا! اسے خلا کہئے، یا گھاؤ کا نام دیجئے!

مرنے والے نے اپنی بیش بہا زندگی کے لمحے ایک عالمِ نو کی تعمیر میں گنا دیے ہیں۔ ایک ایک کر کے وہ خیالات و عقاید کی اینٹیں رکھتا رہا۔

واضح رہے کہ علامہ اقبال نے سر راس مسعود کا جو مرثیہ لکھا ہے یہ مصرعہ اس سے ماخوذ ہے۔ نام کی مناسبت ہے کہ جب مسعود ندوی کی یاد آتی ہے یہ مصرعہ معاً ذہن میں ابھر آتا ہے۔

ں کی تعمیر اپنے ہاتھوں سے مٹی لا لانے کا فریضہ ادا کر سکیں۔"

بیماری آدمی سے شگفتگی سلب کر لیتی ہے خصوصاً دمہ جیسی بیماری جو مستقل طور پر جان کی لاگو ہو جائے، مشکل ہی کسی کو فرصت تبسم دے
سکتی ہے۔ مولانا کی اس بیماری کے جان گسل ہونے کا کوئی اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جنہوں نے اس کے دوروں کا عالم بچشم خود نہ دیکھا ہو
خود میں نے بارہا دیکھا ہے۔ مولانا کی بیماری کا تصور اس واقعہ کے دسویں حصے سے بھی کم تھا جو میں نے
خود یہ شنا کرتا تھا کہ مولانا کو دمہ کا دورہ ہو جاتا ہے، لیکن میرا دمہ کے دورے کا تصور اس واقعہ کے دسویں حصے سے بھی کم تھا جو میں نے
ایک مرتبہ خود دیکھا ہے۔ مولانا مرحوم ایک مرتبہ کام کے سلسلے میں دار الاسلام (پٹھانکوٹ) تشریف لائے اور چند روز قیام فرمانے کا ارادہ
تھا۔ وہاں کی مرطوب آب و ہوا نے اثر کیا اور تکلیف بڑھ گئی۔ ایک رات کو اچانک اطلاع ملی کہ مولانا کو دورہ پڑا ہے۔ فوراً بستر چھوڑ اور
مولانا کے کمرے (مہمان خانہ) میں پہنچا۔ وہاں سارے رفقاء جمع تھے۔ قطعی طور پر بے ہوشی کے عالم میں مولانا کا پورا جسم کرب کے مارے
تڑپ رہا تھا اور سانس ایک ہولناک سیٹی کی صورت میں آ رہی تھی جو بہت دور تک سنائی دیتی تھی۔ بیماری کا معمولی سا منظر بھی مجھے بہت پریشان
کر دیتا ہے اور یہ ڈراؤنا نقشہ دیکھ کر تو میں نے بڑی گھبراہٹ محسوس کی۔ اس کا تصور آج بھی آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایسے جان لیوا مرض کے بھنور میں جس شخص کی کشتیٔ حیات بار بار گھر جاتی ہو، کیا اس سے آپ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ کبھی مسکرا
سکتا ہوگا۔ لیکن مسعود ندوی نے عزیمت کی یہ حیرت ناک مثال قائم کی ہے کہ بیماری کے اس دیو سے لڑ لڑ کر، بہت سے چرکے کھا کر،
بہت سا خون اسے پلا کر جب وہ معرکہ سے عہدہ برا ہوتا تو اس کے نحیف و نزار دھڑ کے اوپر ایک مسکراتا چہرہ چمکتا دکھائی دیتا۔ مجھے جب بھی
مولانا مسعود عالم کی یاد آتی ہے تو میں انہیں مسکراتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ شاذ ہی کوئی ملاقات ایسی ہو سکتی ہے جب کہ سامنا ہونے پر مولانا
پوری پوری شگفتگی کا مظاہرہ کر کے نہ ملے ہوں، پُرتپاک طریق سے نہ ملے ہوں، اور پوری شان بے تکلفی سے نہ ملے ہوں۔ عزیمت حیات کی یہ ایک
عظیم مثال ہے!

ہر آدمی کی طرح مجھے بے شمار آدمیوں کی تعریف اور تنقید سے سابقہ پیش آتا رہا ہے۔ لیکن ہر آدمی کی طرح میرے حصے میں بھی ایسے
شفقت کیش خیر خواہ کم آئے ہیں جن کی محبت بھری تعریف بڑھاوا دیتی ہے اور جن کی خیر خواہانہ تنقید ترقی کے راستے پر ڈالتی ہے۔ اس صف
میں اپنے لئے میں مولانا مودودی کے بعد جن دو چار ناموں کو سوچ سکتا ہوں ان میں مولانا مسعود عالم کا مقام بہت ہی نمایاں ہے۔ مجھ
سے بالکل شروع ہی سے مولانا کو جو خاص دلچسپی رہی ہے اس کا خیال کرتا ہوں تو ہمیشہ شرمندہ ہوتا ہوں کہ اتنا بڑا مصنف، اتنا بڑا عالم،
اتنا بڑا ادیب مجھ جیسے علمی لحاظ سے کھوکھلے اور عملی لحاظ سے کمزور آدمی پر کتنا مہربان رہا ہے اور مجھے کتنے محبانہ حسن ظن کا مستحق سمجھتا رہا ہے،
طفیل صاحب اور میرے بارے میں اکثر تو غیر حاضری میں ——— اور دو ایک بار ہمارے سامنے بھی یہ فرماتے تھے کہ یہ دونوں آدمی مرکزی عملے
میں "سینئر" ہیں۔

"ذہنی زلزلے" شائع ہوئی تو اس میں بالکل ذاتی نوعیت کی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ اس کے نسخے اپنے خاص ادبی دوستوں کو بھجوائے۔
چنانچہ عبدالاحد خاطمی صاحب کو جیل میں یہ کتاب پہنچائی اور ان کی رائے حاصل کی جو اس کتاب کے تازہ ایڈیشن میں شامل کر دی گئی ہے۔ اپنے
تصنیفی کاموں میں بارہا خود فرمائش کر کے مجھ سے مشورے لئے، حالانکہ وہ مجھ جیسے معمولی آدمی کے مشوروں کے محتاج نہ تھے۔ بلکہ بسا اوقات
میرے مشوروں کو اہمیت دے کر ان کو قبول فرمایا۔ خاص طور پر مجھے یاد ہے کہ جب پہلے پہل مولانا مودودی سے مشورہ کر کے انہوں نے
"ہندوستان میں اسلام کی سرگزشت" لکھنے کا ارادہ کیا تو اس سلسلے میں مجھ سے گفتگو ہوئی۔ اس موضوع کے لئے ایک خاکہ میں نے نوٹ کر کے

دیا ، اسے مرحوم نے بڑی اہمیت دی اور بعض چیزیں اس میں سے پسند کیں - وہ کام اب ہو چکا ہے ، اور عربی میں "غربۃ الاسلام فی الهند" کے نام سے
تیار ہے - اسی طرح اشتراکیت کے متعلق جب بھی کچھ لکھا ہے توجہ سے اپنے نقشے کے متعلق بات چیت کی ہے -
جب کبھی آپ کی کوئی کتاب شائع ہوتی تو محبت و اخلاص کے پورے پورے جذبے کے ساتھ اس کے دو دو نسخے ہدیہ کئے ہیں - ہدیہ کا جز
[illegible] بھی دیکھوں اس پر تہدیہ کے لئے بہترین جذبہ آمیز الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے مع نیچے دستخط اور تاریخ !
۱۹۴۸ء سے تقریر کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے - متعدد موقعے آئے کہ گوجرانوالہ اور راولپنڈی میں میں نے ایسی تقاریر کیں جب کہ مولانا ،
کا قیام ان شہروں میں تھا - لیکن یہ تقریریں چونکہ رات کو ہوتی رہیں اور رات کو مولانا اپنی علالت کی وجہ سے جلسوں میں شریک نہ ہو سکتے تھے اس لئے
کبھی موقع نہ آیا کہ میری تقریر کو براہ راست خود سن سکتے - ہمیشہ رفقاء کے ذریعے رپورٹ پہنچتی - ۱۹۵۱ء کے سالانہ اجتماع (کراچی) میں پہلا موقع
تھا کہ دن کے اجلاس میں میری تقریر "اسلامی تحریک دنیا کی دوسری تحریکوں کے مقابل میں" کے عنوان پر تھی اور مولانا مسعود عالم اسٹیج کے پیچھے تشریف رکھتے
تھے - اس کے بعد ہی خود مولانا کا لکھا ہوا ایک مقالہ پڑھا جانے والا تھا - میری تقریر سن کر مختلف رفقاء کے سامنے آپ نے اپنا تاثر بیان کیا - ایک رفیق
کے ذریعے آپ کا یہ اظہار رائے مجھ تک پہنچا کہ "آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ اس کی تقریر کو کیوں پسند کرتے ہیں !
آدمی کے ایسے محب اور قدردان جب اٹھ جاتے ہیں تو وہ بالکل ذاتی قسم کا درد و کرب محسوس کرتا ہے !

●

میرے سامنے اس وقت مولانا مرحوم کا میرے نام لکھا ہوا ایک یادگاری خط ہے جو اگرچہ بالکل پرائیویٹ قسم کا ہے ، لیکن اس کا ایک
حصہ ایسا ہے کہ جسے اشاعت کے لئے دے سکتا ہوں - یہ ۵ - ۶ - ۱۹۵۵ ہجری کو دار العروبہ ، شہر جالندھر سے لکھا گیا ہے - غور فرمایئے کہ مجھے
"مکرمی و محترمی" کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے اور خاتمہ "آپ کا" کے الفاظ پر ہے - اب میں اس خط کا محولہ بالا اقتباس پیش کرنے سے پہلے اس کا
پس منظر بیان کر دوں - ایک خاص سلسلۂ گفتگو میں میں نے مولانا سے عرض کیا کہ "آپ کم سے کم تنقید تو برداشت کر سکتے ہیں ، اپنے خلاف کچھ سن
تو سکتے ہیں" یہ جملہ دراصل کسی خاص ذہنی رد عمل میں کہا گیا تھا - یعنی اشارہ کسی اور طرف تھا کہ لوگ اپنے اوپر تنقید کو سہہ نہیں سکتے - مولانا نے یہ
سمجھا کہ شاید میں خود ان پر تنقید کا اذن طلب کر رہا ہوں - چنانچہ اسی تاثر میں خط لکھا اور اپنے آپ کو فراخ دلی سے تنقید کے لئے پیش کر دیا - یہ
اقتباس مرحوم کے کردار کی عظمت کی دلیل ہے - ملاحظہ ہو :-

"آپ نے میری کسی رائے پر پوچھا تھا کہ کیا تم اپنے خلاف سن سکتے ہو؟ اور اختلاف برداشت کر سکتے ہو؟ میں
اس وقت ایک دوسرے ادھیڑ بن میں تھا - اس لئے جواب نہ دے سکا ، بلکہ اچھی طرح سوال سمجھ بھی نہ سکا تھا -
اب خوش دلی کے ساتھ عرض ہے کہ آپ میری ذات ، تحریر اور افکار ، جس پر جو نقد کرنا چاہیں بخوشی کر سکتے
ہیں - انشاء اللہ شکر گزار ہوں گا - جو عیوب ہوں گے ، قبول کروں گا - جو نہ ہوں گے ، ان سے برأت کی کوشش
کروں گا - جو باتیں قابل توجیہ ہوں گی ، ان کی توجیہ بھی کی جائے گی ---- بلکہ آپ یہاں آئیں (عنایت اللہ[1] کی
خواہش بھی ہے) اور مجھے اندر سے دیکھیں اور پھر نقد کریں ، بکھلم کھلا اور میرے رفیقوں کے سامنے !

اس کے بعد خط میں خود مجھے کچھ مشورے دیئے ہیں اور ایسے مشورے سوائے مشفق اور خیر خواہ بزرگوں کے اور کوئی کسی کو نہیں دیتا - خاتمہ پر پھر یہ فقرہ ہے :
"اور آپ مجھ پر جو تنقید بھی کریں ، انشاء اللہ ممنون ہوں گا ، غور کروں گا اور اس کی روشنی میں اپنی اصلاح

---

[1] یہ میرے قریبی عزیز ان دنوں مولانا کے زیر تربیت تھے -

کی کوشش بھی کروں گا (اگر اس میں کوئی کلام ہو تو بات نہیں)"

تھی اگرچہ محض ایک غلط فہمی! ــــ لیکن دیکھئے کس خراج ملا ہے اپنے سے ایک فرد تر آدمی کے سامنے تنقید کے لئے رکھ دیا ہے کہ جدھر سے چاہو جانچو پرکھو! یہ مقام اسلامی نظام اجتماعی کے تصورات جذب کئے بغیر کیسے ہاتھ آسکتا ہے!

●

جماعتی زندگی کے خاص دائروں میں مرحوم کے کردار پر جب توجہ جاتی ہے تو چند چیزیں بہت ہی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔

پہلی خصوصیت اخلاص و محبت کا وفور ہے۔ ایک ایک رفیق سے محبت اور گہری محبت! ایک ایک ساتھی سے یگانگت اور بے تکلفانہ یگانگت! مولانا مسعود کی خدمات اور کارناموں کو دیکھ دیکھ کر تو ایک زمانہ روئے گا لیکن اس محبت و یگانگت کی یادیں ہمیں دو گونہ تڑپائیں گی!

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اپنی رائے حد درجہ اخلاص سے پیش کرتے اور پورے زور سے پیش کرتے، لیکن قدم قدم پر ضد کی کمزوری کا کبھی مظاہرہ نہیں کیا۔ دوسروں کی باتیں ہمیشہ غور سے سنیں اور اپنی رائے میں تبدیلی پیدا کی۔ ایک بار نہ جانے کیا مسئلہ مجلس شوریٰ کے سامنے تھا جس میں مولانا مسعود عالم نے کسی رائے کو انتہائی تحدی کے ساتھ پیش کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈیڈ لاک پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن نہیں، چوہدری علی احمد خاں اور کسی دوسرے رفیق کی تھوڑی سی گفتگو سے فوراً مطمئن ہو گئے اور خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی رائے کی سختی کو کم کر کے دوسرے نقطۂ نظر کے لئے گنجائش پیدا کر دی۔

تیسری خصوصیت یہ نمایاں نظر آتی ہے کہ اطاعت امر میں آپ ایک سپاہی اور ایک رضا کار رہے۔ بعض اوقات آپ کو امیر جماعت یا مجلس شوریٰ کی کسی رائے سے اختلاف رہتا، لیکن جب فیصلہ ہو جاتا تو مشترک ذمہ داری (JOINT RESPONSIBILITY) کے اسلامی داعیہ کے تحت اس پر عمل درآمد کے لئے ایسے شرح صدر کے ساتھ تل جاتے جیسے فیصلہ عین آپ کی ذاتی رائے کے مطابق ہوا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ مولانا مودودی نے جب جیل کے عالم بے بسی میں ایسے قیمتی رفیق کی اچانک موت کی خبر سنی ہو گی تو ان کے دل پر کیا گزری ہو گی!

●

مارچ ۱۹۵۳ء میں جب ہم لوگوں سے دعوت اسلامی کے جرم کا انتقام لینے کے لئے معرکۂ دار و رسن برپا کیا گیا تو اس انبوہ عاشقاں میں مولانا مسعود عالم ندوی بھی تھے۔ معشوقانِ ہزار شیوہ اس نحیف و ناتواں جسم کو بھی بخشنے کے لئے کہیں سے حوصلۂ بلند نہ لا سکے ــــ ہاں مگر! جھگڑا اس جسم سے تو تھا ہی نہیں، روح سے تھا، فکر سے تھا، ذہن و قلب سے تھا ــــ جسم بے چارا تو بیگانہ گھن تھا جو گیہوں کے ساتھ پس گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس مرحلۂ ابتلا سے گزرتے ہوئے جب بھی اپنی کمزور صحت کے بارے میں تشویش محسوس کی تو معاً مجھے مولانا مسعود عالم کی یاد آگئی اور اپنے سے بڑھ کر مرحوم کو رہائی کی دعاؤں کا مستحق سمجھا۔ یہی کیفیت محترم چوہدری محمد اکبر صاحب کی تھی کہ جب آپ کا خیال آتا تو شدید احساس دکھاتے۔

لیکن وہاں روح کی استقامت کا عالم یہ تھا کہ مسعود ملک جب پنڈی جیل سے منتقل ہو کر ہمارے پاس آگئے تو انہوں نے وہاں کی روداد سناتے ہوئے مولانا کے متعلق خاص تاثر کا اظہار کیا کہ جیل میں یہ ایک کردار مثالی کردار ہے۔ صبر و تحمل بلکہ عزیمت کے ساتھ جیل بھگتنے کے لحاظ سے مولانا کے مرتبے کو کوئی دوسرا نہیں پہنچا۔ اغلباً مسعود ملک کے اس تاثر کو میں نے اپنے روزنامچہ میں بھی درج کیا ہے۔

ایسا ساتھی جب بچھڑ گیا ہو تو کاروان تحریک کہاں سے کہاں جا پہنچنے پر بھی مٹی کی اس ڈھیری کو فراموش نہیں کر سکتا جس میں اس ساتھی کے جسد خاکی کو مدفون کیا گیا ہے۔

●

مرحوم کی سب سے بڑی یادگار دارالعروبہ ہے۔ دارالعروبہ پاکستان کے قلب سے اٹھنے والی اسلام کی آواز کو دوسرے مسلمان ممالک میں پہنچا رہا ہے اور وہاں کی صدائے بازگشت کو ہمیں سنا رہا ہے۔ دارالعروبہ جو عربیت کے ذوق کی سوکھی ہوئی جڑوں کی از سر نو آبیاری کر رہا ہے ــــ دارالعروبہ جو واحد

اسلامی نصب العین کے رشتے سے مسلمانانِ عالم کو باہم دگر جوڑ رہا ہے !

پھر مولانا کی زندہ یادگاریں ان کی قیمتی علمی تصانیف ہیں۔ ان تصانیف میں ایمان اور فکر اور شعور کے جو سرچشمے اُبل رہے ہیں اُن سے انسانیت رہتی دنیا تک بہرہ اندوز ہوتی رہے گی۔ ان تصانیف کے ذریعے ہم اور ہمارے بعد کی نسلیں اُس روح اور اس کردار سے ملاقات کرتے رہیں گے جس کی لَو کبھی مدھم نہیں پڑ سکتی۔

●

مولانا مسعود عالم اپنے ملک ہی کی ایک بڑی شخصیت نہ تھے، تمام عالمِ اسلامی کے محبوب تھے اور ان کے قدردانوں کا حلقہ دور دور تک وسیع تھا جس کا اندازہ "دیارِ عرب میں چند ماہ" کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نمازِ جنازہ میں عربی ممالک کے سفیروں نے شرکت کی، جنازے کو کندھا دیا، قبر پر پہنچ کر مٹی ڈالی اور ایسے جذبات کا مظاہرہ کیا جو ہم میں اور عربی ممالک میں محبت و یگانگت کا جوڑ مضبوط کرنے والے ہیں۔

لیکن ہزار افسوس کا مقام تھا کہ خود پاکستان کی حکومت سے تعلق رکھنے والا کوئی ایک نمایاں فرد موجود نہ تھا، سیاسی لیڈروں میں سے کوئی نہ تھا، وزراء اور سیکرٹریوں میں سے کوئی نہ تھا ! بلبل چوہدری کے مرنے پر اس طبقے کے دل تڑپ سکتے ہیں، استاد بندو خاں کی موت شاید کسی نہ کسی حد تک ان کو محسوس ہو سکتی ہے، لیکن دین کے ایک خادم کا اٹھ جانا ان کے سنگین کلیجوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتا، وقت کے بڑے مصنف کی جدائی ان کو اشکبار نہیں کر سکتی، اپنے دور کے ایک عالی مقام مسلم مورخ کا سفرِ آخرت ان کے جذبوں میں کوئی لہر پیدا نہیں کر سکتا، عربیت کے ایک ایسے پیکر کا ہاتھوں سے چھن جانا جس کے مرتبے کے کُل چار، چھ افراد سارے خطۂ ہند و پاک میں مل سکیں، ان کی توجہ اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا۔ ایک عالم، ایک مصنف، ایک مورخ، ایک ادیب، عربی ادب و انشاء کا ایک استاد ملک کی کتنی بڑی قیمتی دولت ہے، لیکن دولت کا یہ خزانہ لٹ جاتا ہے اور اس ملک کے کارپردازوں میں سے کسی ایک کو بھی احساسِ زیاں نہیں ہوتا۔

غالباً یہ سزا ہے اُس اختلاف کی جو مرنے والے کو نظریاتی اور سیاسی حیثیت سے اپنے ملک کے خداوندوں سے خود ان کی خیر خواہی اور ملک و قوم کی محبت کی وجہ سے تھا ! ــــــ صد افسوس اس تنگ ظرفی پر ! ہزار حیف اس سیاسی تعصب پر !!

کیا کہتے ہوں گے عربی ممالک کے وہ سفراء جنہوں نے تمہارے ملک کے ایک شہری کے جنازے کو محبت و شوق کے ساتھ آکر کندھا دیا تھا اور جس کی نمازِ جنازہ کی شرکت کے لئے وہ اپنی دوسری سرگرمیوں اور پروگراموں کو چھوڑ چھاڑ کے آ گئے تھے، باہر کے مہمانوں نے اسے اپنا سمجھا اور گھر والوں نے اسے غیر جانا !

●

چراغِ راہ سے مولانا مرحوم کو جو خاص محبت تھی اور اس کے مہتمم اور مدیر سے جو خاص قلبی رابطہ تھا۔ اس کے فطری تقاضے کے تحت ہم یہ اشاعتِ خاص نکال رہے ہیں۔ اس کی ترتیب میں اُن سے مستفید ہونے والے، ان سے محبت کرنے والے، اُن کی صحبت سے حصہ پانے والے اور ان سے مختلف قسم کے روابط رکھنے والے بہت سے اشخاص نے حصہ لیا ہے اور ہر ایک کا حصہ قابلِ قدر اور مستحقِ تشکر ہے۔ لیکن خصوصیت سے اس اشاعت کی ترتیب کا کریڈٹ ہمارے عزیز بھائی عاصم صاحب کے حصہ میں جاتا ہے جو مرحوم سے تربیت پا کر آج دارالعروبہ کی ساری ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ عاصم صاحب سے مولانا کو جو قریبی تعلقِ خاطر تھا اسی کی وجہ سے یہ جب مولانا کا ذکر کرتے ہیں تو بھائی جان جیسے بے تکلفانہ الفاظ ہی سے کرتے ہیں۔

یہاں تذکرہ رہ گیا ہے۔ مولانا "جماعت اسلامی" سے پہلے کے دور میں سوشلسٹ حلقوں سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے ان حلقوں سے کوئی تاثرات حاصل نہ کئے جا سکے۔ نیز بعض اہم اور مفید مضامین کتابت شدہ ہونے کے باوجود جگہ کی قلت کے باعث

(باقی بر صفحہ ۱۴)

تاثرات و مُطالعات

- سید ابوالاعلیٰ مودودی
- السید مفتی محمد امین الحسینی مفتی اعظم، فلسطین
- ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی
- محمد محمود الصوات۔ ایڈیٹر العروۃ الاسلامیہ بغداد
- استاذ احمد مظہر العظمہ، ایڈیٹر التمدن الاسلامی، دمشق
- طٰہٰ فیاض، مدیر السجل۔ بغداد
- مولانا محمد ناظم ندوی، پرنسپل جامعہ عباسیہ
- ماہر القادری
- چوہدری علی احمد خاں
- رئیس احمد جعفری
- سید ابوالحسن علی ندوی
- مولانا عبدالغفار حسن
- سلطان احمد
- لالۂ صحرائی
- جیلانی بی، اے
- محمد حسنین سید
- سید مظفر حسین شاہ ندوی
- حافظ محمد زکریا، ایم اے
- محمد عاصم
- نذیر حسین، ایم اے
- پروفیسر عبدالحمید صدیقی، ایم اے
- عنایت الرحمٰن صدیقی

ایک خط

سید ابوالاعلیٰ مودودی

بنام محمد عالم صاحب

برادرِ عزیز! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

....

....

....

مولانا مسعود عالم صاحب کی وفات پر اس کے سوا کیا لکھوں کہ اس کے بعد سے اپنا ایک بازو ٹوٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ بلکہ شاید جسم کا بازو ٹوٹنے کی بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی روح کے اس بازو کے ٹوٹ جانے سے محسوس ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ جزیل عطا فرمائے اور اپنے دین کے لیے ویسا ہی کوئی دوسرا خادم پیدا کرے۔ بظاہر تو یہ جگہ پُر ہونی مشکل ہے۔ مگر اللہ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔

....

والسلام

ابوالاعلیٰ

ترجمہ

الاستاذ مسعود الندوی

محمد امین الحسینی
(مفتی فلسطین)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وآلہ وصحبہ والتابعین

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ۝

استاذ مسعود عالم ندوی مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۳ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوئی تھی، اُس وقت میں ہندوستان آیا ہُوا تھا۔ ندوۃ العلماء وہ بابرکت ادارہ ہے جس نے عربی زبان کے ماہرین اور اسلام کے سچے خادموں کی ایک کثیر تعداد دنیا میں پیش کی۔ یہی وہ برگزیدہ علماء تھے جنہوں نے ہر قیمت پر علم کے علَم کو ہمیشہ بلند رکھا اور ہندوستان و دیگر ممالک بالخصوص ممالک اسلامیہ میں عربی زبان کی نشر و اشاعت کا کام اپنے سر لیا۔ میں نے مرحوم کو جواں عمری ہی میں اسلام کی خدمت اور اعلائے کلمۃ الحق کے جذبہ سے بھرپور پایا۔ کچھ عرصہ بعد موصوف میدانِ عمل میں کود پڑے اور اس کے بعد اپنے قلم، زبان اور تحریر سے دعوتِ اسلامی کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے، راولپنڈی وغیرہ میں دار العروبۃ للدعوۃ الاسلامیہ قائم کر کے ٹھوس کام شروع کیا اور وہاں سے عربی کے رسالے اور کتابیں چھپوا کر پاکستان بلادِ عرب اور ممالک اسلامیہ میں پھیلاتے رہے۔ اب یہ ادارہ پنجاب کے دار الحکومت لاہور کو منتقل ہو گیا ہے۔ لاہور ہی وہ شہر ہے جس نے علامہ اقبال جیسے مفکر کو پروان چڑھا کر عالم اسلامی پر بڑا احسان کیا ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اکثر مجھے خط لکھا کرتے تھے کبھی مسلمانوں کے اہم مسائل پر اپنا ہمدردانہ نقطۂ نگاہ واضح کرتے اور کبھی کسی اور موضوع پر۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اُن کا دم غنیمت تھا۔ کیوں کہ اسلامی غیرت و حمیت، عربی زبان کے عشق کے ساتھ ساتھ موصوف بہترین مضمون نگار تھے اور عربی تحریر میں ایک خاص ملکہ رکھتے تھے۔ اللہ کی راہ میں کما حقہٗ جہاد کرتے کرتے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ابھی چالیس پنتالیس سال کی عمر تھی اور وہ اپنی علمی پختگی کو پہنچ چکے تھے، کہ اللہ کی رحمت نے اپنے دامن میں چھپا لیا۔ ہمیں ان سے ابھی بہت کچھ توقعات تھیں۔ اس کی حکمت، اُس کی مشیت کون جانتے؟ انسانی عقل و ادراک سے بالا ہے۔ اور ہر ایک جاندار کا وقت معین ہے جسے کون ٹال سکتا ہے!

(وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ)[1]

ہم بلکہ دست بدعا ہیں کہ اللہ رب العزت مرحوم کو غریق رحمت فرمائے، عالمِ باعمل کا پورا پورا اجر عطا کرے اور صالحین کی جماعت

---

[1] اور اس سے زیادہ اچھی بات کہنے والا کون ہوگا جس نے اللہ کی طرف لوگوں کو بلایا، اعمال صالحہ کئے اور کہا کہ "میں اسلام لانے والوں میں ہوں"؟

میں شامل کرے (مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ)[1]

اللھم اجعلنا من الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ ۔ اولٰئک الذین ھدا ھم اللہ واُولٰئک ھم اولوا الالباب

وَلاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ۔ وھو حسبنا و نعم الوکیل ۔

---

[1] مرد یا عورت میں سے جو عمل صالح کرے گا جب کہ وہ ایمان لاچکا ہو تو ہم اُسے حیاۃ طیبہ ضرور فرمائیں گے ۔ اور اس کے اُن نیک اعمال کا (جن پر وہ کاربند رہا) پورا پورا بدلہ دیں گے ۔

بقیہ: سوچ بچار صفحہ ۱

شامل نہیں کئے جا سکے ہیں ان مضمون نگاروں سے انتہائی شرمندگی ہے ۔

ایک اہم مقالہ "مورخ کی حیثیت سے" ہمیں آخری وقت تک موصول نہیں ہو سکا جس کا ہمیں افسوس ہے ۔

بہرحال جو کچھ ہم پہنچ سکے ہے، ہمیں توقع ہے کہ اسے قارئین پسندیدگی اور قبولیت کی نگاہ سے دیکھیں گے ۔

●

اے برزخ کی پرسکون فضاؤں میں پرواز کرنے والی روح آشنا ! تیری جدائی کا صدمہ سہنے والے رفیق تیری زندگی سے عزیمت کا درس لے کے دشوار گزار گھاٹیوں میں برابر گامزن ہیں ——— جہاں اندھیرے ہیں، جہاں کانٹے ہیں، جہاں ٹھوکریں ہیں، جہاں اپنوں کی گالیاں ہیں، جہاں غیروں کے کوسنے ہیں، جہاں زنجیریں اور بیڑیاں ہیں۔ جہاں عدالتوں کے کٹہرے ہیں۔ جہاں جیل کی سلاخیں اور پھانسیوں کے تختے ہیں۔ جہاں رہزنوں کے غول منڈلا رہے ہیں۔ جہاں سازشوں کے دام بچھے ہیں۔ جہاں شکاری گھات میں بیٹھے ہیں۔ جہاں اسلام کا مذاق اڑتا ہے، جہاں قرآن کی توہین ہوتی ہے۔ جہاں رسولؐ کے نام سے دل لگی کی جاتی ہے۔

خدا تجھ پر اپنی خاص نوازش فرمائے ! خدا تیری قبر کو ٹھنڈا رکھے! خدا تجھے اپنی رضا کی جنت ابدی میں جگہ دے!!

نوٹ:۔

انفرادی خریداروں کے لئے یہ اشاعت خاص
چار شماروں کے عوض شمار کی جائے گی !

مسعودُ الندویؒ

ڈاکٹر محمد تقی الدین الہلالی
(بغداد)

۱۳۴۹ھ (۱۹۳۱ء) کا واقعہ ہے کہ مجھے لکھنؤ کے دارالعلوم ندوہ میں عربی ادب کی تعلیم دینے کے لئے دعوت دی گئی۔ مجھے یہ دعوت علامہ
ید سلیمان ندوی مرحوم نے دی تھی۔ جب میں ندوہ پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ وہاں کے طلبہ اگرچہ عربی ادب کے ازحد شوقین اور اسے سیکھنے کے
ئے انتہائی محنت کرنے والے تھے، لیکن ہندوستان میں قرآن کی زبان پڑھانے کا جو طریقہ اس وقت رائج تھا — بلکہ بدقسمتی سے اب تک رائج ہے
وہ بالکل بے کار اور طلبہ کو عربی ادب کے ذوق سے دور ہی رکھنے والا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج کو اس قدر بادلوں نے ڈھانپ لیا ہے
اس کا چہرہ اہلِ زمین کے لئے نظر آنا ناممکن ہو گیا ہے۔ مجھے عربی زبان کی یہ مظلومیت دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ میں نے پہلے ہی دن سے اپنے
یقہ کے مطابق عربی پڑھانا شروع کی۔ میں پڑھاتے وقت کسی کتاب کا اردو میں ترجمہ نہ کرتا تھا بلکہ پڑھاتے وقت شروع سے آخر تک عربی
ے علاوہ دوسری کوئی زبان استعمال نہ کرتا تھا۔ ان طلبہ میں ایک طالب علم مسعود عالم کو میرا یہ طریقہ تعلیم بے حد پسند آیا۔ طلبہ کی عادت عموماً یہ ہوتی
ہے کہ وہ جماعت میں اپنا سبق پڑھنے کے بعد نہ صرف محنت نہیں کرتے بلکہ اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے، لیکن مسعود عالم اکثر اوقات میرے
تھ ہی رہتے۔ جب موقع ملتا، میرے ہاں آ موجود ہوتے۔ کبھی کسی موضوع کے متعلق سوالات کر رہے ہیں اور کبھی کسی موضوع کے متعلق۔ عربی
بولنے کی مشق کے خیال سے مختلف مسائل پر مجھ سے بحث بھی کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد وہ اپنے مقصد
ں بڑی حد تک کامیاب نظر آنے لگے اور ان میں عربی ادب کا نہایت اعلیٰ ذوق پیدا ہو گیا۔

اس کے بعد علامہ سید سلیمان ندویؒ کی رائے ہوئی کہ دارالعلوم ندوہ سے ایک عربی ماہنامہ جاری کیا جائے جس کے ذریعے خود
رالعلوم کے طلبہ بھی عربی انشاء کی مشق کر سکیں اور اس ملک کے دوسرے مدارس کے طلبہ میں بھی عربی ادب کا ذوق پیدا کیا جا سکے۔ چنانچہ
وں نے یہ ذمہ داری میرے سپرد کی۔ کسی عربی رسالہ کا جاری کرنا اور اس میں طلبہ کا لکھنا ہندوستان کے عربی مدارس کے نزدیک ایک "بدعت"
ے کم نہ تھا، اور یہ اندازہ کرنا بڑا مشکل تھا کہ ہم اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکیں گے، لیکن میں نے سید صاحبؒ
اس تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا اور تمام رکاوٹوں اور مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ ندوہ کے طلبہ میں نظر
ڑائی کہ ان میں سب سے زیادہ میرے کام کا کون ہے اور مجھے سب سے زیادہ امداد کس سے مل سکتی ہے؟ لیکن مجھے مسعود عالم سے بڑھ کر
س کام کے لئے موزوں کوئی طالب علم نظر نہ آیا۔ رسالہ کی ادارت ان ہی کے سپرد کی گئی اور میں اس کا نگران مقرر ہوا۔ اس زمانہ
مسعود عالم صاحب کی ذہانت کے جوہر کھلے۔ دو سال تک رسالہ میری نگرانی میں چلتا رہا، لیکن اس کے بعد کچھ میری صحت کی خرابی اور کچھ
دوسرے حالات نے مجھے ہندوستان چھوڑ کر عراق واپس آ جانے پر مجبور کر دیا۔ میں رسالہ پوری طرح مسعود عالم صاحب ہی کے
الے کر کے عراق چلا آیا۔ اس کے بعد دو سال تک رسالہ پوری شان سے جاری رہا اور اس کی فصاحت و بلاغت، حسنِ ترتیب اور دوسری
بیوں میں ذرا کمی نہ آئی۔ یہ رسالہ عربی کے تمام رسائل و اخبارات کے نزدیک حد درجہ مقبول ہوا۔ اکثر پرچے اس کے مضامین اپنے

صفحات میں نقل کرنے لگے۔ جس سے تمام عربی ممالک میں مسعود عالم صاحب کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اور عالم اسلامی کے تمام ادبا اور علماء ان کے علم و ادب کا اعتراف کرنے لگے۔ یہ وہ چیز ہے جو ہندوستان بھر کے کسی دوسرے ادیب اور عالم کو اس عمر میں نصیب نہیں ہوئی۔

اس کے بعد میرا جرمنی جانا ہوا۔ لیکن مسعود عالم صاحب نے خط و کتابت کے ذریعے مجھ سے برابر اپنا تعلق قائم رکھا۔ دوسری جنگ عظیم میں ہماری خط و کتابت بند ہو گئی۔ خط و کتابت تو بند ہو گئی لیکن دلی محبت اور دلی تعلق کسی مرحلہ کم نہ ہوا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد مسعود عالم صاحب کو کسی عربی رسالہ کے ذریعے ایک دن یہ معلوم ہو گیا کہ میں بچتا بچاتا بالآخر بصحیح سالم تطوان (مراکش) پہنچ گیا ہوں۔ فوراً میرے پاس ان کا خط پہنچا، جو شروع سے آخر محبت و اخلاص میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں "کہ جب میں نے آپ کے تطوان میں موجود ہونے کی خبر الفتح میں پڑھی، تو خوشی کے مارے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور میں فوراً سجدہ شکر میں گر پڑا"۔

اس کے بعد پھر خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ١٣٦٦ھ میں جب میں کوشش کر کے عراق واپس پہنچا، تو مسعود صاحب نے مولانا مودودی کے جن رسالوں کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، ان کا ایک ایک نسخہ مجھے روانہ کیا۔ میں نے ان رسالوں کی زبان دیکھی تو نہایت شستہ اور ہر قسم کی کمزوریوں اور غلطیوں سے صاف تھی۔ مادی اور روحانی استعمار کے اس زمانے میں عرب مصنفین اور ادبا کے قلموں پر جو غلط ترکیبیں رائج ہو گئی ہیں، ان رسالوں کی زبان ان سے پاک تھی۔ لیکن اس کے باوجود مسعود صاحب یہ سمجھتے تھے کہ ابھی ان کی انشا پختہ نہیں ہوئی اور ان رسالوں کی زبان میں ضرور غلطیاں موجود ہیں، چنانچہ میرے پاس بغداد آنے کے لئے وہ بے تاب رہنے لگے تاکہ ان رسالوں میں جہاں جہاں انہیں شک ہو، میں ان کی اصلاح کروں اور ان کی زبان کو زیادہ سے زیادہ صحیح معیار پر لاؤں۔ انہوں نے جب مجھے اپنے اس خیال کی اطلاع دی، تو میں نے انہیں خوش آمدید کہا، چنانچہ اپریل ۴۹ء کو وہ اپنے جانشین محمد عاصم کے ساتھ عرب ممالک کی سیاحت کے لئے کراچی سے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے میرے پاس بغداد آئے۔ تین ماہ تک بغداد میں ان کا قیام رہا۔ عصر سے مغرب تک ہم تقریباً ہر روز اپنی ایک نشست رکھتے، بعض اوقات یہ نشست عشاء تک بلکہ اس سے بھی بعد تک لمبی ہو جاتی۔ اپنے ساتھی محمد عاصم کی مدد سے مسعود صاحب نے اپنے عربی رسالے مجھے پڑھ کر سنائے، میں جہاں جہاں غلطیوں یا کمزوریوں کی نشان دہی کرتا، پہلے وہ مجھ سے ان کے متعلق تبادلۂ خیال کرتے اور پھر جب ہم کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے، تو وہ اسے وہیں نوٹ کر لیتے۔

اس کے بعد ان دونوں مہمانوں نے بلادِ مقدسہ کا رخ کیا اور حج و زیارت سے شرفیاب ہو کر اپنے وطن لوٹ گئے۔ اس لمبے سفر کی انہوں نے ایک روداد بھی لکھی جو بعد میں کتابی شکل میں شائع بھی ہوئی۔ غالباً یہ ۴۹ء کا واقعہ ہے۔ پھر اس سے اگلے سال میں پاکستان گیا اور ان کے پاس دارالعروبہ میں قیام کیا، جب کہ دارالعروبہ راولپنڈی میں تھا۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے میں مری چلا گیا لیکن کبھی کبھی مسعود صاحب کے پاس راولپنڈی برابر آتا رہا۔ مسعود صاحب نے میری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس کے بعد جب میں عراق واپس آ گیا، تو ہمارے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے رب کی پکار کو لبیک کہہ دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے ڈھانکے اور اپنے نیک بندوں کے ساتھ جنت میں داخل کرے۔ جوانمردی، ہمت اور صبر و استقامت میں مسعود صاحب ایک بے نظیر شخصیت کے مالک تھے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے۔ انہ غفور رحیم ؕ

(مترجمہ: محمد عاصم)

ترجمہ

داعیِ حق ۔ جو ہم سے جدا ہو گیا

محمد محمود الصواف
ایڈیٹر الاخوت الاسلامیہ بغداد

اللہ تعالےٰ مولانا مسعود عالم ندوی کو جوارِ رحمت اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور اُن کی قبر پہ بارانِ رحمت برسائے، دعوتِ اسلامی کی جدوجہد میں اُن کا جو گرانقدر حصّہ ہے اس کا پورا پورا اجر عطا کرے۔

موصوف عالم باعمل اور داعیِ مخلص تھے۔ سچے دل سے میدانِ عمل میں کود جانے والے سپاہی، محبت و شفقت سے بھرپور دل رکھنے والے دوست اور اہم پیچیدہ مسائل میں بہترین مشیر تھے۔ معمولی احسان کا بدلہ بھی احسان سے چکاتے تھے۔ میرا اُن سے تعارف اس وقت ہوا جب وہ ممالکِ عرب کے دورے پر بغداد تشریف لائے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کیونکہ ان سے مل کر میں ایسا محسوس کرتا تھا۔ میں ایک مجسم فضل و تقویٰ، علم و عمل اور صاحبِ فکر و نظر سے شرفِ ملاقات حاصل کر رہا ہوں۔ اور ان کے ادب و تدین، فراستِ ایمانی اور دقتِ نظر کا سکہ میرے دل میں بیٹھتا جا رہا ہے۔

پھر ہمیں مختلف مواقع پر تبادلۂ خیالات کا موقعہ ملا۔ مسلمانوں کے موجودہ مصائب، مغربی حکمرانوں کی سامراجی چالیں، ان کی ریشہ دوانیاں اور دوسرے مختلف مسائل زیرِ گفتگو رہتے۔ گفتگو کے وقت مولانا میں دینی تڑپ اور سچا جذبہ محسوس ہوتا تھا۔ یہاں کے مسلمانوں کے مصائب پر خون کے آنسو روتے رہے۔

اللہ نے قرآن عربی میں نازل فرمایا۔ اس زبان سے انہیں خاص شغف تھا، اس سے انہیں اس حد تک اُنسیت تھی کہ اللہ نے انہیں عربی کے مضمون نگاروں کی صفِ اول میں شامل کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ آپ اس زبان کی خدمت میں ہمیشہ اپنے ہمعصروں میں سب سے پیش پیش رہے۔ بیشتر سال پیشتر عربی کا ایک رسالہ "الضیاء" ہندوستان سے نکالا۔ جو چار سال تک جاری رہا۔ اسی رسالہ کی بدولت عرب ممالک کے باشندوں کو معلوم ہوا کہ اسلام کی خدمت کے لئے بالخصوص اور مسلمانانِ عالم کی خدمت کے لئے بالعموم یہ شخص کیا کچھ کرنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ اُن کی طرح اُن کے ساتھی سید علی حسن ندوی کی کوششوں سے بھی لوگ مستفید ہوتے رہے۔ مولانا مرحوم کا عراق میں قیام بہت مختصر رہا۔ لیکن اس قلیل قیام کے باوجود مولانا نے اخوان کے نوجوانوں اور دوسرے اہلِ قلم حضرات کے دل میں خاصا گھر کر دیا۔

وہ مملکتِ پاکستان اور وہاں کے باشندوں کے بالعموم اور وہاں کی تحریکِ اسلامی کے بالخصوص صحیح نمائندہ ترجمان تھے اس لئے کہ ہمیں اُن سے پاکستان کے اور وہاں کی جماعتوں کے وہ حالات معلوم ہوئے جن سے بلادِ عرب بالکل ناواقف تھے۔ گویا انہوں نے ہمیں وہاں کے باشندوں سے قریب تر کر دیا۔ اور پھر۔ انہوں نے پاکستان اور ہندوستان میں تحریکِ اسلامی کی مکمل روداد لکھی۔ جس سے وہاں کے مجاہدین کے مصائب و مشکلات کا صحیح اندازہ ہوا۔ یہاں سے واپسی پر مولانا نے "بلادِ عرب میں چند ماہ" کتاب لکھ کر یہاں کے مسلمانوں کے حالات و کوائف سے، یہاں کی تحریکوں سے، اپنے ملک کے مسلمانوں کو خبر کیا۔ اس طرح یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ انہوں نے تنہا وہ کام کیا جو دونوں ممالک خود نہ کر سکے۔ اللہ تعالےٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اُن کا سب سے بڑا احسان، جسے عرصہ تک اخوان المسلمون کے نوجوان بالخصوص اور ملّتِ اسلامیہ کے دوسرے بالعموم نہیں بھلا سکتے،

یہ ہے کہ انھوں نے جماعتِ اسلامی پاکستان کے امیر علامہ سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تصنیفات کے عربی تراجم کا سلسلہ شروع کرکے ہمیں اُن کے علم سے مستفید ہونے کا موقعہ دیا۔ اللہ تعالےٰ اس سلسلہ کو قائم رکھے اور مولانا مودودی کے علم و فضل سے مسلمانوں کو بہرہ ور ہونے کا موقعہ دے۔

ہمارے لئے مولانا کی یہ کتابیں ایک نادر عطیہ ہیں جنہیں اخوان نے اپنی اہم کتابوں میں شمار کرتے ہیں اور ہمارے نوجوان انہیں سبقاً سبقاً پڑھتے، یاد کرتے اور اس طرح قدر و منزلت کی میزان میں گرانقدر بنائے رکھتے ہیں۔ گویا کہ یہ قیمتی موتی ہیں جنہیں مولانا مودودی نے (خدا ان کی زندگی میں برکت فرمائے اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ اُن کے علم سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دے) مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی وساطت سے عرب دنیا کو ہدیۃً کیا ہے۔

ہماری ہمیشہ یہی آرزو رہے گی کہ مولانا مرحوم کے ذریعے جو تراجم ہمیں وصول ہو رہے تھے اب بھی ہمیں اُن کے جانشینوں سے اسی طرح برابر ملتے رہیں ہماری تمنا ہے کہ ان کے نوجوان شاگرد اور مخلص کارکن، برادر عزیز محمد عاصم الحداد سلمۂ اس نیک کام کو جاری رکھیں اور ہمیں اس چشمۂ علم و معرفت سے سیراب ہونے کا موقعہ ملتا رہے۔

اللہ نے اُن کو ہم سے ایسے وقت میں جدا کیا جب کہ ہمیں ان کی شدت سے ضرورت تھی، لیکن اللہ کے فیصلہ کے آگے کوئی پر نہیں مار سکتا وہی ہمارا مالک اور آقا ہے، جب تک چاہے کسی کو زندہ رکھے اور جب چاہے واپس بلالے۔ وہی ہمارا حامی و ناصر ہے، اسی پر ہمارا بھروسہ ہے اور ایک دن ہمیں اُسی کے پاس لوٹ کے جانا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ مرحوم کو جوار رحمت عطا فرمائے آمین۔

(ترجمہ عبد الخالق)

بقیہ:- کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں صفہ ۱۹

جو شخص مرحوم کی تحریروں کو پڑھے گا، اسے معلوم ہوگا کہ ان کے ایمان میں کس قدر قوت تھی اور ان کا ادب کس قدر بلند اور شستہ تھا۔ ان کی تحریر ایک فنی انداز میں تہذیب و ادب کی تحریر تھی، جس سے ان کے گہرے مطالعہ، باریک بینی، دینی تڑپ، رقتِ قلب اور زندگی و جدان کا اندازہ ہوتا ہے۔

میری خواہش تھی کہ میں مرحوم کے متعلق پوری تفصیل سے لکھتا اور ان کی تمام خوبیوں اور کمالات کو ظاہر کرتا، مگر وقت کی تنگی نے اجازت نہیں دی مجبوراً ان چند سطروں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ہمارے ان ایسے صاحب علم اور جذبہ رکھنے والے علما پائے گئے، اس پر ہمیں فخر ہے کیوں کہ اسلام اور عربیت کو ہمیشہ اس قسم کے بہترین داعیِ حق لوگوں پر فخر رہا ہے۔

يفخر الدهر بالقليل من الناس — مثلما تفخر البحور بدر
ومن الدر عالم يشبه الشمس — مثلما النور في الظلام بشر
ذاك (مسعودنا) الفقيد فحيا — ه الله يجزي الجميل باجر

(ترجمہ: کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن پر زمانہ کو فخر ہوتا ہے جیسا کہ سمندر اپنے موتیوں پر فخر کرتے ہیں۔ موتی میں سے وہ عالم ہوتا ہے جو سورج کے مشابہ ہوتا ہے اور اندھیرے میں روشنی کوئی بعید نہیں۔ یہ ہمارے "مسعود" ہیں، اللہ جو ہر احسان کا بدلہ دیتا ہے۔ آپ کو زندگی عطا فرمائے)

کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں !

استاذ احمد مظہر العظمہ
(ایڈیٹر "التمدن الاسلامی" دمشق)

اسلام ایک انسان میں کس قدر عظیم الشان انقلاب برپا کرتا اور اللہ کے لئے کام کرنے کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں دور کر دیتا ہے۔ اس کی مثال اس زمانے میں ہمارے سامنے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم تھے۔ جنہیں اسلام اور عربیت سے اس قدر محبت تھی کہ عجمی ہونے کے باوجود عربی کے چند نمایاں علمبرداروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ۱۳۵۱ھ میں انہوں نے لکھنؤ سے ایک عربی ماہنامہ "الضیاء" جاری فرمایا۔ چار سال تک یہ رسالہ عربی زبان کی خدمت کرتا رہا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد مسعود صاحب نے دار العروبہ کی بنیاد رکھی۔ کہاں؟ مکہ معظمہ میں نہیں، دمشق میں نہیں، بغداد میں نہیں، قاہرہ میں نہیں..... بلکہ راولپنڈی میں۔ پھر اس ادارے نے حق کی آواز کو دنیا میں پھیلانا شروع کیا۔ یہ اس جماعت اسلامی کا عربی شعبہ ہے جس کے مؤسس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (اللہ ان کی عمر دراز فرمائے اور جلد سے جلد ان کی رہائی عمل میں آئے) ہیں۔ اس جماعت والوں نے لوگوں کو یہ بتانا شروع کیا کہ ان کی زندگیوں میں کیا چیز خراب ہے جسے چھوڑنا چاہئے۔ اور کیا چیز اچھی ہے کہ اسے اختیار کرنا چاہیے، اور یہ کہ اس زمانہ میں اصل کام اسلام کو زندہ کرنا اور دنیا پر اسے اپنی صحیح شکل میں پیش کرنا ہے۔ اسلام کی زندگی کے بغیر انسانیت کی زندگی قطعی بے کار اور بے معنی ہے۔ اللہ کی طرف دعوت دینے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے مسعود صاحب نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی سچ مچ اسلام کا یہ ایک کرشمہ تھا۔ اپنی کتاب "نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ" میں لکھتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری اور اس کے بعد جو مسلمان بادشاہ ہندوستان میں داخل ہوئے، انہوں نے اسلام کو پھیلانے اور اس کی دعوت سے دنیا کو روشناس کرنے کی ذرہ برابر فکر نہیں کی۔ اور یہ کہ اگر ان لوگوں کو اسلام کی دعوت اور حق کی آواز کو پھیلانے کا ذرا بھی خیال ہوتا اور اس راہ میں انہوں نے اس کوشش کا دسواں حصہ بھی صرف کیا ہوتا، جو انہوں نے اپنی شاندار عمارتیں اور مقبرے تعمیر کرنے میں صرف کیں، تو آج ہندوستان کی سرزمین کا رنگ اور ہی ہوتا اور پورا ملک کفر کی آلائشوں سے پاک ہو چکا ہوتا ——— اس کے بعد دوسری جگہ وہ نہایت درد اور حسرت سے لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی سرزمین ان عرب فاتحین کے مبارک قدموں سے محروم رہی، جو براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب اور آپ کے صحابہ کرام کے علوم سے مستفید تھے، جو جس ملک میں گئے، اسے اسلام اور عربیت کے رنگ میں رنگ کے رکھ دیا ——— اس کے بعد وہ لکھتے ہیں، افسوس ہمارے حصے میں مغل اور ترک قسم کے وہ لوگ آئے جو یہاں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے اور انہیں اسلام کے اصولوں اور اس کے اجتماعی قانون کا سرے سے کوئی علم نہ تھا۔"

یہ تھا مرحوم کا عربیت (ایمان و اسلام کی حدود میں) سے تعلق۔ اس کی مثال قرآن کی ایک آیت میں یوں بیان کی گئی ہے "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ دنیا بھر کا مال و متاع بھی صرف کر دیتے، تو ان لوگوں کے دلوں میں محبت و الفت نہ ڈال سکتے تھے لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں محبت و الفت پیدا کر دی"۔
آپ کو عربی زبان سے محبت بلکہ عشق تھا اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ عربوں کی زبان ہے، جو جزیرۃ العرب سے اٹھی ہے، بلکہ یہ محبت و عشق صرف اس لئے تھا کہ یہ وحی الٰہی اور دین خداوندی کی زبان ہے۔ اس لئے کہ یہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے۔ اس کے بغیر دنیا بھر کے مسلمان مل کر بھائیوں کی طرح کبھی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا مرحوم کا "عربیت" سے ان کا تعلق کوئی قومی یا لسانی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مادہ کا جوہر سے جسم کا روح سے اور زندگی کا اپنی صحیح اور بلند قدروں سے تعلق تھا

(باقی بر صفحہ ۶۹)

اللہ کے حوالے

طٰہٰ فیاض
ایڈیٹر جریدۃ التآخی بغداد

کراچی سے آنے والے ایک تار سے اطلاع ملی ہے کہ ۱۶، مارچ ۱۹۵۴ء کی شام علامہ سید مسعود عالم ندوی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم کی عمر ابھی زیادہ نہ تھی۔ لیکن یہ عمر بھی تصنیف و تالیف اور قلمی جہاد میں بسر ہوئی۔ مرحوم ایک جرأت مند اور باحوصلہ شخصیت کے مالک تھے۔ عربی اور اردو دونوں زبانوں کے ذریعے ایک ساتھ اسلام کی دعوت کو پھیلاتے رہے۔ آپ کا تعلق پاکستان کی جماعت اسلامی سے تھا۔ حال ہی میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے ساتھ قید و بند کے مرحلہ سے بھی گزرے۔ مرحوم اپنا تمام وقت علامہ مودودی کی تصنیفات کا عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے صرف کرتے تھے۔ عربی زبان میں آپ کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی عربی تحریر سے یہ ہرگز معلوم نہ ہوتا تھا کہ ان کی مادری زبان عربی کے علاوہ کوئی دوسری ہے۔

ابھی کچھ ہی مدت ہوئی کہ مرحوم کا ہمارے پاس ایک خط آیا تھا، جس میں انھوں نے ہم سے یہ دریافت کیا تھا کہ آیا روزنامہ "السجل" کے دفتر کے قریب ہی انہیں کرایہ پر کوئی کمرہ رہائش کے لئے مل سکتا ہے کہ نہیں؟ چند سال ہوئے پہلے بھی ایک مرتبہ بغداد تشریف لا چکے ہیں۔ اس وقت انھوں نے "السجل" میں اپنے مضامین کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ آپ علامہ ڈاکٹر ہلالی کے شاگردوں میں سے تھے۔

تار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام عربی ممالک کے سفراء نے آپ کے جنازے میں شرکت کی۔ آپ کی وفات کا سبب دمہ کا مرض تھا جس میں مرحوم ایک زمانہ سے مبتلا تھے۔

اس عظیم الشان اور جاں گداز حادثہ پر ہم پاکستانی قوم سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم پوری مسلمان قوم سے بھی دلی ہمدردی کا اظہار کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیوں کہ آج دعوت اسلامی کا ایک اہم رکن اس کے ہاتھ سے چھن گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی کوششوں کو قبول فرمائے اور اپنے نیک بندوں کے ساتھ جنت میں داخل فرمائے۔

"خیال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے"

(مرحوم کی ذاتی ڈائری کے سرورق سے ماخوذ
بزمانہ اسیری (۱۹۵۳) بیں زیر استقبال ہوا)

دن ــ جو گزر گئے!

مولانا محمد ناظم ندوی
پرنسپل جامعہ عباسیہ - بہاولپور

وربّ کئیب لیس تندی جفونہ　　　وربّ کثیر الدمع غیر کئیب

کچھ غمگین ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اشک آلود بھی نہیں ہوتیں اور بعض اشک فشانی کرنے والے مغموم نہیں ہوتے۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

۱۷ مارچ ۹۴ کی سوگوار صبح مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ جب کہ میں جامعہ عباسیہ کے کتب خانہ میں مطالعہ کر رہا تھا کہ دفعتاً برادر عزیز سید کاظم شاہ صاحب سباق نے حزین و مغموم چہرہ کے ساتھ مسعود صاحب کی موت کی خبر سنائی، ایک ہمدم دیرینہ کی موت کی خبر سن کر دل دھک سے رہ گیا آنکھیں نم ہو گئیں اور زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہو گیا۔ سانحۂ موت کی خبر عموماً تکلیف دہ ہوتی ہے مگر مسعود عالم صاحب جیسے رفیق و دوست کی موت کی خبر مدیرِ حجاز کا مقتی دل کو شدید دھکا لگا گھر جا کر اہل خانہ کو اطلاع دی سب ہی بے چین ہو گئے۔ مسعود صاحب ان لوگوں میں تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کے لئے وقف کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں موت اور غربت و مسافرت کی موت، پاس نہ کوئی قریبی رشتہ دار نہ کوئی عزیز غم گسار، مقصد میں منفق اور راہ اسلام کے ایک رفیق سفر کے ہاں مقیم تھے کہ موت جو ہمیشہ بلا اطلاع آتی ہے دفعتاً آ گئی۔ مسعود عالم صاحب مرحوم کی موت پر دس ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے مگر ان کی یاد اس طرح تازہ ہے کہ وہ دنیا سے ابھی رخصت نہیں ہوئے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

موت سے ۱۵ روز قبل چند بہاولپوری احباب کے ساتھ ملاقات ہو چکی تھی وہ غیر معمولی ہشاش بشاش تھے اور خلاف معمول تنہا سفر کر رہے تھے مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ٹرین کی یہ مختصر ملاقات جو بہاولپور کے اسٹیشن سے سمہ سٹہ تک قائم رہی یہ آخری ملاقات ہے اور ربع صدی سے زیادہ عرصہ کی دوستی و تعلقات کا یہ آخری نقطۂ اتصال ہے۔ وہ میرے ہمدم دیرینہ محب مخلص ہم وطن اور وفادار دوست تھے وہ عزیزوں سے بڑھ کر عزیز اور مخلصوں سے بڑھ کر مخلص تھے۔ کبھی مہینوں مراسلت کی نوبت نہیں آتی اور کبھی دو دو سال تک ملاقات نہیں ہوتی مگر جب ملاقات ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی اجنبیت نہیں پیدا ہوئی وہی مزاج وہی شگفتگی آنکھوں سے وہی ذکاوت صدق و صفا کی چمک ہویدا۔ گھنٹوں ملاقات کے بعد بھی مجلس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہر موضوع پر گفتگو ہوتی علم، دین اور سیاست سے لے کر نجی اور شخصی معاملات پر باتیں ہوتیں اور وہ یکساں دلچسپی سے سنتے اور گفتگو کرتے۔

مسعود صاحب کی موت سے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر ہند و پاک سے نہ صرف عربی زبان کا ایک ادیب و انشا پرداز اٹھ گیا بلکہ دین کی سربلندی کے لئے جد و جہد کرنے والوں میں سے ایک مرد مجاہد کی کمی ہو گئی۔ تاریخ اسلام کا ایک دیدہ ور مورخ رخصت ہو گیا، علمار ندوہ میں سے ایک بلند پایہ عالم و محقق ہم سے جدا ہو گیا اور ندویوں کی محفل علم کی ایک شمع فروزاں گل ہو گئی۔ چمن ندوہ کا ایک عندلیب ہزار

واستان پرواز کر گیا۔ ۲۶ء کے بعد ندوہ کے متخرجین میں مسعود عالم صاحب مرحوم کا مرتبہ بہت بلند تھا وہ اس دور کے گل سرسبد تھے، عربی انشا پردازی میں خصوصیت کے ساتھ انہیں بڑی مہارت حاصل تھی بقول استاذی علامہ سید سلیمان ندوی وہ ہندوستان کے شکیب ارسلان تھے عربی میں صدیق محترم مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کو مستثنیٰ کرکے میرے نزدیک برصغیر ہندوپاک میں ان جیسا کوئی دوسرا انشا پرداز نہیں ہے زبان و لغت پر ان کی نظر بڑی وسیع تھی عربی اسلوب نگارش کے نقاد اور جدید و قدیم زبان کے واقف، علوم دینیہ کے ساتھ علوم عصریہ خصوصاً سیاسیات اور اقتصادیات کا براہ راست انگریزی سے مطالعہ کرنے کی وجہ سے ندوۃ العلماء کے تخیل کے صحیح علمبردار تھے ان کی ذات جدید و قدیم کا بہترین سنگم تھی، وہ اپنی صورت شکل اور ہیئت و لباس سے عالم دین، اپنے مذاق علمی اور تحقیق و جستجو کے فطری ذوق کی بدولت ایک مستشرق اور تواضع و انکسار کی وجہ سے ایک صوفی باصفا معلوم ہوتے تھے، وہ عقائد میں ٹھیٹھ ملا، لیکن فروع میں وسیع المشرب و وسیع القلب اور متاخرین فقہا کی تنگ نظری و تشدد سے بہت دور، سنت نبوی کے متبع اور علماء مجاہدین کے عاشق و شیدائی تھے، ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا جن میں علماء، پروفیسر دفتر کے ملازمین، سیکنڈری مدارس کے مدرسین اور گریجویٹ حضرات سے لے کر معمولی لکھے پڑھے لوگ شامل تھے،

مرحوم سے میری پہلی ملاقات غالباً ۲۶ء یا ۲۷ء میں ہوئی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب میں اور وہ مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں پڑھتے تھے، میں ان سے جونیئر تھا وہ غالباً درجۂ عالم میں تھے، مگر ہم سن ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت جلد مانوس ہوگئے یہ انس رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور آخر میں دوستی و مودت سے بدل گیا -

جمعہ کا دن عربی مدرسوں میں تعطیل کا دن ہوتا ہے اس دن مدرسہ کے طلباء بہار شریف کی پہاڑی پر سیر و تفریح کرنے جاتے تھے یہ پہاڑی شہر کے مغرب میں واقع ہے کوئی زیادہ اونچی نہیں ہے نہ زیادہ لمبی ہے اس پر فاتح بہار اور دوسرے غازیوں کی قبریں ہیں ان قبروں پر ایک عظیم الشان قبہ بنا ہوا ہے اس کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان بھی ہے جس میں بہار شریف کے مشہور کھلاڑی سالانہ میلوں کے موقع پر کبڈی کھیلا کرتے تھے اس پہاڑی کے عقبی حصہ میں ایک غار نما پر فضا مقام ہے یہاں سے پہاڑی کے عقب میں آم و جامن کے گھنے سرسبز درختوں کا دلکش منظر نظر آتا ہے اس غار نما مقام تک اس زمانہ میں کوئی راستہ نہیں تھا بڑی دشوار گزار ناہموار چٹانوں سے گزر کر وہاں کوئی شخص پہنچ سکتا تھا۔ رفیق مکرم حکیم سید غلام مصطفےٰ صاحب ہیبت پوری مسعود عالم صاحب مرحوم اور میں دوسرے طلباء کے ساتھ اسی غار نما مقام سے ہوتے ہوئے پہاڑی کے عقب میں اترا کرتے تھے کبھی کبھی تھوڑی دیر تک اسی غار نما مقام میں دم لینے کے لئے بیٹھ جاتے کیسے بہار کے دن تھے اس زمانہ میں خطرات میں پڑنے ہی میں لطف آتا تھا، پہاڑی کے سامنے کا حصہ ڈھلوان اور اس پر چڑھنا آسان ہے مگر عقبی حصہ ڈھلوان نہیں ہے بلکہ بالکل سیدھا الف مستقیم کی طرح ہے اس طرف سے اترنا بڑا مشکل کام تھا کبھی کبھی جان جانے کا خطرہ ہو جاتا تھا مگر ہم لوگ اس مہم کو سر کرنے میں لطف محسوس کرتے تھے ناہموار چٹانوں اور دروں سے گزرنا پڑتا کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ اترنے میں ایک کو دوسرے کی خبر نہیں ہوتی اور ٹولی کے افراد ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے اور ہر شخص کوشش کرتا کہ وہ زمین پر پہلے اتر کر اپنی قوت و چستی کا اعلان کرے۔ مسعود صاحب مرحوم کی دوستی کا آغاز اسی زمانہ سے ہوا۔

مدرسہ عزیزیہ میں ابھی ابھی نئے نصاب کا اجراء ہوا تھا، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے بورڈ سے اس کا امتحان ہوا تھا علماء کا ایک گروہ اس الحاق اور نئے نصاب کا مخالف تھا کیوں کہ علماء دین کے نزدیک مدارس دینیہ کا سرکاری بورڈ سے تعلق پیدا کرنا مستحسن نہ تھا اس الحاق کے برے اثرات تو بعد کو معلوم ہوئے مگر اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ مدرسہ عزیزیہ کے طلباء میں بورڈ کے امتحان کی تیاری اور اچھے نمبروں سے پاس کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا اور ابتداءً چند سال تک مدرسہ عزیزیہ کے طلباء اپنے لائق اساتذہ کی اعلیٰ تعلیم اور ان کی تربیت و شفقت کی وجہ سے شمس الہدیٰ کے امتحانات میں اول دوم آکر تعلیمی وظائف پاتے رہتے، اس سے مدرسہ عزیزیہ کی نیک نامی کو چار چاند لگے۔

در مدرسہ عزیزیہ صوبہ بہار میں ایک ممتاز مقام حاصل ہوگیا مسعود صاحب مرحوم نے بھی عالم کا امتحان دیا اور اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا ہے تو مسعود عالم مرحوم مولوی شفیع صاحب بنولیہ بہار شریف ابو یوسف مرحوم اور مولوی برہان صاحب معلوم نہیں اب یہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں ہیں) وغیرہ نے مدرسہ عزیزیہ میں ایک علمی انجمن قائم کی تھی جس میں ہندوستان کے اخبارات و رسائل کے علاوہ مصر کے اخبارات بھی آتے تھے یہیں مجھے الہلال مصر، المصور، کل شئی وغیرہ اخبارات و رسائل کے مطالعہ کا پہلی مرتبہ موقع ملا، اس زمانہ میں مصر کی ہر چیز اچھی لگتی تھی عربی کا ہر جملہ فصیح اور شیریں معلوم ہوتا تھا۔ سعد زغلول کا نام انہیں مصری اخبارات میں پہلی مرتبہ پڑھا تھا، عربی رسائل و اخبارات پڑھنے کا اور جدید عربی سیکھنے کا شوق انہیں اخبارات سے پیدا ہوا مسعود صاحب اسی زمانہ سے عربی اخبارات بڑے ذوق و شوق سے پڑھنے لگے تھے مسعود صاحب مرحوم کے مشورہ سے میں نے پہلی مرتبہ ایک مضمون کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اور کسی اردو اخبار میں شائع ہوا تھا اور مجھے اس مضمون کے چھپنے سے بے حد مسرت و خوشی ہوئی تھی، شہرت و نمود کی طبعی خواہش کا ظہور تھا۔

۱۹۲۷ء میں مسعود عالم صاحب مرحوم کی علامہ سید سلیمان ندوی سے مراسلت ہوئی سید صاحبؒ کی نگاہ مردم شناس نے مسعود صاحب مرحوم کے جوہر قابل کو پہچان لیا اور انہیں فوراً دار العلوم ندوہ لکھنؤ بلا لیا۔

۱۹۲۸ء میں وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی آخری جماعت ہشتم میں داخل ہوئے غیر معمولی ذہانت محنت اور علمی ذوق کی بدولت سالانہ امتحان میں وہ اول آئے محب مرحوم ابتدا ہی سے احباب سے مراسلت پیدا کرنے اور اسے جاری رکھنے میں لطف محسوس کرتے تھے وہ جہاں بھی ہوتے اپنے احباب کو اس کے ماحول اور نئے احباب اور نئے اشخاص سے مطلع کرتے رہتے چنانچہ وہ لکھنؤ جا کر اپنے قدیم احباب کو نہیں بھولے بلکہ ان ہی کی ترغیب سے میں، ابو یوسف مرحوم اور غالباً مولانا یحییٰ صاحب ندوی اور ان کے برادر خورد مولانا طٰہٰ صاحب۔ آبگلوی اور اصغر صاحب بہاری مرحوم اور دوسرے بہاری طلبا دار العلوم ندوہ میں داخل ہوئے۔ محب مرحوم نے سب سے پہلے استاذی علامہ سید سلیمان ندویؒ سے میرا تعارف کرایا تعارف کی تقریب مجھے اب بھی یاد ہے غالباً جولائی یا اگست ۱۹۲۹ء کا مہینہ تھا سید صاحبؒ کی تشریف آوری کی خبر دار العلوم میں عام تھی ہر ایک کی زبان پر تھا سید صاحب تشریف لے آئے، ابھی سید صاحبؒ نے دار العلوم کی عظیم الشان عمارت کے زینوں کے آخری زینہ پر قدم رکھا ہی تھا کہ اعلیٰ جماعتوں کے طلبا سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوگئے مسعود صاحب مرحوم بھی ملے مجھے پہل کرنے کی جرأت نہیں ہوئی میں ابھی دار العلوم کے ماحول میں بالکل نیا نیا تھا سید صاحبؒ نے آتے ہی دریافت کیا آپ کے وہ دوست کہاں ہیں انہوں نے میری طرف اشارہ کیا میں آگے بڑھا اور مصافحہ کیا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی خوش قسمتی ہے ۱۹۳۱ء میں استاذی علامہ تقی الدین الہلالی استاذ ادب کی حیثیت سے دار العلوم تشریف لائے۔ دار العلوم ندوہ میں حدیث و تفسیر کی محققانہ تعلیم کے ساتھ اب دار العلوم کی فضا صحیح عربیت سے متاثر ہونے لگی، صحیح عربی بولنے اور لکھنے کا ذوق پیدا ہونے لگا استاذ ہلالی کی فصیح گفتگو خود ایک ادبی درس رکھتی تھی۔ مسعود عالم صاحب مرحوم درجۂ تکمیل ادب میں داخل تھے انہوں نے ہلالی صاحب سے بڑا استفادہ کیا جس کمرہ میں ہلالی صاحب مقیم تھے اسی میں مسعود صاحب مرحوم اور میں بھی رہتا تھا اگرچہ اس اقامت کی مدت زیادہ طویل نہیں ہو سکی مگر ہلالی صاحب کی یہ صحبت ادبی ذوق پیدا کرنے میں بہت معاون ثابت ہوئی اور مسعود صاحب مرحوم نے اس سے بڑا فائدہ اٹھایا ہر وقت زبان کی صحت و صفائی کی فکر رہتی اور ہلالی صاحب کی تعلیم اور اصلاح کا کام ہر وقت جاری رہتا۔ اسی زمانہ میں مسعود صاحب مرحوم نے کتاب الاغانی، صبح الاعشیٰ، نہایۃ الارب جیسی ضخیم کتابوں کا باضابطہ مطالعہ کیا۔ دیوان نابغہ سبقاً سبقاً ہلالی صاحب سے پڑھا کرتے اور کبھی کبھی میں بھی اس درس میں شریک ہو جاتا اور ہلالی صاحب کے ایک ایک ادبی فقرہ پر سر دھنتا مجھے اب بھی ہلالی صاحب کے ساختہ ادبی فقرے یاد ہیں۔

دار العلوم ندوۃ کی آخری سند حاصل کرنے کے بعد انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کا امتحان دیا جس میں وہ کامیاب ہوگئے تھے اس کے بعد انہوں نے میٹرک کا امتحان دیا جس میں وہ کامیاب ہوگئے اس کے بعد ایف اے کے امتحان کی تیاری مکمل کر لی تھی جس زمانہ میں وہ ایف اے کی تیاری کر رہے تھے استاذ محترم ماسٹر عبد السمیع صاحب ایم اے استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء کہا کرتے تھے کہ مسعود صاحب کی انگریزی بی اے کے برابر ہے اور ان کے مضامین کا معیار بی اے کے اعلیٰ استعداد کے طالب علم کے مضامین کے برابر ہے وہ چند ماہ کے بعد ایف اے کا امتحان دینے والے تھے اور تیاری مکمل کر لی تھی کہ یکایک ان کے ذہنی نقشہ میں تبدیلی ہونے لگی۔ اور کالج و یونیورسٹی کی اسناد کے متعلق ان کی رائے بدلنے لگی، انہیں اپنے لئے یہ اسناد بیکار معلوم ہونے لگیں چنانچہ وہ چند ہفتے تک ایف اے کا امتحان دینے یا نہ دینے کے بارے میں تذبذب رہے ایک دن انہوں نے معروف طریقہ پر دعاء استخارہ کی، ان کا تذبذب دور ہوگیا اور کالج کی سند حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن انگریزی کتابوں، رسائل اور اخبارات کا وہ باضابطہ مطالعہ کرتے رہے، انہوں نے متعدد بار کہا کہ استخارہ کے بعد الحمد للہ مجھے کامل اطمینان و سکون حاصل ہو گیا ہے اب اس معاملہ میں کوئی خلش اور تذبذب نہیں ہے میں نے جو راہ اختیار کی ہے وہ سوچ سمجھ کر اطمینان قلب کے ساتھ اختیار کی ہے

ایف اے کے امتحان دینے کا ارادہ ترک کرنے کے بعد وہ ہمہ تن ادب عربی اور تاریخ اسلام کے مطالعہ میں مشغول ہوگئے استاذی علامہ سید سلیمان ندوی" اور علامہ تقی الدین ہلالی کی نگرانی و سرپرستی میں رسالہ "الضیاء" نکالا، یہ برصغیر ہند کا واحد عربی رسالہ تھا اس کے اجراء پر ابھی چند ماہ گزرے ہوں گے کہ مسعود صاحب مرحوم کی شہرت بلاد عرب تک پہنچ گئی انہوں نے بڑی محنت سے اس کے معیار کو بلند کیا احباب کو عربی میں مضامین لکھنے کی ترغیب دی چنانچہ مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی اور خاکسار نے اسی الضیاء کے طفیل عربی میں لکھنے کی مشق کی، اور میرا عربی میں پہلا مضمون اقبال پر اسی الضیاء میں چھپا۔ غالباً دو سال کے بعد شام کے مشہور پادری عربی زبان کے ادیب و نقاد کرملی نے مسعود صاحب مرحوم کے علم و فضل اور خصوصاً عربیت کا بڑے اچھے الفاظ میں اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ گو آپ ابھی کم سن ہیں مگر میں آپ کو عربی زبان کا علامہ اور محقق سمجھتا ہوں"۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علمی ماحول میں انہیں اپنے ذوق علمی کی تکمیل کا پورا موقع ملا، اس کے عظیم الشان کتب خانہ میں ہر علم و فن پر اعلیٰ درجہ کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں دار العلوم میں داخل ہوئے ابھی چند ماہ بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ اپنی خداداد ذہانت غیر معمولی علمی ذوق اور مطالعہ کی بدولت ان کا شمار ممتاز طلباء میں ہونے لگا تھا انہیں انجمن الاصلاح کی کتابوں کے مطالعہ کا الگ موقع ملا، انجمن الاصلاح کو طلباء دار العلوم کے افکار و خیالات اور ان میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں بڑا دخل رہا ہے اس میں مختلف علوم و فنون پر اردو زبان میں بڑا بیش بہا سرمایہ ہے ہندوستان کے مشہور مصنفین کی تقریباً تمام تصنیفات عربی و اردو کے مشہور اخبارات کے فائل موجود ہیں۔ تاریخ ادب اردو اور ادب عربی اور صحافت سے انہیں ابتداء ہی سے دلچسپی تھی ان کے مطالعہ کی رفتار بہت تیز تھی انہوں نے بہت جلد انجمن الاصلاح کو کھنگال ڈالا، اور اس کا مغز ہضم کر لیا، انجمن الاصلاح کی بدولت اچھے اچھے اہل قلم، ادیب اور افسانہ نگار پیدا ہوئے ان میں مسعود عالم صاحب مرحوم کا پایہ بہت بلند ہے ابتداءً وہ مولانا ابو الکلام آزاد کے بڑے شیدائی، ان کے علم و فضل اور ان کی خطابت و صحافت کے بڑے مداح و معترف تھے البلاغ کی جلدوں کو خود پڑھتے اور اپنے احباب کو ان کے مطالعہ پر آمادہ کرتے، مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم مولانا عبد السلام قدوائی ندوی اور رئیس احمد صاحب جعفری ندوی اور رفیق محترم نجم الدین صاحب قدوائی کی بدولت نہ معلوم کتنے طلباء ندوہ ابو الکلام آزاد کے اسلوب نگارش" افکار و خیالات سے متاثر ہوئے مگر رفتہ رفتہ مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت کا مسعود صاحب مرحوم پر پہلا جیسا اثر نہیں رہا تھا بلکہ جوں جوں ان کا علم گہرا ہوتا گیا سیاسی و دینی افکار و خیالات میں پختگی آتی گئی مولانا ابو الکلام سے ان کی والہانہ عقیدت میں کمی آتی گئی۔ گرچہ ان کی ذہانت غیر معمولی

حافظہ اور ان کی مروت و شرافت اور ان کی عبقریت کے وہ ہمیشہ معترف رہے، مگر مولانا ابوالکلام کی عربی دانی اور لغت وادب پر ان کی وسعت نظر کے متعلق مرحوم کی رائے عامیانہ سطح سے بہت بلند ہوگئی تھی اور عربی زبان کے ایک ادیب و محقق کی حیثیت سے ان کی نظر تنقیدی ہوگئی تھی، اسی طرح وہ تذکرۂ ابوالکلام کے بہت سے مجہول الحال رجال کے متعلق کہا کرتے تھے کہ ان کا وجود مولانا کی طباعی و ذکاوت کا رہین منت ہے۔ جماعت اسلامی سے وابستگی سے قبل محب مرحوم کی زندگی پر ہندوستان کی تین عظیم شخصیتوں اقبالؒ ابوالکلام اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے گہرے اثرات پڑے تھے۔ ڈاکٹر اقبالؒ اور مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ کے درمیان ملت اسلامیہ و قومیت کے نظریہ کی، تعبیر و تشریح میں جو مشہور اختلاف ہوا تھا اس کے متعلق وہ بڑے رنج و افسوس کے ساتھ کہا کرتے تھے "مولانا مدنی کی تعبیر صحیح نہیں ہے اور اقبال کی تعبیر اسلامی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ انہوں نے اپنی "حاضر مسلمی الھند و غابرھم" نامی کتاب میں اقبالؒ کی شاعری، اسلامی پیام اور ان کے فلسفہ پر ایک مبسوط باب لکھا ہے۔ افسوس ہے کہ وہ کتاب اب تک نہیں چھپ سکی، اقبالؒ کی موت پر محب مرحوم نے چشم گریاں کے ساتھ عربی میں ایک مقالہ لکھا تھا جو "الفتح" میں شائع ہوا تھا۔ وہ اظہار حق میں بڑے جری اور اپنے خیالات و افکار کے اظہار میں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے چنانچہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جب اپنے دوستوں کے مشورہ سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف تزکیہ اور سلوک کی خاطر رجوع کیا تو محب مرحوم نے اپنے مربی و استاذ سید صاحبؒ سے بڑے ادب کے ساتھ اختلاف کیا اور تصوف کے بارے وہ اپنے مربی و استاد کے ہم خیال نہیں تھے، ان دونوں کے درمیان جو مراسلت ہوئی وہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

زمانہ طالب علمی میں اردو ادب میں چکبست، شرر اور پریم چند کے ناول اور افسانے بڑے ذوق سے پڑھا کرتے تھے مولانا عبدالماجد دریابادی کی زبان وادب کے بڑے قدر دان تھے۔ سچ اور صدق کے پرانے فائل تک پڑھا کرتے تھے۔ مولانا کی سیاسی رائے سے اختلاف کے باوجود مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمات ادبیہ اور ان کی صاف وستھری ٹکسالی زبان کے مداح ہی نہیں تھے بلکہ ان سے خوشہ چینی کا اعتراف کرتے تھے جماعت اسلامی اور دوسری اسلامی تحریکات پر مولانا عبدالماجد دریابادی کی شدید تنقید کو کون نہیں جانتا انہیں خوارج (یعنی مفسدین فی الارض) کا لقب دیتے ہیں اور فاسقوں پر کاروں حتی کہ قادیانیت کی غیرارادی، ور ضمنی تائید بھی کر جاتے ہیں اس کے باوجود مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم سے جب میری گفتگو ہوتی تو اسی مجلس میں مولانا عبدالماجد کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے اور کہتے مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے اسلوب نگارش میں یکتا ہیں خصوصاً طنز نگاری میں ان کا جواب نہیں۔

استاذی علامہ سید سلیمان ندویؒ کے وسیع مطالعہ، تبحر علمی کے علاوہ جس خصوصیت کا وہ ہمیشہ ذکر کیا کرتے تھے وہ علامہ مرحوم کی دینی بصیرت، احکام اسلامیہ کی حکمت و مصلحت اور اختلاف مذاہب پر ان کی نپی تلی رائے اور ہر مسئلہ میں ان کا تعمق ہے وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے عالم اسلام میں سید سلیمان ندویؒ کی ژرف نگاہی اور تعمق کسی دوسرے عالم میں نظر نہیں آتا۔

محب مرحوم بعض اہل علم اور بعض مدرسۂ فکر سے شدید اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے علم و فضل اور خدمات دینیہ کا بڑے حوصلہ اور فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کرتے تھے ——— اور باوجود ذکی الحس اور عصبی المزاج ہونے کے اظہار رائے اور تنقید میں جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹتے تھے۔

"نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ" میں ہندوستان کی اسلامی تحریکات کا اختصار کے ساتھ ذکر ہے۔ اس میں مدارس عربیہ کے نصاب کا بھی ذکر ہے اور علوم عقلیہ کے ساتھ علماء کی وابستگی اور فقہ کی کتابوں کی تفریعات کو نصوص شرعیہ قرار دینے اور شروح و حواشی اور منیات کے ساتھ طلباء مدرسین کے اشتغال اور ان کے غلو پر شدید نکتہ چینی کی ہے مگر اسی کے ساتھ علماء دیوبند کی دینی خدمات کا اعتراف ہے اس کے مقابلہ میں نصب الرایہ للزیلعی کو جب مجلس علمی ڈابھیل نے دوبارہ طبع کرایا تو اس کے مقدمہ میں حدیث کی خدمت کرنے والے علماء کا ذکر کیا ہے مگر صرف ایک مکتب خیال کے علماء کا ذکر ہے دوسرے مکتب خیال کے کسی عالم کا ذکر نہیں ہے ———

محب مرحوم میں محبت کا بڑا جزو تھا اور ان کی شخصیت میں بڑی کشش و جاذبیت تھی وہ دوستوں کے بڑے قدر دان اور ان کے علم و فضل کا ہر مجلس احباب میں ذکر کیا کرتے وہ جہاں ہوتے ان کے تمام قدیم احباب سے جدید احباب متعارف ہو جاتے میں جب استاذی سید سلیمان ندویؒ کے مشورہ سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) میں مدرس ہو کر گیا تو مسعود عالم صاحب مرحوم نے اپنے ایک رفیق و دوست کی جدائی کو شدت سے محسوس کیا اور "الضیاء" میں اس کا محبت آمیز انداز میں ذکر کیا۔ مدرسہ ڈابھیل کے اثنائے قیام میں میرا تعلق "الضیاء" سے باقی رہا اور اخبار عالم کے کالم پر میرے تبصرہ کے لئے وہ ہر ماہ منتظر رہتے اور تاخیر کی صورت میں تعریفی کلمات کے ساتھ مضمون کا تاکید مطالبہ کرتے۔ سالانہ تعطیل کے موقع پر جامعہ ڈابھیل سے جب اپنے وطن بہار جاتا تو لکھنؤ میں ضرور اترتا وما حب الدیار شغفن قلبی ولکن حب من سکن الدیارا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا ایک مرتبہ حسب دستور ڈابھیل سے لکھنؤ گیا مسعود صاحب مرحوم کے ہاں قیام کیا ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کا مہمان بننے کا خیال بھی نہیں آتا تھا، عشاء کی نماز کے بعد ہم دونوں باتیں کرنے لگے رات کا بڑا حصہ باتوں میں گزر گیا خیال ہوا کہ اب سو جانا چاہئے چنانچہ ہم دونوں اپنے اپنے پلنگ پر سونے لیٹ گئے گرمیوں کی مختصر رات تھی پلنگ پر لیٹنے کو لیٹ گئے مگر نیند کافور ہو چکی تھی۔ ہر ایک نے دوسرے کا نام لیا دونوں نے ایک دوسرے کو بیدار پایا پھر لیٹے لیٹے باتیں کرتے رہے۔ پھر دونوں اٹھ کر فرش پر بیٹھ گئے کہ اتنے میں صبح کی اذان کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔ استغفر اللہ یہ کیا ہوا۔ اور اس طرح ساری رات باتوں میں گزر گئی۔

ان کے دل میں احیاء اسلام کے جذبہ کی تخم ریزی کا آغاز ابوالکلام آزاد کے الہلال اور جمال الدین افغانی کے العروۃ الوثقیٰ کے مضامین سے ہوا تھا۔ اس کے بعد اسلامی تاریخ کے مطالعہ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے خالص علمی و دینی ماحول اور تحریک خلافت کے لٹریچر کے مطالعہ نے اس میں پختگی پیدا کر دی تھی، اس کے بعد دارالعلوم سے تعلق منقطع ہونے کے بعد جب وہ کتب خانہ خدابخش خاں بانکی پور پٹنہ میں کیٹلاگر کی حیثیت سے گئے تو انہیں سید احمد شہید کے جہاد اور ان کے احیاء اسلام کی تحریک کی تاریخ کے مطالعہ کا اچھا موقع ملا، اس کتب خانہ میں انہیں ہندوستان کے انگریز حکمرانوں اور فوجی افسروں کی اصل تحریروں، دستاویزوں اور یادداشتوں کے مطالعہ کا موقع دستیاب ہوا چنانچہ انہوں نے اس موضوع پر بڑا قیمتی مواد جمع کیا جسے بعد کو مضمون کی شکل میں شائع کیا، اسی مطالعہ اور فکری رجحان نے آخیر میں انہیں جماعت اسلامی سے وابستہ کر دیا۔

وہ شروع سے منظم و مرتب زندگی گزارنے کے عادی تھے ان کی ہر چیز میں ترتیب و تنظیم تھی وہ روزانہ ڈائری لکھتے انگریزی اخبارات بڑی پابندی سے پڑھتے، روزانہ کچھ نہ کچھ اردو ادب پڑھا کرتے اسی طرح پابندی کے ساتھ عربی ادب پر کوئی نہ کوئی کتاب پڑھا کرتے، اہل علم سے مراسلت کے ذریعہ استفسار کیا کرتے لکھنے کا ذوق فطری تھا، مشق و مزاولت نے اس میں چار چاند لگا دیئے تھے وہ عربی میں قلم برداشتہ لکھتے اور صفحات کے صفحات لکھتے چلے جاتے بمشکل کوئی نقطہ قلم زد کرنے کی نوبت آتی ممدوح کے مسودات بہت صاف ہوتے تبییض کی ضرورت نہیں ہوتی، اپنے اس وصف میں وہ ممتاز تھے، ندویوں میں رئیس احمد صاحب جعفری اردو کے بہت زود نویس ادیب ہیں مسودات میں ترمیم و اصلاح نہیں کرتے البتہ اس وصف میں مولانا عبدالسلام صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین بہت زیادہ ممتاز ہیں ان کے مسودات دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے سینکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات کے مسودات میں شاید ہی کسی ایک نقطہ کو قلم زد کرتے ہوں ان کے مضامین کی تبییض کی ضرورت نہیں ہوتی مگر مولانا مسعود عالم صاحب ایسے زود نویس تھے اور پھر عربی زبان میں ایسی قدرت حاصل کرنا بڑا کمال ہے۔

محب مرحوم کو مجھ سے بہت حسن ظن تھا ان کی طبیعت میں تصنع و ریا نام کو بھی نہیں تھا اور بے حد متواضع تھے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلق منقطع ہونے کے بعد ان کے کام کی نوعیت بدل گئی تھی عربی میں لکھنے کے بجائے انہیں کتب خانہ خدابخش کی فہرست ترتیب دینے کا کام انگریزی میں انجام دینا پڑا تھا مصنفین و مؤلفین کے حالات انگریزی میں لکھتے تھے "حاضر مسلمی الہند وشاعرهم" کے دو ابواب لکھنا باقی تھے کہ وہ سنہ ۳۳ء کے اواخر میں پٹنہ چلے گئے انہوں نے اس کے مسودات پر نظر ثانی اور اس کی ترتیب و تکمیل کی مجھ سے فرمائش کی چنانچہ اپنی بساط بھر ادب اردو اور مسلمانوں کی اقتصادی حالت پر دو باب سپرد قلم کر دیئے افسوس ہے کہ اس اہم کتاب کا مسودہ محب الدین الخطیب مدیر جریدۃ الفتح مصر کے پاس رہ گیا

اور معلوم نہیں کب اس کے چھپنے کی نوبت آتی ہے، جب وہ کوئی کتاب لکھتے تو اپنے احباب کو اس پر تنقید لکھنے اور اس کے کمزور پہلو پر روشنی ڈالنے کی درخواست کرتے۔ اسی طرح وہ عربی کے ترجموں کے متعلق میری تہی مائیگی اور کم علمی کے باوجود محض مجھ سے حسن ظن اور دوستانہ تعلق کی بنا پر اس کی اصلاح کی فرمائش کرتے اور میرے بعض مشوروں کو قبول کرتے حالاں کہ یہ تواضع و انکسار کے اس کا اظہار کرتا ہوں کہ عربی زبان پہ ان کی نظر مجھ سے بہت زیادہ وسیع اور انشاء عربی پر ان کو بہت زیادہ قدرت حاصل تھی۔

وہ نسباً سید تھے اور ان کا خاندان اپنی نجابت و شرافت میں مشہور و معروف ہے بہار شریف کے مشرق میں بیسیوں بستیوں میں سادات کے خاندان ہیں۔ جن میں سے وستہ، استھاوان، اوگانواں وطن محب مرحوم بیر بگھوی، گیلانی، اورانواں، دھرہرا، سباں، کوتندا وغیرہ زیادہ مشہور ہیں ان ہی بستیوں میں مرحوم کا خاندان پھیلا ہوا ہے۔ محب مرحوم کے والد مولانا عبدالشکور صاحب مدظلہ ۱۹۳۰ء میں مئو اعظم گڑھ یو پی کے ایک عربی مدرسہ میں صدر مدرس تھے اسی تعلق کی بنا پر ضلع بلیا کے ایک شریف النسب ملکی خاندان میں محب مرحوم کی شادی ہوگئی تھی مگر یہ رشتہ کامیاب نہیں ہوا۔ محب مرحوم ایک اعلیٰ علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نازک طبع تھے ان کا ذوق بڑا بلند تھا ان کی سسرال اس مرتبہ کی نہ تھی، درحقیقت تمدنی کفاءت نسبی کفاءت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ محب مرحوم کی خانگی زندگی پُرسکون نہ ہوسکی اور آخر میں انہوں نے پاکستان بننے سے قبل اس رشتہ کو خلاصی حاصل کر لی تھی، انہیں کوئی اولاد نہیں ہوئی اور سوا ان کی مصنفات کے اور دینی جد و جہد کی امٹ تاریخ کے انہوں نے اپنے پیچھے کوئی مادی یادگار نہیں چھوڑی، میں ۱۹۳۴ء میں ان کی سسرال بورد اخورد گیا تھا اور بہار کے مشہور زلزلہ کی ہولناک تباہی کے اثرات بلیا میں دیکھے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے چند متجر طلبہ محب مرحوم مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی اور راقم السطور حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم سے حجۃ اللہ البالغہ اور قرآن کریم کے خاص درس سننے کے لئے دارالمصنفین اعظم گڑھ گئے ہوئے تھے، مسعود صاحب مرحوم کی دعوت پر میں نے عید ان کی سسرال میں گزاری تھی۔

ان کے انتقال کے ایک ہفتہ کے بعد ان کے ایک دیرینہ ہمدم نے انہیں خواب میں دیکھا، ان سے سوال کیا کہ آپ کا انتقال نہیں ہوا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں انتقال ہو گیا ہے پھر انہیں اٹھایا تو ان کا جسم پھول کی طرح ہلکا تھا اس کے بعد وہی دوست راوی ہیں کہ مسعود صاحب مرحوم کو ایک ماہ قبل دیکھا وہ سفید ریشمی شیروانی پہنے ہوئے ہیں اور قمیص و پائجامہ بھی خلاف معمول بہت اعلیٰ زرق برق کپڑے کے ہیں خواب ہی میں تعجب کا اظہار کر رہے ہیں کہ مسعود عالم صاحب اور ریشمی کپڑے کی شیروانی اور اس قدر قیمتی کپڑے کے پائجامہ اور قمیص زیب تن کریں؟ جب صبح ہوئی تو خیال ہوا کہ کیا عجب ہے کہ اللہ کی رحمت نے اپنے آغوش میں لے لیا ہو اور ان کی مغفرت ہو چکی ہو اور انہیں حلۂ بہشتی سے نوازا گیا ہو۔

میں نے خواب اور تعبیر خواب کو دو عربی شعروں میں اس طرح ادا کیا ہے:

أتيناك في سنيّ الحرير ولم تكن ... لتلبس ما قد شفّ من ناعم الغزل

میں نے آپ کو ریشمی لباس زیب تن کئے ہوئے دیکھا۔ حالانکہ آپ تو باریک ادھی کے کپڑے بھی نہیں پہنا کرتے تھے۔

ولا غرو ان الله اكرم عبده ... بزيّ الجنان من حرير ومن حلل

مقام حیرت و تعجب نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے بندہ کو ریشم کے حلۂ بہشتی سے نوازا ہے۔

مسعود صاحب مرحوم کے دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ مضامین کی ترتیب کے ساتھ ان کی دعاء مغفرت سے غفلت نہ کریں کہ اس زندگی میں یہی کام کی بات ہے۔

اللهم اغفر له وارحمه وادخله فردوس الجنان انه كان مجاهدا يك متبعا لسنة نبيك يحب فيك ويبغض فيك انت الغفور الرحيم

"مردِ مومن"

ماہر القادری

یہ ایک رسم سی ہو گئی ہے کہ عام طور پر افراد اور شخصیتوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے — کہ "وہ نیک ہے۔ شریف ہے — بھلا مانس ہے — اچھا کردار رکھتا ہے — صاحبِ فکر و نظر ہے" — مگر دیکھنا یہ ہے کہ کتنے لوگ ہیں جو واقعی شریف، نیک، بھلے مانس اور صاحبِ کردار ہوتے ہیں، مروت اور شرما حضوری کی دوسری بات ہے آپ جس کو چاہیں خطاب دے دیں لیکن جب انسانیت کی کسوٹی پر زندگیوں کو کسا اور پرکھا جائے گا تو قلعی کھلے گی کہ کون کیا ہے، کتنے پیتل کے پتر تھے جن پر سونے کا ملمع تھا اور کتنی لوہے کی سلاخیں تھیں جن پر چاندی کے خول چڑھا دیئے گئے تھے، سیرت و کردار کی یہ دو رنگی اور قول و عمل کا یہ تضاد کوٹ پتلون ہی تک محدود نہیں ہے، عمامے کے پیچوں اور جبہ و دستار کی سلوٹوں میں بھی نفاق چھپا ہوتا ہے!

مسلمان قوم شہرت یافتہ افراد کو خطاب دینے میں بڑی فیاض اور سخی واقع ہوئی ہے، کتنے لوگ ہیں جن کے سایہ سے بھی قوم کو بچنا چاہیے مگر قوم ان کو زندگی بھر "مدظلہم العالی" ہی کہتی رہتی ہے اور مرنے کے بعد وہ "رحمتہ اللہ علیہ" اور "قدس سرہٗ" ہو جاتے ہیں۔

لوگوں کی مرعوبیت اور زمانہ سازی کا یہ عالم ہے کہ جس کے ہاتھ میں بھی اقتدار ہوتا ہے اُسے "نجات دہندہ" اور قوم کی ناؤ کا کھویا کہتے ہیں اور شاید سمجھتے بھی ہوں۔ اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی سیاسی بازی گر نے اسٹیج پر قرآن کی دو چار آیتیں پڑھ کر تھوڑی سی لچھے دار تقریر بیان کی، عبا کے دامن کو مروڑ کر گردن کو جھٹکا دیا، آواز میں دل گرفتگی کا انداز پیدا کیا جیسے قوم کے غم میں یہ حضرت بس کچھ دیر میں رونے ہی والے ہیں۔ بس اس کی ایکٹنگ کے بعد قوم ان کو "علامہ" "مجاہد" "شیخِ طریقت" "ہمدردِ قوم" جیسے خطابات دینے میں ذرا سی بھی دیر نہ کرے گی! یہ ہوتا رہتا ہے یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے۔ یہ شب و روز کے تجربے ہیں، خالی سیپیوں اور گھونگھوں کو لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان میں گوہرِ یک دانہ و درہائے شاہوار بند ہیں۔

قوم اپنے "بڑے آدمیوں" کو جانچنے اور پرکھنے کی بہت ہی کم کوشش کرتی ہے۔ شخصیتوں کے جانچنے کا اُس کے پاس سب سے بڑا پیمانہ "اخبارات" ہیں، عوام کا خیال یہ ہے کہ جو شخص بھی مشہور ہے وہ واقعی "بڑا آدمی" ہے اس لئے عزت و احترام کا مستحق ہے! قوم کے اس جذبۂ شہرت پرستی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایسی غلط قسم کی قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں جنہوں نے قوم کے مزاج کو بگاڑ دیا۔ اور مزاج کے اسی فساد، زاویۂ نگاہ کی اسی کجی اور ذہنیتوں کے بگاڑ کا یہ نتیجہ ہے کہ پاکستان میں بلبل چودھری کو "ہیرو" کی پوزیشن حاصل ہوتی جا رہی ہے۔

یہ نہیں ہے کہ قوم میں اچھی صلاحیتیں رکھنے والوں کا قحط ہے، ہمارے یہاں بہتر سے بہتر صلاحیتوں کے لوگ موجود ہیں مگر رونا اس کا ہے کہ یہ صلاحیتیں غلط طریقہ پر صرف ہو رہی ہیں! جمال ناصر ایک اچھا فوجی افسر ہے اُس کی جرأت، بے خوفی اور فنِ جنگ کی مہارت کا اظہار جہاد فی سبیل اللہ میں ہونا چاہیئے تھا، تنہا مصر کی فوجیں فلسطین کے معرکہ کو سر کر سکتی تھیں مگر اس شخص کی تمام جرأت اور دلیری اپنے ہی بھائی بندوں کے مٹانے اور برباد کرنے میں صرف ہو رہی ہے اور جمال ناصر "جمال السفاح" بن گیا ہے۔

خود پاکستان میں زبان، قلم، دل، دماغ، فکر و نظر اور علم و عقل کی کتنی صلاحیتیں اور قوتیں ہیں جو صحیح طور پر قوم کی تعمیر، ملک کی ترقی اور دین کی بہتری کے کام آ رہی ہیں؟ کتنے قلم اور زبانیں ہیں جو خریدی گئی ہیں اور کتنے علمی ادارے ہیں جو جہالت کو فروغ دے رہے ہیں! جن دماغوں کو قوم کی تعمیر و ترقی

کے لیے تدبیریں سوچتے میں لگنا چاہیے تھا وہ سازشوں میں مصروف ہیں، جن سے توقع تھی کہ دین کی عمارت کے لئے ستون اور پشتے فراہم کریں گے ان کے ... ہاتھوں میں تیشے اور کدالیں دکھائی دیتی ہیں!

افراد کی قدر و قیمت متعین کرنے کا معاملہ صرف اس منزل پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا کہ کس میں کیا صلاحیت، کیسی قابلیت اور کتنا جوہر ہے، دیکھنا یہ چاہیے کہ صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کہاں ہو رہی ہیں!

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم سے محبت و عقیدت رکھنے کے باوجود ہم اُن کو فرشتہ نہیں ایک انسان ہی سمجھتے ہیں ——— انسان جس سے لغزش بھی ہو جاتی ہے، جو خطا و نسیان کا پتلا ہے اور بھول چوک جس کی سرشت ہے! یہ کون کہتا ہے کہ مولانا مرحوم کی ہر رائے سو فی صدی درست ہوتی تھی، اور اُن کے قلم سے جو بات نکل گئی ہے اس میں ذرا سا بھی جھول نہیں ہے اور وہ بے نفسی و تقویٰ میں ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کی مثال تھے! ہر شخص کو اُسی جگہ رکھنا چاہیے جو اُس کا مقام ہے، مبالغہ آمیزی حقائق کو مجروح کر دیتی ہے! جس کے ہاتھ میں قلم اور منہ میں زبان ہو تو وہ جو چاہے لکھ سکتا اور کہہ سکتا ہے اور غیر ذمہ دار لوگ سب کچھ کر گزرتے ہیں مگر جو شخص اپنی ذمہ داری کو پہچانتا ہو، وہ ان بے احتیاطیوں اور بے اعتدالیوں کو روا نہیں رکھ سکتا ——— پس ہم وہی کہیں گے جسے اپنے نزدیک ہم واقعہ اور حقیقت سمجھتے ہیں۔

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو علمی دنیا نے سب سے پہلے مجلہ "الضیاء" کے عربی مضامین کے ذریعہ پہچانا، پھر وہ "خدابخش پٹنہ لائبریری" کے ذریعہ جانے گئے اور یہ وہ دوراہہ تھا جہاں سے دو راستے پھٹتے تھے ——— ایک اقامت دین کا راستہ، دوسرا دُنیوی شہرت و ترقی اور حصول جاہ و زر کا راستہ! ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک راستہ کے انتخاب میں وہ مختار تھے! یہ بڑا نازک مسئلہ تھا۔ ایسے موقعہ پر نفس و ضمیر کی کش مکش بڑی شدید اور ہنگامہ خیز ہوتی ہے!

دوراہہ، دو موڑ، دو راستے ہے ——— ایک میں شہرت کے پرچم لہراتے ہوئے، عیش و راحت کی بزم جمی ہوئی، زر و مال کے ڈھیر، جہاں تہاں بکھرے ہوئے، نفس کی لذتوں کے قدم قدم پر مواقع اور زریں مواقع! بے فکری کی زندگی ——— اور دوسرے راستہ میں حدِ نظر تک کانٹے بچھے ہوئے خشک اور غیر دلچسپ سفر، ہر قدم پر طرح طرح کے خطرے۔ کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے! جاہ و دولت کا دور دور پتا نہیں اور پھر نفس کی لذتوں کی قربانی اس راہ کی پہلی شرط تھی۔

مگر......

مسعود عالم کی حق شناس فطرت نے اسی دوسرے راستہ کا انتخاب کیا اور وہ دو ٹوک فیصلہ کر کے اس منزل پر چل پڑے۔ اُن کی پچھلی زندگی کے بعض ساتھیوں نے ان کو ٹوکا بھی بلکہ مذاق بھی اڑایا کہ تم کو کیا بننا چاہیے تھا اور کیا بنے جا رہے ہو مگر مرحوم نے ساتھیوں کے طنز و طعن کو گوارا کر لیا، انھوں نے دوراہہ پر کھڑے ہوئے ساتھیوں کو پھر مڑ کر بھی نہ دیکھا، منزلِ سفر کے اس انتخاب پر انہیں بعض بزرگوں کی تھوڑی بہت کبیدہ خاطری بھی برداشت کرنی پڑی مگر اب انھوں نے اپنے فکر و عمل کی زمام اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی گرفت میں دے دی تھی! تیر کمان سے چھٹ چکا تھا، لوٹ کر کیسے آتا، وہ اس راہ میں اپنے خدا سے پیمانِ وفا باندھ کر چلے تھے اور آخر دم تک چلتے ہی رہے!

مسافر اور ضیق النفس کا بیمار مسافر کہ بعض وقت سانس کا دورہ پڑتا تو،

جو اُکھڑی سانس تو بیمارِ غم سنبھل نہ سکا
ہوا تھی تیز چراغِ حیات جل نہ سکا

کا سماں پیدا ہو جاتا، مگر ذرا افاقہ ہوتے ہی راہِ حق کا یہ مسافر پھر چل پڑتا! ع

آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب!

اس میں رائی برابر مبالغہ نہیں ہے کہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے دین کی خاطر بہت سی کلفتیں مول لے کر اپنے راحت و آرام کو خیرباد کہہ دیا تھا" اس شخص نے بیمار رہ کر وہ کام کیا جو بہت سے لوگ تندرست اور صحت مند رہ کر نہیں کر سکتے!

ہندوستان اور پاکستان میں جہاں تک عربی انشاء پردازی کا تعلق ہے دو تین آدمی مشکل ہی سے اُن کی ٹکر کے نکلیں گے، وہ عربی ادب کے جاشیہ شکیب ارسلان تھے، اگر مرحوم مصر اور شام چلے جاتے تو ان کی بڑی قدر ہوتی اور اپنے قلم کے زور سے بڑی دولت اور نام پیدا کرتے ——— مگر وہ اپنے قلم کو خدمتِ دین کے لئے وقف کر چکے تھے پھر ان چٹخاروں میں کیسے اُلجھتے!

مسعود عالم ایک فرد نہیں اپنی ذات سے ایک "اکیڈیمی" تھے مگر اس اکیڈیمی میں اہرامِ مصر کی تاریخ، فراعنہ کی ممیوں کے افسانوں، ام کلثوم اور عبدالوہاب کی موسیقی کی ریسرچ، طرفہ اور ابو نواس کی شاعری پر بحثیں نہیں ہوتی تھیں، یہاں کی فضا میں "قال اللہ" اور "قال الرسولؐ" کے نغمے گونجتے تھے، حق و صداقت کی ترجمانی ہوتی تھی اور وہ مرقع ترتیب دیئے جاتے تھے جن کی پہلی لکیر اور آخری خط میں "اقامتِ دین" کی بھرپور جھلک پائی جاتی تھی۔

آج لوگ جماعتِ اسلامی کی قدر و منزلت کو پوری طرح نہیں جانتے مگر بے خبری اور بیگانگی کا ہمیشہ تو یہی عالم نہ رہے گا، ایک وقت آئے گا جب لوگ کہیں گے کہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے اور یہ اُس دور کا بہت بڑا اعزاز تھا، جاننے والے کے باب مفاخر کا بہت بڑا فخر! دین میں بھی اور دنیا میں بھی! جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کا رکن صرف اُن کو علم و فضل ہی کی بنا پر نہیں بنایا گیا تھا بلکہ اس میں اُن کے کردار کی پاکیزگی، عزم کی بلندی اور اخلاصِ عمل بھی شریک کار تھا۔

مولانا مرحوم نے راہِ حق میں اُس کے تمام عواقب و شدائد کا پوری طرح اندازہ کر کے ہی قدم رکھا تھا اس لئے قید و بند کا مرحلہ درپیش ہوا تو ان کو ہنسی خوشی جیل خانہ کے پھاٹک سے اندر جاتے ہوئے دیکھا گیا اور کئی مہینہ اسی ماحول میں وقار و استقامت کے ساتھ گزار دیئے! پھر اس کے چند ماہ بعد وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

اس ترقی کی کوئی انتہا ہے کہ خدا بخش پٹنہ لائبریری کا کیٹلاگر دار العروبہ کا ناظم بن جاتا ہے اُس دار العروبہ کا، جہاں عربی زبان میں دین کی دعوت کے لئے صالح اور پاکیزہ ادب تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ترقی روپیہ پیسہ کی نہیں فکر و نظر اور مقصد و عمل کی ترقی تھی، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے تحریکِ اسلامی کو عرب ممالک میں تعارف کرانے کا جو کام کیا وہ حقیقت میں بہت بڑا کارنامہ ہے، علمی بھی، فکری بھی اور دینی بھی۔

اردو زبان میں اُن کے لکھنے کا اسٹائل بہت خاص تھا، بنے تلے جملے، لفظوں کا محتاط اور برمحل استعمال! بات کو خواہ مخواہ طول دینے سے گریز، وہ جسے ادب و معانی میں ——— "مختصر مفید" کہتے ہیں، یہی خصوصیت ان کی اردو تحریر میں جھلکتی ہے! اچٹتی ہوئی باتیں لکھنے کے وہ عادی نہ تھے جو کچھ لکھتے سوچ سمجھ کر لکھتے، احساسِ ذمہ داری اور مسئولیت کا تصور قلم کی ہر جنبش کے ساتھ ساتھ چلتا۔

اس علم و فضل کے باوجود کیا انکسار اور فروتنی کا عالم تھا۔ مجھ جیسے بے علم سے کس قدر تواضع کے ساتھ ملتے جیسے وہ کچھ نہیں ہیں اور میں سب کچھ ہوں، یہ اُن کی وسعتِ ظرف کی بات اور بڑے پن کی دلیل تھی ورنہ اس خود فروش اور خود نما زمانہ میں ایک ابجد شناس بھی اپنے کو فارابی اور ابن سینا سے کم نہیں سمجھتا!۔

اُن کے لباس میں خوراک میں نشست و برخاست میں ایک تنظیم پائی جاتی تھی، یہ نہیں تھا کہ سو رہے ہیں تو گھنٹوں سو رہے ہیں، کام کرنے بیٹھے تو مسلسل کام ہی کرتے رہے، انہوں نے اپنے اوقات کا نظام العمل بنا رکھا تھا، وہ فطری طور پر حضرت مظہر جانؒ جاناں کی طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے بیماری نے اس تنظیم میں اور حُسن پیدا کر دیا، جیب کے فاؤنٹین پن سے لے کر جوتوں کے تسموں تک ہر چیز میں سلیقہ جھلکتا تھا! یہ سلیقہ ٹھاٹ باٹ دکھانے کے لئے نہ تھا، بلکہ اس سے خود اُن کے دینی کاموں میں ترتیب و باقاعدگی پیدا ہو گئی تھی۔

مصر و شام کے سفراء مولانا مسعود عالم مرحوم کی بڑی قدر کرتے تھے، جب وہ کراچی تشریف لاتے تو انہیں کھانے پر بلاتے لیکن مولانا مرحوم کی زبانی ان دعوتوں کا ذکر میں نے نہیں سنا، دوسروں کی زبانی ان دعوتوں کی اطلاع مجھے مل جاتی ـــــ ورنہ آج کل لوگ بڑے آدمیوں سے ملنے جُلنے اور ان کے یہاں آنے جانے کا ذکر جان بوجھ کر چھیڑتے ہیں اور دوسروں سے تعلق اور شناسائی کو نمک مرچ لگا کر کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔

ہم جس زمانہ میں رہ رہے ہیں یہ حسن بصریؒ اور ابو حنیفہؒ کا نہیں دینی اعتبار سے "ضعفا" کا زمانہ ہے کہ جہاں دین و ایمان کے ہر شعبہ میں ضعف ہی ضعف نظر آتا ہے، اس دور میں مولانا مسعود عالم ندوی جیسے مسلمان بھی اگر پیدا ہو جائیں تو قوم کی بہت بڑی خوش بختی ہے! نیکی ان میں تھی، شرافت ان میں تھی، عزم و اخلاص اُن میں تھا، علم و فضل وہ رکھتے تھے "صحیح اور متوازن دینی فکر کے وہ حامل تھے، خود داری مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی! اہلِ حق کے لئے وہ ابریشم سے زیادہ نرم مگر اہلِ باطل کے لئے فولاد سے زیادہ سخت تھے، کوئی طاقت ان کو مرعوب نہ کر سکتی تھی!

ہم شدتِ الم سے گھبرا کر کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مسعود عالم کی موت ناوقت ہوئی، ابھی ان کو بہت کام کرنا تھا۔ عمر بھی کچھ ایسی زیادہ نہ تھی، کام کرنے کا وقت تو اب آیا تھا کہ ہر چیز میں پختگی پیدا ہو گئی تھی ـــــ مگر یہ ہماری سادگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم اپنے ٹھیک وقت پر ہی نازل ہوتا ہے، جس سانحہ اور حادثہ کے لئے جو وقت مقرر ہے، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ مقدم ہو سکتا ہے اور نہ مؤخر۔

مولانا مرحوم کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ اپنے جیتے جی اللہ کے دین کو برپا دیکھ لیں مگر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی، اللہ کو منظور رہا تو اب وہ جنت میں اس مژدہ کو سنیں گے کب؛ اس کا تعین کون کر سکتا ہے، مگر یہ ہو کر رہے گا، کوئی طاقت اسلام کا راستہ روک نہیں سکتی!

جانے والے تجھ پر خدا کی رحمتیں ہوں، قبر میں، برزخ میں، قیامت میں اور آخرت میں ـــ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیک!

بقیہ: مرحوم دوست ص ۳۷

اور خوب باتیں کروں لیکن جماعتی ذمہ داریوں نے بنگال میں باندھ رکھا تھا ـــ مارچ میں مجھے جماعت کی شوریٰ میں شامل ہونے کے لئے اچانک ہی کراچی روانہ ہونا پڑا۔ دل بہت خوش تھا کہ مرحوم سے بہت باتیں ہوں گی لیکن ہوائی اڈے پر پہنچ کر جب ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لئے آگے بڑھا تو محترم رفیق آدم بھائی ملے جو اسی جہاز میں کراچی سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں آئے تھے اور یہ معلوم کر کے کہ میں کراچی جا رہا ہوں اُن کا پہلا سوال یہ تھا کہ "مولانا مسعود عالم کے متعلق معلوم ہوا؟" مجھے جھٹکا سا لگا اور میں نے دریافت کیا کہ "کیا ہوا؟ مجھے تو علم نہیں۔" آدم بھائی نے بتایا کہ "وہ تو ـــــ کو سفرِ آخرت کر چکے ہیں"۔ یہ خبر اور ایسے وقت میں جب کہ دوست سے ملاقات کی امید کا مرحلہ بالکل لبِ بام ہو آتی جا نکاہ ثابت ہوئی کہ آج محض اس کی دوبارہ گی ہی ہوا ہو اور قلم کے لئے ....

مرحوم دوست

چوھدری علی احمد خاں (ڈھاکہ)

چراغ راہ کے ادارہ کا یہ فیصلہ قابل ستائش ہے کہ وہ مارچ میں مسعود عالم نمبر نکال رہا ہے۔ مرحوم دوست کی یاد میں سبھی دوست کچھ نہ کچھ کہیں گے۔ مجھے بھی اس بزم احباب میں شامل ہونا ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ مرحوم سے میرے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ جماعتی ہونے کے علاوہ، ذاتی اور شخصی روابط کا سلسلہ اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ میں اگر موصوف کو اپنے خاندان کے افراد میں شمار کرنے کا دعویٰ کروں تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

تعارف | مرحوم کے نام سے پہلے پہل میں اس وقت واقف ہوا، جب ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان رسالہ "معارف" میں ڈاکٹر زکی علی کی کتاب ISLAM IN THE WORLD پر اُن کا تبصرہ شائع ہوا۔ تبصرہ مفصل تھا۔ اور تبصرہ نگار کے گہرے مطالعہ اور ٹھوس معلومات کا غماز! پھر دوسرا مضمون "الفرقان" کے "شاہ ولی اللہ نمبر" میں دیکھا۔ اس نے میرے دل میں موصوف کے لئے ایک خاص مقام پیدا کر دیا۔ میں اُن دنوں پھلور (مشرقی پنجاب) میں تھا، بعد میں جب جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی اور مولانا بھی اس میں شامل ہو گئے تو ایک دن اطلاع ملی کہ مولانا مسعود عالم صاحب پنجاب تشریف لا رہے ہیں، اور اُن کا قیام جالندھر میں ہوگا۔ میرے لئے یہ بہت ہی مسرت کن خبر تھی۔ چنانچہ جب مولانا جالندھر تشریف لے آئے تو اطلاع ملتے ہی وہاں پہنچا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اور صبح کا وقت۔ مولانا "بستی دانش منداں" میں اپنے مکان کے صحن میں کمبل اوڑھے کرسی پر بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے[1] ہم دونوں کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ تفصیلی تعارف کے بعد اسلام، جماعت اسلامی، جماعت کے ذمہ دار کارکن، رہنما اصحاب، لٹریچر، مسلم لیگ، پاکستان، غرض یہ کہ بہت سی باتیں زیر بحث آئیں۔ اُس ملاقات کا آج تک جو نقش لوح ذہن پر میں محسوس کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ موصوف ایک اچھے عالم دین کے علاوہ، معاملہ فہم، مردم شناس، سیاسی شعور سے مالا مال اور باعزم انسان تھے۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ تاآنکہ مولانا گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے اپنے وطن تشریف لے گئے۔

غالباً ۱۹۴۴ء کی بات ہے مرکزی دفتر سے اطلاع ملی کہ مولانا مسعود عالم صاحب دوبارہ جالندھر تشریف لا رہے ہیں۔ ان کے لئے رہائشی مکان کا انتظام کیا جائے۔ میں نے مولانا کو پھلور ہی میں قیام کرنے کی دعوت دی جسے انھوں نے بخوشی قبول فرمایا۔ اور موصوف میرے ہی مکان میں رہائش پذیر ہو گئے۔ دارالعروبہ کے لئے کارکن تیار کرنے کے لئے مولانا نوجوانوں کو زیر تربیت رکھتے۔ پہلے جالندھر میں ان کے پاس ایک مدراسی نوجوان قطبی صاحب تھے۔ اب پھلور میں حافظ فتح محمد صاحب تھے، جو ان دنوں حافظ محمد فتح اللہ صاحب بن گئے ہیں۔ مولانا کی موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے عربی پڑھنا شروع

---

[1] "دھوپ کھانا" اُردو میں رائج ہے۔ بنگال میں تو بہرحال پانی اور چائے تک کھائی جاتی ہے میں "دھوپ سینکنے" کے پنجابی محاورہ کو ترجیح دیتا ہوں۔ اور وہی لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن مرحوم کے ادبی ذوق کے پیش نظر "دھوپ کھانا" ہی لکھ رہا ہوں مرحوم کو مجھ سے جو اختلافات تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ میں اُردو میں دوسری زبانوں اور خصوصاً پنجابی کے اچھے محاورے شامل کرنے کا قائل تھا لیکن مرحوم کے نزدیک یہ حق صرف مستند اہل زبان ہی کو حاصل تھا جن کی اکثریت میرے نزدیک تو اتفاق سے پنجابی زبان کی خوبیوں سے کچھ زیادہ واقف نہ تھی۔

کی تو اس وقت یہ معلوم ہُوا کہ ایک مخلص دوست ایک کامیاب استاد کس طرح بن سکتا ہے۔

مولانا کے قیام پھلور کے دوران میں ان کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ نیز انہی دنوں اُس موذی و مزمن بیماری کی شدت کا بھی علم ہُوا، جو مولانا کو لاحق تھی اور بالآخر اُن کی جان لے کر ہی گئی۔ علاوہ ازیں آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ صبر و استقامت کا پہاڑ ایک نحیف و لاغر جسم کے اندر کس طرح سمایا ہوا ہوتا ہے۔ پھر یہ بیماری ہی تھی، جو مولانا کو پھلور سے دوبارہ جالندھر لے گئی۔ چنانچہ اُن کا قیام جالندھر اور میرا پھلور رہا کہ تقسیم ہند کے نتیجہ میں تشکیل پاکستان کا اعلان ہو گیا۔ اُس وقت سکھا شاہی اور طوائف الملوکی تھی۔ پٹیالہ اور کپور تھلہ کی ریاستی فوجیں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہی تھیں۔ تار کا سلسلہ منقطع، ذرائع رسل و رسائل مسدود، پھلور سے جالندھر کا سفر نا ممکن ہو گیا۔ مولانا کے بارہ میں طبیعت بہت پریشان رہتی۔ جب لاہور پہنچ کر موصوف کو بخیر و عافیت دیکھا تو غنچۂ دل پھر کھل گیا۔

پاکستان میں اپنی صحت کی پریشانی کی وجہ سے مولانا کو بار بار اپنا دفتر تبدیل کرنا پڑا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ۱۹۵۰ء میں گوجرانوالہ مقیم ہوئے ان دنوں مولانا علامہ گوجرانوالہ کے امیر ادارہ میں مقیم تھا۔ یہاں پھر ایک دوسرے سے بہت ہی قریب رہنے کا موقعہ ملا۔

یہ داستان خصوصاً اس لئے سنانی پڑی کہ مرحوم کے متعلق میں نے جو رائے قائم کر کے آئندہ سطور میں پیش کی ہے، وہ کم از کم ان لوگوں کے لئے شاید تعجب انگیز ہو جن کو مرحوم سے قریبی سابقہ پیش نہیں آیا۔ اور انہوں نے چند ہی ملاقاتوں میں موصوف کے بارہ میں ایک رائے قائم کر لی ہو۔ نیز مرحوم کی زندگی کے اُن گوشوں پر کچھ نہیں کہنا چاہتا جن کو ان کی تحریریں خود ہی زبانِ حال سے بیان کر رہی ہیں۔ بلکہ ان کی سیرت کے اُن نقوش کو زیبِ قرطاس پر محفوظ کرنا چاہتا ہوں جو کم از کم اب تک شرمندۂ تحریر نہیں ہوئے ہیں۔

کلام اللہ اور سنتِ رسول سے شغف

بارہا گفتگو کے دوران میں مرحوم نے بتایا کہ مولانا مودودی کی تحریروں نے اُن کے اندر خدمتِ دین کی اُن چنگاریوں کو سلگا دیا جو عربی زبان کے عشق کی راکھ میں دب چکی تھیں۔ مرحوم فرمایا کرتے کہ نوجوانی اور طالب علمی کا ایک وقت وہ بھی تھا جب اُن پر عربیت اتنی سوار تھی کہ قرآن کو بھی اُسی نظر سے پڑھا جاتا تھا۔ اس تبدیلی ہیئت کے بعد اُن کا قرآن فہمی کا ذوق اتنا بڑھ چکا تھا کہ شاید اس کتاب سے زیادہ وہ کسی کتاب کو نہیں پڑھتے تھے۔ عربی زبان پر عبور نے قرآن فہمی میں ان کی بہت مدد کی۔ چنانچہ متعدد اردو تفسیروں کے ترجموں پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

سنتِ رسول صلعم سے موصوف کو عشق تھا۔ شروع شروع میں روایت اور درایت کا جھگڑا ان کے نزدیک بھی اس قابل تھا کہ وہ اس میں حصہ لیتے چنانچہ پھلور کی رہائش کے دوران میں اس پر خوب تبادلہ خیالات ہوا کرتا[1]۔ لیکن بعد میں صورتِ حال وہ نہیں تھی اگرچہ اُن کے مسلک میں بڑا فرق نہیں آیا۔ سنت اور عادتِ رسول کے بارہ میں بھی موصوف کا مسلک واضح تھا اور وہ اس تفریق کے کچھ زیادہ قائل نہیں تھے۔ ان باتوں کے علاوہ سنتِ رسول کے وہ پہلو اور اسوۂ حسنہ کے وہ گوشے جو عام مولویوں کے نزدیک پیروی کے لئے ضروری نہ تھے، مثلاً سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، اجتماعیات وغیرہ ——— مولانا کے نزدیک جزو دین تھے۔ یقیناً کہ اس دور میں جب کہ الحاد و دہریت نوجوانوں کے ذہن میں گھس ہی ان راستوں سے رہی ہو، شمعِ نبوت کی روشنی سے بے نیاز ہو کر ان شعبوں میں تو بہت اشتمالیت کے نظریات کو اپنا تا یا سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظام سے اپنے معاملات کے

---

[1] شاید کم اصحاب کو اس کا علم ہوگا کہ مولانا کی ڈاڑھی پہلے چھوٹی ہُوا کرتی تھی لیکن مقدار ریش کی بحث کے دوران میں انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا، کہ اب انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اسے بڑھائیں گے۔

عمل ڈھونڈنا مولانا کے نزدیک کسی طرح بت پرستی سے کم نہ تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا کہ جب مولانا سندھی نے اس قسم کی باتیں کہنا شروع کیں تو مسعود عالم مرحوم ندوی کا مقابلہ پہ اتر آیا اور سنت کی حمایت میں ٹھوس دلائل اور معقول استدلال کے وہ لشکر لایا جس کے مقابلے کی باطل میں تاب نہ تھی۔ اس معاملے میں موصوف کسی رعایت اور مداہنت کے قائل نہ تھے اور کوئی تعلق، کوئی رشتہ اور کوئی مناسبت اس میں آڑے نہیں آسکتی تھی۔

جماعتی زندگی

مولانا مرحوم نے جماعت سے جو رشتہ قائم کیا وہ روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ جماعت کے وہ کارکن جو شروع ہی سے اس میں شامل ہیں، اچھی طرح جانتے ہیں کہ جماعت کی تشکیل کے کچھ ہی عرصہ بعد بعض افراد کی علیحدگی نے نئے متاثرین کے ذہن و قلب میں شکوک و شبہات کے ایسے کانٹے بوئے تھے جن کو چننے کے لئے مختلف لوگوں کو مختلف قسم کے پاپڑ بیلنے پڑے۔ اس سلسلے میں مرحوم کا ایک ہی جملہ میرے نزدیک بہت وزنی تھا۔ علیحدہ ہونے والوں میں بعض اُن کے نہایت ہی محبوب دوست تھے۔ چنانچہ اُن کے بارہ میں اُن کی رائے یہ تھی کہ "وہ بیچارے مجبور ہیں۔ اُن پر اُن کے دماغ سے زیادہ اُن کا دل سوار ہے جدھر کا رُخ کیا ساتھ بہا لے گیا۔ پھر عقل کا کام نہیں کہ اُس راستہ کے نشیب و فراز اس کے صحیح یا غلط، اس کے سیدھے یا اُلٹے ہونے پر دلیل دے سکے"۔ چنانچہ بعد کے واقعات کی روشنی میں مَیں نے اُن کی اس رائے کو لفظ بلفظ صحیح پایا۔

آزادیٔ فکر و رائے کی حوصلہ افزائی

موصوف کی شروع ہی سے کوشش رہی ہے کہ جماعت کے عام ارکان میں آزادیٔ رائے، آزادیٔ فکر اور آزادیٔ تحقیق کا جذبہ قائم رہے۔ وہ اس ذہنیت کے نہایت ہی سختی سے مخالف تھے کہ کارکنوں پر کسی کا ایسا ذہنی تسلط قائم ہو جائے کہ وہ سوچنے سمجھنے کا کام، پالیسی کی تشکیل کا معاملہ، جماعت کی بہتری کے لئے غور و فکر کی ذمہ داری میں محض مقلد بن کر رہ جائیں۔ جماعت کے وہ اصحاب فکر و نظر جن کی قدر و احترام خود مرحوم کے دل میں بہت ہی زیادہ تھی اُن کے بارہ میں بھی وہ جب کسی نئے کارکن یا متاثر کو حد سے زیادہ حسن ظن، عقیدت یا احترام میں مبتلا پاتے تو بعض دفعہ سختی سے، بعض دفعہ دلیل و برہان سے اور بعض دفعہ محبت و شفقت سے سمجھاتے۔ اگرچہ خود جماعت کا لٹریچر بھی اس مسئلہ میں بہت محتاط ہے اور ذمہ دار حضرات کی نظر سے بھی یہ پہلو اوجھل نہ تھا لیکن مرحوم نے اس معاملہ میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ میرے نزدیک کچھ کم اہم نہ تھا اور اگر میں یہ کہدوں کہ اس حد تک جماعتی مزاج کی ساخت میں مرحوم کا ایک مؤثر حصہ تھا تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

تنقید کی حوصلہ افزائی

مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ وہ باغی پیدا ہوئے ہیں۔ ماحول سے وہ کبھی بھی دب کر نہیں رہے۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں بھی وہ شریر طلبہ ہی میں شامل تھے۔ دوسرے سے دب جانا، ان کی فطرت کے خلاف، افتادِ طبع سے بیگانہ اور ذہنی ساخت سے بہت بعید تھا۔ مزاج کی اسی ساخت نے موصوف کے اندر برطانوی حکومت کے خلاف لڑنے والوں کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ جماعت اسلامی میں شمولیت سے پہلے اسی جذبہ کے تحت انگریز کے خلاف لڑنے والوں کے حامی تھے۔ تنقید کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے۔ خود تنقید میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ اپنے محترم ترین استادوں اور دوستوں پر بے دریغ تنقید کر جاتے۔ لیکن توازن ذہنی اس حد تک قائم رکھتے کہ اس تنقید کے دوران میں کوئی لفظ، کوئی خیال، کوئی جملہ ایسا نہیں ہوتا تھا جو اُن متعلقہ حضرات کی ذاتی حیثیتوں سے فروتر ہو۔ ان کی کوشش رہی کہ جماعت کے اندر بھی ایک چھوٹے سے چھوٹا کارکن اپنے آپ کو بڑے سے بڑے رفیق پر تنقید کرنے کا حقدار سمجھے۔ لیکن تنقید میں توازن، اس کے حدود، اس کے مطالبات کو سمجھنے پر پورا زور صرف کرتے تھے۔ جب کبھی خود بھی نشانۂ تنقید بنتے تو اگر اُس وقت ناقد کے دلائل کا وزن محسوس نہ کر سکتے تو ایسے مواقع بھی یاد آتے ہیں کہ ناقد کے دلائل پر انہوں نے علیحدگی میں غور کیا اور جس میں جتنا وزن محسوس کیا پوری فراخ دلی سے اس کی اہمیت کا اقرار بھی کیا۔

محاسبہ

مرحوم دوست کی انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ کارکن اپنے اندر محاسبہ کرنے کی عادت پیدا کریں۔ وہ اس بات کا جائزہ لیتے رہیں کہ کہیں اپنی گفتگوؤں، تقریروں اور تحریروں ہی کے پیچ و خم میں نہ الجھ کر رہ جائیں۔ اُن کے اعمال و کردار سے وہ سب کچھ ظاہر ہونا چاہئے

جو اسلام کا مطالبہ ہے۔ مجھ سے بارہا اس بات پر گفتگو ہوئی اور بعض کارکنوں کے بارہ میں اس قسم کے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس کا مجھ کو فائدہ مجھے پہنچتا تھا کہ دوسروں کے بارہ میں تو گیا، میں پہلے خود اپنا ہی حساب لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور موصوف کی صحبت سے یہ بات ایک حد تک پیدا ہو گئی تھی۔

افراد میں گھل مل کر حالات کا جائزہ لینا

مرحوم کی عادت تھی کہ وہ سب رفقاء کے ذاتی حالات سے بہت کچھ دلچسپی لیا کرتے تھے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے اندر رفقاء کے ذاتی حالات سے جتنی زیادہ واقفیت مرحوم کو تھی شاید ہی کسی دوسرے دوست کو ہو۔ ایسے مواقع بھی یاد ہیں کہ بعض احباب کے بارہ میں مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ میں اُن کے حالات سے سب سے زیادہ واقف ہوں لیکن جب مولانا سے بات ہوتی تو معلوم ہوتا کہ وہ مجھ سے بھی آگے ہیں۔ اُن کی اس عادت کا رفقاء پر یہ اثر پڑتا کہ موصوف کے سامنے دل کھول کر رکھ دیتے۔ یہ طریقہ آپس میں اُس بے تکلفی، اُس ہمدردی اور اُس قرب و یگانگت کی پیدائش میں مدد و معاون ثابت ہوتا جس کی انتہائی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

امیر جماعت تک صحیح حالات پہنچانا

عام کارکنوں سے گھل مل کر مرحوم اُن کی صلاحیتوں سے پوری واقفیت حاصل کرتے۔ ان میں سے جو جو جس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے، مولانا امیر جماعت کی خدمت میں بھیج رپورٹ ارسال کر دیتے۔ میرا اندازہ ہے کہ اُن کی اس روش سے آغاز جماعت میں، امیر جماعت کو افراد کی صلاحیتوں سے واقفیت حاصل کرنے میں اچھی مدد ملی ہو گی۔

ادیبوں پر تنقید

موصوف کے نزدیک ادیبوں کے قلم کی بہت اہمیت تھی۔ ایک اصولی جماعت کے ادیب کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کارکنوں کی تربیت، ذہنی ساخت، عملی کارکردگی پر گہرا اثر رکھتے ہیں۔ شروع ہی سے وہ ایسے قلموں پر خصوصی نگاہ رکھتے جن میں تحریر کی صلاحیت نظر آتی، اُن کی قدر بھی کرتے اور حتی الامکان رہنمائی بھی۔ جب مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی پہلی دفعہ جیل گئے تو تحریک کے میدان میں بہت سے ایسے احباب بھی کود پڑے تھے جن کا قلم ابھی خام، ذوق ناپختہ اور فہم دین نامکمل تھا۔ مرحوم ان پر خاص طور پر نگاہ رکھتے۔ بعض ایسی تحریریں بھی ہوتیں جن کو پڑھ کر انہیں دکھ ہوتا۔ مجھ سے بارہا ایسے احباب کی شکایت کی اور کہا کہ کاش یہ احباب لکھنے کے اس ڈھب سے باز آجائیں۔ میں نے بھی بارہا کہا کہ مولانا اگر آپ ان لوگوں ہی کو درست کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو بہت بڑا کام ہے۔ لہٰذا ان سے خط و کتابت اور براہ راست تعلق رکھیں۔ ان کا ارشاد ہوتا کہ محض خطوط لکھنے سے ذہن کی ساخت نہیں بدلی جا سکتی۔ اس کے لئے ایک ایسے قلم کی ضرورت ہے جو اپنے طرز استدلال، علمی پختگی اور زور بیان ہی سے دوسروں کو ساتھ بہا لے جائے۔ اگرچہ مولانا مودودی کی رہائی کے لئے تو ہر نقطۂ نظر سے مولانا بھی دوسرے احباب کے ساتھ کوشاں اور دست بدعا رہتے لیکن اس خاص مقصد کے لئے تو وہ بار بار کہا کرتے تھے کہ ادیبوں کی اصلاح کا یہ کام اُن کے بس کا روگ نہیں تھا بلکہ اس کے لئے ملتان جیل کا دروازہ کھلنا چاہیئے۔ اسی چیز کا اُن کے ذہن پر اتنا اثر تھا کہ جب مولانا مودودی رہا ہو کر آئے تو سب سے پہلے مرحوم نے اُن سے ایسے ادیبوں ہی کی شکایت کی۔

قلم کے بارہ میں ایک بات پر مرحوم بہت زور دیا کرتے تھے۔ جب کبھی کسی نوجوان دوست کا مضمون پڑھتے اور اس میں وہ بنیادی خامیاں محسوس کرتے جو نہ ہونی چاہیئے تھیں تو فرمایا کرتے کہ مجھے اندیشہ ہے نوجوانوں کو کہیں (PUBLICITY MANIA) (شہرت کا خبط) نہ ہو جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب کوئی نیا آدمی پرچوں میں اپنی تحریر اور اپنا نام دیکھتا ہے تو اُس کو اپنے بارہ میں بہت کچھ شبہات پیدا ہو جاتے ہیں، وہ پھر اسے پبلسٹی کا کچھ ایسا چسکہ پڑ جاتا ہے کہ وہ کسی ٹھوس علمی کام کے لئے مفید نہیں رہتا۔ مجھے بارہا کہتے کہ قلم کی ناپختگی کے عالم میں پبلسٹی کے میدان میں کود پڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی نابالغ کا وظیفۂ زوجیت کا ارتکاب کرنا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انسان اس وقت قلم اٹھائے جب وہ واقعتاً محسوس کر رہا ہو کہ اُسے واقعی تعمیری کام میں کچھ حصہ ادا کرنا ہے۔ محض لکھنے کی خاطر لکھنا ایک ایسا مرض ہے جس سے ہر وقت پناہ مانگنی چاہیئے۔

جماعتی مفاد کے لئے لچک

اب تو جماعت کی پالیسی بہرحال ایک حد تک متعین ہو چکی ہے۔ پالیسی کی تشکیل سے متعلق چھوٹے سے چھوٹے کارکن کے ذہن میں بھی الجھن نہیں لیکن ۱۹۴۹ء میں جب کہ مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور چند اور صاحب جیل میں تھے، "قرارداد مقاصد" پاس ہو جانے کے بعد جماعتی پالیسی، طریق کار اور طرز عمل میں بنیادی تبدیلیاں ہو گئیں۔ اس وقت حالات کا تقاضا اور ان تبدیلیوں کا جو مطالبہ تھا اس کے مطابق الیکشنوں میں حصہ لینا، ہنگامی پروگراموں کو اپنانا اور اسی قبیل کے ایسے کام کو جسے عرف عام میں "سیاسی" کہا جاتا ہے۔ اپنے آئندہ کاموں میں شامل کرنا جماعت کے پیش نظر تھا۔ بنیادی فیصلہ تو غالباً اسی وقت ہو چکا تھا جب مرحوم عرب ممالک کا سفر کر رہے تھے۔ البتہ اُن کی واپسی تک بعض ذہنوں میں ایک حد تک حالات کی تبدیلی سے الجھنیں باقی تھیں۔ احباب کا ایک حلقہ یہ کہتا تھا کہ اس اصولی تبدیلی کے بعد بھی یہ کوئی ضروری نہیں کہ سب ہی قسم کے کاموں میں حصہ لیا جائے۔ اُن کو اندیشہ تھا کہ اپنی رفتار ترقی، طاقت و استطاعت کے لحاظ سے جماعت اس وقت جس مقام پر تھی کہیں اسی قسم کے کاموں میں الجھ کر اپنے اخلاقی، دینی اور اصلاحی موقف سے گر نہ جائے۔ جس حد تک اس بنیادی اندیشہ کا تعلق تھا، اس کی اہمیت سے تو کسی کو بھی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن بعض دوسرے احباب کا خیال تھا کہ ان پروگراموں کو اپنا کر بھی جماعت اپنے مقام سے نہیں گرے گی۔ اور یہ کہ دونوں کام یعنی اصلاح نفس اور ہنگامی پروگرام ایک ساتھ نبھ سکتے ہیں۔ بدلے حالات کے تقاضوں سے فائدہ بہرحال اٹھانا چاہیے۔ جب مولانا مشرق وسطیٰ سے واپس آئے تو جماعت کے اندر اس ذہنی اختلاف کو محسوس کیا۔ مولانا کا ذاتی رجحان پہلی طرف تھا اور میرا دوسری طرف۔ اسی دوران میں مولانا گوجرانوالہ مقیم بھی تھے۔ اُن دنوں مولانا کو میں اکثر اس الجھن کی وجہ سے پریشان پاتا۔ مجھ سے علیحدگی میں بار ہا گفتگو میں اور تبادلۂ خیال ہوتا رہتا۔ لیکن افسوس کہ ہم ایک دوسرے کو ہم خیال نہ کر سکے۔ مولانا اس حلقے کے امیر اور میں قیم تھا۔ چنانچہ جماعتی پالیسی کے سلسلے میں باوجود امیر حلقہ ہونے کے انہوں نے مجھے پورا اختیار دے رکھا تھا اور شوریٰ کے فیصلے پر اپنی ذاتی رائے کو قربان کر رہے تھے۔ اُن کی انتہائی کوشش رہی کہ شوریٰ کے فیصلے کو بدل سکیں لیکن جب تک فیصلہ علیٰ حالہ قائم رہا، موصوف اسی کو نبھاتے رہے۔ میں نے ان دنوں ان کے مزاج میں وہ لچک محسوس کی جو ایسے افراد ہی کے حصے میں آتی ہے جنھیں اللہ نے بلند ظرف، حکمت دین اور اخلاص نیت دے رکھا ہو۔ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ خدا اور رسول کے واضح احکام کی خلاف کا تو یہاں سوال ہی نہیں۔ معاملہ حکمت و تدبیر ہی سے متعلق ہے۔ اس لئے شوریٰ کی رائے کو جب تک ایک حد تک نقصان دہ نہ پاؤں گا، اجتماعی فیصلہ پر بہرحال عامل رہوں گا۔

شخصی و ذاتی زندگی

موصوف سے متعارف اصحاب اُن کی خرابی صحت سے تو بخوبی واقف ہیں۔ مرحوم کو تنفس کی موذی بیماری تھی۔ اس ظالم نے ان کی قوت، طاقت اور ہمت کو کھا لیا تھا۔ جسم نحیف اور لاغر تھا۔ بیماری کسی موسم میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ اس خرابیٔ صحت کا اثر اُن کے مزاج پر پڑنا ایک فطری امر تھا۔ اسی لئے موصوف کے مزاج میں غصہ تھا۔ اور معمولی سی بات جو طبیعت کے خلاف ہوتی انہیں مشتعل کر دیتی تھی۔ لیکن یہ اشتعال بالکل ہی وقتی، ہوائی اور برقی ہوتا تھا۔ ابھی غصہ میں ہیں اور ابھی ایسے جیسا کہ کبھی غصہ آیا ہی نہیں تھا۔ جو احباب موصوف کے مزاج کی اس ساخت سے بے خبر تھے۔ ان کے بارے میں اندیشہ رہتا کہ وہ بدگمانیوں کے پھندے نہ باندھ لیں۔ لیکن جو اس حقیقت سے واقف تھے، اُن کے لئے موصوف کی ذات میں محبت اور کشش تھی۔

مرحوم مسلکاً اہل حدیث تھے۔ لیکن اہل حدیث کہلوانے کی "نسبت" وہابی جیسے بدنام لفظ کو ترجیح دیتے تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل اور عربی زبان کے نامور انشاء پرداز تھے۔ عرب دنیا میں اُن کے قلم کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ ندوہ کے احباب کی دوستی کا آخر وقت تک دم بھرتے رہے۔ اپنے استاد مرحوم سید سلیمان ندوی کا بڑا احترام کرتے تھے۔ جب کبھی ایسے معاملات پر گفتگو ہوتی، خصوصاً تصوف جن میں استاد بزرگوار سے انہیں اختلاف تھا، وہاں بھی دامن احترام ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ استاد مرحوم اور ندوی دوستوں سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ فرمایا کرتے کہ احیاء اسلام کی جو سعی جماعت اسلامی کر رہی ہے، اس کے لئے ندوہ نے اگر کوئی بڑی سے بڑی قربانی کی ہے تو استاد اور صاحب ندوہ کی [illegible] اکثر کہا کرتے تھے کہ استاد کی شفقت و محبت کے ان پہ بے احسانات

جن سے وہ کسی طرح بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اُن کی علمی بلندی کا بارہا ذکر کیا کرتے تھے ۔

علماء کے ایک طبقہ سے سوءِ ظن

مرحوم مستند عالم تھے۔ علماء میں رہے۔ ان کا گہرا مطالعہ کیا۔ شاید اسی لئے اُن کے ایک بہت بڑے طبقہ سے وہ بہت ہی نالاں تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ایسے علماء میں وہ خلوص نہیں جو مسلمان کی شان ہے۔ اس بارہ میں اُن کی ایک بات آج تک مجھے نہیں بھولی۔ موصوف کہا کرتے تھے کہ ان کا ایک بہت ہی بڑا طبقہ ایسا ہے جو دوسروں کے بچوں کو اپنے عربی مدارس میں تعلیم و تربیت کے لئے بلاتا ہے لیکن اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے حوالے کر رکھا ہے۔ اگر دین واقعی ایک نعمت ہے جیسا کہ بظاہر ان کا عقیدہ ہے تو کیا وجہ کہ وہ اپنی اولاد کو اس نعمت سے محروم رکھتے ہیں۔ جس جگہ بھی کسی عربی مدرسہ کے مولوی کے بارہ میں انہوں نے رائے قائم کرنا ہوتی تھی تو دوسری باتوں کے علاوہ اس کے اس پہلو کو وہ بہت نمایاں حیثیت دیتے تھے ۔

صاف گوئی

مرحوم بہت ہی صاف گو تھے۔ اور اُن کی یہ صاف گوئی ایسے احباب کے دلوں میں شکوک و شبہات کا موجب ہو سکتی تھی جو اُن کی طبیعت سے بخوبی واقف نہ تھے۔ اس صاف گوئی کے معاملہ میں وہ اپنی ذات کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ بارہا اپنی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے اور ان کو ہدفِ تنقید بناتے تھے۔ اپنے جماعتی رفقاء پر بھی منہ در منہ صاف صاف تنقید کرتے۔ اس معاملہ میں کسی سے کوئی مداہنت نہ تھی۔ چوں کہ ہر صاحب اُن کی دیانت، خلوص اور مخلصانہ طبیعت سے واقف تھے اس لئے اُس تنقید کو اس کی روشنی میں خوشی خوشی سنتے اور برداشت کرتے ۔

عزم و جرأت

موصوف اپنی کمزوری صحت کے باوجود، عزم و ہمت کی چٹان تھے۔ جماعتِ اسلامی جیسی پارٹی جو اربابِ اقتدار کی نظرِ عتاب کا ہدف بنی رہی ہے اوّل تو اس میں شمولیت ہی کمزور آدمی کا کام نہیں تھا لیکن پھر قدم قدم پہ اُس جرأت و مردانگی کا عملی اظہار تو بہرحال بڑی بہادری کا کام ہے۔ موصوف اس میدان میں بھی پورے اُترے ۔

غالباً ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے جب مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور طفیل صاحب کی گرفتاری ہوئی تو جماعت کے سبھی لوگ قریب قریب جیل کی دعوت کے منتظر ہی رہتے تھے۔ موصوف اُن دنوں راولپنڈی میں تھے۔ میں اگرچہ گوجرانوالہ میں تھا۔ لیکن ایک دن ایک ایسے دوست کے بارہ ہی میں گفتگو ہو رہی تھی۔ جو ان کا بھی دوست تھا۔ اور میرا بھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ وہ صاحب انہی دنوں مولانا کو بار بار یہ یاد دلایا کرتے تھے کہ دیکھئے آپ کی صحت کیسی ہے ؟ جیل میں آپ کے ساتھ کیا برتاؤ ہو گا ؟ آپ اس مصیبت کو کس طرح برداشت کر سکیں گے ؟ وغیرہ ذالک۔ مرحوم بے تکلفی میں یہ بتا گئے کہ انہوں نے اس دوست کو صاف صاف کہہ دیا کہ یہ سب باتیں درست لیکن حق کے راستے میں جو قدم اُٹھ چکا ہے وہ پیچھے تو ہٹ نہیں سکتا۔ رہا یہ سوال کہ میں کیا کروں گا ؟ تو اس کا ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ یہ کہ "مجھے جیل میں لے جا کر بھی اگر حکومت نے اس بیماری کے مطالبات کو پورا نہ کیا تو بس نتیجہ یہی تو ہو گا نا کہ مر جاؤں گا۔ اور اس کے لئے میں تیار ہوں"۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مولانا تو بے تکلفی اور روانی تقریر میں یہ بات کہہ گئے لیکن میرے نزدیک یہ جملہ دنیا کے اس قسم کے بیش گرانہ جملوں میں سے ہے جو زبانوں پہ بے ساختہ آجاتے ہیں لیکن کبھی نہ کبھی حد تک ہونے والے واقعات کے غماز ہوتے ہیں چنانچہ قادیانی ایجی ٹیشن کے ناکردہ گناہ کی وجہ سے جب جماعتِ اسلامی پر حکومت کا استبدادی چکر چلا تو پنجاب کے باقی نمایاں کارکنوں کی طرح مرحوم بھی جیل میں تھے۔ جیل کی زندگی نے اُن کی بیماری اور کمزوری صحت میں بہرحال اضافہ کیا جو بالآخر اُن کی موت پر منتج ہوا۔ کہے ہوئے الفاظ بھی پورے ہو گئے اور عزم و ہمت کی لاج بھی رہ گئی ۔

جیل کے دوران میں عزیزم عاصم کے ذریعہ مرحوم کی خرابیٔ صحت کا پتہ چلتا رہا۔ جب رہا ہوئے تو خط آیا کہ مجھ سے ملاقات کے لئے دل بہت چاہتا ہے۔ اور یہ کہ مجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں جو خط و کتابت کی متحمل نہیں ہو سکتیں میں خود بھی چاہتا تھا کہ کسی طرح راولپنڈی پہنچ کر مرحوم سے ملوں ...

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

رئیس احمد جعفری

آہ، کس طرح اُسے مرحوم لکھوں جو زندگی سے بھرپور تھا جس نے اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی صلاح و فلاح کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، جس نے زندگی کی ساری امنگوں اور حوصلوں کو، ترقی کے سارے امکانات کو، عروج دنیاوی کے تمام توقعات کو ٹھکرا دیا، وہ عربی زبان پر وہی دسترس رکھتا تھا جو ایک اہلِ زبان رکھتا ہے۔ جس کا دل بھی مسلمان تھا، دماغ بھی، روح بھی، اور فکر و تخیل بھی، وہ دشمنوں کو دوست بنا لیتا تھا، دوستوں سے مخالفت مول لے لیتا تھا، اپنوں سے رُوٹھ جاتا تھا، اگر مقصد اور منزل کا سوال درپیش ہو۔

مسعود عالم میرے ندوہ کے دوستوں میں تھے، وہ مجھ سے دو سال آگے تھے، لیکن اس فرق کے باوجود ذاتی تعلقات ندوہ ہی میں استوار ہوئے اور پھر زندگی کی آخری سانس تک، اگرچہ کبھی کبھی ان میں تعطل پیدا ہوتا رہا، لیکن فرق نہ آیا، وہ جماعتِ اسلامی کے رکنِ رکین تھے، ہر بات کو جماعت ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے، مجھے متعدد معاملات و مسائل میں فروعی اور اصولی اختلافات تھے لیکن اختلافات اپنی جگہ پر تھے، ذاتی مراسم اور تعلقات اپنی جگہ!

طالب علمی ہی کے زمانہ سے عربی ادب سے والہانہ شغف رکھتے تھے، معاصرین میں عربیت کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز اور یگانہ رہے حضرت سید صاحب قبلہ مغفور کی سرپرستی میں عربی کا ایک بلند پایہ ماہنامہ "الضیاء" ندوہ سے نکالا، جو ہندوستان کے عربی داں طبقہ میں، اور ممالک عربیہ میں بہت مقبول ہوا۔ اگرچہ پتھر پر چھپتا تھا اور عرب ٹائپ کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ وہ پتھر کا چھاپا پڑھتے ہی نہیں۔ لیکن وہ "الضیاء" کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، اور شوق کی نگاہوں سے پڑھتے تھے، ممالک اسلامیہ کے اہلِ علم اور اہلِ قلم اصحاب سے اسی زمانہ میں روابط اور تعلقات قائم ہوئے، جو آگے چل کر بہت زیادہ مستحکم ہو گئے، جماعتِ اسلامی کے ذہنی اور علمی افکار کو جس خوبی سے مسعود عالم نے عربی میں منتقل کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی اس خوبی اور سلیقہ سے یہ کام انجام نہیں پا سکتا تھا، جو اس فقیر بوریہ نشین نے کر دکھایا، عربی زبان پر مسعود عالم کو جو عبور تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی کتاب "لغات جدیدہ" میں، جب مرورِ ایام سے کمی محسوس ہوئی اور بہت سے نئے عربی الفاظ و اصطلاحات و معربات کے اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اپنی بے پناہ مصروفیات کے باعث وہ اسے انجام نہ دے سکے، تو ان کی نظرِ انتخاب مسعود عالم ہی پر پڑی، لغات جدیدہ کا تتمہ انہوں نے اپنے استاد کے حسب الحکم لکھا۔ اور دار المصنفین سے انہی کے نام سے شائع ہوا۔

ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد مسعود عالم نے کئی مشغلے اختیار کئے، کچھ عرصہ تک ندوہ ہی میں رہے، پھر خدا بخش خاں لائبریری کے کیٹلاگر مقرر ہوئے، سید صاحب کے پاس بھی کچھ دن گزارے، عبد الوہاب نجدی پر ایک بڑی اچھی اور تحقیقی کتاب "ایک بدنام مصلح" لکھی، عربی تو اہلِ زبان کی طرح لکھتے ہی تھے، اردو بھی بڑی اچھی اور ستھری لکھتے تھے، ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی گھلاوٹ اور شیرینی محسوس ہوتی تھی۔

اپنے مسلک پر مخلص لوگوں کی طرح بڑی سختی سے قائم تھے، اور جو بحث کرتے کرتے کبھی پر تاؤ آ جاتا تھا، اس سے خفا بھی ہو جاتے تھے، لیکن ذرا دیر کے لئے، لیکن جن لوگوں کے اخلاص کے وہ قائل تھے، یا جن کی علمی اور تحقیقی حیثیت کے وہ معترف تھے، اختلافِ فکر و نظر کے باوجود، دل کی محبت

سے سرشار تھا جب کبھی ان کا ذکر چھڑ جاتا تو زیادہ تر گفتگو ان کی خوبیوں ہی تک محدود رہتی تھی! ——— بڑی فراخ دلی سے محاسن کا اعتراف کرتے تھے۔

کراچی میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں ملاقات ہوئی تھی، ندویوں کا ایک اجتماع تھا، مصروف ہونے کے باوجود آئے، اور آخر تک اجتماع کی سرگرمیوں میں شریک رہے، بلکہ ایک ندوی کی طرح حصہ لیتے رہے، مسعود عالم سب کچھ تھے، لیکن ندویت کبھی ان سے منفک نہ ہو سکی، سید صاحب کی وفات پر جب بعض اکابر کی طرف سے سیرت سلیمانی کی تسوید و ترتیب کے لئے غیر ندوی اصحاب کے نام پیش کئے گئے تو مسعود عالم اسے برداشت نہ کر سکے، اس سلسلہ میں ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے "صدق" میں ان کا مکتوب بھی شائع ہو چکا ہے، اس کی ایک ایک سطر سے یہی جذبہ ابھر رہا ہے۔

گزشتہ ہفتہ وہ کراچی آئے، اور حکیم نصیرالدین ندوی کے مہمان خانے میں ٹھہرے، دمہ کی شکایت، طالب علمی ہی کے زمانہ سے تھی، ہر طرح کا علاج کیا، مگر صحت نہ ہوئی، علاج سے صرف وقتی فائدہ ہو جاتا تھا، لیکن ہمت اور عزیمت کا یہ حال تھا کہ ادھر دمہ کے شدید اور قریب قریب ہلاک دورے سے فارغ ہوئے، ادھر کرسی پر تن کر کام کرنے بیٹھ گئے، گویا ابھی جو شخص مرگ و زیست کی کش مکش میں گرفتار تھا، وہ مسعود عالم نہیں کوئی اور تھا! ——— ہاں تو وہ حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے، دوا کا بھی اچھا انتظام تھا، اور پرہیزی غذا کا بھی بندوبست تھا، میں ایک روز حکیم صاحب کے ہاں گیا، ان سے کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں، پھر میں رخصت ہونے کے لئے اٹھا، حکیم صاحب نے کہا "مسعود عالم آئے ہیں ان سے مل لو" میں نے کہا "پھر کسی وقت"! فرمایا "نہیں، میں ان سے کہہ چکا ہوں، نہیں آتے ہوں گے"! اس پر انہوں نے کہا "وہ مجھ سے ملنے کیوں آنے لگے، آپ سے ملنے آئیں گے، ——— مل لینا چاہیئے ——— !"

ہم دونوں مسعود عالم کے کمرہ میں پہنچے، اسی تپاک و محبت سے ملے، جو ان کی سرشت تھی، ملاقات یا تو بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی، یا ہوئی تو بہت مختصر، گفتگو دراز تر ہوتی چلی گئی، سید صاحب کی ذات و صفات، مولانا عبدالماجد کی تحریر و تحریک، مولانا امین احسن اصلاحی کا جماعت کے خلاف فتویٰ، اور اس کے الفاظ، سیاستِ عالم اسلام، سیاسیاتِ ملی، دوسرے دن حکیم صاحب نے حضرت جگر مرادآبادی کی دعوت کی تھی، "پرتکلف دعوت" اور بے تکلف اجتماع لطف آ گیا، مسعود عالم بھی اس اجتماع سے کیف سے پورے طور پر لطف اندوز ہوتے رہے، جگر صاحب کے کلام کے بعد، ماہر القادری صاحب نے اپنے مخصوص ترنم، اور دل آویز لحن کے ساتھ اپنا کلام سنایا، خاص طور پر نعت، سماں بندھ گیا، بڑی دیر تک یہ نشست قائم رہی، دو دن کے بعد صاحبزادہ اسحاق جان نے مخصوص احباب کو "لنچ" پر مدعو کیا، یہاں بھی مسعود عالم اپنی تمام دلآویزیوں کے ساتھ موجود تھے، وہی تبسم، وہی تکلم، لنچ کے بعد انہوں نے سامانِ سفر بندھوانا شروع کیا، حکیم صاحب نے پوچھا "یہ کیا"؟ کہنے لگے، جماعت کے اجتماعات کالونی میں ہو رہے ہیں، سب وہیں ٹھہرے ہیں، لہٰذا مجھے بھی جانا پڑ رہا ہے، اجتماعات کے بعد انشاء اللہ پھر آ جاؤں گا، صحت اچھی خاصی تھی، دمہ چند روز کوئی خاص شکایت بھی نہیں ہوئی تھی۔ کسے معلوم تھا، یہ آخری ملاقات ہے، یہ مسکراتا ہوا چہرہ، آنکھیں پھر کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

یہ واقعہ ۱۴ مارچ کا ہے، ۱۵ کو حکیم صاحب، صاحبزادہ اسحاق جان، اور محمود صاحب نے سومامد کا سیر و شکار کا پروگرام بنایا، طے یہ ہوا کہ رات میں وہیں گزاروں، اور صبح ۸ بجے کار پر ہم لوگ روانہ ہو جائیں، میں تھکا ہوا تھا، جلدی سو گیا، صبح اٹھا، اور اچکن پہن کر باہر نکلا، کہ غازی صاحب کے ہاتھ میں صبح کا اخبار دیکھا، پہلے صفحہ پر ماتمی حاشیہ کے ساتھ ایک خبر پر نظر پڑی، "مولانا مسعود عالم کا انتقال" خبر پڑھ کر دل دھک سے ہو گیا، یقین ہی نہیں آتا تھا۔ یہ خبر صحیح ہو سکتی ہے، ہر موت، انسان کے اس وہم باطل پر ٹھوکر لگاتی ہے، کہ زندگی مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ ناپائدار ہے۔ لیکن ہر حادثۂ موت کے بعد انسان پھر دنیا کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے، اور سب سے زیادہ کمزور چیز کو دائمی، اور جاودانی سمجھ کر غفلت میں مبتلا ہو جاتا ہے، سمجھنے لگتا ہے۔ موت ہم سے بہت دور ہے، اب اس طرح کا کوئی حادثہ نہیں پیش آئے گا، لیکن وہ آتی ہے بار بار آتی ہے، کبھی ناکام نہیں جاتی، ہر مرتبہ اپنی سطوت اور جبروت کا سکہ بٹھا کر جاتی ہے، حادثہ جب تک واقع نہیں ہو جاتا، دل اسے ناممکن سمجھتا ہے اور جب واقع ہو جاتا ہے تو اپنی بے بسی پر رونے لگتا ہے، گریبان پھاڑنے لگتا ہے، فریاد و شیون سے ہنگامہ بپا کر لیتا ہے ——— غازی صاحب نے بتایا خبر گیارہ بجے رات کو آئی تھی، اور نصیر اسی وقت چلے گئے تھے، میں نے

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ـــــــ

شکایت کی مجھے یوں نہیں جگایا؟ فرمایا بڑے اہتمام سے یہ خبر تم تک نہیں پہنچنے دی، وہ کہہ رہے تھے، دل کمزور ہے، اس صدمے سے اٹھا کر خبر سنائی جائے گی تو زیادہ اثر پڑے گا! اتنے میں حکیم صاحب بھی آگئے، معلوم ہوا، رات کے تین بجے تک کالونی کی ایک ایک گلی کا طواف کرنے کے باوجود وہ جگہ ڈھونڈ نکالی جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا، جب دھوپ نکل چکی تھی، ہم لوگ پھر کالونی پہنچے، ایک بڑا سا خیمہ تھا، جس کے وسط میں سفید لباس میں ملبوس، ایک سیاہ چارپائی پر مسعود عالم چین کی نیند سو رہے تھے، اور کچھ جماعت کے رفقا تھے، کوئی قرآن میں مصروف تھا، کوئی اخبار پڑھ رہا تھا۔ ـــــــ
چادر ہٹا کر میں نے اور حکیم صاحب نے منہ دیکھا، معلوم ہوتا تھا ملت اسلامیہ کا یہ وفادار، اور غمگسار!

ابھی ابھی روتے روتے سو گیا ہے!

خواص میں صرف جناب عبدالجبار صاحب تشریف رکھتے تھے، ان سے حکیم صاحب نے تعزیت کی، اور چلے آئے۔

"ریاض" کا سلیمان نمبر دیکھ کر مسعود عالم بہت خوش ہوئے تھے، بڑے مبالغے کے ساتھ داد دی تھی، ایک ایک مضمون پڑھا تھا اور بڑے شوق سے پڑھا تھا، وعدہ کیا تھا کہ فرصت مل گئی تو پھر خود بھی اپنے تاثرات سید صاحب پر قلم بند کریں گے، کالونی جانے سے دو تین دن پہلے حکیم صاحب کی معرفت ایک خط بھی مجھے لکھا تھا، اگر میں کہوں کہ یہ مسعود عالم کی آخری تحریر تھی تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، وہ خط یہ ہے:-

"محب مکرم جناب حکیم نصیر الدین ندوی کی عنایت سے "ریاض" کا سید سلیمان نمبر نظر سے گزرا، خوشی ہوئی، اور بے اختیار آپ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرنے کو جی چاہا، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے، ہم وابستگان سید کی دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں اور رہیں گی۔

استاذ مرحوم حضرت سید صاحب قبلہ پر ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا، وہ کہ چالیس برس اپنے بزرگوں، دوستوں، ہم چشموں اور عزیزوں کی مرثیہ خوانی کرتا رہا، آج اس کی یاد میں جس قدر آنسو بہائے جائیں، کم ہیں، اس کی خدمات کے اجاگر کرنے کے لئے جتنی مجلسیں بھی ترتیب دی جائیں، ان کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اس جامع اور ہمہ گیر شخصیت کا ہم پر یہ حق ہے کہ اس کے کارناموں سے دنیا کو روشناس کرائیں اور نہ جاننے والوں کو بتائیں کہ کیسی بیش بہا نعمت ہم سے چھن گئی، حق یہ ہے کہ پوری ملت اس غم میں سوگوار رہے تو بجا ہے۔

یہ سطریں آپ کے خاص نمبر کی رسید کے طور پر لکھ رہا ہوں، اس وقت کوئی مضمون لکھنا مقصود نہیں، البتہ مجھے ندامت ضرور ہے کہ آپ کی ترتیب دی ہوئی بزم سلیمانی کی شرکت سے محروم رہا، وفقا اللہ زندگی رہی تو پھر کبھی یہ سعادت حاصل ہو جائے گی۔

یار زندہ صحبت باقی، والسلام

نظامی دواخانہ۔ کراچی | خاکپائے سید
۲ رجب ۱۳۷۳ھ | مسعود عالم ندوی

آہ! مسعود عالم رخصت ہو گیا! ایک بہت اچھا ندوی ہی نہیں، ایک بہت اچھا مسلمان بھی!
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

رئیس احمد جعفری
محفوظ ساہیوال ۱۰ اپریل ۱۹۵۴ء (مکتوبہ ... کراچی)

ـــــــ

دوست کی یاد میں

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

سنہ ۲۹ء کی ابتداء میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم سے پہلے پہل تعارف ہوا، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک نوجوان طالب علم تھے۔ عمر تقریباً ۱۸-۱۹ سال، کشیدہ قامت، چھریرا بدن۔ صاف رنگ کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، زبان میں لکنت، لیکن قلم میں اسی قدر روانی انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری سال (درجہ ہشتم) کا امتحان دیا تھا، اور تکمیلِ ادب کے طالب علم تھے، وہ عربی ادب و انشاء میں شروع ہی سے ممتاز تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں بھی وہ اپنا روزنامچہ عربی میں لکھتے تھے۔ ان کا یہ عربی ذوق سب کو معلوم تھا، اور جو لوگ ان کے ذوق میں کسی طرح کے شریک تھے، ان کا وہ مرکز اور سرِ حلقہ تھے، راقم سطور کو بھی اپنے عرب اساتذہ کی صحبت اور فیضِ درس سے اس کا چسکا تھا اور وہ بھی عربی میں لکھتا پڑھتا رہتا تھا۔ اس وقت میرا تعارف ندوی حلقہ میں سابق ناظم ندوۃ العلماء (مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ) کے فرزند اور حال نائب ناظم ندوۃ العلماء (ڈاکٹر سید عبدالعلی) کے چھوٹے بھائی اور ایک ایسے طالب علم کی حیثیت سے تھا جس کو اپنی کم عمری کے باوجود عربی ادب و انشاء سے شغف تھا۔ اس وقت مسعود صاحب شبلی دارالاقامہ میں مقیم تھے، مولانا شبلی مرحوم فقیہ دارالعلوم کے پاس میرا ایک فقہ کا سبق تھا، اور مسعود صاحب کا کمرہ راستے میں پڑتا تھا، ایک آدھ بار گذرتے ہوئے مسعود صاحب نے مجھے اندر آنے اور کچھ دیر بیٹھنے کی دعوت دی، میرے لیے ایک دلچسپی کا سامان یہ تھا کہ عربی رسائل و مجلات جو طلبہ کے دارالمطالعہ میں آتے تھے، وہ دن میں اکثر مسعود صاحب کے پاس رہتے، دمشق کے مشہور علمی و ادبی رسالہ "المجمع العلمی" کے دیکھنے کا سب سے پہلے وہیں اتفاق ہوا۔

کچھ عرصہ کے بعد طلبہ دارالعلوم کی روایات کے مطابق مسعود صاحب نے عربی کا ایک قلمی رسالہ جاری کیا جس کا نام "الضیاء" تھا، اس کے مضمون نگاروں کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ اپنے مضامین خود اپنے قلم سے لکھ کر شامل کریں، رسالہ کے ممتاز مضمون نگاروں میں ہونہار ایڈیٹر کے علاوہ مولانا عبدالرحمن کاشغری ندوی (حال استادِ ادب مدرسہ عالیہ ڈھاکہ) مولانا محمد ناظم ندوی (حال شیخ الجامعہ العباسیہ، بہاولپور) اور جواں مرگ ادیب ابو یوسف بہاری مرحوم تھے، اس رسالہ کے شمارے ابھی تک طلبہ کی انجمن میں محفوظ ہیں، ان کو دیکھ کر آج بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس قلمی رسالہ کا نوعمر مدیر ایک دن ملک کا بہت بڑا ادیب اور پختہ کار صحافی بنے گا۔

مسعود صاحب مرحوم زمانۂ طالب علمی ہی میں بڑی بے چین اور حال حوصلہ طبیعت رکھتے تھے، وہ تحریکِ خلافت اور اس کے افکار و ادبیات سے بہت متاثر تھے، ہم لوگوں میں ان کا مطالعہ سب سے زیادہ وسیع اور تازہ تھا، ان میں شروع سے انقلابی رجحانات، اور انگریزی حکومت کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی تھی، اور وہ احیاءِ خلافت اور اسلامی اقتدار کی بازگشت کے متمنی تھے، وہ ترکی کی انجمن اصلاح و ترقی کے نوجوانوں کی طرح سوچتے اور منصوبے بناتے تھے، چند ہم خیال دوستوں کا حلقہ بنا، تو انہوں نے طلبہ کی ایک خاص انجمن بنائی جس کا مقصد انقلابی خیالات کی توسیع و اشاعت اور اپنی ذہنی و سیاسی تربیت تھی، اس انجمن کے ارکان (جو تعداد میں اس وقت پانچ سات سے زائد نہ تھے) انجمن کے مقاصد کے ساتھ وفاداری اور کامل رازداری کا عہد کرتے تھے، اس کی نشستیں دریائے گومتی کے کنارے اہتمام کے ساتھ ہوتی تھیں، طلبہ اور نوجوانوں میں انقلابی خیالات کی تخم ریزی اور دینی جذبات کی پرورش کے لیے مختلف تجاویز سوچی جاتی تھیں، اس سلسلے میں انجمن کی شاخیں قائم کرنے اور مطالعہ کے مراکز اور حلقے بنانے کا پروگرام تھا، ایک خاص موقع پر جب اس کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا، کہ خفیہ پولیس کچھ تفتیش کرے اور بعض غیر متعلق نوجوان زد میں آجائیں،

اس سلسلے کی تحریریں اور کاغذات جلا دئے گئے، لیکن اسی زمانہ کا ایک خط کسی طرح پڑا رہ گیا ہے جو ایک تاریخی یادگار ہے، یہ خط مرحوم نے اس ناچیز کو لکھا تھا، اس میں ان کے بلند عزائم، ان کی ادبی پختگی اور ان کی غیر معمولی صلاحیتیں اچھی طرح جھلکتی ہیں۔ اور الہلال کا اسلوب تحریر صاف نمایاں ہے، یہ خط ۲ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ کا لکھا ہوا ہے، اور بہار شریف سے لکھا گیا ہے جہاں مولانا تعطیل میں مقیم تھے لکھتے ہیں:

برادر مخلص

ازکی التحیات

محبت نامہ ملا، لیکن وقت پر شافی جواب نہ لکھ سکا، کیوں؟ افسوس! کہ عذر لنگ بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا، صرف معذرت خواہ ہوں — جذبات کا ہجوم ہے، خیالات کا انبار ہے، دل چاہتا ہے کہ دل کھول کر رکھ دوں، درد جگر کا تقاضا ہے، کہ صفحۂ قرطاس کو اشک ہائے جگر سے لالہ زار بنا دوں، کیا لکھوں؟ اپنی تباہی کا مرثیہ مگر اب یہ بھی بے سود جنت نگاہ کشمیر کی گلگوں پیراہنی کا ذکر کروں[1] کیا فائدہ؟ کہ اخبارات کے ذریعے آپکے دل و دماغ بھی بادہ ... سے مخمور ہوں گے، کیا اپنی بدنصیبی کا ماتم کروں نیرنگئ توم تو سنت سجاد کی یاد تازہ کر رہے ہیں عاملان دین کو زنجیر بہ پہنائی جاری ہیں اور ہم نشۂ غفلت سے ایسے سرشار ہیں کہ سروں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ تمام چیزیں اپنی جگہ پر توجہ کی محتاج اور دل و جگر کو ذوق جگر کاوی دے رہی ہیں، لیکن میں نہ شب و شبینہ کی شغل مے خواری کا ذکر چھیڑوں گا، اور نہ صبح سعادت کی کیف آور رنگینیوں سے بحث کروں گا، بلکہ اجازت دیجئے، تو افسانۂ دیرینہ کے متعلق کچھ منتشر و غیر مربوط جملے پیش کر دوں — جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اپنے خیالات میں مستقل ہوں۔ جو کچھ بن پڑتا ہے اس سے باز نہیں رہتا معنوی اعتبار سے ایک سنانح قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کن خطوط پر اس کام کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں، اگر پروپگنڈا اور دعایت پر اعتماد ہے، تو اب تک اس کا بھی کافی سامان نہیں، افراد کا پیدا کرنا تو ذرا مشکل کام ہے، جب تک تربیت گاہ کا انتظام نہیں ہوتا، یہ کام صحیح طور پر نہیں ہو سکتا — اس وقت اصل میں ہم خیال حضرات کی تنظیم، اور ان میں کام کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، بہرحال یہ تمام چیزیں عمل اور استعداد کی محتاج ہیں، مختلف جگہوں میں جمعیت نوجوانان اسلام کی بنا ڈالنی چاہیے، جس کا ظاہری مقصد تبادلۂ افکار، زبان و ادب کی ترقی، مطالعہ جرائد و اخبارات ہو، — یہ تمام باتیں ابتدائے کار سے پیش نظر ہیں امید ہے کہ آپ تمام امور پر غور فرما کر جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

مسعود صاحب اس وقت درجۂ تکمیل کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ (THESIS) تیار کر رہے تھے، جس کا عنوان یہ تھا کہ اسلام کے آنے کے بعد عربی شاعری کو زوال نہیں ہوا، بلکہ اس نے ترقی کی، اس مضمون میں انھوں نے مورخین ادب کے اس مشہور دعوے کو چیلنج کیا تھا کہ اسلامی اثرات سے عربی شاعری کے زور، روانی اور مضامین کی آمد میں فرق پڑ گیا تھا۔ اسلامی عقائد و آداب اور اس کی تہذیب، تربیت اور ماحول نے اس کو پابند و بے روح بنا دیا تھا، اس سلسلے میں انھوں نے اسلامی دور کے شعراء کا کلام اپنے ثبوت میں پیش کیا تھا اور تفصیل سے اس پر بحث کی تھی کہ اسلام نے زندگی کے اور شعبوں کی طرح ادب و شاعری کو بھی بہت کچھ عطا کیا، اسی خط میں اس مضمون کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: میں نے ڈاکٹر صاحب[2] کے نام ایک جوابی کارڈ روانہ کیا تھا۔ مگر جواب سے محروم ہوں، میرا مودبانہ سلام عرض کر دیجئے، انشاءاللہ میں اطروحہ جلد از جلد بھیج دوں گا، ایک صاحب کو املا کرا دیتا ہوں، اس کے معاوضہ میں وہ لکھ رہے ہیں، دیکھیے کب تک پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔

اس زمانہ کا ایک اہم واقعہ جس نے ہم سب کی زندگی پر خاص اثر ڈالا، یہ تھا کہ شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی ہمارے دارالعلوم میں استاذ ادب ہو کر آئے۔ موصوف عالم عربی کے ممتاز ترین محقق و ادیب اور صرف و نحو میں سند و حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی بول چال اور عام تحریر کی زبان پوری عربی دنیا میں اپنی صحت، سلاست، برجستگی اور عربی محاورات میں بے نظیر ہے۔

---

[1] اس زمانہ میں کشمیر کی تحریک چل رہی تھی اور بہت سے مسلمان رہنما و علماء قید و بند میں تھے۔ [2] ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء

شیخ کے آنے سے دارالعلوم میں ایک نئی ادبی زندگی اور چہل پہل پیدا ہوگئی، مسعود صاحب اگرچہ دارالعلوم سے فارغ ہوگئے تھے اور صاحبِ قلم اور ادیب تھے، لیکن شیخ کی ملاقات کے بعد انھوں نے اندازہ کرلیا، کہ ان کی طالب علمانہ زندگی کا اختتام نہیں بلکہ اس کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ یوں تو ہم سب شیخ کے تلامذۂ خاص اور مریدانِ با اختصاص تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی ذات سے سب سے زیادہ مسعود صاحب نے فائدہ اٹھایا، اور پھر اس فائدے کو اپنے قلم و اخلاص سے چمکایا۔

غالباً ۱۳۳۲ھ تھا کہ میں نے شیخ کی معیت میں بنارس، اعظم گڑھ، مئو، مبارک پور کا سفر کیا، دارالمصنفین کے زمانۂ قیام میں مولانا سید سلیمان ندویؒ اور بلالی صاحب نے دارالعلوم سے ایک عربی رسالہ کے اجراء کا فیصلہ کیا، اور اس کی ادارت کے لیے قرعۂ فال قدرتی طور پر مسعود صاحب کے نام پڑا، ان سے زیادہ نہ صرف ہمارے حلقہ میں بلکہ سارے ہندوستان میں اس کام کے لیے کون موزوں تھا؟ محرم ۱۳۵۱ھ سے رسالہ "الضیاء" کا اجراء ہوا، رسالہ کے مضمون نگار اگرچہ بہت محدود تھے، اور پرچہ پتھر پر چھپتا تھا، جو عرب قارئین کے مذاقِ طبیعت کے بہت خلاف اور ان کی نگاہوں پر بار ہوتا ہے، لیکن زبان کی صحت، حسنِ انشاء اور مضامین کی بلندی کی وجہ سے وہ ممالکِ عربیہ کے سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا اور اس کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا، اور موقر و وسیع رسائل و مجلات نے دل کھول کر اس کی داد دی، لبنان کے امیر ناصرالدین نے جو اپنی ادبی تنقید اور ادبی ذکاوت حس میں بدنامی کی حد تک نامور تھے، اپنے اخبار "الصفا" میں بڑے بلند کلمات کے ساتھ تبصرہ کیا، غالباً اسی میں تھا، کہ یہ ہندی رسالہ اپنی صحتِ زبان اور عربیت میں خود ممالکِ عربیہ کے بہت سے رسالوں پر فوقیت رکھتا ہے، اسی طرح صیدا (شام) کے مشہور ادبی رسالہ "العرفان" نے بڑا شاندار تبصرہ کیا، بغداد کے عیسائی محقق انستاس کرملی نے جو اپنی ادبی گرفتوں میں بہت خورد بین اور حرف گیر واقع ہوا تھا مسعود صاحب کو ایک خط میں "علامہ" کے لفظ سے خطاب کیا اور لکھا کہ اگرچہ آپ کم عمر ہیں، لیکن آپ کے علم و فضل کی وجہ سے میں مجبور ہوں، کہ آپ کو علامہ کے لفظ سے خطاب کروں۔

اس رسالہ میں علاوہ ادبی مضامین کے عالمِ اسلام کی اہم خبریں اور ہندوستان کے سیاسی حالات پر تبصرہ اور تلخیص بھی ہوتی تھی مسعود صاحب یہ حصہ بھی پوری روانی اور بے تکلفی سے لکھتے تھے، وہ عموماً مضامین قلم برداشتہ لکھتے اور اپنے مسودہ میں بہت کم حک و اصلاح کرتے، میں بھی ایک طرح سے رسالہ کا ایک مستقل مضمون نگار رہنے کی وجہ سے شریکِ ادارت تھا، اور بہت غور و فکر کے ساتھ بنا سنوار کر لکھنے کا عادی تھا جو مضامین جلد دینے کے ہوتے تھے، یا ادارتی یا صحافتی قسم کے ہوتے وہ مسعود صاحب خود ہی لکھتے تھے، جس مضمون کو بہت اہتمام سے لکھنا ہوتا تھا وہ اکثر میرے سپرد کرتے، اور کہتے تھے، کہ میں تو پیشہ ور لکھنے والا (PROFESSIONAL) ہوں، اس سرعت کے باوجود ان کے ہر مقالے میں ادبی چاشنی اور زبان کا لطف ہوتا۔

۱۳۵۲ھ میں بلالی صاحب دارالعلوم سے علیحدہ ہو کر زبیر (عراق) چلے گئے، اور وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی، مسعود صاحب پر یہ جدائی بہت شاق تھی کہ ان کو ابھی اپنے فاضل استاذ سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا انھوں نے اس کا عزم کرلیا کہ وہ دارالعلوم سے چھٹی لے کر کچھ عرصہ کے لیے بلالی صاحب کے پاس زبیر میں قیام کریں گے، اور علومِ عربیہ میں ان سے مزید استفادہ کریں گے، محرم ۱۳۵۳ھ کے خط میں لکھتے ہیں:

"بلالی صاحب زبیر میں قیام پذیر ہیں، میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ ایک سال کے لیے ہو آؤں، ڈاکٹر صاحب راضی ہیں، اور پوری تائید کرتے ہیں مسعود صاحب پہلے متامل تھے۔ مگر اب راضی معلوم ہو رہے تھے، مگر ان کا پہلے مطالبہ یہ ہے کہ علی میاں کو بلا کر الضیاء سپرد کردو اس کے بعد رخ کرسکتے ہو، سید صاحب کو خط لکھا ہے، اب صرف ان کے جواب کا انتظار ہے۔ اگر حسبِ توقع انھوں نے اجازت دے دی، تو میرا سفر صرف آپ کے اختیار میں رہے گا، ادارت و ترتیب کا آپ ذمہ لے لیں، دوڑ دھوپ کا کام کوئی اور صاحب کرلیں گے۔"

پھر اس کے ایک ہفتہ بعد ۱۲ محرم کو لکھتے ہیں:

"مقصود سفر کیا ہے، کیا کہا جائے؟ آپ میرے خیالات اور ارادوں

۱- ... دارالمصنفین، اعظم گڑھ و رکن انتظامی دارالعلوم ندوۃ العلماء

بخوبی واقف ہیں، پہلے بلالی صاحب کے پاس زبیر حاضر ہوں گا اور وہیں قیام کروں گا۔ اگر حالات و مصارف نے اجازت دی، تو دمشق بغداد و فلسطین تک کا ارادہ ہے، مگر ابھی خواب ہی خواب ہے۔"

اس خواب کی تعبیر اس طرح نکلی کہ صوبہ کی حکومت نے خفیہ پولیس کی رپورٹ پر پاسپورٹ منظور نہیں کیا، مسعود صاحب تو عراق نہ جا سکے، مگر میں دارالعلوم آ گیا۔ ہم لوگ دارالعلوم کی بالائی عمارت کے ایک کمرے میں مقیم تھے، مسعود صاحب "الضیاء" کی ادارت کے علاوہ دارالعلوم میں ادب و انشاء کے معلم بھی تھے، میں ادب و تفسیر کا معلم اور "الضیاء" کا مستقل مضمون نگار تھا۔ ہمارا کمرہ، ہماری رہائش گاہ، "الضیاء" کا دفتر اور عربی ذوق رکھنے والوں کا مرکز تھا، "الضیاء" کے تبادلہ میں مصر و شام کے بکثرت رسائل و مجلات آتے تھے، ان کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا کہ ہم لکھنؤ میں نہیں، بلکہ کسی عرب شہر میں ہیں، ہر وقت عرب ادباء و اہل قلم پر تبصرہ و تنقید اور مختلف ادبی موضوعات پر اظہار خیال اور مذاکرہ رہتا عربی ڈاک ہاتھوں ہاتھ لی جاتی، اور بڑے شوق سے پڑھی جاتی، اس وقت ہمارا یہ چھوٹا سا کمرہ اور محدود ماحول اس ہندی فضا میں عربی کا جزیرہ بنا ہوا تھا۔ شب و روز ساتھ گزرتے، صبح و شام کی تفریح بھی ساتھ ہوتی اس زمانہ کے نظام اوقات کی ہلکی سی جھلک یہ ہے کہ صبح کی نماز کے بعد مسعود صاحب پابندی سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے، اکثر بہت انہماک اور لطف و ذوق کے ساتھ وہ قرآن مجید پڑھتے، اس کے بعد دارالعلوم کے اسباق یا ان کی تیاری میں ہم لوگ لگ جاتے، دس گیارہ بجے ڈاک آ جاتی جس کا بڑا حصہ عربی ڈاک پر مشتمل ہوتا، مصر و شام کے اکثر مشہور رسالے تبادلے میں آتے تھے، بعض مصنفین اور دارالاشاعت "الضیاء" میں (جو ہندوستان بھر کا واحد عربی رسالہ تھا) تبصرہ اور تنقید کے لیے اپنی مطبوعات بھیجتے، اکثر کھانے کے بعد تھوڑا سا وقت ان کے مطالعہ میں گذرتا، پھر اطمینان کے وقت کے لیے ان کو رکھ دیا جاتا، دوسرے وقت اکثر "الضیاء" کے مضامین کی ترتیب و تحریر میں شمولیت ہوتی، عصر کے بعد ساتھ ہی تفریح کو جانا ہوتا۔ رات کے کھانے کے بعد کچھ وقت چہل قدمی میں صرف ہوتا، اس دوران میں اکثر عربی یا اردو کے شعراء اساتذہ فن کے اشعار زبان پر ہوتے، اردو میں مسعود صاحب کو غالب و اقبال کے کلام کا ذوق تھا، اور اکثر ان کے اشعار پڑھتے تھے، عربی کے جدید شعراء میں سے شوقی اور معروف الرصافی کے کلام سے مناسبت تھی، معاصرین میں سے مسعود صاحب ہندوستان کے اندر مولانا آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی کے افکار و مضامین اور مولانا محمد علی مرحوم کے اخلاص و عزیمت سے متاثر تھے۔ عالم اسلامی میں سے وہ سب سے زیادہ امیر شکیب ارسلان اور علامہ سید رشید رضا کے معترف تھے؛ امیر شکیب ارسلان کے حواشی "حاضر العالم الاسلامی" اس وقت ہم لوگوں کی گویا "بیاض" تھی، خود بھی بار بار پڑھتے اور دوسروں کو مشورہ دیتے، مسعود صاحب امیر کی شخصیت سے بھی بہت متاثر تھے، اسی زمانہ میں طلبہ کی انجمن الاصلاح میں ایک بڑا معرکہ کا ادبی مباحثہ ہوا جس کا موضوع تھا "اکبر رجل فی العالم الاسلامی" (عالم اسلامی کی سب سے بڑی شخصیت)، مقررین اس جوش و خروش و سنجیدگی اور اصرار کے ساتھ اس بحث میں حصہ لے رہے تھے، گویا عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کا انتخاب اسی وقت کرنا ہے، اور اس کے سر پر عظمت کا تاج رکھنا ہے اس بحث میں شام کے ایک اخبار نویس سیاح محمود خیر الدین الدمشقی، اساتذہ میں سے ہم دونوں اور شیخ محمد العربی المراکشی نے اور طلبہ میں سے اکثر ہونہار نوجوانوں نے حصہ لیا۔ اس موقع پر جن لوگوں کے نام لیے گئے ان میں سے اندرون ملک کی شخصیتوں میں مولانا آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال مرحوم اور باہر کی شخصیتوں میں امیر عبدالکریم الریفی، علامہ رشید رضا اور امیر شکیب ارسلان تھے، مسعود صاحب کے رجحان اور صدر جلسہ (راقم سطور) کے فیصلے نے امیر شکیب ارسلان کا پلڑا بھاری کر دیا، اور حاضرین کی اکثریت نے ان کے حق میں فیصلہ کیا، اس جلسہ کی صدائے بازگشت مصر میں سنی گئی، امیر شکیب ارسلان نے مسعود صاحب کو ذاتی خط لکھا، جس میں ان کے حسن ظن کا شکریہ ادا کیا، اور بہت صفائی سے لکھا کہ یہ جامہ صرف محمد عبدالکریم الریفی کے قد و قامت پر راست آتا ہے اور وہی اس دور کی سب سے بڑی شخصیت ہیں، جنہوں نے اپنی خداداد جنگی قابلیت اور عبقریت سے فرانس کے چھکے چھڑا دیئے۔ امیر مرحوم نے اپنی کتاب "السید رشید رضا او اخاء اربعین سنة" میں اس جلسہ کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس جلسہ سے ہم لوگوں کا اس وقت

ذہنی سطح اور ذوق و مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مسعود صاحب اس زمانہ میں ترقی پسند سیاسی خیالات رکھتے تھے اور ان کو ان جماعتوں سے جو حکومت کے ساتھ تعاون کرتی یا اس کے حق میں نرم تھیں، شدید نفرت تھی، وہ انگریزی اخبار پابندی سے پڑھتے تھے، اور سیاسی جماعتوں اور افراد پر آزادانہ تبصرہ کرتے تھے، وہ اپنے خیالات کے اظہار میں بڑے جری، دلیر اور صاف گو تھے، وہ شدت سے اپنے معتقدات و افکار کے داعی اور مبلغ تھے اور مشکل سے کوئی مجلس ان تذکروں سے خالی جاتی۔ طلبہ کا ایک حلقہ ہمیشہ ان کے گرد رہتا جن پر وہ شفقت بھی فرماتے، ضرورت ہوتی تو عتاب و احتساب سے بھی کام لیتے، ان سے بے تکلف کام بھی لیتے اور ان کی علمی رہنمائی بھی کرتے طلبا ان کی تلخ و شیریں کو انگیز کرتے، اور ان سے استفادہ کرتے رہتے ان کا تعلق اپنے عزیز شاگردوں سے بڑے بھائی و اتالیق کا سا تھا۔

درجہ میں بھی وہ بڑے اہتمام اور دلچسپی سے پڑھاتے اور باہر بھی وہ اپنے مخصوص طلبہ سے ذاتی تعلق رکھتے، اسی زمانہ میں ہم چند نوجوان اساتذہ نے اپنے استاذ شیخ تقی الدین کے اصول کے مطابق عربی زبان کی تعلیم کا ایک نیا تجربہ شروع کیا، جو پورا کا پورا طرز مستقیم (DIRECT METHOD) کے اصول پر تو نہیں تھا، لیکن اس سے بہت قریب تھا، اس تجربہ کی کامیابی نے ہماری بڑی ہمت افزائی کی، اور اس نے دارالعلوم کے ساتھ ہماری دلچسپی اور انہماک کو بہت بڑھا دیا۔

"الضیاء" کا حلقۂ اشاعت محدود اور مضمون نگاروں کا حلقہ محدود تر رہا، وہ عرب ممالک میں جس قدر وقعت و قبولیت رکھتا تھا ہندوستان میں اسی قدر غیر معروف اور مظلوم تھا، اشاعت کی کمی اور مصارف کی زیادتی نے منتظمین کو اس کے التوا پر مجبور کیا اور رسالہ چار سال نکلنے کے بعد بند ہو گیا، اب مسعود صاحب صرف دارالعلوم کے ایک استاذ اور معلم ادب تھے لیکن اس رسالہ کے ذریعہ ان کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی، اور ممالک عربیہ کے ادبی حلقوں میں روشناس ہو چکے تھے۔ "الضیاء" کے علاوہ وہ مصر کے "الفتح" اور اس کے مدیر الاستاذ محب الدین الخطیب کے بڑے قائل اور گرویدہ تھے، وہ ان کے اسلامی فکر اور اسلوب تحریر دونوں کے مداح تھے، مسعود صاحب کا بھی شمار "الفتح" کے مخصوص وممتاز مقالہ نگاروں میں تھا، اسی رسالہ میں ان کی سب سے عزیز تصنیف "حاضر مسلمی الہند وغابرہم" بالاقساط چھپنی شروع ہوئی۔

مسعود صاحب اسباق و تعلیم کے علاوہ طلبہ کی علمی و ذہنی تحریک سے بھی غافل نہیں تھے۔ ہر صنف زندگی میں دعوت کا رنگ ان پر ہمیشہ غالب رہا، وہ جہاں رہتے تھے، اپنے خیالات کی برابر اشاعت کرتے رہتے تھے، جو طلبہ ان کے پاس زیادہ اٹھتے بیٹھتے، ان کو منتخب کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیتے رہتے، انھوں نے ایسی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی، جو نوجوانوں کو اسلامی انقلاب کے لیے تیار کرے اور ان کے اندر تجدید و اصلاح کی خواہش اور ماحول سے بے اطمینانی پیدا کرے، وہ ذہنی طور پر سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، سید عبدالرحمٰن الکواکبی اور ہندوستانی مصنفین میں سے مولانا شبلی، مولانا آزاد اور علامہ اقبال کی تحریروں اور نتائج افکار کے مطالعہ کا مشورہ دیتے اصول کے قائل، مولانا محمد علی کے مضامین، اور "تبیع" کی جلدوں کے مطالعہ کا مشورہ ضرور دیتے۔ طلبہ دارالعلوم کی انجمن کے ساتھ ایک اچھا کتب خانہ بھی تھا جس کے منتظم طلبہ ہی تھے، مسعود صاحب مرحوم نے بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ طلبہ کے مطالعہ کے لیے ان کتابوں کی فہرست مرتب کی تھی، جو ان کے ذہن کی اسلامی تربیت کرے، یہ فہرست عرصہ تک جمعیۃ الاصلاح میں محفوظ رہی، اور اس سے طلبہ نے فائدہ اٹھایا ـــــ عرب انشاء پردازوں میں وہ سب سے زیادہ مصطفیٰ صادق الرافعی کے قائل تھے اور ان کو اس دور کا مجدد ادب مانتے تھے۔ نئے ادیبوں میں وہ خود اپنے استاذ شیخ تقی الدین، امین ناصر الدین، محمد اسعاف النشاشیبی اور محب الدین الخطیب کے مداح تھے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے ان کے غیر اسلامی خیالات اور ذہن کی وجہ سے تعصب رکھتے تھے، اور اس کی تعریف ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ یہ دینی حمیت اور بغض فی اللہ ان کی طبیعت کا خاصا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس میدان میں وہ اپنے رفقاء سے ممتاز تھے۔

لباس اور کھانے کے معاملہ میں وہ بہت سادہ مزاج اور زاہدانہ واقع ہوئے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، وہ آخر تک سودیشی کے پابند رہے، اور اس دور میں تو وہ کھدر استعمال کرتے رہے۔ وہ طبعاً

نفاست پسند تھے، کئی کئی شیروانیاں رکھتے تھے، لیکن ان کے رنگ اور ڈیزائن کے انتخاب کا ذوق نہیں رکھتے تھے اور اس کا اعتراف بھی کرتے تھے حساب بہت صاف رکھتے تھے، اور اکثر کہا کرتے تھے کہ اس میں مروت سے کام نہیں لینا چاہیے، یہ فقرہ ان کی زبان زد تھا کہ حساب جو جو بخشش سو سو، وہ خرچ کرنے میں بڑے فراخ دل اور عالی ہمت تھے، لیکن قرض کے بارے میں وہ اپنے لیے بھی محتاط تھے اور دوسرے کے لیے بھی، نتیجہ تھا کہ ہر وقت کے ساتھ رہنے والوں کے تعلقات پر کبھی اثر نہ پڑتا۔

عقائد میں وہ ہمیشہ سے سلفی تھے، توحید و اتباع سنت میں ان کو تصلب تھا، اس بارہ میں وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے، کچھ تو خاندانی اثر تھا، ان کے ننہال پر رنگ اہل حدیث علماء اور مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، شیخ تقی الدین ہلالی کی صحبت نے (جو سخت اہل حدیث تھے) اس رنگ کو اور شوخ کر دیا۔ ان کے استاذ حدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب صدر مدرس دار العلوم ندوہ اگرچہ اتنے ہی سخت حنفی تھے، لیکن ان کے فیض تعلیم نے اس رجحان میں کوئی کمی نہیں پیدا کی، کچھ اہل صادق پور کے تعلق و طنیت، کچھ خاندانی روایات کے اثرات اور زیادہ تر مطالعہ نے ان کے دل میں حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کی پاکباز جماعت سے ایک والہانہ تعلق، اور عاشقانہ ارادت پیدا کر دی تھی، ان کے تمام خیالات و رجحانات میں ہمیشہ یہ چیز شامل رہی، کہ وہ جس چیز کو صحیح سمجھ لیتے تھے، اس پر شدت سے قائم رہتے تھے، اور کثرت سے اس کی تبلیغ کرتے تھے، کچھ ان کی صحت، کچھ ان کی افتاد طبع اور کچھ ان کے حالات نے مزاج میں حدت اور ذکاوت حس پیدا کر دی تھی، جو بعض اوقات مخاطب کو غیر معمولی معلوم ہونے لگتی تھی۔

اس وقت ہم لوگوں کا ذوق تمام تر علمی و ادبی تھا، ابھی ہم میں پختگی اور گہرائی نہیں آئی تھی۔ کوئی واضح اور منظم دعوت بھی سامنے نہیں تھی، کوئی موثر و طاقتور دینی ماحول بھی سامنے نہیں تھا، ایسی شخصیتیں اور ایسی صحبتیں بھی مفقود تھیں، جن کو دیکھ کر ہم کو اپنی زندگی میں کچھ خلا محسوس ہوتا اور اس کو پر کرنے کی تڑپ اور خواہش پیدا ہو۔ ہم لوگ گویا ایک علمی و ادبی حصار میں تھے، باہر کی دنیا دیکھنے کا ہم کو بہت کم اتفاق ہوا تھا۔ کچھ خاندانی رجحان، کچھ خاص مطالعے اور کچھ بعد کے حالات نے مجھے بعض ایسی شخصیتوں سے تعارف و قرب کا موقع دیا، جن کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ صرف ادب، فکر و نظر اور معلومات و مطالعہ ہی سب کچھ نہیں بلکہ کچھ اور کیفیات و حالات بھی ہیں، جو مخصوص ذہانت، مطالعہ اور ضوابط سے نہیں پیدا ہوتے، یعنی الیقین، اخلاص، ایمان و احتساب شدت تعلق مع اللہ، ذوق دعا، درد و محبت، جس طرح سے احکام و ضوابط کا سلسلہ محفوظ و متوارث چلا آرہا ہے، اسی طرح یہ احوال و کیفیات بھی یکسر ضائع اور ناپید نہیں ہو گئے ہیں، اور جس طرح پہلی چیز کے لیے وسائل اساتذہ فن اور نظام ہے، اسی طرح دوسری چیز کا ماخذ و ذرائع موجود ہیں، اور اس کے لیے بھی اہتمام و طلب کی ضرورت ہے، یہ چیز روح شریعت اور فقہ باطن ہے۔ اس کا منصوص نام کتاب و سنت کی زبان میں تزکیہ و احسان ہے، بعد کی صدیوں میں معلوم نہیں کیوں اس کا نام تصوف پڑ گیا، اور اس کے ساتھ بعض ایسی چیزیں شامل ہو گئیں، جن کا حقیقتاً شریعت میں ثبوت نہیں، یہ نام اور بعد کے لوازم بہت سی طبیعتوں کے لیے موجب بُعد و وحشت بن گئے لیکن جو شخص اس شعبہ کی روح کے حاملین اور فن کے مجتہدین کو دیکھتا ہے، اس کے اندر یہ اذعان پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی اصل اور اس کی روح شریعت کا عین مطلوب اور نبوت کی میراث ہے۔ وہ آسانی سے اصل و زوائد میں امتیاز کر لیتا ہے۔

مسعود صاحب کی علمی مشغولیت بڑھتی گئی، اور ان کے خیال میں پختگی آتی گئی، ان کے مخصوص حالات نے اس کا موقع نہیں دیا، کہ وہ اس شعبہ کے صاحب نظر اور مجتہد الفن اشخاص سے ملتے، اور ان کی رائے و نظریات میں کچھ تبدیلی واقع ہوتی، اس کے برخلاف بُعد کے اسباب کچھ بڑھتے ہی چلے گئے جس کا اندازہ ان کی تحریروں اور تنقیدوں سے ہوتا ہے، لیکن چونکہ وہ سلیم الطبع اور طالب حق تھے اس لیے جب کبھی کتاب و سنت کی روشنی میں ان سے گفتگو کی جاتی، تو وہ تزکیہ و احسان کی ضرورت تسلیم کرتے، اور اعتراف کرتے تھے کہ اس کے بغیر بڑے اہم خلا رہ جاتے ہیں۔ ۵۶ھ ہجری میں دار العلوم میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ

مسعود صاحب وہاں کے قیام سے کچھ غیر مطمئن ہوگئے۔ اسی زمانہ میں "مدینہ" بجنور کی طرف سے ایک پیش کش ہوئی اور مسعود صاحب شریک ادارت ہوکر بجنور چلے گئے، انھوں نے اپنے فرائض خوش اسلوبی اور لیاقت سے انجام دیئے۔ عالم اسلام کی واقفیت اور بالخصوص ممالک عربیہ کے حالات میں وہ مستند (AUTHORITY) کا درجہ رکھتے تھے، وہ ہمیشہ سے شستہ اور شگفتہ اردو لکھتے تھے اور کامیاب صحافی بن سکتے تھے ان کے بہت سے دوستوں نے ان کی اس نئی ذمہ داری کو پسند کیا، قارئین مدینہ نے بھی ان کے اداراتی شذرات و مضامین پر پسندیدگی کا اظہار کیا لیکن خود ان پر دارالعلوم ندوہ کی جدائی شاق تھی اور خالص صحافتی زندگی ان کی افتادِ طبع اور علمی مذاق کے خلاف تھی، ۶ جمادی الاول ۵۶ھ کو میرے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

" میں یہاں آیا، حالات سے مجبور ہوکر لیکن معلوم ہوا کہ عربی ختم ہوجائے گی، دو ہی ہفتوں کے بعد ارادہ متزلزل ہوگیا، اتنے میں فاران بند ہونے لگا،[1] شبیر محمد صاحب کو ایک جگہ مطلوب تھی۔ سید صاحب مدظلہ کا گرامی نامہ آیا کہ تم ندوہ چلے آؤ، کوئی صورت نکالی جائے گی اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، فوراً تیار ہوگیا، شبیر محمد صاحب بھی خوش ہوئے، مالک اخبار کو کچھ رنج ہوا، ڈاکٹر صاحب مدمجدہٗ نے بھی اپنی عنایت سے مسرت کا اظہار کیا ہے، اب اس ناچیز کو اور کیا چاہیے، میرے پاس اس دوران میں متعدد خطوط آئے۔ مدینہ ہر جگہ جاتا ہے، تمام ملنے والوں نے اپنی بری بھلی رائے دی لیکن اب تک اس کا خط نہیں آیا تھا جس کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہے۔ محبت نہیں بلکہ احترام ہیچ کہتا ہوں، کچھ تکلیف محسوس کر رہا تھا، معلوم نہ تھا کہ آپ کہاں ہیں ورنہ خود لکھتا، آخر آج صبح نوید بشارت ملی۔ اور دل کا ایک بوجھ دور ہوگیا، میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ آپ دارالعلوم سے الگ ہوں اور نہ اپنے لیے تصور پہلے کرسکتا تھا، لیکن حالات سے مجبور ہوگیا۔ پھر کشش لے جارہی ہے۔ سید صاحب کا فرمان ایک بہانہ بن گیا، آپ نے دل کی بات کہہ دی ورنہ لوگوں کو یہی لکھا ہے کہ سید صاحب کی حسب ہدایت جانا پڑ رہا ہے "

غالباً چھ سات مہینے ان کا قیام بجنور رہا، پھر وہ جیسا کہ انھوں نے اس خط میں لکھا ہے، دارالعلوم آگئے، لیکن یہاں شاید دو ہی ایک مہینے قیام کیا تھا کہ پٹنہ خدا بخش خاں مرحوم کے مشہور کتاب خانہ کے مرتب فہرست (CATALOGUER) ہوکر چلے گئے وطن اور والد صاحب (مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مدظلہٗ) سے قرب اور کتب خانہ کی پُرسکون و خاموش فضا کی وجہ سے ان کو وہاں زیادہ راحت تھی اور معاشی حیثیت سے بھی وہ زیادہ فائدہ میں تھے ۲۱ شوال ۵۶ھ کو پٹنہ سے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

" اطمینان کی بات یہ ہے کہ میرے پٹنہ آجانے سے والد ماجد، اعزہ، احباب سب کو انتہائی مسرت ہے، پٹنہ کا ذی علم اور باذوق طبقہ بھی مطمئن ہے، اور سب خواہش مند ہیں کہ میرا قیام یہاں منتقل ہوجائے کتب خانہ کی فضا بہت پرسکون ہے، کوئی افسر نہ ماتحت، نفیس عمارت، الماریاں دیدہ زیب، کتابوں کی جلدیں نظر فریب، کام خاموشی کا، میرے کام کے نگراں عظیم الدین صاحب[2] ہیں۔ آخر میں انگریزی کی تصحیح کے لیے ایک انگریز پروفیسر سے مشورہ لینا پڑتا ہے، کام چار پانچ سال کا ہے، توسیع ہوجائے گی، شاید وقت نہ ہو، ممکن ہے یہ رائے قبل از وقت ہو، بہرصورت دو تین مہینے میں صحیح اندازہ ہوجائے گا البتہ منتقل (GRADE) اور (POST) کے حصول کے لیے کچھ جدوجہد کرنی پڑے گی جس کے لیے ابھی نفس تیار نہیں۔

---

[1] مولانا ابواللیث ندوی جو اس وقت فاران کے ایڈیٹر تھے۔ [2] ڈاکٹر عظیم الدین احمد پی ایچ ڈی سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور و پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی

ممکن ہے آئندہ اس ماحول سے متاثر ہونے کے بعد
یہ چیز بھی کرلوں، ایک ندوی (حاجی معین صاحب[1])
کی مثال تو بہت حوصلہ افزا ہے، وہ آٹھ سال رہنے
کے بعد بھی ذرہ برابر نہیں بدلے، کسی سے نہیں ملے
اور اسی جرم میں مستقل جگہ نہ مل سکی۔"

لیکن وہ ماحول کے اثرات اور تعاونوں کے باوجود "ملازمت پیشہ" لوگوں کی سطح پر نہ اتر سکے، ان کی خودداری اس مقام کے شرائط پورا کرنے سے مانع رہی، پھر بھی ان کی اہلیت اور امتیازی قابلیت ان کے لیے سب سے بڑی سفارش تھی اور اسی بنا پر ان کی توسیع ہوتی رہی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مستقل تو نہیں ہوا، کہ یہ سعادت ڈاکٹر سید محمود صاحب[2]
کے آستانہ پر جبیں سائی کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتی،
جو کچھ اعانت غیر سے اور اللہ کے فضل و کرم سے
ہو سکا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک سال کی توسیع ہوئی ہے
اور جب تک کام باقی ہے، اسی طرح توسیع ہوتی رہے گی
میرے تخمینہ سے بقیہ کام کم از کم سات سال کا ہے
یوں بڑھ جائے تو تعجب نہیں، اللہ کا ہر حال میں
شکر ہے، کتنے مجھ سے اچھے اور ہونہار نوجوان
بہت معمولی تنخواہوں پر کام کر رہے ہیں، کتنے بیکار
ہیں، مجھ میں کوئی زیادہ اہلیت نہیں، کارساز حقیقی کا
احسان ہے کہ اس نے ایک عاجز و درماندہ کے واسطے
سے ایک شریف خاندان کی عزت اور ظاہری خودداری کا
سامان بہم پہنچایا۔ فالحمد للہ اولاً و آخراً"

مسعود صاحب زمانہ ملازمت اور پٹنہ کے قیام کے دوران میں اپنے عقائد و خیالات میں زیادہ پختہ اور ان کی تبلیغ و اشاعت میں زیادہ سرگرم و پرجوش ہو گئے تھے، نامناسب فضا اور ناجنس رفیقوں نے دبی ہوئی چنگاریوں کو روشن اور مشتعل کر دیا۔ اسی زمانہ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کو حیرت ہوگی، میں یہاں آکر عقیدۃً زیادہ
مولوی بلکہ "ملا" ہو گیا ہوں، مولانا سجاد صاحب باطل
ملاحدہ اور دہریوں کی مخالفت اور سیاسی حوصلہ شکنی پر
گفتگو آئی، ممکن ہے دہلی کی تعلیمی کانفرنس میں وہ اسے
پیش بھی کریں، رات تشریف لے گئے ہیں۔ دنیا
تنگ ہے، فضا بدلی ہوئی، پورے پٹنہ میں کوئی اپنا
ہم خیال نہیں کسے داستانِ درد سناؤں؟"

(یکم جمادی الثانیہ ۵۵ھ)

وہ اپنے مخصوص تعلیمی خیالات اور افکار میں جن کے مجموعہ کا نام "ندویت" ہے نیز مذہبی خیالات و عقائد جن کے مجموعہ کا نام مشہور عوام "وہابیت" ہے نیز اپنے خاص علمی و ادبی ذوق میں جس کا عنوان "عربیت" ہے کافی متصلب تھے اور جہاں رہتے اس کی دعوت و تبلیغ سے باز نہ رہتے، پٹنہ سے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کی یاد کس تقریب سے آتی ہے؟ کیا کہوں؟ میرا
یہ اعتقاد ہے کہ آپ عبدالسلام صاحب[3] اور مسعود
سے زیادہ دنیا میں کوئی تین آدمی ہم خیال نہیں ہو سکتے
لیکن کس قدر تکلیف کی بات ہے کہ ایک ملکِ غیر اور
اجنبی ماحول میں پڑا ہوا ہے۔ بہرحال یقین رکھیے، کہ
میں یہاں جب تک رہوں گا "ندویت" مخصوص قسم کی
"وہابیت" اور "عربیت" اور اپنی تمام "ازمیں" پھیلاتا
رہوں گا خواہ اس راہ میں شہید ہی کیوں نہ ہو جاؤں۔

(۲۱ ذی قعدہ ۵۶ھ)

وہابیت میں وہ سخت سے سخت تر ہوتے گئے، خصوصاً جب انھوں نے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کی سیرت لکھنی شروع کی تو یہ نشہ دو آتشہ ہو گیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"آج کل وادی نجد میں ٹھوکریں کھا رہا ہوں، اس بادیہ
پیمائی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہابیت اور زیادہ تلخ بلکہ

---

[1] حاجی معین الدین صاحب ندوی مصنف "مہاجرین" وغیرہ [2] ڈاکٹر سید محمود سابق منسٹر ترقیات بہار

[3] مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی بانی ادارہ تعلیمات اسلام لکھنؤ حال ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

(CONVASSING) کے بعد اپنا ایک حلقہ پیدا کر لیا ہے اور ندوہ بلکہ ہم لوگوں کے مخصوص خیالات کی ایک چھوٹی موٹی دنیا بسنے لگی ہے، گو ابھی مختصر ہے، جمال الدین ۔ سنوسی ۔ سید احمد اسماعیل شہیدین وغیرہم (رحمہم اللہ ولقنہ اللہ نور انجمہم) سے آشنا ہو گئی ہے ۔ بس اس منحوس اور بنگال زدہ علاقہ سے اتنا تعلق ہو سکا (۲۶-۱۰-۵۹ء)

مسعود صاحب معاصر علمی و سیاسی رہنماؤں اور بزرگوں میں سب سے زیادہ ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحب، بہاری مرحوم کی اصابت رائے خلوص اور فہم کے قائل تھے اور ان کو مرحوم سے نہ صرف عقیدت تھی بلکہ محبت اور ذاتی تعلق بھی تھا اور ان کی ذات سے ان کو بڑی تقویت اور سکون حاصل تھا، مولانا بھی مرحوم پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور بڑی توجہ سے ان کے مشورے اور خیالات سنتے تھے ، ۱۸ شوال ۱۳۵۹ھ کو مولانا کی وفات کا داغ لگا، مسعود صاحب کا دل اس حادثہ سے سخت متاثر ہے ان کی تحریروں میں یہ تاثر صاف جھلکتا ہے اور یتیمی کا سا داغ معلوم ہوتا ہے ۔ ۲۹ شوال کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" گھر (اوگانواں) سے لوٹا تو خیال ہوا کہ آپ لوگوں سے لوٹا ہوا رشتہ جڑ رہا ہے لیکن دوہی روز ہوئے ہیں لکھوں کہ آہ ہندوستان مولانا سجاد کی علالت کی خبر ملی اور ہر ایک روز میں حالت غیر ہوتی گئی تا آنکہ ۱۸ شوال (۱۸ نومبر) کی شام کو یہ پاکباز ہستی رہ گزار آخرت ہو گئی ۔ ہم لوگوں پر کیا بیتی، اسے زبان سے بیان نہیں کر سکتا ۔ دو چار دن تو ہوش و حواس قابو میں نہیں رہے ، جس سے ملاقات ہوئی طرفین سے دیدہ باری ۔۔۔ اور پھر مخصوص حالات نے اور بھی چرکے لگائے ۔ مرنے کے وقت گھر میں کفن کو بھی ایک کوڑی نہیں تھی (بالکل لفظی معنوں میں) ... اور کیا لکھوں، آپ جانتے ہیں کہ مجھے مولانا سے کتنا تعلق تھا اور وہ بھی مجھے بہت مانتے تھے ، پچھلے تین سالوں میں یہ تعلق اور گہرا ہو گیا تھا ، اب یہ حال ہے کہ پٹنہ کاٹے کھا رہا ہے ، اگر اللہ موقع دے تو آج چھوڑ دوں "

اسی تاثر اور جذبہ ادائے حق کا نتیجہ ان کی کتاب " محاسن سجاد " ہے جو مولانا کی وفات کے بعد شائع ہوئی اور جس سے ان بہت لوگوں کو جن کو مولانا سجاد صاحب کے ساتھ کام کرنے اور ان کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا ۔ ان کے محاسن و کمالات کا علم ہوا ، اب یہ کتاب ان کی تنہا یادگار اور ان کی زندگی کا آئینہ ہے ۔ اسی زمانہ میں انہوں نے شیخ الاسلام شیخ محمد عبدالوہاب پر کام شروع کیا ، شیخ ہمارے دینی حلقوں میں جس قدر بدنام ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں، انگریزوں اور ترکوں نے اور علمائے حجاز نے اپنی اپنی مصلحت سے ان کے متعلق جو کچھ مشہور کر دیا ، ہمارے علماء نے بلا تحقیق و تفتیش تسلیم کر لیا ، کسی نے براہ راست ان کی تصانیف اور ان کے حالات کے صحیح مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی ، ضرورت تھی کہ کوئی مرد حق شناس ان کے صحیح حالات و خیالات پیش کرتا تاکہ اہل علم اور طالبین حق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملتا، علمائے نجد اور شیخ کے جانشینوں نے تو متعدد کتابیں لکھیں اور وہ حجاز و مصر میں شائع ہو چکی ہیں ، اردو میں کوئی کتاب نہ تھی، مسعود صاحب نے اس بدنام مظلوم مصلح کی سیرت نگاری کا بیڑا اٹھایا، اور خالص مورخانہ اور محققانہ حیثیت سے ان کی سوانح اور ان کی تحریک و دعوت کی تاریخ مرتب کرنی شروع کی، اس سلسلہ کا کوئی مضمون شاید معارف میں شائع ہوا تھا اور اس پر راقم نے مسعود صاحب کو داد دی تھی ۔

اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

" محبت نامہ آیا ، گویا دل پژمردہ میں جان آ گئی ۔ اللہ جانے آپ کی تحریر میں کیسی دلنوازی ہے کہ بار بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی ۔ کاش آپ برابر اسی طرح لکھا کرتے تو مجھے شکایت نہ ہوتی اور اس " پردیس " میں ندوہ کی صحبتوں کا مزہ آ جاتا ، خیر میں تو عرصہ ہوا " عہد رفتہ " کی واپسی سے مایوس ہو چکا ورنہ یوں غرق ہو کر بھی بیڑوں کو اچھلتے دیکھا ہے ۔

لکھ ہی ڈالوں، داؤد غزنوی صاحب نے بعض خبریں سنائی ہیں اور آج کل میں مولوی عبدالمجید صاحب کو بھی لکھتا ہوں۔ یہ بنارس میں شوکانی کے شاگرد کون تھے؟ بہرحال اس کتاب کے مفروضات اور مفروضاتی شعوات کا جواب دینا ضروری ہے۔ حیرت ہے کہ ایسا ذی علم آدمی اب تک ایک مشرب اور اسکول کے چاہ زمزم سے نہیں نکل سکا ہے۔ (۲۷۔۷۔۶۱ھ)

۱۱ رمضان المبارک ۶۱ھ کے خط میں لکھتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک مولوی عبدالغفار صاحب کے یہاں گئی تھی۔ انھوں نے اس پر ایک طویل نوٹ لکھ کر میرے پاس ایسے وقت بھیجا کہ میں پابرکاب تھا۔ اب ارادہ ہوتا ہے کہ اسے لکھ ڈالوں ان شاء اللہ مفصل اور طویل مضمون ہوگا۔ جی چاہتا ہے کہ یہ نوٹ آپ کے پاس بھیج دوں اور آپ اسے دیکھ کر فوراً واپس کردیں مگر شرط یہ ہے کہ جلد ۔۔۔"

۲۲ صفر ۶۲ھ کے ایک خط میں میری کوتاہ قلمی کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا زمیں آپ کو ایک خط پہلے لکھا تھا۔ خط پہنچا ہوگا۔ مگر جواب ندارد، آخر یہ کہاں کی مولویت ہے۔ آپ نے تو مجھے مولانا سندھی سے بھڑا دیا اور خود الگ جا بیٹھے، خیر خاکسار نے اس سلسلے کے دو مضمون لکھے پہلا مضمون فروری کے معارف میں چھپ گیا ہے اس میں صرف (سید صاحب اور مودودی صاحب کی زبان میں) سید مظلوم کی مدافعت کی گئی ہے۔ ضمناً مولانا پر ان کے ثنا خوانوں اور منقبت نگاروں کی مدافعت بھی ہوگئی ہے۔ پہلا مضمون صرف سید صاحب سے متعلق ہے، معارف کے ۳۵ صفحوں میں آیا ہے دوسرا مضمون اہل حدیث اور اہل صادقپور سے متعلق ہے۔ عقیدۂ غیبوبت وغیرہ کی بحث بھی آئی ہے یہ مضمون اغلب یہ ہے کہ مارچ کے معارف میں پورا چھپ جائے گا۔ تیسرا حصہ زیر قلم ہے۔ اس میں شوکانی۔ زیدیت، نجد و یمن پر بحث کرنا چاہتا ہوں شوکانی اور زیدیت پر گویا لکھ چکا اب نجد پر گفتگو ہوگی۔ (۲۲ صفر ۶۲ھ)

مسعود صاحب میں ان کی تمام علمی ترقیوں کے ساتھ انگریزی حکومت سے نفرت اور مجاہدانہ جذبات برابر رہے اور کسی حد میں بھی وہ ان سے علٰحدہ نہیں ہو سکے، ۴۲ء کے ہنگامہ میں جب اکثر مسلمان بے تعلق اور دور کے تماشائی بنے رہے، بلکہ ان میں سے اکثر ان ہنگاموں کا لطف لیتے تھے اور اپنے ہم وطنوں کی ابتلا پر فاتحانہ مسرت اور شماتت کا اظہار کرتے تھے، ان کی طبیعت بہت بے چین تھی اور دبی ہوئی چنگاریاں مشتعل ہوگئی تھیں۔ ۲۵ اگست ۴۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"حسب معمول صبح کو حسب معمول قرآن مجید تلاوت کر رہا تھا اس آیت پر آکر رک گیا، بار بار پڑھتا رہا مگر تسکین نہ ہوئی۔ ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستهم البأساء والضراء وزلزلوا حتى يقول الرسول والذين آمنوا معه متى نصر الله، الا ان نصر الله قریب۔ اور پھر اس ایک آیت بعد کتب علیکم القتال وهو كره لكم۔ الآیة پر نظر گئی تو یقین آگیا۔

ایک لطیفہ اور ملاحظہ ہو۔ شوقی کا ایک شعر ہے (دمشق کی تباہی کے مرثیہ کا شعر ہے) وہ مرثیہ جس کا مطلع ہے ؎

۱؎ مولانا عبدالمجید الحریری سابق قنصل حکومت ہند متعینہ جدہ، جو ایک صاحب نظر اور صاحب ذوق اہل حدیث فاضل ہیں۔
۲؎ مولانا عبدالحق نیوتنوی بنارسی جو سید صاحبؒ کے قافلہ حج میں تھے اور یمن جا کر امام شوکانی سے حدیث پڑھی۔
۳؎ خاندان صادق پور کے ایک باخبر اور ذی علم فرد۔

سلام من صبا بردیٰ ارق
ودمعٌ لا یکفکف یادمشق

ہاں تو شعر یہ ہے ؎

ومن یسقی ولشرب بالمنایا
اذ الاحرار لم یسقوا ویسقوا

کیا فرماتے ہیں ...."اذ الاحرار لم یسقوا ویسقوا" کے بارہ میں؛ کہاں ساقی گری جام شہادت کی اور کہاں الاستعمار الاوربی کی طرف ید المعونہ بڑھانا، تف ہے۔ یہ شذرات ہیں اور مرآت انکا بھی۔ دماغ اچٹا ہوا ہے اور دل اجڑا ہوا، امیر شکیب نے کہیں لکھا ہے " لا یجتمع الاسلام والمیل الی الاستعمار الاوربی فی قلب واحد" مگر یہ کیا اندھیر ہے کہ صادق پور کے بہاسے اور ہم وطن اسی استعمار اوربی کو اپنا ملجا وماوی سمجھنے لگے ہیں گزشتہ تین ہفتوں میں یہ عجیب PHENOMENON (مصری ظاہرہ) نگاہوں کے سامنے آیا، میرا ذاتی خیال یہ نہیں تھا، کہ سلطان شہید کی برادری اس قدر "جعفریت اور صادقیت"[1] میں ڈوب گئی ہے، پچھلے سالوں میں ازقم پاکستانیوں سے کچھ حسن ظن رکھنے لگا تھا، لیکن اس گھناؤنے مظاہرے کے بعد تو ان پیدائشی مسلمانوں سے ہر قسم کی امید اٹھ گئی۔"

۱۲/۸/۶۱ء
۲۵/۸/۶۲ء

مسعود صاحب دار العلوم ندوہ سے تعلق وقیام کے زمانہ ہی میں "ترجمان القرآن" کے علمی وکلامی مضامین کے مداح اور مدیر "ترجمان" کے قائل ومعترف تھے، ان کی ثقافت (کلچر) ان کی تعلیم وتربیت اور ان کے مطالعہ نے ان کو جماعت اسلامی کے فکری ودینی مزاج سے بہت کچھ ہم آہنگ کر دیا تھا، وہ بھی فطرتاً حساس اور نقاد واقع ہوئے تھے، وہ بھی اپنی تحریروں میں ہمیشہ اسلام ومسلمانوں کے درمیان امتیاز قائم رکھتے تھے اور دونوں لفظوں کے استعمال میں محتاط تھے، ان کا قلم بھی اسلام کی تاریخ نگاری میں یا اسلامی دعوتوں اور تحریکوں اور اصلاحی کوششوں کا جائزہ لینے میں مسلمان بادشاہوں، ان کے غیر اسلامی افعال اور غلط نمائندگی پر سخت تنقید کرتا رہا[2]۔ وہ بھی تجدید کے داعی اور پرزور حامی اور تجدد کے مخالف تھے، اور اسی بنا پر کمال اتاترک اور جدید ترکیہ کے بانیوں کے سخت مخالفین اور ناقدین میں تھے، فقہی آراء ومسائل میں وہ اپنے خاندانی اثرات وافتاد طبع کی بنا، پر ہمیشہ سے متوسع اور مسائل واحکام بالخصوص عبادات میں بالعموم حنفی تحقیقات ومسائل پر عمل کرنے کے باوجود اپنے لیے کسی خاص نسبت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا ذہن وذوق کسی ایک فقہی مذہب کے التزام وتقلید سے "ابا" کرتا تھا، جیسا کہ ان کے متعدد خطوط وتحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اہل حدیث حضرات کے تعصب اور جماعتی عصبیت کے بھی شاکی اور مخالف تھے[3]۔ ان کے سیاسی خیالات وافکار بھی ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے بنے بنائے سانچوں میں سے کسی سانچے میں کلی طور پر فٹ نہیں ہوتے تھے، ان کا خود ایک ذہنی سانچہ تھا اور وہ جماعت اسلامی کے سانچہ سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا، مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء دونوں سے وہ یکسر غیر مطمئن تھے، یہ سب وجوہ تھے، جن کی بنا پر وہ روز بروز جماعت اسلامی سے قریب اور دوسری جماعتوں اور حلقوں سے دور ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ ایک منطقی نتیجہ کے طور پر وہ جماعت اسلامی کے ہم خیال اور بالآخر اس کے رکن رکین بن گئے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھنؤ آئے، اور دار العلوم ندوہ کے مہمان خانہ میں قیام فرمایا۔ انھوں نے مجھ سے ایک عربی رسالہ کے اجراء کی تجویز کا تذکرہ کیا۔ اور یہ خیال ظاہر کیا کہ میں اس کی ادارت کی ذمہ داری قبول کروں، میں نے بے تکلف عرض کیا، کہ اس کام کے لیے موزوں ترین شخص مولانا مسعود عالم ندوی ہو سکتے ہیں اور اپنے خصوصی تعلق کی بنا پر اس کا ذمہ لیا، کہ میں ان کو اس خدمت کے لیے راضی کر لوں گا، اس سلسلے میں مولانا سے میری خط وکتابت بھی ہوئی اور وہ اس پر آمادہ ہو گئے، انتظامی مشکلات کی بنا، پر رسالہ کا

---

[1] جعفر از بنگال وصادق از دکن، [2] ملاحظہ ہو الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر میں ان کا مضمون "شاہ ولی اللہ سے پہلے ہندوستان کا حال" نیز [3] ملاحظہ ہو العلما

اجرا تو نہیں ہو سکا۔ لیکن ۱۹۴۴ء میں مسعود صاحب جماعت کی عربی نشر و اشاعت کے شعبہ کے انچارج اور کلیتًہ اس کام کو انجام دینے کے لیے جالندھر منتقل ہو گئے، جہاں انھوں نے "دار العروبۃ للدعوۃ الاسلامیۃ" کے نام سے نشر و اشاعت اور دعوت کا مرکز قائم کیا اور چند رفقاء کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا، جو خطوط اس عرصہ میں انھوں نے لکھے، افسوس ہے کہ وہ بہت سے محفوظ نہیں رہے، جن کی مدد سے اس دور کے نقوش و تاثرات کو روشن کیا جاتے اس عرصہ میں غالبًا صرف ایک بار ان سے ملاقات ہوئی، جب وہ لکھنؤ آئے اور دار العلوم ندوہ کے مہمان خانہ میں قیام فرمایا، البتہ ان کے پُر محبت سلام و پیام پہنچتے رہے، اور یہ معلوم ہوتا رہا کہ حسب عادت ان کی مجلسیں اپنے قدیم دوستوں کے تذکرہ بالخصوص اس عاجز کے ذکر سے معمور رہتی ہیں، میں جن نوجوان طلبہ کو ہونہار سمجھتا تھا، ان کے متعلق خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ اپنی دینی و ادبی تربیت کے لیے کچھ مدت ان کے پاس قیام کریں، اور ان کی رہنمائی اور مشوروں سے فائدہ اٹھائیں۔ متعدد طلبہ کی سفارش کی جن کو انھوں نے ہمیشہ بڑی گرم جوشی اور خوش دلی سے منظور کیا۔ وہ بڑے خورد نواز اور شفیق تھے اور اسی وفاشعاری کی توقع اپنے دوستوں اور عزیز شاگردوں سے کرتے تھے، اس سلسلے میں وہ اپنے پورے حلقہ تلامذہ میں سید مظفر حسین شاہ ندوی[1] کی سعادت و شرافت اور وضع داری کے سب سے زیادہ معترف تھے، اور ان کے ساتھ ان کا سلوک بالکل بڑے چھوٹے بھائی کا سا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب کہ میں حجاز میں تھا، ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی، اور آبادی کا تبادلہ و انتقال ہوا جس نے دونوں ملکوں کی چولیں ہلا دیں اور پوری زندگی کو زیر و زبر کر دیا۔ اس طوفان میں دار العروبۃ کا سا نوخیز و کمزور ادارہ کیا قائم رہتا، وہ بھی ہندوستان سے پاکستان منتقل ہوا۔ اس نقل مکانی میں مولانا کا اچھا خاصا کتابی ذخیرہ ضائع ہو گیا، پاکستان پہنچ کر انھوں نے از سر نو "دار العروبۃ" کی بنیاد ڈالی اور کچھ عرصہ گوجرانوالہ کچھ عرصہ حیدرآباد سندھ قیام کرنے کے بعد انھوں نے راولپنڈی کو اپنا مستقر بنا لیا، جس کی خشک آب و ہوا ان کی صحت کے لیے بہت سازگار تھی۔ اس عرصہ میں ہم دونوں کی خط و کتابت اور علمی روابط برابر قائم رہے۔

۱۹۴۹ء میں انھوں نے عراق کا سفر کیا جس کی ان کو مدتوں سے آرزو تھی۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے بغداد و زبیر کی بالکل تیاری کر لی تھی، مگر ان کو پاسپورٹ نہیں مل سکا تھا، اور سفر ملتوی ہو گیا تھا، وہ سفر اگر میسر بھی آتا تو صرف علمی ترقی اور ادبی ذوق کی تکمیل کے لیے ہوتا۔ یہ سفر بڑے بلند عزائم اور مقاصد کے ساتھ تھا، اب وہ اپنی کتابوں اور ادبی شہرت کی بنا پر علمی و دینی حلقوں میں روشناس اور ایک دعوت و تحریک کے نقیب اور ترجمان سمجھے جاتے تھے، قدیم آرزو کی تکمیل کا سامان بھی موجود تھا، ان کے محبوب استاد شیخ تقی الدین الہلالی موجود تھے، جو اب ان کے تلمذ پر فخر کرتے تھے اور حلقہ احباب میں شمار کرنے کے لیے تیار تھے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۴۹ء سے ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء تک سفر ممتد رہا، جس کی مفصل روداد اور روزنامچہ "دیار عرب میں چند ماہ" میں محفوظ ہے۔ اور وہ ان کی جد و جہد، انہماک جذبۂ دعوت اور ان کی ذہنی و علمی صلاحیتوں کی ناطق شہادت ہے، اس کتاب میں وہ بولتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور ان کے ذہن و مزاج کی پوری تصویر آگئی ہے، وہی صاف گوئی، وہی تلخ نوائی، کہیں تنقید کی تلخی کہیں محبت کی شیرینی، اکثر وبیشتر عقل کی پاسبانی لیکن کبھی کبھی اقبال کے اس مشورے پر عمل کرتے ہیں

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

"الفرقان" کے کسی شمارہ میں ان کی زندگی ہی میں اس کتاب پر مفصل تبصرہ کر چکا ہوں، جس میں کتاب پر تبصرہ ہی نہیں، دو دوستوں کی مفصل کہانی آگئی ہے۔ مسعود صاحب نے ایک خط میں لکھا تھا کہ کئی بار پڑھ چکا ہوں، لیکن سیری نہیں ہوئی۔

راولپنڈی کے زمانۂ قیام میں وہ خرابی صحت کے باوجود کام میں مشغول رہے، اس عرصہ میں کئی کتابیں ان کی نگرانی اور مدد سے شائع ہوئیں۔ "المسلمون" "الدعوۃ" اور "منبر الشرق" میں بھی

---

[1] حال ناظم دینیات آزاد کشمیر مظفرآباد۔

ان کے مضامین شائع ہوتے رہے، ملاقات کو اب آٹھ نو برس ہو چکے تھے، اتنا طویل وقفہ ہماری ملاقاتوں اور دید و شنید میں زندگی بھر نہیں ہوا تھا، شاعر نے تو کہا تھا کہ "منزل دوست چوں شود نزدیک" لیکن منزل دوست دور ہونے کے باوجود آتش شوق تیز تر ہوتی چلی جارہی تھی، تقسیم کا بھلا ہو کہ جن دوستوں اور بزرگوں کا جیتے جی جدائی کا خیال بھی نہیں آتا تھا، وہ زندگی ہی میں ایسے جدا ہوئے کہ برسوں ان سے ملاقات کی نوبت ہی نہ آئی اور بیگانہ ملکوں کے باشندے ایک دوسرے سے قریب تھے، اور ان کی ملاقات و سفر کے امکانات زیادہ مگر ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان کا سفر جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

اس عرصہ میں برابر ان کا معمول رہا کہ ان کی کوئی تحریر کہیں شائع ہوتی، وہ سب سے پہلے اس دور افتادہ نیاز مند کو بھیجنے کی کوشش کرتے اکثر لفافوں میں اپنے مضامین کے تراشے نشان لگا کر بھیج دیتے "دیار عرب" شائع ہوئی، تو پہلا نسخہ جو پریس سے ان کو ملا، وہ انہوں نے مجھے بھیجا، یہی حال اس راقم کا تھا، کہ مضمون لکھتے وقت اور چھپنے کے بعد اس کا تصور ہوتا، کہ مسعود صاحب کی نظر سے گزرے گا، اور اس تصور سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی، غالباً یہ دوسرے مضمون نگاروں کو بھی پیش آتا ہوگا۔ اور زندہ انسان کی زندہ تحریر میں ایسا ہونا بھی چاہیئے ورنہ مضمون کیا ہے، ایک عدالتی دستاویز۔ راقم سطور ۱۳۷۰ھ میں مصر و شام گیا، اور وہاں اس کی کچھ تقریریں اور تحریریں شائع ہوئیں، تو وہ بھی مسعود صاحب کو بھیجتا رہا۔ اور وہ اپنے حلقہ احباب میں محبت آمیز الفاظ کے ساتھ ان کا تعارف کراتے رہے۔ میری ہندوستان واپسی کے بعد انھوں نے ان مضامین پر "ترجمان القرآن" میں تبصرہ و تنقید کی تنقید میں وہ ذاتی تعلق و محبت کو زیادہ دخل نہیں دیتے تھے، اگرچہ یہ تعلق دوں کے چھپا سے چھپتا نہیں تھا، ان کا تبصرہ اس تعلق و بے تعلقی کا ایک عجیب گلدستہ ہوتا تھا، بہرحال انھوں نے تبصرہ کیا، مضمون نگار کی حالت ہر وقت یکساں نہیں رہتی، بعض رسائل و مضامین پر انھوں نے ایسا تبصرہ کیا جس کی توقع نہ تھی "اسمعی یا جارۃ" اور "شاعر الاسلام محمد اقبال" پر توقع تھی، کہ وہ کچھ زیادہ لکھیں گے کہ دونوں رسالے ان کے معین ذوق کے مطابق اور ان کی دلچسپی کے تھے، لیکن آگے حصے میں چند جملوں سے زیادہ نہ آسکے۔ ان کی بعض گرفتیں بھی ایسی تھیں، جو غلط فہمی پیدا کرسکتی تھیں، بہرحال اس عاجز نے ایک خط میں بے تکلف اس تاثر کا اظہار کیا۔

مسعود صاحب جن کو ان کے صدہا قارئین اور بیسیوں واقفین ایک بے لاگ ناقد اور ایک خشک مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں، محبت سے بھرا ہوا دل رکھتے تھے، ان کی مثال ایک پہاڑی چشمہ کی سی تھی، جو بہت دور تک پتھر کی سلوں کے نیچے بہتا ہے لیکن پتھر کو ہٹائیے تو ابل پڑتا ہے، میرے اس خط نے ان کے ساز محبت کو چھیڑ دیا اور انھوں نے اس خط کا جواب اس طرح دیا:

"برسوں یا چوتھے روز محبت نامہ ملا۔ پڑھ کر سکتہ سا ہوگیا۔ یہ چار دن اور راتیں بلا مبالغہ آپ کی یاد اور پچھلی فراموش شدہ (جو الحمدللہ مسعود بے نوا نے کبھی فراموش نہیں کی) صحبت کے خیالی تذکروں میں گزری ہیں" تزویر کلام "جس کا عمر فاروقؓ سقیفہ والی روایت میں ذکر کرتے ہیں، مجھ پر مسلط ہے، باتیں بناتا رہا۔ انشا پردازی کا زور دکھلاتا رہا، دل کا دل میں لمبے لمبے خط لکھ ڈالے، دماغ کے لوح قلم پر جانے کتنی صفائی پیش کر ڈالی۔ یوں سمجھئے کہ ان چار دنوں میں صرف یہی خیال مسلط رہا کہ کسی طرح علی میاں کے دل و دماغ سے یہ اثر دور ہو جائے ندوہ سے علیحدگی، فکر و مسلک میں تھوڑا سا تفاوت بعض مسائل میں اختلاف اور زندگی کی راہوں کے بدل جانے کے باوجود دو شخصیتوں سے میری محبت کبھی کم نہ ہوئی، پٹنہ، جالندھر، پنڈی اور لیندا د ہر جگہ ان کے ذکر سے مجلس معطر رہی، اس حد تک کہ میرے رفیق، عزیز اور شاگرد سب کے سب انہیں اپنا استاذ، مربی اور اپنے سے قریب سمجھتے ہیں۔ جماعت اسلامی اور دوسرے حلقوں کی چھوٹی بڑی

مجلسوں میں جب کبھی ذکر آیا، تو اسی محبت و اظہار
قرب کے ساتھ، اور اس جرأت و صفائی کے ساتھ
کہ تعجب کی ماری ہوئی مخلوق کو بارہا حیرت ہو ہو گئی
آپ مجھے ہر دو بزرگ کرن ہیں؟ آپ جیسے ذہین
آدمی سے صاف صاف کیا عرض کروں، مگر وقت
آگیا ہے کہ صاف صاف کہوں، یہ دونوں دو دمان
شجرۂ نبوت، صورت و سیرت میں سادات کرام
کے سچے نمونے، ایک استاد دوسرا دوست و محبوب
محبوب تو استاد بھی ہیں، پر انہیں "محبوب" کہتے ہوئے
ادب مانع ہے۔ سید صاحب قبلہ کی محبت کبھی کم نہیں
ہوئی، اللہ گواہ ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سید صاحب
بھی اس کسک کو محسوس کرتے ہیں۔ بارہا ناظم صاحب کہہ
بھی گئے ہیں "مسعود عالم باغی ہے مگر وفادار" اس
نالائق کے لیے یہ شہادت کافی ہے۔ جانے
علی میاں بھی یہ کسک محسوس کرتے ہیں یا نہیں؟
کہتے ہیں "دل راز دل را ہست" ۔

لیکن اس پُر جوش محبت کے ساتھ ان کی پختگی اور توازنِ دماغی دیکھیے
کہ وہ اپنے مسلک پر قائم ہیں اور اس کے لیے کسی معذرت کی ضرورت
نہیں سمجھتے، بڑی صفائی سے کہتے ہیں :-

"اما بعد۔ آخر یہ جھگڑا کیا ہے؟ تنقید و تحسین میں آخر برا
ماننے کی بات کیا ہے، جہاں تک فکر و رائے کا
تعلق ہے، دوستوں کے درمیان اختلاف قابلِ
برداشت ہونا چاہیے۔" الخ

اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ آرام پہنچائے ؎

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

ان کی کتاب "نظرۃ اجمالیہ" شائع ہوئی تو حسبِ معمول انھوں نے
مجھے بھیجنے میں پہل کی، کتاب پر سرسری نظر ڈالی تو اس میں چند خلا
محسوس ہوئے اور بعض مباحث کسی قدر تشنہ، خیال تھا کہ ان کی توجہ خود
[illegible] اس طرف تو آپ ہی دلاؤں گا، ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ [illegible]

عزیز نے اس پر تبصرہ اور تنقید کی، اس تنقید میں کچھ خوش طنزی کی جھلک
آگئی اور قلم حدود سے تجاوز کر گیا۔ اس کا جواب جماعتِ اسلامی کے
ایک پُر جوش رفیق نے تلخ لہجہ میں دیا۔ اس کا جواب الجواب بھی اسی
لہجہ و انداز میں شائع ہوا۔ اس پورے سلسلے میں الحمد للہ ایک طرف
راقم سطور دوسری طرف مولانا ابو اللیث صاحب اور خود صاحب کتاب
بالکل بے تعلق رہے۔ یہ دو نوجوانوں اور ادیبوں کی ادبی نوک جھونک
تھی، جو حدود سے تجاوز کر گئی۔ بدگمانیوں کا بڑا موقع تھا، لیکن اعتماد
نے الحمد للہ ان کو راہ نہیں دی۔ مسعود صاحب کا خط آیا:
آپ اس مناظرہ سے دل گرفتہ نہ ہوں، میری طبیعت بھی متاثر
ہے۔ آپ بھی متاثر نہ ہوں، میں نے ۲۳ جنوری ۵۴ء کے خط
میں جواب دیا :

"مولوی عبید اللہ صاحب نے میری نادانستگی اور
لاعلمی میں مضمون لکھا، اور مولوی جلیل احسن صاحب نے
مولانا ابو اللیث صاحب کی لاعلمی میں مضمون لکھا،
دونوں نے اس سلسلے کو ناپسند کیا اور تنبیہ کی، اب
مجھے معلوم نہیں جواب الجواب شائع ہوتا ہے یا نہیں
بہرحال آپ اطمینان رکھیے وتلک شکاۃ ظاہر
عنک عارھا"

تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی آزمایا،
اس زار و نزار مریض کو جس کو ہمیشہ راحت و انتظام کی ضرورت رہتی
راولپنڈی جیل میں اسیری اور نظربندی کے دن گزارنے پڑے، مجھ
کو اس سعادت پر بڑا رشک آیا۔ ان کے علم، فضائل و کمالات کا
اعتراف ہمیشہ سے تھا، لیکن اس موقع پر دل نے ان کی سبقت
اور اپنی پسماندگی کا صاف اعتراف کیا، اسی زمانہ میں عزیزی محمد میاں
میں نے ایک خط لکھا جس میں ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ
میری مبارکباد پہنچا دیں، اور میرے ہم نام شاعر ابو الحسن التہامی کا
مصرعہ خفیف سی ترمیم کے بعد سنا دیں :

فسبقتنی و اخرتنی فی المضمار

چار مہینہ کی اسیری کے بعد ۲ اگست ۵۳ء کو جب وہ رہا

لوگوں نے مسرت و تہنیت کا خط لکھا، اس کا انھوں نے جو جواب دیا وہ ان کے صحیفۂ اعمال میں ان شاء اللہ ہمیشہ درخشاں رہے گا اور کیا عجیب ہے کہ وہ میزانِ قیامت میں بھی وزنی ثابت ہوا۔

"محبِ گرامی — سلام و تحیات فراواں

آپ کے عنایت نامے رہائی کے بعد نظر سے گذرے، محبت و اخلاص کے نقوش اور گہرے ہو گئے، اللہ تعالیٰ آپ کو خدمتِ دین کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا کرے۔ مجھ فقیر کے لیے یہ بس کرتا ہے کہ ایک پاک باز نوجوان سید کے دامنِ الفت سے وابستہ ہے، دوسرا خط بھی مل گیا، شکریے پر شکریہ! کیا گرفتاری اور کیا رہائی؟ سیرت نگاری کرتا رہا مولوی جعفر تھانیسری [illegible] کی، یہ میٹھی میٹھی گرفتاری اور بی کلاس کی آسائشیں کس شمار میں ہیں؟ حاشا! کہ ابتلا کو دعوت نہیں دیتا، اور نہ اس مریضِ ناتواں میں برداشت کی طاقت ہے۔ پر یہ مہمانی بھی تو نہیں، بس سیاسی زبان میں زیارت (یاترا) ہوگئی، جھجک تو الحمد للہ کبھی نہیں تھی اور کچھ چھپی چھپائی ہوگی تو وہ بھی دور ہوگئی۔

اس تنہائی میں کچھ حدیث پڑھ لی، اللہ کرے، یہ سلسلہ جاری رہے، کل لاہور جا رہا ہوں پھر کبھی اطمینان سے

(والسلام عاجز مسعود ۱۹-۱۲-۱۹۵۳ء)

اللہ تعالیٰ کا فضل خاص تھا کہ یہ سنتِ یوسفی ادا ہوگئی اور جس نے امام احمد کی استقامت اور صادقین صادق پور کی عزیمت کی داستان ہمیشہ مزے لے لے کر بیان کی تھی۔ اس کو بھی اس مئے الفت کا ایک جرعہ چلتے چلتے عطا فرما دیا گیا۔ رہائی کے بعد مجھے مسلسل خطوط لکھے کہ مصر و شام کے سفر سے متعلق اپنے مشورے اور تجربات لکھو، مصر و شام کا عزم پختہ تھا، اور اس کی ضروری تیاریاں ہو رہی تھیں، لیکن کس کو اور خود ان کو معلوم نہ تھا کہ کونسا سفر درپیش ہے۔ ۲۱ جمادی الآخر ۱۳۷۳ھ کو مجھے آخری خط لکھا جس میں ان کی زبان سے "ایں داغ ما ثبت شبنم" نکل گیا۔

"محبِ عزیز — سلام و تحیات

اب تک ہنوز روزِ اوّل ہے، یہاں بڑی پوچھ گچھ ہے پہلی مارچ پیر کے دن کراچی جا رہا ہوں۔ دیکھیں اللہ کو کیا منظور ہے:"

اللہ کو منظور یہ تھا کہ تھکا ہارا مسافر جو بیماریوں کا تھکا ماندہ تکلیفوں کا زار و نزار تھا، اب آرام کرے۔

اس خط کے ٹھیک اٹھارہ روز بعد ۱۰ رجب ۱۳۷۳ھ (۱۹ مارچ ۱۹۵۴ء) کو رات کو ۹ بجے کراچی میں ایک سخت دورہ کے بعد آخری ہچکی آئی اور جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ رحمہ اللہ و غفر لہ و رفع درجاتہ

۲۰ مارچ کو اچانک انتقال کا تار ملا، ادھر سفرِ پاکستان کی تیاری تھی خیال تھا، ۸، ۹ برس بعد ملاقات ہوگی، جی کھول کر باتیں ہوں گی، یہاں جانے والا دوسرے عالم میں پہنچ گیا، اس عالم میں ملاقات کی امید ہی منقطع ہوگئی ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

دوسرے روز مسافرت در مسافرت کے عالم میں اس گنجِ خوبی کو سپردِ خاک کیا گیا، دوستوں نے لکھا، کہ بہت بڑا مجمع تھا، بعض عرب سلطنتوں کے سفراء اور شہر کے عمائد اور صاحبِ علم رخصت کرنے آئے تھے، سفیرِ شام استاذ جواد المرابط جو ان کے علم و فضل کے خاص طور پر گرویدہ تھے، اور کچھ ہی عرصہ پہلے بڑے ذوق و شوق سے مجھ سے "الضیاء" کی فائل طلب کر چکے تھے۔ خاص طور پر متاثر تھے اور سنا ہے کہتے تھے کہ کاش! ان کی جگہ میں ہوتا۔

ان کے جاننے والوں نے تعزیت کے خطوط لکھے، ان کا کوئی حقیقی بھائی زندہ نہ تھا۔ جو لوگ ان کے تعلقات سے واقف تھے انھوں نے جس طرح ان کے والد صاحب (مولانا حکیم عبد الشکور صاحب مدظلہ) کو تعزیتی خطوط لکھے وہاں انھوں نے پرانے رفیق اور بھائی کی حیثیت سے بجا طور پر مجھے بھی تعزیت کا مستحق سمجھا، مخلص دوستوں اور قدیم رفیقوں نے ایک دوسرے کی تعزیت کی۔ علمی، ادبی اور دینی حیثیت سے یہ ایک بڑا خسارہ تھا، بلاشبہ ایک بڑا صاحبِ قلم اور اس برصغیر ہند و پاکستان کا سب سے بڑا عربی کا انشا پرداز اٹھ گیا۔ اس برصغیر

افسوس کیا جائے کم ہے، لیکن میرے لیے یہ حادثہ ذاتی نوعیت کا ہے میرا تیس برس کا مخلص رفیق، چاہنے والا دوست، شفقت کرنے والا بھائی، میری کامیابی سے خوش ہونے والا، لغزشوں پر متنبہ کرنے والا ساتھی، دنیا سے اٹھ گیا، زمانہ جس رخ پر جا رہا ہے، اور جس خود غرضی اور مادیت کا دور دورہ ہے، اس کے پیش نظر اس کی بہت کم امید ہے کہ ایسے سچے دوست، باوفا رفیق اور مخلص ساتھی پیدا ہوں گے۔

اگر ہماری قوم بیدار ہوتی، اور اس میں جوہر شناسی اور فراخ حوصلگی کا مادہ ہوتا تو ان کی ذات سے بڑا نفع اٹھایا جا سکتا تھا، ان سے نصاب کی ترتیب میں مدد لی جا سکتی تھی۔ ان سے عربی مدارس عربیت اور انشاء کے بارہ میں استفادہ کر سکتے تھے۔ طلبہ اور علوم عربیہ کے شائقین اطراف و اکناف سے ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے آتے، لیکن افسوس ہے کہ ان سے ان کے شایانِ شان فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ اور ایک محدود حلقہ کے سوا بہت کم لوگوں نے ان کو پہچانا، اور ان سے فائدہ اٹھایا — ان کی عمر ۴۴ سال سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اس عمر میں انھوں نے بڑے بڑے کام کئے اور ایسی تصانیف یادگار چھوڑیں، جو ایک شخص کو کامیاب مصنف اور نامور صاحبِ علم و صاحب قلم بنانے کے لیے کافی ہیں، کسی شخص کے افتخار کے لئے وہ سرمایہ ناکافی نہیں جو انھوں نے چھوڑا، مگر جو لوگ ان کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے واقف تھے، اور جو ان کے علم و فکر کا ارتقاء دیکھ رہے تھے، اور جن کو اس کی آرزو تھی کہ بہت دن زندہ رہیں اور کام کریں، ان کی زبان پر بصد حسرت و یاس یہ مصرعہ ہے کہ

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

بقیہ۔ ہمارے مہمان صفحہ ۶۴

تا رجب سمجھتے ہیں کہ الفاظ قلب کی گہرائیوں سے نکلیں!

مولانا مسعود صاحب کے جذب و سوز کا اظہار ان کی گفتگو سے ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کی تحریروں میں بھی یہ چیز نمایاں ہے خاص طور پر اُن کی کتاب "دیارِ عرب میں" ان کی دلی کیفیات بالکل منظر عام پر آگئی ہیں۔ یوں بھی کسی مصنف کا روزنامچہ اس کی تمام تحریروں سے زیادہ اس کے مذاق و عادات کو بے نقاب کرتا ہے اس لئے مولانا مسعود صاحب کے عربی ممالک کے سفر کی یہ روداد اُن کی سیرت و مزاج کو سمجھنے کا ایک بڑا اچھا ذریعہ ہے جس میں کسی قسم کا تصنع اور تصنیفی رنگ آمیزی نہیں ہے۔ خاص طور پر کہ حجاز میں مولانا کی ناسازیٔ طبع کے باوجود، دھرتی تڑپ اور ملاقاتوں کے لئے بھاگ دوڑ، بڑی قابلِ رشک ہے۔ مدینہ منورہ کے سفر میں روضۂ نبویؐ کی قربت کے ساتھ ساتھ شوق و اضطراب کا لمحہ بلمحہ بڑھنا اور اس عالم میں بے ساختہ اشعار کا زبان پر آ جانا۔ ان کی طبیعت کا ایک بالکل ہی نیا رخ سامنے لاتا ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ مولانا مسعود عالم صاحب اپنے "خشک" مسلک کے باوجود قلب کے کیسے رقیق تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ان کو کیا کچھ دلی تعلق تھا۔

ایک عجیب اتفاق کے تحت مولانا نے اپنے آخری سفر میں میرے مکان پر قیام نہیں فرمایا بلکہ خاص طور پر مجھ سے خط کے ذریعہ اجازت طلب فرمائی کہ اس مرتبہ وہ بجائے میرے یہاں کے کرم حکیم نصیر الدین صاحب ندوی کے یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ حکیم صاحب اپنے یہاں قیام نہ کرنے پر مسلسل ناراض ہیں اور اب خفا ہو کر یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ جماعتی عصبیت کے سبب کسی اور کے یہاں ٹھہرنا گوارا نہیں، اور یہ کہ ندویوں سے ربط و ضبط بڑھانا پسند نہیں۔ اس لئے اس مرتبہ حکیم صاحب کے یہاں قیام کروں گا و سمجھئے کیوں کہ یہ الزام مجھ کو کسی طرح گوارا نہیں۔"

تین چار دن تک جناب حکیم صاحب کے یہاں مہمان رہنے کے بعد ہمارے مہمان جماعتِ اسلامی کی شوریٰ کے اجلاس کے سبب پیر الٰہی بخش کالونی میں عارضی قیام گاہ پر منتقل ہو گئے۔ اور اس سے اگلے روز شب کو اچانک وہ ہم کو اپنی میزبانی کے شرف و مسرت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر کے اللہ کے مہمان ہو گئے۔ ربِّ العزت اُن کو اپنی میزبانی کا اعزاز عطا فرمائے! آمین

چند تاثرات و مشاہدات

عبدالغفار حسن

مولانا مسعود عالم ندوی سے ماہنامہ الضیاء (عربی) لکھنؤ کے ذریعہ غائبانہ تعارف تقریباً ۱۹۳۲ء سے تھا، لیکن ملاقات بالمشافہ گفتگو کا شرف پہلی بار ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حاصل ہوا۔ دارالعلوم میں راقم الحروف کی حیثیت ایک اجنبی نوارد مسافر کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مولانا مرحوم جس خندہ پیشانی، محبت اور تواضع سے پیش آئے۔ اُس کے نقوش دل میں اب تک تازہ ہیں۔

ان کے اسی اخلاص محبت کا اثر تھا کہ جب مجھے ۱۹۴۲ء میں اُن کی جماعت اسلامی میں شرکت کی اطلاع ملی تو دل کی گہرائیوں میں فرحت و انبساط کی لہر دوڑ گئی۔

۱۹۴۴ء میں جب مولانا مرحوم دارالعروبہ کے سلسلہ میں جالندھر منتقل ہوئے تو بارہا مالیر کوٹلہ سے جالندھر کا سفر اور دو دو تین تین دن وہاں قیام کا موقع ملا۔ اس طرح یہ رشتہ اخوت و محبت قوی تر ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں جماعت اسلامی کی تربیت گاہ کے سلسلہ میں مجھے راولپنڈی منتقل ہونا پڑا اور دو ماہ تک مولانا مرحوم کی رفاقت حاصل رہی۔ اس عرصہ میں مولانا کے سوانح، اخلاق، عادات اور روزمرہ کے معمولات کو قریب سے دیکھنے اور ان سے علمی استفادہ کرنے کے مواقع بھی میسر آئے۔

آخری ملاقات

مولانا سے جیل سے رہائی کے بعد وسط مارچ ۱۹۵۴ء میں کراچی میں آخری ملاقات ہوئی۔ دن کے وقت مرکزی مجلس شوریٰ میں شرکت رہتی تھی اور مغرب کے بعد مولانا مرحوم سے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ وفات سے آدھ گھنٹہ قبل ہی مولانا سے تقریباً ایک گھنٹہ تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا مرحوم کو رفقاء جماعت کی دینی اور اخلاقی تربیت کا احساس تھا۔ جب اُن کو بتایا گیا کہ حلقہ سیالکوٹ میں ارکان و متفقین کی تربیت کے لئے دو روزہ تربیت گاہوں کا سلسلہ جاری کر دیا گیا ہے۔ جو اچھا خاصا مفید ثابت ہو رہا ہے تو مولانا مرحوم نے اُس پر مسرت و اطمینان کا اظہار فرمایا۔

مولانا مرحوم کو اپنے خصوصی مزاج، لطیف ذوق اور بلند پایہ علمی صلاحیت کی بنا پر نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ پورے عالم اسلامی میں ایک اہم نمایاں مقام حاصل تھا۔ ذیل میں اسی سلسلہ کے چند مشاہدات و تاثرات کو قلمبند کیا جا رہا ہے۔

۱۔ مقصد سے والہانہ وابستگی

ناتواں جسم، کمزور صحت کے باوجود اقامت دین کے سلسلہ میں مفوضہ فرائض انجام دینے میں ہر وقت مستعد نظر آتے تھے۔

بارہا ایسا ہوا کہ دمہ کے دورہ نے بے دم کر کے چارپائی پر لٹا دیا لیکن حال یہ تھا کہ ذرا سی توانائی پاتے ہی اپنے کام میں مشغول ہو جاتے۔

دمہ کا شکار، لاغر، نحیف جسم محض مقصد سے یکسوئی کی بنا پر بغداد، بصرہ، موصل کویت، نجد اور حجاز کے طویل اور طویل سفر کی صعوبتیں کس طرح خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ مولانا مرحوم کے سفر نامہ "دیارِ عرب" سے ہو سکتا ہے۔

مولانا کی زندگی میں جو کہ مسلسل جد و جہد کی ایک داستان ہے۔ ان لوگوں کے لئے درس عبرت ہے جو ماحول کی ناسازگاری اور جسم کی ناتوانی کو آڑ بنا کر اقامت دین کے فرض سے غافل ہو جاتے ہیں۔

۲۔ سراپا اخلاص محبت

مولانا کی محبت میں اخلاص کی چاشنی اور شفقت کی مٹھاس تھی۔ دوستوں اور ساتھیوں سے کبھی ظاہر داری اور بناوٹی خوش مزاجی سے پیش نہیں آئے۔ بلکہ تعلقات و روابط میں ظاہر باطن کا پرتو ہوتا تھا۔ جو دل میں ہوتا وہ زبان پر آ جاتا۔

فرمایا کرتے تھے کہ میرے دوستانہ روابط میں یک رنگی ہوتی ہے۔ ظاہر و باطن دونوں یکساں۔ مجھے تصنع، بناوٹ اور منافقانہ ظاہر داری سے سخت نفرت ہے۔ اگر میں کسی سے ملتا ہوں تو پوری طرح ملتا ہوں۔ اور کٹتا ہوں تو پھر اس کٹنے میں کوئی لچک نہیں ہوتی۔

۳۔ تواضع

مولانا؟ کا علمی لحاظ سے جو مقام ہے۔ اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود مزاج میں تواضع اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ جب کسی بات پر ٹوکا گیا۔ تو مولانا نے بھری مجلس میں اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں ذرا سی بھی جھجک محسوس نہ کی۔ تواضع اور انکساری کا یہ جوہر عام طور پر اہل علم میں بہت ہی کم نظر آتا ہے۔ ایک عالم اور صاحب فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس کا ذہن کبر اور خود پسندی سے آلودہ نہ ہونے پائے۔

۴۔ بے لاگ تنقید

تواضع اور مخلصانہ محبت کے باوجود دوستوں اور ساتھیوں پر اُن کی تنقید بے لاگ ہوتی تھی۔ شوریٰ کا اجلاس ہو یا احباب کی مجلس جہاں کہیں انہوں نے محسوس کیا کہ کتاب و سنت کے منافی طور پر عمل اختیار کیا جا رہا ہے۔ فوراً اُن کی زبان تنقید بے نیام ہو گئی۔ اس بارے میں نہ انہوں نے کبھی ارباب اقتدار کی پرواہ کی اور نہ اصحاب ارشاد و افتاء کی۔

اس فریضہ احتساب کے معاملہ میں نہ رفقائے جماعت کی رعایت تھی اور نہ امیر جماعت کا لحاظ۔ لیکن یہ تنقید غیظ و غضب کا مظہر نہ ہوتی تھی۔ بلکہ اس موقع پر مولانا مرحوم کا دل سوز و گداز اور مخاطب کی بھلائی سے پوری طرح لبریز نظر آتا تھا۔

۵۔ سادگی اور وضعداری

مولانا مرحوم شروع سے کم روپوش تھے۔ لباس، رہائش اور مزاج میں سادگی ان کی زندگی کی نمایاں خصوصیات میں سے شمار کی جا سکتی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب تک لباس میں تکلف اور رہائش میں کر و فر نہ ہو۔ مخاطب کو متاثر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس کے پاس قوت کا اصل منبع یعنی ایمان کا خزانہ موجود ہو۔ اُسے اس ظاہری تکلف اور نمائش کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

۶۔ معلمانہ شفقت

مولانا مرحوم اپنے رفقا کے لئے ہمدرد ساتھی بھی تھے اور مشفق و مخلص استاد بھی۔ اُن کی تنبیہہ اور زجر و توبیخ میں بھی شفقت کی مٹھاس پائی جاتی تھی۔ اُن کی رفاقت کا صحیح لطف وہی اٹھا سکتا تھا جو قدرت کی طرف سے تحمل اور قوت برداشت کی نعمت سے نوازا گیا ہو۔

مولانا مرحوم کو مرض کی شدت اور جسم کی ناتوانی کے باعث بہت جلد غصہ آ جایا کرتا تھا۔ لیکن جتنی جلدی یہ غصہ آتا تھا۔ اتنی ہی تیزی سے اتر بھی جاتا تھا۔ وسعت ظرف کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی رفیق کی کوتاہی کو کینے کی شکل نہ دی۔ جو شکایت ہوئی برملا کہہ دی۔ اور دل صاف کر لیا۔

آیت قرآنی "ربنا ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا" پر پوری طرح عامل تھے۔

۷۔ صفائی سلیقہ شعاری اور وقت کی پابندی

لباس اور قیام گاہ کی صفائی کا پورا خیال رکھتے تھے۔ اس بارے میں مولانا کے جذبات بہت ہی نازک تھے۔ اگر ضرورت پڑتی تو خود ہی جھاڑو لے کر کمرے کی صفائی شروع کر دیتے۔

مولانا مرحوم کو اس عادت سے شدید نفرت تھی کہ کسی رفیق کی کوئی چیز بلا اجازت اٹھائی جائے۔ اسی طرح ان کی ہدایت تھی کہ جو چیز جہاں سے لی جائے وہیں رکھی جائے۔ اوقات کی پابندی کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ اس معاملے میں رفقاء کار سے بھی سخت بازپرس فرماتے۔

۸۔ نمائش سے نفرت

مولانا مرحوم کو نمائش اور اخبارات و رسائل کے ذریعہ نام و نمود کی خواہش سے سخت نفرت تھی اس قسم کی ذہنیت کو مولانا "حب الظہور" اور "چھپنے کی خواہش" سے تعبیر فرمایا کرتے تھے۔

۹۔ شخصی عقیدت

غالباً ۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ لدھیانہ میں جماعت کا سہ ماہی اجتماع تھا۔ راقم الحروف نے رفقاء کو خطاب کرتے ہوئے کہا "کہ اصولی جماعت کے لئے شخصی عقیدت میں غلو "سم قاتل" کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مرض جب بڑھتا ہے تو شخصیت پرستی کے جراثیم پوری جماعت میں پھیل جاتے ہیں اور مقدس نصب العین اور صحیح اصولوں کی علمبردار جماعت محض ایک نفسی فرقہ بن کر رہ جاتی ہے۔ زعمائے جماعت اور راہنمایان ملت کی تکریم و توقیر ایک فطری امر ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر اس تکریم و توقیر کی لے اس قدر بڑھے کہ شخصیت پرستی کی وبا پھوٹنے کا اندیشہ ہو تو رفقا کو اس طرز عمل کی ہمت افزائی کے بجائے اس کے خلاف سراپا احتجاج بن جانا چاہیئے"

مولانا بھی اس اجتماع میں تشریف فرما تھے۔ اس تقریر پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "کہ جماعت کے ذمہ دار کارکنوں کو اس طرف پوری توجہ دینی چاہیئے۔ ہمارے لئے اصل محبوب و مقصود نصب العین ہے نہ کہ اشخاص۔

اشخاص اور مردان کار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر اشخاص کی عقیدت اصل مقصد کی راہ میں حائل ہو تو ہمیں اشخاص کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کو اس مرض سے محفوظ رکھے"

مشاہدات و تاثرات کا دامن بڑا وسیع ہے۔ ضروری باتیں پیش کر دی گئی ہیں۔ خدا کرے یہ معروضات رفقاء کے لئے تعمیر سیرت اور تطہیر اخلاق میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

بقیہ محسن کی یاد میں صلا

ہوتے ہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

بارِ الٰہا! اپنے اس مجاہد بندے پر رحمتوں کا نزول فرما۔ اور اس کو اپنے دامن عفو میں جگہ دے۔ اس نے تیری رضا کے لئے جس طریق کار کو حق سمجھا آخر وقت تک اس پر قائم رہا۔ اسی کے لئے اس نے گھربار چھوڑا۔ دوستوں عزیزوں کو چھوڑا۔ غربت و مسافرت کی زندگی بسر کی۔ ملک ملک کی خاک چھانتا پھرا۔ بے شک وہ راہ حق کا ایک مسافر تھا۔ اور اسی راہ میں کام آیا۔

من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه فمنهم من قضیٰ نحبه ومنهم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔

[illegible]

ہمارے مہمان

سلطان احمد

اپریل ۱۹۴۵ء میں جماعت اسلامی کا پہلا کل ہند اجتماع دارالاسلام پٹھان کوٹ میں منعقد ہوا تھا، میرے لئے تحریک اسلامی سے عملی طور پر واقف ہونے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ شروع سے لے کر آخر تک اجتماع کی ساری کارروائی اس قدر دلچسپ، ولولہ انگیز اور ایمان افروز ثابت ہوئی کہ آج تک پھر ویسی ہی کیفیت دوبارہ محسوس ہونے کی تمنا ہی رہی۔ ایسی مصروفیت اور انہماک کا یہ نقصان بھی ہوا کہ جماعت کی مشہور اور چیدہ شخصیتوں سے واقف ہونے کا بالکل موقع نہ مل سکا۔ واقف ہونا تو درکنار بجز دو تین اصحاب کے کسی کا صورت آشنا بھی نہ ہو سکا۔ گھر پہنچ کر عرصہ تک شرکت کا وہ سرور باقی رہا۔

روح میں ایک بے چینی اور قلب میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی کہ خبر ملی مولانا مسعود عالم صاحب ندوی لکھنؤ تشریف لائے ہیں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مقیم ہیں۔ بڑے ہی اشتیاق کے ساتھ دو ایک رفقاء کے ہمراہ ملنے کے لئے گیا۔ میرے لئے نہ صرف جماعت کے مشاہیر میں سے کسی صاحب سے ملنے کا پہلا موقع تھا بلکہ خود ندوہ جانے کا بھی پہلا اتفاق تھا۔ اور یہ پہلی حاضری خوشگوار تعجب کا باعث ہوئی۔ ندوہ کا سکون، صفائی اور سادگی دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا، پرانے مذہبی حلقوں اور دینی مراکز میں جو ایک خاص قسم کا بے ڈھنگا پن اور بدسلیقگی دیکھنے میں آتی ہے، وہ یہاں مفقود تھی۔

مسجد سے متصل مہمان خانہ میں کچھ حضرات جمع تھے، جو سب کے سب میرے لئے اجنبی تھے، مختصر سا تعارف ہوا، مولانا مسعود عالم صاحب جسمانی لحاظ سے بڑے نحیف و ناتواں اور تنفس کے مریض تھے مگر چہرہ بڑا باوقار اور سنجیدہ تھا، زبان میں لکنت بھی تھی جو نئے آدمی کے لئے گفتگو کے سمجھنے میں مانع ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی باتیں بڑی جاذب توجہ ثابت ہوئیں۔

عربی زبان سے ان کا خاص شغف نمایاں تھا اور عربی ممالک کے حالات اور اشخاص سے وہ خوب واقف معلوم ہوتے تھے، میرے لئے ذاتی طور پر ان کی نشست و برخاست اور عادات و اطوار میں خوش سلیقگی سب سے پہلے متاثر کرنے والی تھی۔ اتنے عرصہ کے بعد یاد نہیں کہ کیا باتیں ہوئیں لیکن یہ خوب یاد ہے کہ میرا تعارف "بدقسمتی" سے دہلی کے تاجر گھرانہ کے ایک فرد کی حیثیت سے کرایا گیا تھا جس کو بعد میں میں نے ہمیشہ یاد رکھا، کیونکہ تاجروں کے متعلق مولانا کی مستقل رائے یہ تھی کہ یہ لوگ پیسہ ہونے کی وجہ سے خواہ مخواہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کے پاس عقل بھی ہے، اور محض اس مفروضہ پر علمی اور دینی معاملات میں پیسہ کے ساتھ ساتھ مشورہ دینا بھی اپنے اوپر لازم کر لیتے ہیں!

بڑے خوشگوار تاثرات کے ساتھ میری پہلی ملاقات ختم ہوئی۔ میں نے اپنے مکان پر قیام کی درخواست پیش کی تو فرمایا "لکھنؤ جب آؤں گا تو پہلا حق ندوۃ ہی کا رہے گا، لیکن اگر کبھی دہلی آنا ہوا تو آپ کی خوشی پوری کر دوں گا"، اس سے مجھے مولانا مسعود عالم ندوی کی وضع داری اور ہر ایک کے لئے ان کے پاس و لحاظ کا اندازہ ہوا، جو ان کی مستقل خصلت اور دائمی عادت تھی۔

چنانچہ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ مولانا نے خط کے ذریعہ مجھے اپنے دہلی آنے کے ارادہ سے مطلع کیا۔ میں مولانا مسعود عالم صاحب سے عمر میں چھوٹا اور ہر بات میں بہت چھوٹا تھا، پھر مذاق و مرتبہ کا فرق بھی موجود تھا تاہم ازراہ شفقت انہوں نے میری خواہش کا پورا احترام کیا اور یوں مجھ کو ان کی میزبانی

کا دوسری شرف حاصل ہوا۔

میرا قیام اپنے مکان کے بالاخانہ پر تھا جو بہت ہی چھوٹا تھا لیکن خلاف توقع مولانا نے اسے پسند کیا۔ بلکہ حیرت کا اظہار کیا کہ اتنی کم جگہ میں تمام ضروریات پوری کرنے کا سامان موجود ہے اور اس کی داد دی کہ چیزیں ترتیب دینے میں ایک ایک انچ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ میرے لئے میزبان کے فرائض انجام دینے کا پہلا موقع تھا لیکن یہ نیا تجربہ دشوار ثابت نہیں ہوا۔ البتہ شام کو مولانا نے چائے کی فرمائش کر کے مجھ کو خاصی پریشانی میں ڈال دیا۔ میں تو اس سے بیزار تھا ہی لیکن ہمارے گھر میں بھی کسی کو چائے کی عادت نہ تھی۔ اس لئے چائے کا سامان تک موجود نہ تھا۔ بہرحال جوں توں کر کے سب چیزیں مہیا کیں، دیگچی میں پانی جوش دیا، بازار سے پکا ہوا دودھ اور چائے کی پتی منگوائی اور تیار کر کے مولانا کے سامنے معذرت کے ساتھ پیش کر دی۔ مولانا نے تمام سامان پر ایک نگاہ ڈالتے ہی سارے گھر کے چائے کے ذوق کے بارے میں اندازہ کر لیا۔ اور خاموشی سے چائے پینے لگے۔ پینے کے بعد فرمایا "اب آپ کل سے چائے بنوانے کی تکلیف بالکل نہ فرمائیں، میں خود سارا انتظام کر لوں گا لیکن برائے خدا اس چینی کے پیالہ میں مجھ کو چائے پینے پر مجبور نہ کریں!" اس کے بعد مولانا نے پھر کبھی مجھ سے چائے کی فرمائش نہیں کی اور یوں میزبانی کا سب سے بڑا بوجھ ہمیشہ کے لئے میرے اوپر سے کم کر دیا۔

اگلے روز رسالہ ترجمان کے دفتر چلنے کی خواہش ظاہر کی، اور میرے ساتھ قرول باغ جا کر مفتی عتیق الرحمن صاحب وغیرہ سے ملاقات کی۔ واپسی پر میں نے دریافت کیا "کیا یہ حضرات جماعت اسلامی سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں؟" فرمانے لگے "اختلافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہم بہرحال اپنے تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں" یہ مجھے بہت آگے جا کر پتہ چلا کہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کی یہ بہت بڑی خصوصیت تھی کہ وہ ہر قسم کے اختلافات و مخالفت کے علی الرغم جس شخص سے جیسے مراسم رکھتے تھے، ان کو حتی الامکان پوری وضع داری کے ساتھ نبھانے کی پابندی کرتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا نے دارالعروبہ کے لئے مستقل جگہ کا انتخاب کرنے کی غرض سے کئی مقامات پر قیام کر کے دیکھا۔ ان کے کام کے لحاظ سے سب سے بہتر ذرائع و وسائل کراچی میں تھے لیکن افسوس کہ ان کے دمہ کے مرض کی وجہ سے کراچی کی آب و ہوا ان کو راس نہیں آ سکتی تھی۔ اس لئے مولانا نے حیدرآباد سندھ کو اپنا مستقر بنایا۔ کراچی میں مولانا مسعود عالم صاحب کے مستقل قیام سے مایوسی کے بعد حیدرآباد کی قربت بھی بڑی غنیمت تھی لیکن ہماری بدقسمتی کہ اس شہر کا موسم بھی ان کے لئے باعث تکلیف ہوا، اور مولانا گوجرانوالہ اور بالآخر راولپنڈی منتقل ہونے پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد مجلس شوریٰ کے اجلاس کے سوا سال میں ایک پھیرا کراچی کا لگانے ہی پر مولانا سے شرف ملاقات حاصل ہونے کا موقع رہ گیا۔

کراچی جب بھی تشریف لائے، مولانا مسعود عالم صاحب نے تقریباً ہمیشہ اپنی میزبانی کا شرف ہم کو بخشا۔ بڑی سادگی اور شفقت کے ساتھ اپنے آنے کے ارادہ سے مطلع فرما دیتے اور اصرار کرتے کہ پوری بے تکلفی سے میں اپنی آمادگی یا مجبوری کا اظہار کر دوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری مجبوریوں نے کبھی مجھ کو اس سعادت و مسرت سے محروم نہیں کیا۔ آمد کی اطلاع میں جو تاریخ، دن اور وقت لکھ کر بھیجتے، مولانا ہمیشہ اس کی پابندی کرتے۔ پہلی مرتبہ جب کراچی میں میرے یہاں تشریف فرما ہوئے تو میں نے دیکھا کہ تمام معمولات میں حسب سابق باقاعدگی، پابندی اور شستگی کا پورا اہتمام کیا جاتا۔ میزبانی یقیناً مشکل کام ہے اور ایک دائم المریض مہمان کی خاطر تواضع تو اور بھی نازک کام ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ مولانا مسعود عالم صاحب کی بیماری کے باوجود میزبانی کا بار مطلق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ میری اہلیہ مولانا کی تشریف آوری کا سب سے زیادہ خیر مقدم کرتی تھیں۔ دوران قیام میں ملنے جلنے والوں کی کثرت نہ ہوتی تھی اور اس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ مولانا مسعود عالم صاحب نہایت پابندی اور وضع داری کے ساتھ اپنے تمام احباب اور اعزا سے خود ملنے جایا کرتے تھے۔ میں خود اکثر ایسی ملاقاتوں کے وقت ساتھ رہا ہوں اور جس بے تکلفی اور محبت کے ساتھ یہ ملاقاتیں ہوتی تھیں اس سے پتہ چلتا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے لئے دلوں میں کتنی جگہ ہے۔ اختلاف رائے اور مسلک کے سبب مولانا نے کبھی کسی سے مراسم ختم نہیں کئے۔ کسی کی مذمت ان کے منہ سے سننے میں نہ آتی لیکن جس کی

تعریف کرتے تو بہت کرتے اور اکثر کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی صحبت میں بار بار کی کچھ بھی باتیں دہرائی جاتیں۔ اور مولانا کسی شخص کی برائی خصوصیاً
بیان کرنے سے کبھی نہ تھکتے۔ افسوس یہ کہ میزبانی کی قربت کے باوجود ان صحبتوں سے سب سے کم استفادہ کرنے والا میں ہی ہوتا تھا۔ شام کو اپنی مصروفیات
سے واپسی پر جب میں مولانا کی صحت اور دیر تک جاگنے کے خیال اور بات کرنے کی تکلیف کے احتمال سے مجلس برخاست کرانا چاہتا تو مولانا اپنی تکلیف کو
نظر انداز کر کے خود دوسروں کی طرف سے مجلس برقرار رکھنے کی اجازت طلب فرمانے لگتے لیکن بالآخر مجھ کو اپنی میزبانی کا سب سے ناگوار مگر ضروری فرض انجام
دینا پڑتا اور آخر کار مجلس سے اپنے مہمان کے آرام کرنے کی اجازت حاصل کرنی پڑتی۔ اس حرکت کے سبب مجھ کو لوگوں سے سخت دلی اور بداخلاقی تک کے الزامات
تک سننے پڑتے تھے۔ مگر مجبوری تھی۔

مولانا مسعود عالم صاحب اپنے بزرگ استاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور اپنے مکرم دوست مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بالخصوص اور بعض دوسرے
حضرات کا ہمیشہ بڑے احترام اور عقیدت کے ساتھ ذکر کرتے رہتے۔ عربی ممالک کی بہت سی شخصیتوں سے بھی ان کی دلی وابستگی تھی، بلکہ عرب دنیا کی ہر چیز
سے ان کو ایک والہانہ انس تھا۔ خود بھی عالم عرب کے ممتاز ترین انشا پردازوں میں شمار کئے جاتے تھے لیکن اردو داں طبقہ حتیٰ کہ ان کا قریبی حلقہ بھی عربی ادب
میں مولانا کی عظمت اور ان کی قدر و منزلت سے پوری طرح باخبر نہ تھا جو عربی بولنے والی دنیا میں اُن کے لئے موجود تھی۔ البتہ کبھی اسلامی ممالک کے مشاہیر کی مولانا
مسعود عالم صاحب سے ملاقات ہوتی تو کچھ اندازہ دیکھنے والوں کو ہوتا کہ اُن کی نظروں میں مولانا کی حیثیت و مرتبہ کیا ہے۔

مولانا مسعود صاحب یوں بڑے خلیق اور حلیم الطبع انسان تھے لیکن "بڑے لوگوں" سے ملنے
جلنے میں بڑے محتاط اور خود دار واقع ہوئے تھے۔ تاہم ان کی شانِ استغنا کبھی تکبر یا نخوت کا پہلو نہیں بنی۔ خود ہر ایک کے پاس چل کر جاتے، اور پھر پوری خود اعتمادی
اور وقار کے ساتھ بڑے سے بڑے آدمی کو اپنی معمولی قیام گاہ پر مدعو کر لیتے اور لطف یہ کہ تاکید ہم کو کرتے کہ کبھی سفیر، امیر، مفتی یا شیخ کے لئے پر تکلف
اہتمام نہ کیا جائے بلکہ بالکل سادہ اور بے تکلف خاطر تواضع پر اکتفا کیا جائے۔ اس حکم کی ہمیشہ تعمیل کی گئی اگرچہ کافی اضطراب اور پریشانی کے ساتھ۔
باوجود اپنی بیماری اور تکلیف کے مولانا مسعود عالم صاحب بڑی پُر عزیمت طبیعت اور اسلام کی سربلندی کی زبردست تڑپ رکھتے تھے۔ کوئی
مجلس نہ تھی جو اس تذکرہ سے خالی ہو۔ میرے لئے مولانا کے مزاج و سیرت کا سب سے پُرکشش رُخ اُن کی طبیعت کا سوز اور دل کا گداز تھا، دین کی کسمپرسی اور
بےچارگی جہاں بھی دیکھتے یا سنتے تھے، بےچین ہو جاتے تھے اور اس حسرت و درد کے ساتھ تذکرہ فرماتے کہ مخاطب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ دین کے
خادموں میں وہ سوز و کرب کی کیفیت دیکھنا پسند کرتے تھے۔ اور جماعت کے کارکنوں میں اس چیز پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک
مرتبہ تنہائی میں مَیں نے یہ موضوع چھیڑا تو فرمانے لگے "آج یہ دوسرا موقع ہے کہ مَیں نے اس مسئلہ پر جماعت کے کسی شخص سے اس پر گفتگو کی ہے۔" انہوں
نے میری ذمہ داریوں کے پیشِ نظر چند نہایت قیمتی مشوروں پر مشتمل مجھ کو ایک خط بھی اس سلسلہ میں لکھا جو میرے لئے آج تک بڑا عزیز سرمایہ ہے۔
ایک موقع پر فرمایا "آدمی کے تقویٰ کا اندازہ اس کے رکوع و سجود کی کیفیت دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ جو شخص نماز میں جلدی کا عادی ہو اس کے
تقویٰ پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔" اپنے عزیز شاگرد عاصم صاحب کے پیچھے جب نماز پڑھتے تو طویل قیام میں بڑے شغف کے ساتھ قراءت سنتے، فجر کی نماز کے
بعد بھی اپنے رفیق سے، وقتاً فوقتاً بلند آواز سے تلاوت کرواتے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب ملنے آئے، تجوید کا شوق تھا، مولانا نے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی۔ انہوں
نے مصری طرز پر قراءت سنائی، شب کا وقت تھا اور پڑھنے کا انداز بڑا اچھا تھا۔ مَیں نے حجازی قراءت سے پڑھنے کی درخواست کی جو ان صاحب نے قبول
کی۔ مجھ کو مدت کے بعد ایسی تجوید سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔ اُن کے جانے کے بعد مولانا سے کچھ موزوں احوال ان کا پوچھا۔ تو فرمانے لگے
کہ "تجوید کا بہت شوق ہے اور اچھا پڑھتے ہیں مگر افسوس کہ تعریف و داد کے متمنی رہتے ہیں۔" اس لئے کانوں سے زیادہ پڑھنے کا ذوق نہیں ہوتا۔ دل کے
(باقی بر صفحہ ۱۲۸)

ایک لمحہ یاد کا، تاباں، درخشاں، جاوداں

لالۂ صحرائی

یہ واقعہ مئی ۱۹۴۷ء کا ہے، میں ان دنوں انگریز کے نظام باطل کی ایک بے حد قبیح قسم کی چاکری (فوجی ملازمت) سے تازہ تازہ رہا ہوا تھا، اور میرے ذہن پر رحمت حق کا تازہ تازہ ورود تھا، کہ دارالاسلام میں جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع کی خبر آئی، میں اس سے پہلے الٰہ آباد کے اجتماع میں محض ایک خاموش مبصر کی حیثیت سے شریک ہو چکا تھا، لیکن اب کے جذبۂ دل "تماشائی کی بجائے تماشا بنانے پر" مصر تھا، چنانچہ روایتی کچے دھاگے کی بجائے کشش حق کے "فولادی" نہیں نہیں برقی رشتے میں بندھ کر میں بھی کشاں کشاں وادیٔ پٹھانکوٹ کے اس نخلے سے دور افتادہ اور اجنبی قریے کی سمت چل پڑا، جہاں نیم براعظم ہند کے کونے کونے سے انسانیت کے دکھوں کو شفاؤں میں بدلنے کا عزم رکھنے والی تمام دردمند روحیں کھنچی چلی آ رہی تھیں۔

امرتسر کے اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے پٹھانکوٹ کے لیے گاڑی تبدیل کی، اس وقت شام کے چار بج رہے تھے، اور دن کی گرمی لمحہ بہ لمحہ پچھلے پہر کی دھیمی دھیمی اور میٹھی میٹھی خنکی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی، اُدھر دن کے ساتھ ساتھ میرے سفر کی "شام" بھی قریب آ چکی تھی، اور جسم کے ساتھ ساتھ میری روح بھی ــــ قرب منزل کے احساس سے، مدھم مدھم اور شیریں شیریں خنکیاں محسوس کر رہی تھی، میں نے پٹھانکوٹ جانے والی گاڑی پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ اور پھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے ایک پرسکون ڈبے میں داخل ہو گیا، ڈبے میں مجھ سے پہلے کالی ٹوپیاں پہنے دو ہندو تاجر سوار تھے، جو آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کر رہے تھے، میرے داخل ہوتے ہی انھوں نے اپنے پہلو بدلے، اور پھر پاس پڑی ہوئی ٹوکری میں سے کیلے نکال کر کھانے لگے۔ میں پلیٹ فارم کے رخ پر ایک کھڑکی کے سامنے بیٹھ گیا، اور باہر کا منظر دیکھنے لگا،

گاڑی چھوٹنے میں ابھی خاصی دیر تھی، لہٰذا پلیٹ فارم بے رونق سا نظر آ رہا تھا، لیکن ڈبے کے اندر، میرے دل و دماغ کی دنیا پر بے حد رونق طاری تھی، اور اسلام کی نشاط، ایمان کی تازگی، اور اجتماع کی دلکشی کے متعلق بے شمار جھلمل جھلمل کرتے خیالات و جذبات میرے اندرونی وجود میں پے بہ پے ستاروں کی مانند طلوع ہوتے چلے جا رہے تھے پلیٹ فارم کا ماحول، اپنا سفر، اپنی گاڑی، اور اپنے ڈبے کی ہر ہر شے مجھے بے حد دلکش اور وجد انگیز محسوس ہو رہی تھی، ایک عجیب قسم کے مصفا اور پاکیزہ احساس محبت سے میرا رواں رواں سرشار تھا، اور ہر شے پر مجھے خواہ مخواہ پیار آ رہا تھا، ایک میوہ فروش اپنی ریڑھی لے کر میرے قریب سے گذرا، تو میں نے اسے بڑی محبت سے آواز دے کر بلایا، اور پھر بڑے چاؤ کے ساتھ بہت سے کیلے خرید لیے، یونہی خواہ مخواہ ــــ اس کے بعد جب میرے ڈبے کے قریب سے دو قلی باتیں کرتے ہوئے گذرے، تو ان کی گفتگو سے پتہ چلا کہ کلکتہ سے آنے والی پنجاب میل لیٹ ہے، لہٰذا ہماری گاڑی بھی دیر سے چلے گی۔ لیکن میرے ذہن میں خیالات کی ریل گاڑی بدستور برق دار سرعت سے رواں تھی۔ اور میں اپنے ماضی، اپنے حال، اور اپنے مستقبل کے رنگا رنگ خطوں کے دلچسپ سفر میں محو تھا، یہ محویت مجھ پر دیر تک طاری رہی، اور اسے بالآخر پنجاب میل کی تیز سیٹی نے توڑا، جو ایک عجیب دہشت آمیز وقار کے ساتھ ہمارے مقابل کے پلیٹ فارم پر رکی، اور اس کے ساتھ ہی اسٹیشن کا سارا ماحول تھرتھرا اٹھا ...... پنجاب اور بنگال یعنی ہندوستان کے مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملانے والی اس تیز رفتار طوفانی گاڑی کی آمد نے اسٹیشن کے ہر باشندہ کو ایکا ایکی جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور فضا میں چاروں طرف بدحواسی و سراسیمگی بکھر گئی ...... میرے ذہن میں ماضی کے ان ایام کی یاد پھر گئی، جب میں اسی پنجاب میل کے ذریعے وقت کے

فرزندوں کی ایک ذلیل چاکری بجا لانے کی خاطر گھر سے لکھنؤ تک آیا جایا کرتا تھا، دل میں ندامت و شرمندگی کا ایک تیز ریلا امڈا، اور اس کے ساتھ ہی ماضی کے مکروہات سے مخلصی پالینے کے احساس نے زبان پر ترانۂ شکر جاری کر دیا: ۔۔۔ معاً میری نگاہ چند بالکل ہی انوکھے مسافروں پر پڑی، جو بدحواسی و سراسیمگی سے معمور ماحول میں نہایت اطمینان اور پُرسکون انداز میں سامنے سے چلے آرہے تھے، ان کی چال باتمکین، اطوار باوقار، اور حرکات اس بوکھلاہٹ سے یکسر خالی نظر آتی تھیں، جو ریل کے مسافروں خصوصاً تیز رفتار گاڑیوں کے مسافروں کا ناگزیر توشۂ راہ ہوتا ہے ۔۔۔۔ وہ سب ہماری ہی گاڑی کی سمت چلے آرہے تھے، جب وہ ذرا قریب آگئے، تو میں نے سب کو صورت آشنا پایا، اور پھر جب انھوں نے ہمارے ڈبے کا رُخ کیا، تو میری رُوح میں بے اختیار مسرت رقص کرنے لگی، اور میں دیوانہ وار آنے والوں کے خیر مقدم کے لیے اٹھا،

پہلا شخص ڈبے میں داخل ہوا، ۔۔۔۔۔ بلند و بالا قد، باغ و بہار چہرہ گھنی سیاہ ڈاڑھی، نفیس انداز و خصائل بہت حد تک بے داغ لباس، خوش روئی، خوش مزاجی اور خوش آوازی کا ایک دل آویز مرقع ۔۔۔ یہ سید عبدالعزیز مشرقی تھے!

دوسرا شخص اندر داخل ہوا ۔۔۔ بھرا بھرا جسم، متناسب اعضا، گول و موجیہہ چہرہ، جو ذہانت کی چمک، احساس کی لَو اور رفق و محبت کے گداز سے مملو و ہو تھلوں، ترکی ٹوپی، ہلکی نسواری، مگر چمکیلے بٹنوں کی شیروانی میں ملبوس، ۔۔۔ یہ مولانا عبدالجبار غازی تھے!

تیسرا شخص اندر داخل ہوا ۔۔۔۔۔ نسبتاً چھوٹا قد، دھان پان جسم، صاف رنگ، تیکھے نقش، پتلا سا ایک چہرہ، جس پر ایک سبک تر ڈاڑھی کی زیبائش، اور گہری سیاہ ۔۔۔ مگر فراستِ ایمان کی روشنی سے مشعلوں کی مانند چمکتی، اور افکار کی گہرائیوں میں ستاروں کی طرح جھلملاتی ۔۔۔ آنکھیں، جن پر حیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی پلکیں جیسے کسی شفاف جھیل پر بادلوں کے سائے ۔۔۔ اپنے تمام رفیقوں سے زیادہ صاف اور اُجلا لباس پہنے جس میں اکہرا جسم، چھوٹے سے سرو کی مانند، وقار اور تمکنت کے ساتھ نمایاں و استوار، ۔۔۔ یہ مولانا امین احسن اصلاحی تھے!

آخر میں، چوتھا شخص داخل ہوا ۔۔۔ مختصر سا نحیف و کاہیدہ بدن شائستہ اطوار، استوار ناک نقشہ، ذرا سا لمبا چہرہ، جو پھول کی طرح شگفتہ، صبح کی طرح تر و تازہ، اور فرشتوں کی طرح پُرمحبت، ۔۔۔۔۔ اُبھری ہوئی کشادہ پیشانی جس پر گویا "تافتت ستارۂ بلندی" والا مضمون عیاں، آواز میں لکنت، لیکن گفتگو میں طبع رواں کے بحر ناپیدا کنار کی موجیں کروٹیں لیتی ہوئی ۔۔۔ سپید کھدر کا لباس جس پر کہیں کہیں طویل سفر کی کلفتوں کے آثار نمایاں، ۔۔۔ یہ مولانا مسعود عالم ندوی تھے!

میں نے لپک کر ان کا اسباب سنبھالا، اور پھر اپنے قریب کی جگہ رومال سے صاف کر کے پیشِ خدمت کرنا چاہی۔ مولانا "ارے ارے" کہہ کر میرے رومال پر جھپٹے، اور پھر "شکریہ" کہہ کر وہیں تشریف فرما ہو گئے،

آنے والے حضرات کے ساتھ ابھی تک میرا تعارف یک طرفہ تھا، لہٰذا مولانا نے میرے قریب تشریف رکھتے ہی بڑے پُرمحبت انداز سے پوچھا "امرتسر سے تشریف لائے ہیں؟" میں نے اُن کے رعب و احترام کی وجہ سے کہہ دیا "جی ہاں" ۔۔۔ اس کے بعد دوسری طرف سے نہ جانے مشرقی صاحب یا غازی صاحب نے مولانا سے کوئی استفسار فرمایا اور وہ پلٹ کر اُن سے گفتگو فرمانے لگے، یوں میرے ساتھ اُن کا سلسلۂ کلام ٹوٹ گیا، اور پھر تا دیر ٹوٹا رہا، ساتھ ہی میں نے معاً بھانپ لیا، کہ مولانا بھی میری ہی طرح کم آمیز ہیں۔

ہماری گاڑی کی روانگی کا وقت اب قریب آرہا تھا، اور اس کے ساتھ ہی ہمارے ڈبے میں مزید مسافروں کی آمد بڑھتی جاتی تھی۔ یہ انٹر کا ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا، چنانچہ جلد ہی اس میں خاصی بھیڑ ہو گئی، اور تمام برتھ مسافروں سے جیسے لبالب بھر گئے۔ ہم سب انقباض سا محسوس کرنے لگے میں نے مولانا مسعود عالم صاحب کی ناسازیٔ طبع کے احساس سے اٹھ کر اُن کے لیے بیٹھنے کی جگہ کشادہ کر دی، لیکن مولانا نے لپک کر میرا ہاتھ تھاما، اور پھر بولے "بیٹھیے بیٹھیے، تکلف نہ کیجیے" میں بیٹھ گیا، اور اس کے ساتھ ہی گاڑی چل دی، غازی صاحب، اصلاحی صاحب اور مشرقی صاحب اور غالباً دو یا تین اور رفیق ہمارے قریب کے برتھ پر جا بجا تشریف فرما تھے، اور میرے اور مولانا مسعود عالم کے عین سامنے سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک نوجوان بیٹھا تھا جس کے بند ھے ہوئے کان اس کے ہندو ہونے پر دلالت کر رہے تھے، ان دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں کا کھنچاؤ خاص شدت

اختیار کر چکا تھا، اور فرقہ پرستی و تعصب کی وہ خون آشام گھٹائیں، جو بعد میں سارے پنجاب پر آگ اور لہو بن کر برسیں، ان دنوں ملک کے سیاسی مطلع پر امنڈی آرہی تھیں۔ ہر شخص اندر ہی اندر ایک عجیب قسم کا خوف تکدر اور کشمکش محسوس کر رہا تھا، جہاں دو چار آدمی جمع ہوتے، اور باہمی گفتگو کا موقعہ پیدا ہوتا۔ فی الفور اسی کھنچاؤ اور کشمکش کا ذکر چھڑ جاتا، چنانچہ اس روز بھی جونہی ہماری گاڑی چلی، اور ڈبے کے مسافروں کو اپنے ہمراہیوں کا جائزہ لینے کا موقعہ ملا۔ تو یک بیک ذہنوں کی کشمکش کا لاوا زبانوں اور لبوں کے راستے سے بہہ نکلنے کے لیے بے تاب ہو گیا، ... سب سے پہلے سامنے والے سوٹڈ بوٹڈ ہندو نوجوان نے پہلو بدلا، اور بولا "گاڑی آج پھر لیٹ ہو گئی"۔

کالی ٹوپیوں والے ہندو تاجروں میں سے ایک مسکرا کر بولا "جی آپ گاڑی لیٹ ہونے کا کہہ رہے ہیں، ابھی نہ جانے اور کیا کیا ہوگا"۔ اس پر اس کے دوسرے ساتھی نے اسے تیکھی تیکھی نظروں سے گھورا، اور وہ سراسیمہ سا ہو کر رہ گیا۔

"صاحبو، اللہ تو سب کا ہی حافظ ہے، پر اس ملک کی حفاظت کا کوئی سر و سامان ہمیں بھی تو کرنا چاہیے" یہ مولانا مسعود عالم ندوی تھے۔

"بس جی، ہو چکی حفاظت" سوٹڈ بوٹڈ نوجوان کے منہ سے اس کے دل کا لاوا پھوٹ بہا!

مولانا جواب میں مسکرا دئیے، اور اُن کے چہرے پر یکبارگی جیسے محبت ہی محبت نظر آنے لگی، اور پھر جو گفتگو ہوئی، افسوس، کہ میں اسے بہت حد تک بھول چکا ہوں، ہاں اتنا یاد ہے کہ قریباً آدھ ہی گھنٹے بعد وہی ہندو نوجوان جو بیشتر ازیں ہر مسلمان کا منہ نوچنے کے لیے تیار نظر آتا تھا اب بڑے سکون اور انہماک سے مولانا کی میٹھی میٹھی باتیں سن رہا تھا۔ پھر جب وہ اگلے اسٹیشن پر مولانا سے ایک پرتپاک مصافحہ کے بعد اترا، تو میں نے دیکھا، کہ مودودی صاحب کا ایک پمفلٹ اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کا ایڈریس مولانا کی جیب میں!

اگلے اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے اٹھ کر امرتسر سے خریدے ہوئے کیلے فرداً فرداً تمام رفیقوں کی خدمت میں پیش کیے، سب نے بلا تامل انھیں قبول فرمایا۔ البتہ مولانا اصلاحی صاحب نے ازراہ انکسار اعراض فرمایا، اس پر مولانا مسعود عالم صاحب نے بڑھ کر کیلے کی ایک پھلی خود ان کی خدمت میں پیش فرمائی جسے انھوں نے کمال مہربانی سے شرف قبولیت بخش دیا، مشرقی صاحب نے بڑی محبت اور رغبت سے کیلا کھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے ہولے سے کہا "سرنا"

"خوب، خوب، تبھی ہمیں کیلے کھلائے جا رہے ہیں" مولانا مسعود عالم اس قدر بلند آواز میں بولے، کہ سارا ڈبہ گونج اٹھا، میں نے دیکھا، کہ اُن کا چہرہ ایک عجیب معصوم مسرت سے کھل اٹھا ہے، ویسی ہی معصوم مسرت، جیسی کسی بچے کو پردیس میں اپنا ہمجولی میسر آنے پر ہوتی ہے، پھر وہ مولانا اصلاحی صاحب کی طرف رُخ پھیرتے ہوئے بولے "شوق سے کھائیے گا، مولانا، یہ بھی ہمارے رفیق ہیں" ـــ اور سچ جانئے، مولانا کے اس اظہار مسرت پر مجھے یوں لگا، جیسے انھوں نے مجھے کیچڑ سے اٹھا کر اپنے گلے لگا لیا ہو، ان کے تبحر علمی کا سارا رعب میرے دماغ پر سے چھٹ گیا، اور میرے احساسِ کمتری کا نازک آبگینہ چھن سے ٹوٹ گیا۔

... میں نے یوں محسوس کیا، جیسے مولانا مسعود عالم کوئی عالی مقام عالم اور اجنبی شخص نہیں ہیں بلکہ میرے کوئی دیرینہ ہم جلیس ہیں، میرے حقیقی بھائی ہیں، نہ صرف وہ، بلکہ اس ڈبے کے سارے رفیق، مشرقی صاحب، غازی صاحب، اصلاحی صاحب اور ان سے بھی آگے ہر کلمہ گو، ہر درد مند انسان، میرا بھائی ہے، تمام دنیا کے اندر میری ایک وسیع برادری آباد ہے میرے اور اُن کے درمیان اجنبیت کا کوئی احساس قائم نہیں ہے، بیگانگی کی کوئی دیوار موجود نہیں ہے۔ اور دوئی کا کوئی پردہ حائل نہیں ہے!

..... بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، اور میں نے جی ہی جی میں اُس خدائے رحیم و کریم کا شکریہ ادا کیا، جس نے کرۂ ارضی کے گوشے گوشے میں آبادنی نوع انسان کو باہم گرد پیوست رکھنے کے لیے دین فطرت کا بے مثال اور لازوال رشتہ پیدا کیا ... اور اب میں نے بالکل بے تکلفی کے ساتھ مولانا سے گفتگو شروع کر دی، معلوم ہوا، کہ غازی صاحب، امین احسن صاحب اور مشرقی صاحب تو سیدھے مدینہ کی تربیت گاہ سے تشریف لا رہے ہیں، البتہ مولانا مسعود عالم نے لکھنؤ سے ان کی معیت اختیار فرمائی ہے۔ جب مجھے مولانا کے قیامِ لکھنؤ کا علم ہوا

تو میں نے بڑے شوق سے محب گرامی جناب سلطان احمد صاحب کے بارے میں ان سے دریافت کیا، مولانا نے بتلایا کہ وہ ایک مجبوری سے اجتماع میں تشریف نہیں لا رہے۔

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی رواں تھی، باہر شام کے سائے اب کثیف ہوتے جا رہے تھے، لیکن ڈبے کے اندر، میرے دل و دماغ پر نئے نئے افکار کے طلوع سے عجیب چکا چوند کا عالم طاری تھا، ان افکار کی چھوٹ اب یکسر مولانا مسعود عالم کے آفتابِ علم سے مستنیر تھی، مولانا کے ذہنِ رسا نے صاف بھانپ لیا تھا کہ میں دبستانِ حق کا ایک جاہل اور مبتدی طالب علم ہوں۔ چنانچہ وہ بڑی ہی حکمت اور فراست کے ساتھ باتوں ہی باتوں، اور اشاروں ہی اشاروں میں مجھ پر اس دبستان کے اسرار اجاگر فرما رہے تھے... ان کے وہ چھوٹے چھوٹے فقرے، سادہ و سلیس جملے، پُر محبت اور دلگداز اندازِ گفتگو، دلآویزی کے جادو سے بھرپور لہجہ جس میں اثر و تاثیر کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا — مجھے اب تک یاد ہے اور ان شاء اللہ تا زلیست یاد رہے گا، اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں بشری کمزوری کے ماتحت جب کبھی کسی شخص کے ساتھ تلخ و تند انداز میں گفتگو کرنے لگتا ہوں، تو معاً میرے ذہن میں مولانا مسعود عالم کا وہ نرم و ملائم اندازِ گفتگو ابھر آتا ہے، اور میں جی ہی جی میں نادم ہو کر اپنے لہجے کی ترشی پر شیریں کلامی کا برش پھیر دیتا ہوں۔

مولانا کا یہ التفات نہ جانے مجھے کب تک میسر رہا، اور میرا مفلس و قلاش ذہن نہ جانے کب تک ان کے خزینۂ افکار سے زر و جواہر سمیٹتا رہا، اُن کے اس جود و سخا کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا، جب ہماری گاڑی رکی، اور معلوم ہوا کہ سرنا کا اسٹیشن آ پہنچا، سرنا کا اسٹیشن، جو ہماری منزل تھا اور قافلۂ حق کا نقطۂ آغاز — ہم سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے مولانا مسعود عالم صاحب کا سامان اٹھانا چاہا، لیکن انھوں نے مجھے ملائمت — اسی دل موہ لینے والی ملائمت کے ساتھ — منع فرما دیا۔

جب ہم گاڑی سے اترے، تو میں نے دیکھا، کہ سرنا کے چھوٹے سے اسٹیشن پر بے شمار مسافر اتر آئے ہیں، ویسے ہی از کھے مسافر، پُر سکون، باتمکین، خوش اطوار، بدحواسی، بوکھلاہٹ، شور و ہنگامہ سے کوسوں دور، — کہنی مار کر آگے نکل جانے کی بجائے دوسروں کو ساتھ لے کر چلنے والے مسافر، — میرے ہم سفر، میرے رفیق میرے بھائی!

پلیٹ فارم پر مرکز کے کچھ رفیق، اپنے رفقاء کے خیر مقدم کے لیے موجود تھے، مولانا مسعود عالم نے میرے ساتھ ایک پُر جوش مصافحہ فرمایا، اور پھر ان کے ہمراہ چل دئیے، میں نے بھی اپنا اسباب اٹھایا، اور بصد ذوق و شوق اس قافلۂ شوق میں شامل ہو گیا، جو دارالاسلام کی بستی کی سمت رواں تھا۔

اگلے روز، صبح ہی صبح اجتماع کی باقاعدہ کارروائی شروع ہو گئی پہلی نشست ختم ہو جانے کے بعد جب میں بستی میں سے گذرا، تو ایک مکان کی بیٹھک میں مولانا مسعود عالم کو لوگوں کے ایک خاصے بڑے جمگھٹے میں بیٹھا پایا، سب لوگ فرش پر بیٹھے تھے، اور مولانا اُن کے بیچ میں تشریف فرما تھے۔ حاضرین میں بوڑھے بھی تھے، اور جوان بھی، دینی عالم بھی تھے، اور جدید تعلیم یافتہ لوگ بھی، چاروں طرف سے مولانا پر مختلف مسائل کے متعلق استفسارات ہو رہے تھے اور وہ اسی ملائمت، دل موہ لینے والی ملائمت اور محبت سے سب کو جوابات سے مطمئن کر رہے تھے، میں چند ثانیے رکا، اور پھر آگے بڑھ گیا۔

مولانا کے ساتھ میری جو چند ہی ساعت کی ملاقات ہوئی، وہ بعد میں انہیں یقیناً بھول گئی ہو گی، لیکن میں اُس ملاقات کے کیف کو اب تک نہیں بھولا۔ اور ان کی موت کے بعد تو یہ کیف میری روح کی گہرائیوں تک نفوذ کر گیا ہے ...... سوچتا ہوں، کہ میں جو راہِ حق کی بس ایک حقیری گردِ کارواں کی مانند ہوں، مولانا کے ساتھ اپنی بے حد مختصر ملاقات کا تاثر اب تک نہیں بھلا سکا، تو اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا، جو مدت العمر تک جادۂ حق پر مولانا کے شانہ بشانہ گامزن رہے، اور جنھوں نے اپنی زندگیوں کا ایک کثیر حصہ اُن کی معیت میں بسر کیا!

پیدا کہاں ہیں یارو، پھر ایسی ہستیاں!

مسافر

جیلانی۔ بی اے

کل ہند اجتماع پٹھانکوٹ کی بات ہے ۔ ایک شام نماز پڑھتے ہوئے میں نے ایک نہایت دبلے پتلے شخص کو اپنے ساتھ صف میں کھڑا پایا۔ اس کی داڑھی خشخشی اور آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا ۔ وہ رامپوری کا مار ٹوپی، سرد واسکٹ اور تنگ مہری کا پائجامہ پہنے ہوئے تھا ۔ اس کی عالمانہ شکل و صورت سے مجھے اچانک خیال ہوا ۔ ہو نہ ہو یہی مولانا مسعود عالم ندوی ہیں ۔ میں نے خود بڑھ کر مصافحہ کیا جب مولانا کو میرا نام معلوم ہوا تو بڑے خوش ہو کر فرمانے لگے : "اچھا ہوا آپ مل گئے ورنہ میں ارادہ کر رہا تھا کہ مائیکروفون پر آپ کے متعلق اعلان کرا دوں "

نماز سے فارغ ہو کر ہم دونوں مولانا کی قیام گاہ پر آ گئے ۔ سردی بڑھ رہی تھی ۔ مولانا فرش پر بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے اور اپنے آپ کو فسواری رنگ کی اونی چادر میں خوب اچھی طرح لپیٹ لیا ۔ شام کی سیاہی گہری ہو رہی تھی مگر مولانا نے لیمپ نہیں روشن کیا ۔ اس لئے میں مولانا کے چہرے کو بخوبی نہ دیکھ سکتا تھا ۔ ادھر ادھر کی رسمی باتوں کے بعد مولانا نے میری طرز تحریر کی تعریف کی جس کا میں نے اسی زبان میں شکریہ ادا کیا ۔ پھر کچھ آرٹ اور جدید لکھنے والوں کے متعلق گفتگو ہوئی مگر یہ جلد ہی منقطع ہو گئی اس لئے کہ شام کی نشست کا وقت قریب آ رہا تھا ۔ اس پر مولانا نے خود ہی فرمایا "اب اجتماع کا وقت ہو رہا ہے ۔ میں اس نشست میں اس لئے نہیں شریک ہو سکتا کہ مجھے سردی سی لگ رہی ہے اور طبیعت کے بگڑنے کا اندیشہ ہے "

اس نیم اجالے میں مجھے مبہم سا احساس ہوا کہ مولانا بڑے ستھرے قسم کے آدمی ہیں ۔ کیوں کہ کمرے میں ہر چیز خوش سلیقگی کا پتا دے رہی تھی ۔ یہ ابہام اس وقت یقین میں بدل گیا جب مولانا نے مجھے اور نعیم صاحب کو جالندھر بلایا ۔ اس اجتماع کا مقصد باہم مل کر کوئی رسالہ یا پبلشنگ ادارہ قائم کرنا تھا ۔ مجھ کو اب یاد نہیں کہ کیوں یہ اسکیمیں اپنی موت آپ مر گئیں تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ مولانا کی پابندی وضع اور سلیقہ شعاری میرے دل پر مرتسم ہو گئی ۔ آپ کی بود و باش نہایت سادہ لیکن نہایت نفیس تھی ۔ ایک کمرے میں آپ کام کرتے تھے ، دوسرے میں سوتے تھے ۔ کاغذ قلم ، کتابیں ، کپڑے غرض ہر شے بڑی قرینے اور ترتیب سے پڑی تھی ۔ چاندنی اجلی تکیے اجلے ، خود مولانا کا لباس بے داغ ۔

رات دسترخوان پر مولانا اس طرح تن کر بیٹھ گئے گویا وہ اپنے گھر میں نہیں کسی دعوت میں شریک ہیں ۔ اگر انہیں فی الفور اٹھ کر کسی تقریب پر بھی جانا پڑ جاتا تو وہ سوائے شیروانی کے اور کسی چیز کی کمی اپنے لباس میں نہ پاتے ۔ میں ننگے سر ہی دسترخوان پر بیٹھ گیا ۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مولانا آداب طعام کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں اور ننگے سر کھانا کھانا پسند نہیں کرتے ۔

مولانا کو زیادہ سمجھنے کا موقع مجھے اس وقت ملا جب میں خاص مولانا ہی کو ملنے کے لئے جالندھر آیا ، اب کی بار مولانا نے اپنی زندگی کے خانگی پہلو کی بھی ایک جھلک دکھا دی ۔ انہوں نے کہا "میری بیوی کو مالیخولیا ہے ، پھر میں دمہ کا مریض ، اس کو پاس رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ جو کچھ ہوتا ہے وہیں بھیج دیتا ہوں "

پھر مولانا نے بتایا " میں ایک عزم کے ساتھ ہی مدرسے کام کرتا ہوں ۔ جب دورہ پڑتا ہے تو بالکل بے دم ہو جاتا ہوں ۔ لیکن جونہی افاقہ ہوتا ہے فوراً عزم کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں "

مولانا اس وقت صوفہ میں معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے الماری سے "الفتیا" اور "الفتح" کے پرچے نکال لئے جن میں ان کے مضامین چھپے ہوئے تھے، "الفتح" میں مولانا کا عہد جوانی کا ایک فوٹو بھی تھا۔ اس فوٹو میں مولانا کا چہرہ خوب بھرا ہوا تھا۔ غالباً یہ مرض سے پہلے کا فوٹو تھا۔ پھر خطوط کا وہ پلندہ نکال لائے جس میں سید سلیمان ندوی مرحوم، مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دیگر نامور ہستیوں کے خطوط تھے۔ خط بڑی ترتیب سے تاریخ وار بندھے ہوئے تھے۔ مولانا نے سید سلیمان ندوی کا ایک خط نکال کر پڑھا پھر اسی جگہ رکھ دیا۔ جب خط پڑھ چکے تو مولانا کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خط کے ساتھ وہ وقت اور ماحول بھی تازہ ہو گیا تھا جس میں یہ خط انہیں لکھا اور انہیں پہنچا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے فقط خیال ہوا۔" مولانا کو یہ خط کیوں عزیز ہیں؟ لیکن ایک مدت کے بعد جب مجھے ایک اور دمہ کے مریض کے پاس خطوط کا ویسا ہی پلندہ نظر آیا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ دمہ جیسا سخت مرض آدمی کی ہمت کو پست اور اس کے عوالم کو محدود کر دیتا ہے۔ یہ اسے اتنا نیم جان بنا دیتا ہے کہ وہ سفر کے قابل ہی نہیں رہتا۔ جب کہ سفر ہی وہ سب سے بڑا ذریعہ ہے کہ جس سے آدمی خارجی دنیا سے اپنے تعلقات وسیع کر سکتا ہے۔ ناچار وہ اپنے گھر ہی کی چار دیواری کے اندر اپنی شخصیت کے نقش و نگار بناتا رہتا ہے۔ اگر مولانا مریض نہ ہوتے تو وہ اپنی شخصیت و ذہانت کا جلوہ صرف عربی تراجم اور تاریخی وقائع نگاری ہی میں نہ دکھاتے بلکہ ان حقیقتوں پر بھی کمند ڈالتے کہ جن کے انکشاف سے آدمی کی زندگی میں اطمینان اور سکون رہتا ہے۔ لیکن جسم کی کم ہمتی نے ان کی جولانی محدود کر دی اگرچہ ان کا جوہرِ عزم بدستور غیر متاثر رہا۔

دوسری بڑی وجہ جو مولانا کی شخصیت کو "داخل" کی جانب کھینچ رہی تھی وہ زبان کی لکنت تھی۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انسانی تعلقات کی توسیع میں یہ کتنی بڑی رکاوٹ ہے۔ جو چیز ایک کے لئے بالکل فطری اور غیر شعوری ہوتی ہے وہی الکن کے لئے مسلسل دباؤ اور اذیت کا باعث بنی رہتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ آگے بڑھے دوسرے اس کی بات سنیں۔ لیکن نہ تو زبان کی گرہ اسے آگے بڑھنے دیتی ہے نہ سننے والوں کو لطف آتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ اپنا سررشتہ ربط قائم نہیں رکھ سکتا تو وہ ایک تلخ خود سپردگی کے ساتھ اپنی شخصیت کو اس طرح سمیٹ لیتا ہے کہ جیسے کچھوا اپنی گردن کو ناموافق حالات میں اپنے خول میں چھپا لیتا ہے۔ اگر مولانا کی ذہانت معمولی اور ان کا عزم کمزور ہوتا تو وہ کبھی اتنے نامور نہ ہوتے کبھی ایسی تحقیقی کتابیں نہ لکھ سکتے۔ اور کبھی ایک پھیلنے والی انقلابی تحریک میں حصہ نہ لیتے۔ بلکہ گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر کچھ لکھ پڑھ لیتے اور اسی خاموشی کے ساتھ آہٹ پیدا کئے بغیر اس دنیا سے چلے جاتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عزم و ذہانت نے ان چٹانوں سے ٹکرا کر بجائے پیچھے ہٹنے کے سیلاب کی صورت اختیار کر لی۔ اور انہی استقامت کی مدد سے ان کی چھپی ہوئی شخصیت کو نمایاں کر دیا۔

جب میں ان کے کارناموں پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا نظر آتا ہے گویا وہ صرف کھدائی ہی کا کام کر سکے، کوئی عمارت نہ تعمیر کر سکے۔ تاریخ ان کا محبوب موضوع تھا۔ بجائے تاریخ کے عظیم قوانین کی کھوج لگانے کے انہوں نے دو بہت بڑی اسلامی تحریکوں کی کامیابی و ناکامی کے اسباب کی چھان بین اپنے ذمہ لے لی۔ ان موضوعات پر ان کی تصانیف گراں بہا ہیں اور آئندہ کا کوئی بھی تاریخ داں ان تاریک پیمان کتابوں سے صرف نظر کر کے غور نہیں کر سکتا ان کی تالیف میں مولانا نے بڑی محنت تحقیق اور جستجو سے کام لیا ہے اور ہر بات کے ثبوت میں اتنے اقتباسات و حوالہ جات کا انبار لگا دیا ہے کہ پڑھنے والا بعض اوقات یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہتا کہ وہ ان اقتباسات و حوالہ جات سے عمارت نہیں بنا رہے ہیں بلکہ دبی ہوئی عمارت کو ان سے کھود رہے ہیں۔ وہ اپنی نہیں دوسروں کی صحیح بات کے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کر رہے ہیں۔

مولانا اس معاملے میں ان سے مختلف ہیں کہ جن کے پاس کہنے کی کوئی بات ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات کی تائید میں کسی کو نہیں اپنی ہی شخصیت کسی کے نہیں اپنے ہی دلائل پیش کرتے ہیں۔ ان کی بات کا تمام تر وزن اس پر ہوتا ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں اور اس کے لئے انہی کا علم کافی ہے۔ وہ اگر کہیں اقتباس

اعادہ وہ بیگڑی ہیں تو اپنی مطلب برآری کے لئے، اپنی بات کی تفہیم و توضیح کے لئے ۔ ان کے نزدیک دوسروں کے اقوال و خیال اینٹ پتھر سے زیادہ کی قیمت نہیں رکھتے کہ جن سے صرف اپنی ہی عمارت چننے کا کام لیا جا سکتا ہے ۔ ان کا اسلوب بیان چاہے کتنا ہی نرم و ملائم کیوں نہ ہو ان کا انداز مطلق العنان پیدا نہیں رہ سکتا ۔ ایسے لوگ صحیح معنوں میں جابر ہوتے ہیں ۔ وہ دوسروں کو اپنی دنیا بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس معاملے میں وہ کسی رحم یا التجا سے شناسا نہیں ہوتے ۔ ان کے مسلک میں پاسداری نہیں ہو سکتی ۔ اگر وہ دوسروں کے احساسات و جذبات کا خیال رکھنا شروع کر دیں تو انہیں اپنے تمام منصوبے سے دستبردار ہونا پڑے گا ۔ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کیسے پیش کریں گے ؟

لیکن اس قسم کی جباری مولانا مسعود عالم نہ کر سکتے تھے اپنی طبیعت کے لحاظ سے بھی اور اپنی صحت کے لحاظ سے بھی ۔ وہ پاسداری کو کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑتے تھے ۔ وہ کتاب کے آخر میں اپنے ماخذ کا حوالہ دس اہتمام و انداز سے دیں گے کہ کوئی حرف گیری نہ کر سکے کہ فلاں بات غیر مستند سے لی گئی ہے ۔ ہر حوالے کو مع صفحہ اور ایڈیشن کے درج کریں گے اور جب کبھی کسی پر تنقید کرنی ہوتی ہے تو اس عجز و نیاز سے کرتے ہیں کہ مبادا اس کے جذبات ٹھیس لگ جائے ۔ مولانا بار بار یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ تنقید حاشا و کلا شخصی یا ذاتی پرخاش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اصول کی بنا پر ہے اس بارے میں نہایت اخلاص سے کام لے رہے ہیں ۔ مثال کے طور پر میں مولانا کی ایک کتاب "مولانا سندھی کے خیالات و افکار پر ایک نظر" اٹھا لیتا ہوں ۔ مولانا سندھی نے اسلام کا جو قومی تصور پیش کیا تھا وہ سخت خطرناک اور غضب آور تھا ۔ لیکن دیکھیے مولانا بات کہتے ہیں تو کس نیاز مندی اور انکسار کے ساتھ ۔ صفحہ تین پر ہے

"مگر جب خود اپنی جماعت کے ممتاز اصحاب فکر ان نفوس قدسیہ کے منہ آئیں ۔ ان کی پاک نیتوں پر حملے کریں، ان کے ضرب المثل اخلاص پر شک کریں تو پھر خواہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے ۔ ایک طرف یہ خیال کہ بزرگوں کی غلطیوں پر نکتہ چینی کہیں بے ادبی نہ شمار کی جائے عرض مدعا سے روکتا ہے ۔ دوسری طرف احساس فرض اور یہ خوف کہ اگر سکوت سے کام لے کر غلطیوں کی تصحیح نہ کی گئی تو کہیں بزرگوں کی یہ لغزشیں آگے چل کر تاریخی حقائق نہ بن جائیں، اظہار مطلب پر اکساتا ہے ۔ یوں تو مروت اور صداقت کی کشمکش ہمیشہ صبر آزما ہوا کی ہے لیکن راقم کے لئے اس تحریر کے سلسلہ میں یہ کشمکش بہت طویل اور تکلیف دہ رہی آخر دو تین مہینوں کی ذہنی الجھن کے بعد دل و دماغ نے اظہار مطلب ہی کے حق میں فیصلہ کیا اور زبان قلم نے بسم اللہ کہہ کر داستاں کی بسم اللہ کی "

پھر صفحہ ۹ پر ہے: "یہاں عاجز صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ ـــــــ"

ساری کتاب لکھ ڈالنے کے بعد بھی مولانا یہ فرماتے ہیں ۔

"ارادہ ایک مختصر تبصرہ لکھنے کا تھا ۔ مگر کوشش کے باوجود تحریر کچھ نہ کچھ طویل ہو ہی گئی ۔ پھر بھی نقد حق ادا نہ ہوا ۔ ضرورت ہے کہ کوئی صاحب نظر عالم پوری کتاب پر بسط و شرح کے ساتھ تنقید کرے ۔ راقم نے اپنی بساط کے مطابق صرف نمایاں اور زیادہ قابل اعتراض حصوں کی نشان دہی کر دی ہے ۔"

غرض کسی جگہ بھی مولانا نے بڑھ کر بزرگوں اور بڑوں کی مسند پر بیٹھنے کی کوشش نہیں کی ۔ بلکہ ہمیشہ قدموں میں بیٹھنے کو ترجیح دیا ۔ بزرگوں کے نام جب لگے ساتھ لئے اور ہمیشہ اپنے آپ کو "کمترین" "ہیچ رقم" لکھتا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عجیب بات ہے کہ وہ کبھی کسی سے مرعوب نہ ہوتے تھے

وہ بات کہنے میں پاسدار تھے لیکن رائے قائم کرنے میں پاسدار نہ تھے۔ اس معاملے میں وہ حق و حقانیت تھے۔ جہاں بات کہنی ہوتی کبھی خاموش نہ رہتے خواہ بڑا ماننے والے مولانا سندھی یا ابوالکلام آزاد ہی کیوں نہ ہوں۔ مجھے یاد ہے ایک بار انہوں نے بحث کے وقت مجھے مولانا آزاد کے ترجمۂ قرآن میں غلطیاں دکھائیں ——— لیکن اس پر مضمون نہ لکھا۔

پاسداری بڑی خطرناک صنعت ہے۔ اس کا مزہ بار بار اپنی حد مناسب سے بڑھ جاتا رفتہ رفتہ آدمی کو جمود اور موت کی جانب دھکیل دیتا ہے۔ وہ اپنے تئیں بڑا مہذب و حساس سمجھتا ہے حالانکہ اس کی جرأت و بے باکی ختم ہو چکی ہوتی ہے اور وہ بزدلی اور منافقت کی حدوں کو چھو رہا ہوتا ہے۔ درحقیقت میں حق کی حرکت و انقلاب سے پناہ لینے کے لئے اس کی آڑ لیتا ہے یہ ایک ایسا پہاڑی راستہ ہے کہ جس سے ہر آن پاؤں رپٹنے اور کھنڈ میں گر جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن مولانا حیرت انگیز طور پر اس کے مخفی خطرات سے آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت ان کی جماعت اسلامی میں شرکت تھی۔ ان کو نام بھی حاصل تھا اور مقام بھی۔ اگر ان کی حق پاسداری ذرا بھی ٹیڑھی اور غلط ہوتی تو وہ جماعت اسلامی جیسی انقلاب انگیز تحریک میں کبھی بھی شامل نہ ہوتے۔ جب ایک شخص کو بیٹھے بٹھائے وہ سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے جو دوسروں کو تگ و دو کر کے حاصل ہوتا ہے تو اسے کیا ضرورت پڑی ہے کسی کا حریف بننے اور دنیا کی دشمنی مول لینے کی۔ لیکن مولانا اپنی جاہ و افتادگی کے باوجود دیگر اس کے میدان میں اتر آئے اور انہوں نے اس کی پروا نہیں کی کہ اب وہ ان کے حریف بن گئے ہیں جو کل تک ان کے محبوب تھے۔ وہ کسی بھی نفسیاتی مقام میں نہیں آئے اور صرف حق کو معیار محبت و عداوت جانا۔

بعض اوقات جب میں ایسی شخصیتوں کو دیکھتا ہوں تو میرا سر جھک جانے لگتا ہے۔ وہ زندگی اور موت کے بغیر واضح خط امتیاز سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ موت سے کھیلتے ہیں لیکن مرے بغیر، وہ پاسداری کرتے ہیں لیکن جھکے بغیر اور یہی ان کی عظمت ہے۔

تقسیم ہند کے بعد مرکز جماعت میں ان سے ملاقات ہوئی۔ مولانا نے مجھے وہ عربی مسودہ دکھایا جو انہوں نے "الفتح" لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے تقسیم ہند کے اسباب پر روشنی ڈالی تھی۔ باتوں باتوں میں مولانا نے "الفتح" کے کھو جانے اور دیگر قیمتی کتب کے ضائع ہو جانے پر افسوس کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی پاس ہی تشریف فرما تھے۔ انہوں نے بے ساختہ یہ شعر پڑھ دیا ؎

سینہ ما از نور حق گلزار کن
صد کتاب و صد ورق در نار کن

مولانا نے جلدی سے جواب دیا "ہاں لیکن مجھے اب تو بالکل افسوس نہیں ہے"۔

پھر گوجرانوالہ میں ملاقات ہوئی جب دارالعروبہ یہاں منتقل ہو گیا۔ یہ ایک پرانی حویلی تھی چوک خاکساراں کے قریب۔ مولانا یہاں کئی سال رہتے تھے۔ اس وقت شام ہو رہی تھی جب میں دوسری منزل کے دالان نما کمرے میں داخل ہوا۔ مولانا کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ اتنے میں چائے آگئی۔ مولانا نے اپنے شاگرد عزیز ناظم صاحب کو چائے بنانے کے لئے کہا اور میرے ساتھ مصروف گفتگو ہو گئے۔ یہ ملاقات زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹہ رہی لیکن موضوع وہ نوجوان ہی رہا جو بحث میں رہ کر بگڑ گیا تھا۔ مولانا مجھ سے اس طرح بے تکلفانہ لہجے میں باتیں کرتے رہے گویا میں ان کا گہرا دوست ہوں۔ مولانا نے مجھ کو اپنے نئے مشاغل کا پروگرام اور اس کتاب کے چند حصوں کی بابت بھی بتایا جس کی طباعت کا مصر میں انتظام ہو رہا تھا۔

اس کے بعد اکتوبر ۱۹۵۳ء میں ملاقات ہوئی جب وہ اور غازی صاحب پنڈی جیل سے رہا ہو کر آ رہے تھے۔ مولانا نے مجھ کو ساری روداد قید و بند سنائی اور غازی صاحب کی بڑی تعریف کی کہ ان کی رفاقت سے انہیں بڑا عزم اور صبر ملا۔ مولانا کی صحت اچھی تھی۔ جب میں نے اس کی طرف

وہ کیا تو مولانا ہنس کر کہنے لگے: "مجھے اندیشہ تھا کہ اگر جیل میں باقاعدہ اوریات نہ پہنچیں تو کہیں جنازہ ہی نہ وہاں سے نکلے۔ لیکن ہُوا یہ کہ جیل میں داخل ہونے سے رہائی تک مجھے تنفس کی ذرہ برابر بھی تکلیف نہ ہوئی۔ اور دوا کی قطعاً ضرورت نہ پڑی۔"

اور آخری ملاقات مرکزی شوریٰ کراچی (۱۵ مارچ ۱۹۷۵ء) پر ہوئی۔ مولانا مجھ سے بغل گیر ہو کر ملے۔ دوسرے دن یعنی ۱۶ مارچ کو آپ بعد دوپہر کی نشست میں بھی شریک ہوئے، اور ایک بات پر آپ کا آخری قہقہہ بھی مجھ کو یاد پڑتا ہے۔

ساڑھے چار کے قریب نشست ختم ہوئی اور میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مولانا کو ایک صاحب کے پاس کھڑے دیکھا۔ یہ آخری جھلک تھی اور ہم میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کی زندگی کے صرف چار گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔

شام کو ساڑھے آٹھ بجے صفدر حسن صدیقی اور میں قیام گاہ کو لوٹے۔ ابھی کھانے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ ناظم طعام نے بتایا کہ مولانا کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ مولانا قیام گاہ کے متصل ہی ایک بیٹھک میں ٹھہرائے گئے تھے۔ صفدر صاحب اور میں لپک کر بیٹھک کی طرف گئے۔ حکیم اقبال حسین صاحب مولانا کے سرہانے کھڑے تھے اور ڈاکٹر اسٹیتھوسکوپ لگا کر دیکھ رہا تھا۔ مولانا ٹوپی پہنے اس طرح لیٹے ہوئے تھے گویا کسی مجلس میں جانے کو تیار تھے کہ اچانک دل ڈوب گیا اور لیٹ گئے۔ ایک ہاتھ سینے پر تھا اور دوسرا پہلو کے ساتھ۔ ڈاکٹر نے آپ کے پپوٹے اٹھائے۔ آنکھوں میں زندگی کا شعلہ سرد پڑ چکا تھا۔ اس نے اسٹیتھوسکوپ سمیٹتے ہوئے کہا "ختم"

تب ہمیں معلوم ہُوا کہ مولانا کی جبلت حس و حرکت ختم ہو چکی تھی۔

بقیہ: مولانا مسعود عالم ندوی اپنی نظر میں ص ۱۵۵

ارادہ سفر کا ہے، مدینہ منورہ میں بیس دن ہو گئے، پر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ابھی ابھی اس سرزمین پر قدم رکھا ہے، در و دیوار سے انس و محبت کی بُو آتی ہے، اور جب کبھی دور سے سبز گنبد کی طرف نگاہ اٹھ جاتی ہے، دل دھڑکنے لگتا ہے، بس میں ہوتا تو اس در کی جاروب کشی کرتا، خوش نصیب ہیں وہ جو اس دیارِ محبت و الفت میں رہتے ہیں، اور اس کی قدر کرتے ہیں ع اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است!

(مدینہ منورہ) ـــــــــــــــــــــــــ (۳۴۳)

○

کشاں کشاں بارگاہ نبوت کی طرف گیا، اپنی جرأت پر نازاں اور بادشاہوں کے درباروں میں بے محابا جانے والا، یہاں ششدر اور مبہوت تھا، کیا کہے، اور کیا عرض کرے، قدم حدودِ نبوت سے آگے نہ بڑھنے پائے، ۔۔۔۔۔ زبان السلام علیک یا رسول اللہ والسلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ سے زیادہ نہ کہہ سکی۔ بڑی ہمت کی، تو ماثورہ درود پڑھ کے آگے بڑھ گیا۔

(مدینہ منورہ) ـــــــــــــــــــــــــ (۳۴۸)

بوڑھے والد پہ کیا گزری

محمد حسنین سید
(مدھوبنی، بہار)

ابھی فروری کے آخری ہفتہ میں کل ہند جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے رامپور جانا ہوا تو وہاں سے فراغت کے بعد دہلی، آگرہ، علی گڑھ ہوتا ہوا لکھنؤ بھی پہنچا اور ایک شام کو برادر مخلص و محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اگرچہ میری مولانا علی سے پہلی ملاقات غالباً ۱۹۴۳ء میں دارالاسلام پٹھان کوٹ میں ہوئی تھی جب کہ مولانا مشہد بالاکوٹ کی زیارت سے واپس ہوئے تھے مگر مولانا کا غائبانہ تعارف مسعود عالم مرحوم کے ذریعہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔

مولانا مسعود عالم مرحوم اور مولانا علی کی قلبی اور مثالی دوستی کا راز شاید ہی اب کسی سے پوشیدہ ہو۔ مخلص احباب کی ہر مجلس میں بلکہ کتابوں کی تصنیف و تالیف میں بھی ایک دوسرے کا ذکر خیر کسی نہ کسی عنوان سے آنا ضروری ہے۔ مولانا علی سے میرے اُنس و تعلق کے رشتوں میں ایک بڑا رشتہ مولانا مسعود عالم مرحوم بھی ہیں لہذا جب کبھی بھی مولانا علی سے ملاقات ہوتی، مولانا مسعود عالم مرحوم کا ذکر خیر آنا ضروری ہوا۔ چنانچہ اس ملاقات کے موقع پر بھی جب محترم امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کا تذکرہ آیا تو میں نے بتایا کہ میں مولانا محترم سے آگرہ جیل میں ملاقات کرکے آیا ہوں۔ بحمداللہ مولانا بظاہر صحت کے لحاظ سے اچھے ہیں۔ چلتے وقت مولانا نے فرمایا کہ رفقاء سے سلام کے بعد میرے لئے دعا کی درخواست کر دیجئے گا۔

"آپ بھی ان کے لئے صحت و سلامتی اور صبر و استقامت کی دعا فرمائیں" تو اس جملہ سے مولانا علی بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے دین کی خدمت کے سلسلہ میں دکھ و مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو ان کے لئے خود بخود دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ کسی فرمائش کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے بعد مولانا کا روئے سخن اپنے محبوب (مولانا مسعود عالم مرحوم) کی طرف پھر گیا اور فرمانے لگے کہ مولانا مسعود عالم ندوی کے سکریٹری محمد عاصم صاحب کا کراچی سے خط آیا ہے۔ مولانا مصر جانے کے لئے پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں میں نے ان کو لکھا ہے کہ جب میں مصر گیا تھا تب خزاں کا موسم تھا (یعنی اخوان زیر عتاب اور خلاف قانون تھے) اور اب جب کہ وہ جا رہے ہیں خزاں ہی کا موسم ہے پھر فرمایا میں نے ان کو اس خط میں عربی کا ایک شعر لکھا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دو رفیق ایک ساتھ روانہ ہوئے ایک منزل پر پہنچ گیا۔ دوسرا راہ میں سرگرداں ہے۔ ان پر تاثر کی ایک خاص کیفیت طاری ہوتی گئی اور فرمایا کہ مولانا مسعود عالم صاحب نے دین کی خدمت کے سلسلہ میں خرابی صحت اور علالت کے باوجود جو جدوجہد کی اور قید و بند کے جو مصائب اور صعوبتیں اٹھائی ہیں ان کے مقابلہ میں میری سیکڑوں تحریریں اور تقریریں ہیچ ہیں۔ ان کی حالت پر مجھ کو رشک آتا ہے۔ اس گفتگو کے بعد یہ پُر اثر صحبت ختم ہوئی اور مولانا علی نے دوسرے دن صبح کو چائے کی دعوت دی اور میں نے لکھنؤ کے قیام کی شرط پر قبول کی۔

یہ وہی دن تھا جس کے ۲۲ گھنٹے قبل مولانا مسعود عالم ندوی واصل باللہ ہو چکے تھے اور کراچی کا اسلام پسند حلقہ رنج و الم میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور غالباً مولانا علی کا مولانا مسعود عالم ندوی سے قلبی تعلق کا نتیجہ تھا کہ مولانا اس المناک حادثہ سے غائبانہ غیر شعوری طور پر متاثر تھے۔ یعنی مولانا

سے رخصت ہو کر اپنی قیام گاہ کو روانہ ہوا اور اس کے بعد ہی مولانا کے پاس کراچی سے مولانا مسعود عالم کے انتقال کا تار آیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس خبر سے مولانا پر کیا گزری۔ دوسرے روز میں مولانا کے یہاں حاضر نہیں ہو سکا انتظار کر کے مولانا خود میری قیام گاہ پر تشریف لائے، مگر مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی اور میں نے دوسرے رفیق کی زبانی یہ خبر سنی جو مجھ پر بجلی بن کر گری۔

میرا ذہن فوراً مولانا مسعود عالم مرحوم کے ضعیف والد بزرگوار مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ بہار شریف ضلع پٹنہ کی طرف گیا کہ ان پر اس خبر کا کیا اثر ہو گا؟ چند ماہ ہوئے جب میں بہار شریف گیا تو ان کی زیارت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا یہ ملاقات کئی سال کے بعد ہوئی تھی۔ اول ضعف بصارت کی وجہ سے مجھ کو پہچان نہ سکے جب مولانا مسعود عالم مرحوم کے حوالہ سے اپنا تعارف کرایا تو مولانا مرحوم کے والد بزرگوار جو ضعیفی اور ضعف کی وجہ سے لیٹے ہوئے تھے جوش اور شفقت کے جذبہ میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میری خیریت دریافت کی پھر آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے کہ "اب میری عمر اسی سے تجاوز کر چکی ہے طاقت و بصارت جواب دے رہی ہے۔ دنیا کے ہر کام سے فارغ ہو چکا ہوں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں اب بس ایک ہی تمنا اور آرزو ہے کہ مسعود کو ایک نظر دیکھ لیتا تو مرتا" پھر بتایا کہ "مسعود کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں وہ خود بھی یہاں آنے اور مجھ سے ملنے کے لئے بیقرار ہیں۔ اور کئی سال سے ہندوستان آنے کے لئے پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ تصویر کھینچوانے کے قائل نہیں۔ مگر میری خاطر انہوں نے تصویر کھنچائی لیکن ان کی درخواست منظور نہیں ہوئی۔ جہاں تک ان سے ہوتا ہے میرا خیال کرتے ہیں اور ہمیشہ روپیہ بھیجتے رہتے ہیں" ان کی گفتگو اور حالات سے متاثر ہو کر احتیاط کے باوجود میں نے مولانا کو خط لکھا۔ تقسیم کے بعد چھ سال میں مولانا مسعود عالم کو میں نے یہ پہلا خط لکھا۔ ان کو ان کے والد ماجد کے حال سے مطلع کیا اور مشورہ دیا کہ جلد آنے کی کوشش کریں ورنہ ان کی ضعیفی اور ضعف کے وجہ سے اندیشہ ہے کہ تاخیر سے ملاقات نہ ہو سکے اس کے جواب میں مولانا مسعود عالم مرحوم نے جواب دیا ـــــ نقل خط:

دارالعروبہ للدعوۃ الاسلامیہ راولپنڈی
۲۰/۳/۱۳۷۳ھ

برادر عزیز السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط چند دن ہوئے ملا پچھلے دنوں طبیعت بہت خراب رہی اس لئے اب تک جواب نہ دے سکا۔ خیال تھا کہ خود جواب دوں مگر اب تک کمزوری کافی باقی ہے۔ اس لئے خود لکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ مجبوراً محمد عاصم سے لکھوا رہا ہوں۔ والد صاحب کو دیکھنے کے لئے ہر آن تڑپتا ہوں آپ نے اپنے خط میں جو باتیں لکھی ہیں مجھے خود ان کا ازحد احساس ہے مگر ان چھ سالوں میں ایک مرتبہ بھی ادھر آنے کی اجازت نہیں ملی۔ کوشش ہمیشہ رہی اور اب تک جاری ہے پاسپورٹ کی درخواست ۲ اکتوبر ۵۲ء کو دی تھی جواب تک نہ منظور ہوتی ہے اور نہ رد کی جاتی ہے اپنی حد تک بڑی دوڑ دھوپ کی بہرحال اب مزید دوڑ دھوپ کی جائے گی۔ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائے والد ماجد کو آپ لوگ تسلی دیتے رہا کریں کبھی کبھی مدرسے میں ادھر نکل جایا کریں تو اچھا ہے۔ پچھلے تین ہفتے طبیعت کافی خراب رہی۔ اب اچھی ہے لیکن کمزوری باقی ہے دعاؤں میں فراموش نہ کریں۔ دوسرے رفیقوں اور عزیزوں سے بھی یہی درخواست ہے۔ آپ لوگوں سے ملنے کو طبیعت بہت چاہتی ہے لیکن جس خوف سے آپ خط نہیں لکھتے اسی اندیشہ سے میں بھی خط لکھنے سے احتراز کرتا ہوں۔ اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تمام رفقاء اور احباب سے سلام کہئے غازی صاحب اچھے ہیں سلام کہتے ہیں۔ محمد عاصم بھی سلام عرض کرتا ہے۔

مسعود عالم ندوی بقلم محمد عاصم۔

یو۔ پی کے سفر سے جب بہار آیا تو کوشش کی مولانا مرحوم کے والد بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہو کر تعزیت کا فریضہ انجام دوں بہار شریف کے رفقاء کو میں نے لکھا کہ مولانا مرحوم کے والد بزرگوار کی خدمت میں جا کر تعزیت کریں۔ وہ لوگ گئے تو بتایا کہ ان کو پہلے سے اطلاع ہو چکی تھی اور

(باقی بر صفحہ ۱۰۸)

اے کاش نہ ختم یہ کہانی ہوتی

سید مظفر حسین شاہ ندوی کشمیری

حضرت سید الملت ؒ کا صدمہ ابھی تازہ بہ تازہ ہی تھا، کہ ہماری بدقسمت قوم ایک دوسری نعمت عظمیٰ سے بھی محروم ہو گئی، حضرت سید الملت رحمۃ اللہ علیہ کی روح نے عالم آخرت میں قلیل ترین عرصہ کے لئے بھی اپنے وفادار و مایۂ ناز شاگرد کی مفارقت کو پسند نہ فرمایا، اور صرف یہی نہیں، کہ روح کو ہی دعوت پہنچی ہو، روح و جسم دونوں کو ایسی مؤثر دعوت پہنچی کہ جسم تو راولپنڈی سے اُڑ کر کراچی اور رُوح عالم آخرت کو پرواز کر کے اپنے استاذ کے دربار میں کامل حاضری ہو گئی۔ ع

یہ رتبۂ بلند ملا، جس کو مل گیا

یہ صدمہ بہت ہی بڑا صدمہ ہے، اور جہاں دو بڑے ہم رتبہ صدمے جمع ہو جائیں، وہاں تو قیامت ہی بپا ہو جاتی ہے گی۔

بار بار خبریں پڑھ کر تعزیتی قرار دادیں بھی اخباروں میں دیکھ کر، مرحوم و مغفور کی روشن ترین صورت آنکھوں میں آکر ٹھہر جاتی ہے، لیکن عقل امکان و تصدیق کے باوجود قلب اس خبر بد کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اور عجیب حال یہ ہے کہ کسی طرف سے اس خبر بد کی تردید کا انتظار اب تک ختم نہیں ہونے پاتا، بلکہ یہ خیال بار بار آنے لگتا ہے، شاید ایسا نہ ہوا ہو، رہ رہ کے پھر ایک آہ سی اٹھتی ہے، جو دل و دماغ کو زیر و زبر کر دیتی ہے۔

دل کو تسلی دینے کی بار بار کوشش کر رہا ہوں، آیت پاک "افإن مات او قتل انقلبتم" کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، حضرت صدیق اکبرؓ کے مشہور حکیمانہ قول من کان یعبد محمداً فإن محمداً قد مات ومن کان یعبد اللہ الخ کا تصور کرتا ہوں، پھر خیال آتا ہے، کہ اللہ نے دنیا میں دو بڑی طاقتیں پیدا فرمائی ہیں، ایک تو روحانی قوت جو سب سے زیادہ انبیاء کو حاصل رہی ہے، اس کے باوجود وہ بھی موت کی گرفت سے نہ بچ سکے، دوسری بڑی طاقت مادی ہے، جو سب سے زیادہ ملوک و سلاطین کو حاصل رہی ہے، وہ بھی ہزاروں کوششوں اور تدبیروں کے باوجود موت سے اپنے آپ کو نہ بچا سکے، موت کی گرفت سے کوئی نہ چھوٹ سکا۔ اور نہ چھوٹ سکے گا۔

پھر بھی نہ جانے کیا بات ہے رنج کا بوجھ ہلکا نہیں پڑ رہا ہے، بے قابو ہو جاتا ہوں، البتہ کبھی اس خیال سے تسلی و اطمینان کی ایک جھلک سی آنے لگتی ہے، کہ آخر ہم سب اللہ کے ہیں، ایک روز سب کے سب یکجا ہوں گے، اور اس آخری و مستقل ملاقات کو اب کوئی دیر نہیں، مرحوم و مغفور تو جیتے ہی اللہ کے لئے اور گئے بھی اللہ کی راہ میں، اللہ کو مرحوم کی حیات و ممات دونوں قبول ہو گئیں، اگر ہمارے اعمال و کردار بھی درست ہو جائیں تو انشاء اللہ ثواب الٰہی کے مستحق قرار پا کر وہاں بھی مستقل رفاقت حاصل ہو سکے گی، بلاشبہ رفاقت بھی وہی ہے جس میں دوام ہو اور استقلال ہو، ——— اس مکر و فریب و شر و فساد کی ناپائیدار دُنیا میں چند روزہ ملاقات کی مدت ہی کیا تھی،

تسلی کی بس یہی دو چیزیں ہیں، کہ یا تو قلب کا خبر وفات کو قبول ہی نہ کرنا یا پھر عالم آخرت میں یقینی ملاقات کا تصور۔

اپنے بھائی کی محبت تھی، اچھے دوست کا اخلاص تھا، اور اچھے استاذ کا جذبہ تربیت و اصلاح تھا، مرحوم کی وفات سے جماعت کو کیا نقصان ہوا، عالمی مسائل کا کام کس حد تک رُکا۔ اس کا صحیح احساس تو ارباب جماعت ہی کر سکیں گے، لیکن میری تو دنیا ہی بدل گئی، کوئی ایسا انسان

ہم کلاس تھا، علمی و دینی معیار نہیں رہا۔

فروری سنہ ۳۲ء میں راقم دار العلوم ندوہ پہنچا، ان ایام میں مرحوم ماہنامہ "الضیاء" نکال رہے تھے، اور ہفتہ میں دوبارہ انشاء و ترجمہ کی تعلیم کے لئے ہمیں بھی پڑھانے تشریف لاتے، راقم اپنی استعداد طبع کے باعث ترجمہ و انشاء کا کام زیادہ محنت و شوق سے کرنے لگا۔ مرحوم کی توجہ اور نگاہ شفقت سے میری حوصلہ افزائی ایسی ہوئی، کہ درجہ بھر میں انشاء و ترجمہ کے کام میں سب سے فائق و ممتاز ہو گیا۔ اس طرح تعلقات ذاتی طور پر بھی بڑھتے چلے گئے۔ مرحوم اپنے عربی مضامین تبییض کرانے کے لئے مجھے دے دیا کرتے، تو اکثر ایسا ہوتا، کہ میں صاف ستھرا لکھ کر خدمت میں پیش کر دیتا تھا، جس خوش ہو جاتے، اور ملاقات کے موقع پر عام قسم کی نجی باتیں نہ ہوتیں۔ بلکہ اکثر و بیشتر ادب، محاورات اور صرف و نحو کی اصطلاحات کا ذکر رہتا، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ ایک طرف میری علمی استعداد میں ترقی ہوتی گئی، دوسری طرف مولانا کے دل میں میری شفقت اور میرے دل میں مرحوم کی عظمت و محبت بیٹھتی گئی۔

چھٹی جماعت میں پہنچا، تو راقم کی ایک درخواست پر (جو مولانا ابو الحسن علی صاحب اور مولانا مرحوم سے بیک وقت کی گئی تھی) عربی خطابت کا دار العلوم بھر کے طلبہ کا انعامی مقابلہ ہوا۔ چنانچہ مندرجہ بالا دو نو بزرگوں کے اتفاق سے دار العلوم کی طرف سے "انعام اول" کے طور پر مقدمہ ابن خلدون" راقم کو بخشی گئی، مصر وغیرہ سے اکثر عربی رسائل و اخبارات اور کتب "الضیاء" کے تبادلہ یا ریویو وغیرہ کے لئے آجاتے، تو مولانا جس چیز میرے لئے موزوں سمجھتے ہدیہ و انعام کے طور پر بخش دیتے، اور کبھی مطالعہ کے لئے مستعار عنایت فرماتے۔

سنہ ۳۳ء کے آغاز میں دار العلوم کے حالات کچھ ایسے ہو گئے، کہ مولانا مرحوم سہ روزہ "مدینہ" کے مدیر ہو کر بجنور تشریف لے گئے مگر یہاں بھی مہینہ سے زیادہ قیام نہ ہو سکا، اپنے مربی و مشفق استاد حضرت سید صاحبؒ کی ہدایت پر بجنور سے واپس ہو کر دار العلوم ندوہ تشریف لے آئے، لیکن تھوڑا ہی عرصہ قیام کے بعد حکومت بہار کی دعوت پر اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں کیٹلاگر کی حیثیت سے پٹنہ تشریف لے گئے۔

غالباً سنہ ۳۳ء سے سنہ ۴۴ء تک مولانا مرحوم کا قیام پٹنہ ہی میں رہا۔ اس پوری مدت میں مرحوم سے مسلسل مراسلت قائم رہی۔

بلکہ سنہ ۳۴ء میں (جب کہ میں درجہ ہشتم میں تھا) مجھے دعوت ملی کہ گرما کی تعطیلات پٹنہ ہی میں گزارو، عذر کیا تھا، ۱۵ مئی کی شام کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۱۶ مئی کی صبح کو پٹنہ حاضر ہو گیا، وہاں پہنچ کر بالکل یہی معلوم ہوتا تھا، کہ پوری لائبریری میرا گھر ہے، چند روز رہا، پھر حضرت سید مرحوم کی نگاہ شفقت دیسنہ لے گئی، حضرت سید صاحب مرحوم ان دنوں اپنے پیر کت گدہ میں قیام فرما تھے، چند روز قیام رہا، فضائل و برکات علمیہ کی گرانقدر صحبتوں کا لطف اٹھایا اسی سفر میں دیسنہ سے واپسی پر محلہ سلو گنج قصبہ بہار شریف میں ایک بزرگ صورت و بزرگ سیرت حکیم عبد الشکور صاحب سے ملاقات ہوئی جو ماشاء اللہ آج تک موجود ہیں، موصوف کو جب یہ معلوم ہوا، کہ میں ان کے مایۂ ناز فرزند مسعود عالم کا فرستادہ ہوں، تو اتنی شفقت و محبت سے پیش آئے کہ آج ۱۶ برس بعد بھی محبت و شفقت آمیز کیفیت دل میں تازہ ہے۔

اسی زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند کا ایک کل ہند اجتماع چھپرا میں ہو رہا تھا، دعوت نامہ پہنچا، اس خیال سے کہ حضرت سید صاحب مرحوم شرکت فرمائیں گے، میں نے بھی شرکت کا عزم کر لیا، تین روز بڑی گرما گرم کانفرنس رہی، تین چار روز بعد واپسی ہوئی، واپسی کے سلسلے میں ایک ریلوے اسٹیشن پر ٹھہرنا پڑا، مولانا امین احسن اصلاحی بھی ساتھ تھے، موصوف کے لئے اخبار کی تلاش کرنے نکلا، تو گاڑی چھوٹ گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ دن بھر چلچلاتی دھوپ میں پیدل چل کر گنگا کے کنارے آیا پھر اسٹیمر کے ذریعہ پٹنہ پہنچا، پہنچتے ہی ایسا بیمار پڑا، کہ مہینہ بھر صاحب فراش رہا، اور اس پوری مدت میں مرحوم نے

میری تیمارداری اور علاج کے سلسلے میں وہ سب کچھ کیا، جو ایک بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کے لئے کرتا ہے،

سنہ ۳۹ء میں طلبۂ قدیم کا ایک اجتماع پٹنہ میں ہونا قرار پایا، تو مرحوم کا دعوت نامہ خصوصیت کے ساتھ راقم کو پہنچا، فوراً پٹنہ پہنچا، اجتماع میں شرکت کی اور ایک لطف لازوال لے کر واپس آگیا۔

اس وقت جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں مولانا کے پاکیزہ اخلاق مجسم ہو کر نظر کے سامنے پھر رہے ہیں، مرحوم نہایت درجہ سادہ مزاج، مرنجاں مرنج، اور بے تکلف قسم کے انسان تھے، مصنوعی قسم کے تکلفات ہرگز پسند نہ فرماتے، چھوٹوں اور ساتھیوں کے ساتھ نہایت فراخدلی، بے تکلفی اور خندہ جبینی سے ملاقات فرماتے۔

غالباً سنہ ۴۲ء میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر "جماعت اسلامی" میں شامل ہوگئے، ذہنی طور پر تو مرحوم ابتدا ہی سے اسی مذہب کو پسند کرتے رہے ترجمان القرآن حیدرآباد سے نکلنا شروع ہوا، تو ابتدا میں الضیاء کے مبادلہ میں آنے لگا، مجھے یاد آتا ہے کہ مرحوم مولانا مودودی کے متعلق فرمایا کرتے، تھے اس شخص (مولانا مودودی) کی عبقریت کا پورے طور پر معترف ہوں۔

جماعت کی تجویز کے مطابق "دار العروبۃ للدعوۃ الاسلامیۃ" کے نام سے خالص دینی، علمی و عملی ادارہ قائم کر کے جالندھر میں قیام پسند فرمایا، چنانچہ اگست سنہ ۴۷ء تک اسی مقام پر قیام فرما کر علمی و دینی خدمات میں مصروف رہے۔ مجھے اس سے دوہری مسرت ہوئی، ایک تو جماعت میں مرحوم کا شمول، دوسرے جالندھر میں قیام مجھے یہ سہولت ہوگئی، کہ کلکتہ سے وطن کی طرف آتے ہوئے بسہولت ملاقات ہوجاتی، چنانچہ سال بھر میں دو یا تین بار ملاقات ضرور ہوجاتی، اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا مجھے معیت کا بھی شرف حاصل ہے، خط و کتابت کا سلسلہ بھی پے در پے قائم رہا، اس لئے دوری یا مفارقت کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔

ادارۂ دار العروبہ کے ذریعہ مولانا نے دعوت دین کی جو خدمات انجام دی ہیں، ان کی تفصیل تو جماعت اسلامی کے بالائی حلقہ کے بزرگ ہی زیادہ بہتر بیان کرسکتے ہیں، لیکن یہ اعتراف بالکل مبنی بر حقائق ہے، کہ موجودہ حالات میں ہند و پاکستان کے اندر مولانا کا ساجامع الصفات (فہم دین، علمی توسع اور قادر الکلامی کے اعتبار سے) کارکن جماعت کو میسر نہ آسکے گا، اللہ کی قدرت و مشیئت کا مسئلہ تو بہرحال ہمارے علم و ظن کے قلیل دائروں سے بہت بلند و بالا ہے۔

اگست سنہ ۴۷ء کے اواخر میں پوری جماعت کے ساتھ مجوزہ پروگرام کے مطابق مغربی پاکستان تشریف لے آئے، پاکستان کے اندر، لاہور، گوجرانوالہ سندھ وغیرہ مختلف حلقوں کا تجربہ کر کے راولپنڈی میں قیام، آب و ہوا کے لحاظ سے زیادہ سازگار آیا چنانچہ سنہ ۴۸ء کے اوائل سے راولپنڈی میں زیادہ قیام رہا، اس عرصہ میں تقریباً ایک برس کی مدت ممالک اسلامیہ کی داعیانہ سیاحت میں صرف کی، اور جاننے والے جانتے ہیں، کہ اس دورہ سے جماعت اسلامی کی دعوت کا کام کن کن دماغوں تک پہنچا، اور اس کے کتنے اچھے اچھے اثرات ظہور میں آئے؛

میں بھی انقلاب احوال کے باعث چونکہ سنہ ۴۷ء کے بعد تحریک آزاد کشمیر کے باعث بالکل ہی یہیں کا ہو کے رہ گیا، سنہ ۴۷ء کا آخری ثلث اور سنہ ۴۸ء کا پورا سال کشمیر میں جہاد کا سلسلہ جاری رہا، مجھے محاذ کی کسی ضرورت کے سلسلے میں کبھی راولپنڈی آنا پڑتا، تو ملاقات کے لئے حاضر ہوتا؛ حالات دریافت فرماتے، میں بھی مفصل طور پر واقعات سناتا، اور نہایت دلچسپی اور محبت کے ساتھ سنتے رہتے، اور یہ فرماتے، کہ بھئی، تم لوگوں نے پورے پاکستان کے مسلمانوں کی عزت رکھ لی، اگر یہ اقدام نہ ہوتا، تو مشرقی پنجاب کے واقعات نے مسلمانوں کے اجتماعی وقار کو بہت بڑا صدمہ پہنچا دیا تھا کشمیر کے مسلمانوں نے جانبازی اور دینی غیرت کا نمایاں ثبوت دیا، اللہ تعالیٰ کامیاب فرمائے۔

اگست ۱۹۷۲ء میں غالباً کسی ضرورت سے راولپنڈی آیا، تو اتفاق سے راولپنڈی ہی میں ملیریا کا شکار ہو کر دو ماہ کے لئے ذی فراش رہنا پڑا، اور عجیب اتفاق کہ اس موقع پر بھی تیمارداری تمام ازل سے مولانا ہی کے سپرد فرما دی، چنانچہ مولانا خود بھی ان ایام میں نئے نئے تشریف لائے تھے، مہاجرت کے ایام گزار رہے تھے، اور میرا حال بھی ایسا ہی تھا، لیکن اللہ کی بخشی ہوئی عالی ظرفی، ہمت اور صبر کا وہ نمونہ مولانا میں اپنی آنکھوں سے دیکھا، جو کتابوں میں پڑھا تو ہے، لیکن دیکھنے میں کہیں نہیں آیا تھا،

راقم کی دیکھ بھال کے لئے یونانی طبیب، انگریزی ڈاکٹر، ہومیو پیتھ ڈاکٹر پوری سرگرمی اور محنت سے علاج کرنے آتے رہے، اوائل اکتوبر ۱۹۷۲ء میں اس قابل ہوا، کہ اٹھ کر چل پھر سکوں، اس دوران میں اطلاع ملنے پر میرا چھوٹا بھائی راولپنڈی پہنچا، اور اس نے مولانا سے مجھے گھر لے چلنے کی گزارش کی، مولانا مرحوم نے فرمایا، تم ان کے چھوٹے بھائی ہو اور میں بڑا بھائی ہوں، راولپنڈی میں علاج کی سہولتیں ہیں۔ اور تمہارے ہاں آج کل پراگندہ حالی میں علاج کا انتظام نہ ہو سکے گا۔ اس لئے میں ان کو لے جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ ان کو صحت نصیب ہو جائے گی، اس لئے تم بے فکر ہو کر چلے جاؤ۔ اور اللہ کا فضل ایسا ہوا کہ مولانا مرحوم کی دعاؤں اور توجہ اور عزیز مخلص محمد عاصم صاحب کی محنت سے راقم نے شفا پائی۔

چوں کہ مولانا مرحوم عرصہ بیس بائیس سال سے مرض تنفس میں مبتلا تھے، جہاں بھی مرحوم کا قیام رہا، وہاں کے نہایت ممتاز اور فنی قسم کے معالج مولانا کا علاج کرتے رہے، علاج بھی بدستور رہا کیا، لیکن مرض نے بھی قطعی طور پر پیچھا نہ چھوڑا، ایسا تو ہوتا کہ کبھی دو دو ہفتے تک دورہ نہ پڑتا، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا، کہ کوئی مہینہ خالی گیا ہو، البتہ کبھی ہلکا اور کبھی نہایت درجہ شدید دورہ پڑتا، لیکن اتنے شدید مرض، اور اس کی وجہ سے جسمانی نحافت کے باوجود مولانا مرحوم کا ذہن ہمیشہ جوان و چست رہا، اور مفوضہ کام برابر جاری رہا۔

غالباً ۱۹۷۵ء کا واقعہ ہے، کہ مجھے اچانک خلجان سا پیدا ہوا، کہ شاید مولانا کی طبیعت خراب ہو، فوراً میں مظفر آباد سے روانہ ہو کر راولپنڈی پہنچ گیا، مجھے دیکھتے ہی خوشی سے چہرہ کھل گیا، دریافت فرمایا، کیسے آئے، عرض کیا، بس حاضری دینے، فرمایا کہیں آگے جانا ہے، عرض کیا، صرف عیادت حال کے لئے یہیں تک حاضر ہوا ہوں، ماشاء اللہ مزاج بخیر ہے۔ اس لئے واپس ہی ہو جاؤں گا۔

گزشتہ ماہ نومبر ۱۹۸۳ء کے اوائل میں کسی ہومیو پیتھ ڈاکٹر کی بے احتیاطی سے کوئی ایسی دوا استعمال میں آگئی، جس کا اثر بہت زیادہ خراب پڑا، اس کے نتیجہ میں کئی روز تک مولانا کو شدید تکلیف رہی، مجھے تشویش ضرور رہی، لیکن باقاعدہ طور پر کوئی اطلاع نہ تھی، اس لئے اس طرف متوجہ نہیں ہو سکا، البتہ کچھ روز تک خط نہ پہنچنے سے تشویش کے آثار تھے، بالآخر ۱۶ نومبر کو پہنچا، تو معلوم ہوا کہ اب قدرے افاقہ ہے، ایک وقت یہ ہے کہ مرحوم کے مستقل رفیق حضر و سفر محمد عاصم صاحب بھی موجود نہ تھے، اس لئے مرحوم نے میری مصروفیت کا خیال کر کے میرے بجائے ایک مخلص دوست عبدالوالی صاحب کو رفاقت کے لئے بلوایا تھا، جو اس روز موجود تھے میں نے عرض کیا، اب حاضر ہوں، عبدالوالی صاحب کو واپس کر دیا جائے، لیکن مولانا مرحوم نے فرمایا، میں اچھا ہوں، تم اپنے کام سے جاؤ، عبدالوالی صاحب بھی چلے جائیں، آج کل تک عاصم آنے والے ہیں، میں ۱۷ نومبر کو رخصت ہو کر پھر ۲۰ نومبر کو واپس آیا، اور ۲۲ نومبر تک ساتھ رہا، ماشاء اللہ طبیعت ٹھیک تھی، اس لئے ۲۳ نومبر کو رخصت ہو گیا، البتہ بعد میں معلوم ہوا کہ ۲۴ نومبر کو عشاء کے وقت حضرت سید صاحب مرحومؒ کی رحلت کی اطلاع مولانا مرحوم کو ہوئی، جس سے صحت پر خاصا برا اثر پڑا۔

ایک خط میں ارشاد فرمایا، کہ چاہتا ہوں، ۱۵ فروری سے پہلے پہلے مل لو۔ ۱۰ فروری کو حاضر خدمت ہو گیا۔ ۱۱ فروری کو حاضر خدمت ہی رہا

اتفاق سے ایک کام اور بھی پڑ گیا جس کے لئے ۱۱ فروری کو راولپنڈی سے باہر چلا گیا ۱۶ فروری کو پھر واپس ہو کر خدمت میں حاضر ہو گیا، دو روز ساتھ رہا، ممالک عربیہ میں دعوت و ارشاد کے کام کا تذکرہ ہوتا رہا، گزشتہ حسابات ختم کئے گئے، نئے حسابات کی داغ بیل پڑی، اور بہت سی کام کی باتیں ہوئیں، کیا معلوم تھا، کہ یہ ملاقات آخری ملاقات ہے۔

مرحوم نے اسی آخری صحبت میں فرمایا، کہ ارادہ قطعی ہو چکا ہے، کہ ممالک عربیہ بالخصوص مصر، شام اور حجاز جاؤں، لیکن سفر کا انحصار شوریٰ کے فیصلے پر ہی ہوگا، اگر اس طرف جانے کا امکان نہ ہو سکا، تو ہندوستان جاؤں گا، عرصہ ہوا، والد صاحب سے بھی ملاقات نہیں ہوئی، زندگی میں بہت سی خوشیاں دیکھ لیں، لیکن یہ غم کبھی فراموش نہ ہوگا، —— آہ!!

یہ ہم نہ یہ بزم شادمانی ہوتی — اے کاش! نہ ختم یہ کہانی ہوتی
اے کاش! سدا قرار گل کو ہوتا — اے کاش! بہار جاودانی ہوتی

---

۱۱ مارچ ۱۹۵۲ء کو وقت پر دفتر گیا، غالباً ۱۰½ بجے کا وقت ہے، سامنے فائلیں پڑی ہیں، ضرورت مند لوگ موجود ہیں، کہ ڈاکیہ تار لے کر پہنچ گیا، دل میں بات کھٹک رہی ہے کہ دو تین روز کی پریشانیوں کا نتیجہ سامنے آنے والا ہے، خیال یہ ہے کہ جلدی کرنے والوں کا کام جلدی ختم کر کے بعد میں تار کھولا جائے، چنانچہ ½ گھنٹہ بعد تار کھلتا ہے، میرا مزاج ایسا ہے کہ مسرت کی خبر ہو یا کسی کی دونوں صورتوں میں تنہائی کا خوگر ہوں، لوگوں کو رخصت کیا، اب دفتر کے ایک دو آدمیوں کے سوا کوئی نہیں، تار کھلتا ہے، بھیجنے والے حاکم صاحب ہیں، میں ابھی تار کے بچوں اور معنوں پر غور کر رہا ہوں، ادھر آس پاس کے دوستوں کو خبر ہو گئی، احباب تعزیت و اظہار ہمدردی کے لئے آ رہے ہیں، اور میں ان سے مفہوم کے تعین پر بحث کر رہا ہوں ؎

ایتها النفس اجملی جزعاً — ان ما تحذرین قد وقعا

یہاں عموماً اخبارات تین بجے کے بعد پہنچتے ہیں، دوڑتا بھاگتا ایجنسی پہنچا، نہایت بے چینی سے اخبار کا منتظر ہوں، کوہستان پہنچتا ہے، اسے کھ سامنے رکھتا ہوں، لیکن خبر پر نظر نہیں پڑتی، اس لئے ذرا حوصلہ بندھتا ہے، کہ شاید تار کا مفہوم غلط سمجھا ہو، اگر ایسا ہوتا تو خبر نمایاں ہوتی، جلی سرخی سے ہوتی، اور صفحہ اول پر ہوتی، خیالات یہ ہیں، اتنے میں ایک دوسرے صاحب دیکھنے والے صفحہ اول ہی کے کونے پر انگلی رکھتے ہیں، یہ ہے خبر وفیر وفات، اوسان خطا ہو گئے،

اور خیال ہوتا ہے، کہ کل پرسوں سے احساسات و واردات کا یہ توحش و انتشار ایک قسم کا پیشگی تنبیہ تھا، جسے اپنی کوتاہ فہمی کے باعث سمجھ نہ سکا تھا، —— اللہ کا ایک وفادار و پاک بندہ اپنی زندگی کی (غالباً) چالیس منزل اللہ اور رسولؐ کی کامل اطاعت و بندگی میں طے کر کے اپنے حقیقی معبود سے جا ملا ؎

ہمیں بھی روضۂ جنت میں اے صبا! لے چل
نشاط معرفت کردگار دیکھیں گے!

حبیب غاب عن عینی وجسمی — وعن قلبی حبیبی لا یغیب

۲۱ مارچ [illegible] کے بعد سے یہ حال ہے، کہ ایک طرف دائمی مفارقت کا رنج و درد اور دوسری طرف یہ کیفیت کہ دل کو اب تک یقین نہیں آتا کہ مولانا کا انتقال ہو گیا ہے، پہلے کی طرح اب بھی منصوبہ بناتا ہوں کہ راولپنڈی پہنچوں، اور اپنے استاذ مربی اور رفیق کے سامنے دل کھول کر ایک ایک بات کہوں، پھر معاً "انتقال" کا تصور آتا ہے اور یہ تصور دل کی دنیا کو تہ و بالا کر دیتا ہے، ہوش و حواس جواب دے دیتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ نہیں رخصت ہوئے اس دنیا سے، میں مر رہا ہوں، ـــــ وہی نزع کی سی کیفیت!

کبھی کوئی خوشی کی بات ہوتی یا رنج کی، دل مچل جاتا کہ جلد از جلد راولپنڈی پہنچوں اور اس سراپا اخلاق و مکرمت ہستی کے حضور میں، حاضر ہو کر جو کچھ دل میں ہے، سب کچھ کہہ ڈالوں، وہ میری خوشی سے مسرور ہوتے تھے۔ میرے غم سے کڑھتے تھے خوشی میں ساتھ دیتے تھے۔ غم اگرچہ تقسیم نہیں کیا جا سکتا، ع۔

بارِ غم دنیا میں اٹھواتے نہیں مزدور سے

لیکن وہ اپنی محبت، اور شفقت کے باعث، صحیح معنٰی میں شریکِ غم بن جاتے تھے!

عقل کی ساری تسلیمات و مسلمات ایک طرف، اور جذبات و عواطف کا ہجوم ایک طرف، اب بھی میرا دل یہ قبول کرنے کو تیار نہیں کہ مسعود عالم نے سفرِ آخرت کر لیا۔

یہاں کوئی نہیں جو کسی روحانی رشتہ اخلاص و محبت کا ذوق رکھتا ہو، اسی لئے بعض لوگ آ کر پوچھتے ہیں، کہ مسعود عالم ندوی تمہارے کون تھے جو اتنا رنج محسوس کر رہے ہو؟

---

۲۰ فروری [illegible] کا ذکر ہے، دار العروبہ راولپنڈی کے بالاخانہ میں بیٹھا ہوا چائے پی رہا ہوں، چائے بھی اتنی لطیف و نفیس کہ اس کی لطافت و نفاست کے الفاظ متحمل نہیں ہو سکتے۔ حضرت سید الملت مرحوم کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ مرحوم اپنی زندگی میں بڑے بڑے کام انجام دے گئے ہیں، اب مرحوم کے شاگردوں پر بڑی ذمہ داری آ پڑی ہے ـ دیکھئے، کون کون وفاداری کا حق ادا کرتا ہے؟ نیازمند نے عرض کیا، شاگردوں، عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کی فہرست میں ہم ایسے نالائق بھی ہیں جو دلی تمنا کے باوجود کچھ نہیں کر سکتے، نہ اہل زبان، نہ صاحب قلم۔ متبسم ہو کر فرمایا، تم اونچے مرتبہ کے لکھنے والے بزرگوں سے مرعوب و متاثر زیادہ ہو، کوشش کرو، خلوص نمایاں ہو ہی جاتا ہے پھر فرمایا، میں نے ایک مضمون عربی میں لکھ کر الاخوان المسلمون کو بھیجا ہے، ایک دوسرا اردو میں لکھا ہے، تم چاہو تو دیکھ سکتے ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ، اس میں کوئی بات کھٹکے، تو مجھے اس میں ترمیم کا مشورہ دو، خاکساری نہ کرنا۔

مضمون نہایت غور سے پڑھا، چند مقامات پر نشان لگائے، دار العلوم ندوہ کے بعض انتظامی مسائل اور بعض اشخاص کے نہایت لطیف انداز میں شکایت مندانہ تذکرے کچھ کھٹکے، ترمیم و اصلاح کے لئے نیاز مندانہ درخواست کی گئی، ارشاد ہوا، کہ جس طرح کہتے ہو، اس طرح بات پوری نہیں ہوتی، لیکن چوں کہ تم کہتے ہو، اس لئے مان لیتا ہوں، چنانچہ اسی وقت راقم کی تجویز کے مطابق ترمیم ہو گئی۔

ہوا اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی　　یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے!

چند الفاظ

حافظ محمد زکریا۔ ایم اے

مرحوم سے میری پہلی ملاقات اپریل ۱۹۴۵ء میں دارالاسلام پٹھانکوٹ میں جماعت اسلامی کے ایک اجتماع کے موقع پر ہوئی۔ اس سے پہلے ان کی بعض تحریریں بالخصوص مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر" دیکھنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ اور یہ بھی سن چکا تھا کہ وہ ضیق النفس کے بہت ہی دیرینہ عارضہ میں مبتلا ہیں، اور اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ اپنے علمی اور تحقیقی مشاغل سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہوئے بلکہ باعمل اور مقصدی زندگی اختیار کرنے کے لئے بے پناہ قوتِ ارادی رکھتے ہیں۔ دارالاسلام میں جب پہلی بار ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو اس وقت بھی وہ تنفس کی تکلیف کی وجہ سے تکیے پر اپنا سر ٹیکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سیدھے ہو گئے اور اپنے روایتی تپاک اور خندہ پیشانی کا پورے طور سے مظاہرہ کیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک دیرینہ کرم فرما کی بے تکلف صحبت میں بیٹھا ہوا ہوں۔ خیالات، مزاج، افتادِ طبع حتیٰ کہ صحت ہر پہلو سے بہت ہم آہنگی محسوس ہوئی اور ایک ہی ملاقات میں تعلقات کا رشتہ ایسا جڑا کہ پھر تا دمِ واپسیں کسی طرح ٹوٹنے نہ دیا۔ جب وہ راولپنڈی سے یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو کراچی کے لئے روانہ ہوئے ہیں تو میں اس وقت لاہور میں بالکل صاحبِ فراش تھا۔ ایک دن پہلے ان کا خط ملا۔ فرمایا "آپ کی طبیعت کی خرابی کا حال معلوم کر کے بڑی تکلیف ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامل صحت عطا فرمائے۔ آپ اگر اس روز بآسانی آسکیں (یعنی اسٹیشن پر) تو آجائیں ورنہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مجبور نہ کریں۔ ابھی میں جا نہیں رہا ہوں۔ ابھی صرف کراچی جا رہا ہوں۔ اصل جانے یا نہ جانے کا فیصلہ وہیں ہوگا۔ (کتنے PROPHATIC الفاظ ہیں!) چاہتا ہوں کہ تمہیدی کام تو بہرحال ہو جائے۔ خواہ جانا ہو یا نہ ہو۔ اغلب یہ ہے کہ میں فی الحال راولپنڈی واپس آؤں گا۔ اور انشاء اللہ اگر وقت اور صحت نے اجازت دی تو لاہور اتروں گا۔ (یہ ان کے آخری خط کا ایک اقتباس ہے) قیام پاکستان سے پہلے وہ جالندھر میں مقیم تھے۔ اس دوران میں نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا اور دارالاسلام پٹھانکوٹ کو آتے جاتے اکثر امرتسر میں میرے پاس ہی ٹھہرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد حسنِ اتفاق سے ہم دونوں کو ایک ہی جگہ یعنی راولپنڈی میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ پس پھر تو روزانہ مجلس ہوتی رہی۔ جب ۵۵ء میں دیارِ عرب سے واپسی پر گوجرانوالہ کو اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا۔ اس وقت بھی خط و کتابت باقاعدہ جاری رہی اور جب دوبارہ راولپنڈی میں آکر مستقل طور پر اقامت گزین ہو گئے تو پھر پہلے کی طرح روزانہ کی ملاقات، اور مجلس نشینی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب ظاہر ہے کہ مولانا ایسی گوناگوں خوبیوں کی حامل شخصیت کے اس قدر قریب رہنے کی وجہ سے دل و دماغ پر اس کا بہت گہرا اثر ہے اور اس کو بطرزِ تحریر میں لانے کی قوت مجھ میں بالکل نہیں ہے۔ صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ اس تقریب کی مناسبت سے چند الفاظ لکھ دوں

یہ چیز بہت کم دیکھنے میں آتی ہے کہ کوئی لکنت زدہ شخص اچھی گفتگو پر قادر ہو اور ایک موثر میرِ مجلس بن سکے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ مولانا لکنت کے باوجود ایسی گفتگو پر قادر تھے جو ان کے نیازمندوں اور دوستوں کو پہروں مسحور رکھے۔ ابتدا میں ہر نئے ملاقاتی کو قدرے وقت ضرور محسوس ہوتی تھی لیکن جو بھی ان کے اندازِ گفتگو سے ایک دفعہ اچھی طرح مانوس ہو جاتا وہ گھنٹوں باتیں کرنے کے باوجود بالکل کوئی بار محسوس کرتا اور نہ ہی ان کی باتوں کی دلکشی میں کوئی کمی واقع ہوتی۔ غالباً لکنت زدہ اصحاب میں سے یہ امتیاز بہت کم لوگوں کو حاصل ہوا ہوگا کہ ان کے احباب پہروں ان کی باتیں سنتے رہیں

اور پھر بھی نہ اکتائیں ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس شدید کاوش کے باوجود کوئی نہ کوئی خصوصیت ہی کسی لکنت والے آدمی کی باتوں میں سحر کن چاشنی پیدا کر سکتی ہے ۔ مولانا کی خصوصیت ان کی سیاسی تاریخی، مذہبی اور علمی معلومات کی وسعت۔ اُن پر ٹھوس تنقید و تفریق کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ خاص منفرد ماننے اور گفتگو کرنے وقت گہرا شخصی جذب و انجذاب تھی۔ معلومات کی وسعت کا یہ حال تھا کہ ابھی مارکس اور ہیگل کے معاشی اور فلسفی نظریات پر گفتگو کر رہے ہیں اور ابھی فقہ اور حدیث کے کتابی مسائل پر خیالات کا اظہار ہو رہا ہے ۔ ابھی عالمی سیاست اور اس کی گوناگوں پیچیدگیوں پر تبصرہ فرما رہے ہیں اور ابھی عالم اسلام کی مجلسی اور انقلابی تحریکوں کا تفصیلی جائزہ دے رہے ہیں۔ ابھی دستوری نظریات و قوانین پر گفتگو ہو رہی ہے اور ابھی عالم اسلام یا متحدہ ہندوستان کی پچھلی پچاس سالہ تاریخ کے اہم سیاسی اور مذہبی رہبروں کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی موضوعِ سخن ہے ۔ گویا معلومات کا انداز بالکل ایک انسائیکلوپیڈیہ ہے، اور اس میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں دکھائی دیتی ہے جو محض سُنی سنائی یا سطحی مطالعہ سے اخذ کی ہوئی ہو ۔ اس ہمہ گیریت کی اصل وجہ حد درجہ کی ذہانت، بلا کا حافظہ اور مطالعہ میں بے حد محنت تھی ۔

مولانا کی علمی صلاحیتوں اور کارناموں کا جائزہ لینا میرا منصب نہیں ہے ۔ یہ کام کسی ریسرچ اسٹوڈنٹ کا ہے ۔ لیکن ان کی ملاقاتوں سے بعض باتیں خود بخود ذہن پر منقش ہو جاتی رہی ہیں۔ مثلاً یہ کہ عربی ادب و انشاء، تاریخ اور اشتراکیت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ ان کے خاص موضوع تھے ۔ اور ان تینوں میں ان کا مطالعہ بہت ٹھوس اور تنقیدی اور ان کا مقام خاصا منفرد تھا ۔ عرب ممالک کے بہت سے اصحابِ قلم سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی، اور وہاں کے خطوط دیکھنے کا اتفاق ہوا ان میں مولانا کے اسلوبِ نگارش (STYLE) کو عربی انشاء پردازی میں بہت اچھا مقام دیا گیا تھا ۔ اور ان سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مولانا کی عربی تحریر کا خاصا لوہا مانتے تھے ۔ اسی طرح تاریخ اور سیرت میں ان کا مطالعہ بہت ٹھوس تھا۔ واقعات کی صحت اور تاریخوں کی تعیین میں ان کا طریق ٹھوس ریسرچ کا تھا اور ان کی تصنیفات بالکل (THESIS) ہوا کرتی تھیں۔ "سیرت محمد بن عبدالوہاب" اس خشک عرق ریزی کی بہترین مثال ہے ۔ اشتراکیت اور اسلام کے تقابلی مطالعہ میں بھی ان کا اندازِ تحقیق و تدقیق کا ہی تھا ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شگفتہ اور رواں دواں تحریر پر بھی خاصا ملکہ تھا ۔ اُردو میں "دیارِ عرب" اور عربی میں "نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ ....." اس کی بہترین مثالیں ہیں ۔ اسی طرح حالاتِ حاضرہ سے پوری طرح باخبر رہنے کا بڑا اہتمام تھا ۔ بین الاقوامی سیاست کے لئے "اسٹیٹسمین" اور عالم اسلام کے کوائف کے لئے عربی روزناموں کے تاحینِ حیات باقاعدہ خریدار رہے اور بالالتزام ان کو مطالعہ میں رکھا ۔ ملک کی اردو صحافت کے معیار کے ہمیشہ شاکی رہے ۔ اندرونِ ملک کی مرکزی اور ہنگامی سیاست سے باخبر رہنے کے لئے کوئی سا اردو پرچہ (بالعموم نوائے وقت) صرف دیکھ لیتے اور بس! عربی اور اردو بے تکلف لکھتے ۔ بولتے اور پڑھتے تھے ۔ انگریزی صرف پڑھتے اور گفتگو میں بلا تکلف انگریزی محاورے اور مصطلحات استعمال کرتے تھے ۔ الغرض ٹھوس مطالعہ کی وجہ سے زندگی اور علم کے ہر شعبہ کے سلسلہ میں منقح اور منتخب معلومات کا کافی بڑا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا اور یہ سب کچھ اس دیرینہ مرض کے باوجود تھا جس نے عمر بھر ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی ۔

مولانا کی گفتگو جہاں ان کے تبحرِ علمی ۔ وسعتِ معلومات اور ناقدانہ تبصرہ کی آئینہ دار ہوتی تھی وہاں ان کی بات بات سے ان کے سیرت و کردار کی تصویر نمودار ہوتی معلوم ہوتی تھی ۔ ان کا رہن سہن ۔ گرد و پیش ، اور گفتگو ہر چیز ان کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پہ ایک خاموش تبصرہ ہوتا تھا اور چند ہی صحبتوں کے بعد آدمی کے ذہن میں از خود ان کی سیرت کے متعلق ایک رائے قائم ہو جاتی تھی ۔ جہاں تک میری معلومات ہیں یہ رائے ہمیشہ ایک ہی ہوا کرتی تھی اور وہ یہ کہ ان کی زندگی راست رو ۔ یک سو اور تضاد سے یکسر خالی ہے ۔ جماعتِ اسلامی میں شمولیت اختیار کرتے وقت آپ اپنے آبائی گاؤں کے بالکل قریب پٹنہ کی خدابخش لائبریری کے شعبۂ عربی میں کیٹلاگر تھے ۔ اور نہایت آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتے تھے ۔ سوائے مرض کے اور کوئی تکلیف

یلسبہ توا می نہ تھی اسی اثنا میں امیر جماعت اسلامی نے انہیں دار العروبہ کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے کہا۔ صحت اور حالات کا ظاہری تقاضا یہی تھا کہ وہ اس ذمہ داری سے گریز کی کوئی راہ نکالتے۔ مگر جماعت کی رکنیت اختیار کر لینے کے بعد ایسا کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ چنانچہ وطن کی دوری اور صحت کی کمزوری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بہاولپور کی ڈویژن سروس سے مستعفی ہو کر سیدھے پنجاب چلے گئے۔ اور اپنی جانِ ناتواں کو دار العروبہ کی تعمیر و تشکیل میں لگا دیا۔ اس بظاہر غیر دانشمندانہ اقدام پر ان کو اپنے بعض بزرگوں کی خفگی بھی مول لینی پڑی مگر وہ اپنے راستے پر گامزن رہے۔ پھر اتنے پر ہی بس نہیں ہے بلکہ نئے حالات و ظروف نے انہیں نہ صرف اپنی زندگی کا نہج ہی بہت حد تک بدلنے پر مجبور کر دیا بلکہ معیارِ زندگی بھی نسبتاً پست کر دیا۔ مگر انہوں نے کسی چیز کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اسلامی ممالک کی سیاست پر مولانا کی رائے بالکل ایک سند کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ میں نے کہا کہ آپ اگر عالمِ اسلام کے سیاسی حالات پر ہفتہ وار کالم لکھنے پر آمادہ ہوں تو بعض معیاری روزنامے معقول معاوضہ دینے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کچھ مالی مسئلہ حل ہوتا رہے گا۔ لیکن وہ محض اس وجہ سے اس بات کے لئے تیار نہ ہوئے کہ معاوضہ دینے والے روزناموں کی اخباری پالیسی ان کے اپنے نصب العین سے براہِ راست متصادم تھی: ابھی کچھ عرصہ گزرا کہ ہمارے ملک کے ایک مذہبی ہفت روزہ میں ایک پڑھے لکھے عالم نے جوشِ غضب میں مرحوم کی 'دیارِ عرب' کی ہزیمہ و فرستمت پر پھبتی کسی تھی۔ سخت تعجب ہوا کہ ایسے با اصول آدمی کی اتنی واضح اور روشن زندگی سامنے ہوتے ہوئے کتب فروشی کے طعن کی جسارت کیسے کر دی گئی) یہی حال مولانا کے معتقدات اور خیالات کا تھا۔ اخلاق و مروت کا مجسمہ ہوتے ہوئے بھی خیالات کے اظہار پر شخصیت یا ماحول کے تقاضوں کو رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے۔ یوں ان کے حلقۂ تعارف میں ہر طرز کے لوگ پائے جاتے تھے۔ سوشلسٹ، کمیونسٹ، آزادی پسند اور حنفی علماء سب ہی سے مراسم تھے۔ مگر نہ صرف یہ کہ ہر ایک انہی کے موقف سے اچھی طرح واقف ہوا کرتا تھا بلکہ ان کا قلبی لگاؤ بھی صرف ہم عقیدہ احباب سے ہی رہتا تھا۔ بالخصوص توحید و سنت کے معاملہ میں تو بالکل بے لاگ (UNCOMPROMISING) تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ سمجھے ہوئے علماءِ اہلِ حدیث سے ہمیشہ مراسم رکھتے تھے حالاں کہ طبعاً تحزب سے نفرت تھی اور کسی قسم کی گروہی یا فرقہ وارانہ عصبیت اور تنظیم ان کو نہیں بھاتی تھی۔ دیارِ عرب سے واپسی پر گوجرانوالہ میں سکونت کی بہت کوشش کی مگر آب و ہوا بالکل راس نہ آئی۔ اور بالآخر نقلِ مکانی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ روانگی سے چند روز قبل گوجرانوالہ میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو فرمانے لگے کہ یہاں کی آب و ہوا بالکل راس نہیں آئی لیکن دو چیزوں کی کشش ابھی تک نقلِ مکانی میں مخل ہے۔ ایک تو لاہور کا قرب اور دوسرے مولانا محمد اسماعیل صاحب (ناظمِ اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان) کی شخصیت اور ان کا کتب خانہ۔ (مولانا کے پاس کتابوں کا ذخیرہ کوئی بہت بڑا نہیں ہے۔ مگر منقولات کی اکثر معیاری کتابیں موجود ہیں اور اس باب میں ان کا ذوق کافی اچھا ہے) اسی طرح مولوی عطاء اللہ حنیف۔ پرنٹر پبلشر الاعتصام لاہور سے بھی ان کے خاصے مراسم تھے۔ اور مسائلِ شرعیہ کی تحقیق میں اکثر ان دو حضرات کی رائے بھی ضرور دریافت کیا کرتے تھے۔ اسی طرح تحزب اور گروہی عصبیت سے تنفر کے باوجود تاریخِ اسلام کی انقلابی تحریکوں اور شخصیتوں سے بہت اُنس رکھتے تھے۔ لفظ وہابی سے تو بس عشق تھا۔ کیوں کہ ان کے ہاں وہابی کسی مذہبی فرقہ کا نام نہیں تھا بلکہ ہندوستان میں اسلامی تحریک کے لئے ان کے مخالفین کی طرف سے ایک گالی تھی۔ ایک ایسی گالی جو تحریک کے زعماء اور اراکین کی پوری داستانِ جہاد اپنے اندر لئے ہوئے تھی۔ یہی حال علمی میدان کا تھا۔ اس دور کی ہر بڑی علمی شخصیت کی تحریریں بالالتزام ان کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض سے تو بے پناہ محبت و عقیدت کا اظہار کرنے سے بھی نہیں چوکے۔ عالمِ اسلام میں امیر شکیب ارسلان اور علامہ رشید رضا سے خاص طور پر متاثر تھے۔ ہندوستان میں شبلی۔ ابوالکلام۔ سید سلیمان ندوی اور مولانا مودودی ہر ایک ان کے زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ اور سید سلیمان ندوی سے تو بے حد محبت بھی تھی۔ مگر کسی ایک کا مطالعہ بھی محض عقیدت مندانہ نہیں تھا یہی وجہ

ہے کہ بعض شخصیتوں کے عقیدتمند ان کی تنقیدوں سے عموماً الجھتے رہے ہیں ۔حالانکہ تنقید کے باوجود ان شخصیتوں کی علمی عظمت کے اعتراف میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ الغرض اپنے مسلک میں نہایت پختہ ۔تنقید میں بے لاگ مگر مروت و اخلاق کے مجسمہ تھے اور یہ سعادت ہمارے ہاں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

مولانا بہت دیرینہ مریض تھے اور اکثر کئی کئی دن تک باہر ہی نہیں نکلتے تھے ۔ عام طور پر دائمی امراض قوتِ ارادی کو بالکل زائل کر دیتی ہیں۔ اور مریض بالعموم ایک بے قاعدہ غیر منضبط اور ڈھیلی ڈھالی زندگی کا شکار ہو جاتا ہے ۔لیکن مولانا کی قوتِ ارادی اخیر دم تک پلو ری طرح برسرِکار رہی ۔ ان کے معمولاتِ زندگی اس مضبوط ارادہ کا ہمیشہ مظہر رہے ۔غذا ۔لباس ۔ دوا غرض ہر چیز ضابطے کے ماتحت رہتی تھی اور بڑی سختی سے اس کی پابندی ہوتی تھی۔ لباس سادہ اور دیسی مگر نہایت عمدہ سلا ہوا اور بہت صاف ستھرا ۔کمرے میں ہر چیز قرینے سے اپنے طے شدہ مقام پر لگی ہوئی ۔غذا برسوں کے تجربہ کے بعد نہایت ہلکی پھلکی اور احتیاط سے انتخاب کردہ ۔شام کا کھانا تو خاص طور پر بہت ہلکا ہوتا ۔ بالعموم چائے ۔ رس اور ایک انڈے پر اکتفا کرتے۔ سردی مولانا کے مزاج کے بہت مخالف تھی ۔اس لئے اس سے بچاؤ کا بہت اہتمام ہوتا تھا اور زیادہ وقت بند کمرے میں قرینے سے لگے ہوئے صوفے یا بستر پر ہی گزارتے تھے ۔ اوقات کی پابندی میں کافی سخت تھے ۔ صبح کا وقت دارالعروبہ کے کام ہیں ۔ظہر سے عصر تک اخبارات کے مطالعہ میں اور شام دوستوں سے ملاقات میں صرف ہوتی تھی ۔ دائمی مرض کے باوجود معمولات کی اس قدر پابندی اور ضوابط کی اتنی پاسداری فی الواقع بہت حیران کن دکھائی دیتی تھی ۔مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب نتیجہ تھا ان کے سیرت و کردار کے ان بنیادی اوصاف کا جنہوں نے روزمرہ کی زندگی میں قاعدوں اور ضابطوں کی شکل اختیار کر رکھی تھی ۔ احتیاط ان کی زندگی کا خاص وصف تھا اور مالی معاملات میں تو یہ احتیاط حد درجہ قابلِ رشک تھا۔ پائی پائی کا حساب رکھا جاتا تھا۔ ماہ بماہ بجٹ بنا کر آمد و خرچ کی مدیں متعین کی جاتی تھیں اور بجٹ متوازن کرنے کے لئے اگر معیارِ زندگی پست بھی کرنا پڑتا تو بالکل دریغ نہ کیا جاتا ۔ مگر یہ کبھی نہ ہوتا کہ سر مالی ذمہ داریوں میں کسی قسم کا تساہل پیدا ہو جائے ۔ اگر میں یہ کہوں کہ خود جماعتِ اسلامی کے کم لوگوں میں اس قدر احتیاط پائی جاتی ہے تو شاید خلافِ واقعہ نہ ہو۔ دولت سے انہیں فی نفسہٖ کوئی کد نہیں تھی مگر دولت مندی کا مظاہرہ کرنے والوں اور دولت مندانہ اخلاق کے حامل لوگوں سے سخت متنفر تھے ۔ روزمرہ کے رہن سہن میں سادگی کے ساتھ ساتھ مشرقیت سے بھی خاصا تعصب تھا۔ خواہ کیسی مجلس طعام ہو کھانا بالالتزام ہاتھ سے کھاتے ۔قصہ یہ کہ معمولات میں ضابطہ اور انفرادیت ان کی شب و روز کی زندگی میں بہت نمایاں مقام رکھتے تھے۔

مولانا کی شخصیت پر سیر حاصل بحث تو کوئی فاضل مقالہ نگار ہی کر سکتا ہے ۔میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ مسلمانانِ پاک و ہند کے اس نہایت مختصر طبقہ کے ایک درخشندہ فرد تھے جو بیک وقت قدیم و جدید، مشرق و مغرب اور پرانے اور نئے سے بخوبی واقف ہے اور جو مذہب و سیاست، فلسفہ و سائنس اور علوم و افکار کی دنیا میں ماضی اور حال پر اچھی طرح حاوی ہے ۔یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے قدیم و جدید طرز کے تعلیم یافتہ حضرات ان کی مجلس میں یکساں طور پر بے تکلفی اور لطف محسوس کرتے تھے ۔میرے نزدیک تو یہی ایک خصوصیت انہیں امتیازی حیثیت دینے کے لئے بس کرتی ہے ۔مگر جب ہم اصول پرستی ۔ راست روی ۔حق گوئی اور مقصدِ زندگی سے گہری وابستگی ایسے خصوصی اوصاف کو بھی بات بات میں نمایاں پاتے ہیں تو ایک طرف میرے ایسے صحبت نشینوں کے لئے ان کی جدائی کا غم بہت گہرا ہو جاتا ہے اور دوسری طرف ان کی ہمہ گیر شخصیت ہر صحیح الفکر اور صحیح العمل انسان کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی بھی نظر آتی ہے ۔ان کو ہم سے جدا ہوئے آج تقریباً دس ماہ ہوتے ہیں۔ مگر ان کی یاد ہنوز دلوں کو گرماتی اور آنکھوں کو نمناک کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور مجھے اور آپ کو یہ توفیق دے کہ زندگی کے کسی ایک پہلو میں ہی ان کی صحیح نقل بن سکیں۔

بھائی جان

محمد عاصم

یاد پڑتا ہے۔ کہ بھائی جان مرحوم کا نام سب سے پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں پڑھا، جب کہ وہ نئے نئے دار السلام (پٹھانکوٹ) تشریف لائے تھے۔ اکتوبر کے ترجمان القرآن میں اشارات ان ہی کے قلم سے شائع ہوئے تھے۔ جن میں انہوں نے جماعت کے لٹریچر کے عربی ترجمہ کے لئے ایک شعبہ کا خاکہ پیش کیا تھا۔ میں نے بھی حال ہی میں عربی پڑھنا شروع کی تھی۔ اس لئے ان اشارات کو بار بار اور نہایت دلچسپی سے پڑھا۔ پھر اپریل ۱۹۴۵ء میں جب دار السلام میں جماعت کا پہلا کل ہند اجتماع ہوا تو اس میں بھائی جان کو پہلی مرتبہ دیکھنا نصیب ہوا، اگرچہ یہ دیکھنا ایک مرتبہ سے زیادہ نہ ہو سکا اور گفتگو یا ملاقات تو ہو ہی نہیں سکی، کیونکہ ایک تو بھائی جان اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ تر اپنے کمرے کے اندر رہا کرتے تھے۔ دوسرے عمر کم ہونے کی وجہ سے مجھ میں خود جا کر حاضرِ خدمت ہونے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۴۵ء میں لدھیانہ میں حلقہ جالندھر کا سہ ماہی اجتماع ہوا۔ اس میں بھائی جان کے بھی پھلور سے تشریف لانے کی خبر تھی، اس لئے بعض دقتوں اور رکاوٹوں کے باوجود اپنے بعض رفقاء کے ساتھ شریک اجتماع ہوا۔ اس وقت ہمارے اجتماعات کی کارروائی کا آغاز عموماً تعارف سے ہوا کرتا تھا۔ تعارف کی باری جب مجھ تک پہنچی۔ تو مولانا عبد الغفار حسن صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ ابن قیم کی کتاب کا ترجمہ قسط وار کوثر میں میرے نام سے شائع ہوا کرتا تھا۔ اس لئے غائبانہ طور پر اکثر رفقاء میرے نام سے واقف تھے۔ مولانا عبد الغفار حسن صاحب نے جب میری سکول کی تعلیم کا بھی ذکر کیا، تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بھائی جان اپنی جگہ یک لخت متنبہ ہوئے۔ اور انہوں نے حافظ فتح اللہ صاحب (جو ان دنوں ان کے ساتھ ہی دار العروبہ میں تھے) کی طرف ایک عجیب انداز میں دیکھا۔ دراصل ان دنوں بھائی جان کو اپنے ساتھ ایک ایسے نوجوان کی ضرورت تھی۔ جو مستقل طور پر ان کے ساتھ رہے۔ اور آئندہ چل کر دار العروبہ کے کاموں میں ان کی معاونت کر سکے۔ عربی مدرسوں سے فارغ شدہ طلبہ ملتے تھے۔ مگر نرے عربی پڑھے ہوئے لوگوں سے کام نہ چل سکتا تھا۔ اس وقت بھائی جان نے مجھ سے صرف اتنا فرمایا کہ "شام کو کسی خالی وقت میں مجھ سے ملنا۔ میں تمہارا امتحان لوں گا۔" میرے اپنے حالات بھی کچھ اس طرح کے تھے کہ گھر میں رہتے ہوئے عربی تعلیم میں بڑی دقتیں پیش آ رہی تھیں۔ باہر جانا چاہتا تھا۔ مگر کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ میں بھائی جان کا مطلب سمجھ گیا۔ اور شام کا انتظار کرنے لگا۔ مغرب کے بعد جو عموماً رفقاء کی باہمی ملاقات کا وقت ہوا کرتا تھا، حاضرِ خدمت ہوا مولانا عبد الغفار حسن صاحب بھی موجود تھے۔ بھائی جان نے مجھ سے عربی کے متعلق چند سوالات کئے۔ جو نہایت آسان تھے اور میں نے سب کا صحیح جواب دے دیا اس سے بہت خوش ہوئے۔ اور فرمایا: عدد درک وددمن علمک، اس وقت میں اس فقرے کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ بعد میں مولانا عبد الغفار حسن صاحب سے اس کا مطلب دریافت کیا۔ اس کے بعد بھائی جان کچھ دیر خاموش رہے۔ اور پھر عربی ہی میں فرمایا کہ تمہیں اگر کبھی ضرورت ہوا کرے تو مجھے خط لکھا کرو۔ سخت ضرورت مند ہونے کے باوجود بھائی جان دار العروبہ آنے کی مجھے صاف صاف دعوت نہ دیتے تھے۔ لیکن میں بھی مطلب سمجھ گیا۔

جنوری یا فروری ۱۹۴۶ء میں اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں سرہند جانا ہوا۔ وہاں سے واپسی پر پھلور پہنچ گیا۔ دریافت کرتے کرتے چودھری علی احمد خاں صاحب کے گھر پہنچا۔ کیونکہ بھائی جان ان دنوں وہیں مقیم تھے۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بھائی جان چند دن ہوئے پھلور سے جالندھر منتقل ہو چکے ہیں۔ لیکن کسی کو جالندھر میں ان کی جائے رہائش کا علم نہ تھا۔ خود چودھری صاحب کو اس کا علم تھا۔ مگر وہ ابھی اپنے دفتر سے واپس نہ آئے تھے۔ کچھ دیر تک ان کی

کی کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن جب نہ آئے تو ایک صاحب سے جو اس وقت جماعت کے ہمدرد تھے، جالندھر بھائی جان کی جائے رہائش کا پتہ دریافت کیا صاحب تھے مجھے ریلوے روڈ کا پتہ بتایا۔ میں اسی وقت اسٹیشن پہنچا۔ انتہائی بھیڑ کی وجہ سے مشکل سے گاڑی میں جگہ ملی۔ جالندھر اترا اور ریلوے روڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگانے لگا۔ لوگوں سے بہت دریافت کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر تھک کر ایک مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی اور لوگوں سے دریافت کیا۔ انہوں نے مجھے مولانا خیر محمد صاحب کے خیر المدارس کا پتہ بتایا۔ وہاں پہنچا۔ لیکن وہاں بھی کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ ایک صاحب نے جناب عبدالعزیز صاحب کے مکان کا پتہ دیا۔ دریافت کرتے کرتے وہاں پہنچا۔ لیکن گھر والوں نے بتایا کہ شرقی صاحب اڈہ ٹکوور گئے ہوئے ہیں۔ جہاں پھلور سے ایک صاحب آئے ہیں۔ دریافت کرتے کرتے اڈہ ٹکوور پہنچا اور محلہ سراج گنج کی مسجد میں نماز عشاء پڑھی۔ وہاں کے امام صاحب نہایت معقول آدمی تھے۔ انہوں نے اس چیز سے تو لاعلمی ظاہر کی۔ کہ یہاں پھلور سے کوئی نئے صاحب تشریف لائے ہیں۔ البتہ انہوں نے اپنے صاحبزادہ کو میرے ساتھ کر دیا۔ جو مجھے محلہ شیخاں لے گئے۔ یہاں در اصل تبلیغی جماعت والوں کا مرکز تھا۔ اتفاق سے مسجد میں ان لوگوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ میں نے ان سے بھائی جان کی جائے رہائش دریافت کی۔ تو ایک صاحب نے اظہار علم کیا۔ لیکن چونکہ رات کافی ہو چکی تھی۔ اس لئے صبح ان کے پاس لے چلنے کا وعدہ کیا۔ رات وہیں مسجد میں گزاری۔ میں اس وقت تک تبلیغی جماعت کے نام اور کام دونوں سے ناواقف تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ تبلیغی جماعت کے لوگ تھے۔ اور اس لئے آپس میں لوگوں کو نیکی کی ترغیب دینے کے مشورے کر رہے تھے۔ صبح ایک صاحب جن کا نام "منور" یاد پڑتا ہے۔ مجھے اپنے ساتھ پھر اڈہ ٹکوور لائے۔ وہاں ایک مکان پر نہایت خوشخط عربی خط میں "دار العروبہ" لکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی آرام کا سانس لیا جیسے اپنی منزل مقصود پالی۔ داخل ہوئے تو دیکھا کہ بھائی جان ایک کمرے میں اپنے بستر پر بیٹھے ناشتہ کر رہے ہیں۔ اس وقت ان کے ساتھ تین رفقاء تھے۔ ایک مولانا جلیل احسن صاحب ندوی، دوسرے حافظ ... اللہ صاحب راہوں والے، اور تیسرے جناب سید محمد قطبی صاحب۔ یہ لوگ نیچے چٹائی پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ بھائی جان نہایت محبت اور تپاک سے پیش آئے۔ شام تک ان کی خدمت میں رہا۔ تو مجھ سے میرے حالات دریافت فرماتے اور عربی پڑھنے اور لکھنے کے متعلق مشورے دیتے رہے۔ مختلف عربی رسالے اور کتابیں بھی دکھائیں۔ شام کو جدا ہوتے وقت مجھ سے فرمانے لگے۔ کہ مجھے اپنا بھائی سمجھو اور تمہیں جو ضرورت ہو مجھے لکھو۔ عربی میں روزنامچہ لکھنے کی بھی تاکید فرمائی۔

چنانچہ وہ دن ہے کہ آج کا دن میں نے کبھی بھائی جان کو مولانا کے لفظ سے نہ مخاطب کیا ہے اور نہ یہ لفظ کسی خط میں لکھا ہے۔ ہمیشہ برادر کرم یا اور بھائی جان کہتا رہا۔ بھائی جان بھی اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اور میرے متعلق اکثر فرمایا کرتے تھے کہ یہ ایک شخص ہے جس نے کبھی "مولانا" لکھا نہ کہا۔ بھائی جان نہایت ہی محبت کے آدمی تھے۔ ان سے ایک مرتبہ ملنے کے بعد الگ ہونے کو طبیعت نہ چاہتی تھی۔ اس کے بعد پھر گھر آگیا۔ لیکن دل ہمیشہ دار العروبہ جانے کی طرف مائل رہا۔ صرف دو چیزیں اس کی راہ میں حائل رہیں۔ ایک یہ خیال کہ کھانے پینے اور پہننے کے مصارف کیسے حاصل ہوں گے؟ کیونکہ اس وقت یہ چیز ذہن میں کسی طرح آتی ہی نہ تھی کہ دار العروبہ میں رہ کر عربی پڑھنے اور لکھنے کی مشق بھی کی جائے اور مصارف بھی اسی سے لئے جائیں۔ دوسرے یہ کہ میں چاہتا تھا کہ گھر ہی پر رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ عربی زبان لکھنے کی مشق کر لوں تاکہ جب بھی دار العروبہ پہنچوں تو کسی کام کا ہو سکوں۔ پھر مولانا عبدالغفار حسن صاحب سے بھی کسی قیمت پر الگ ہونے کو طبیعت نہ چاہتی تھی۔ لیکن میرے گھر کے حالات دن بدن کچھ اس طرح کے ہو رہے تھے۔ کہ گھر میں رہنا دوبھر نظر آنے لگا۔ آخر کار ایک دن جب کہ مولانا عبدالغفار حسن صاحب اپنے کام سے گئے ہوئے تھے۔ میں نے بھائی جان کو مفصل خط لکھا۔ جس میں اپنی استعداد اور آئندہ عزائم کا ذکر کرتے ہوئے دار العروبہ آنے کی خواہش ظاہر کی اور یہ بھی لکھا کہ میں اپنی معاش کا خود کوئی نظم کر لوں گا۔ بھائی جان نے میرا وہی خط بعینہٖ مولانا مودودی کے پاس دار الاسلام بھیج دیا۔ وہاں سے جواب آیا۔ پھر مجھے خط لکھا کہ اگر دار العروبہ آنا چاہتے ہو۔ تو آسکتے ہو۔ مولانا عبدالغفار حسن صاحب کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ تشریف لائے۔ تو انہیں بتا کر دوسرے دن جالندھر پہنچ گیا۔ اس وقت اگرچہ گھر والوں کے اصرار پر پھر ایک ماہ کے لئے گھر آیا۔ لیکن آخر کار مستقل طور پر دار العروبہ آجانے میں کامیاب

ہوگیا۔ یہ غالباً اکتوبر ۴۶ء کا واقعہ ہے۔

میں جن دنوں دارالعروبہ آیا۔ بھائی جان کی طبیعت سخت خراب تھی۔ دن کو طبیعت ٹھیک رہتی تھی۔ لیکن رات کو تنفس کے سخت دورے پڑتے۔ ہم سب لوگ ایک ہی کمرے میں سویا کرتے تھے۔ اب تک میں نے نہ صرف یہ کہ تنفس کے دورے نہ دیکھے تھے بلکہ دمہ کے کسی مریض کو بھی نہ دیکھا تھا۔ اور دورے بھی بھائی جان کو نہایت ہی سخت پڑتے تھے۔ ویسے یا ان سے بھی سخت دورے اگرچہ بھائی جان کے اپنے بیان کے مطابق انہیں دارالسلام کے قیام کے دوران میں پڑ چکے ہیں۔ لیکن کم از کم میں نے اتنے سخت دورے بعد میں انہیں بھی پڑتے نہیں دیکھے۔ دراصل ماہ رمضان ابھی گذرا تھا۔ اس میں بھائی جان نے پورے یا اکثر روزے بھی رکھے۔ اور تصنیف و تالیف کا کام بھی سخت محنت اور پابندی کے ساتھ جاری رکھا پہلی اسلامی تحریک ان ہی دنوں کی لکھی ہوئی ہے۔ اس محنت کا اثر یہ ہوا کہ رمضان کے بعد سخت تکلیف ہوگئی۔ لیکن اس تکلیف کے باوجود بھائی جان کو میری تعلیم اور مطالعہ کا دھیان رہتا۔

سب سے پہلی چیز جس کا بھائی جان نے مجھے حکم دیا۔ وہ یہ کہ کو ثر میں اپنے ترجموں کا سلسلہ ختم کردوں کیونکہ علمی پختگی سے پہلے کسی نوجوان کا اخبار یا رسالے میں نام چھپنا ایسا ہی ہے جیسا بلوغ سے پہلے شادی (یہ الفاظ خود بھائی جان ہی کے ہیں) اس کے بعد بھائی جان نے مجھے عربی رسالوں میں سے کوئی رسالہ لے کر اس کا کچھ حصہ اس طرح پڑھنے کا مشورہ دیا کہ ہر لفظ جو میرے لئے نیا ہو۔ یا اس کے معنی اور ضبط میں مجھے شک ہو۔ اسے لغت سے حل کروں۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے کامل کیلانی کی چند کتابیں سرسری مطالعہ (RAPID READING) کے لئے دیں۔ اس طرح کئی کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد میں رسالہ "الفتح" کا بمشکل ایک ڈیڑھ کالم حل کر پاتا تھا۔ شام کو مغرب کے بعد ہی حل کردہ کالم بھائی جان کے سامنے پڑھ کر سناتا۔ لغت ساتھ ہوتی۔ جہاں کوئی لفظ غلط پڑھتا یا اسے سمجھ نہ سکتا۔ بھائی جان اسے بتا دینے کے بجائے اسے لغت سے اپنے سامنے مجھ ہی سے حل کراتے تقریباً ایک ماہ تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ یعنی اس عرصہ میں میرے لئے عربی کا لکھنا قطعی ممنوع تھا۔ پڑھنا اور صرف پڑھنا میرا کام تھا۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد پڑھنے کے ساتھ کچھ لکھنے کی بھی اجازت ہوئی۔

عربی لکھنے کی ابتدا روز نامچہ لکھنے سے کی گئی۔ دن میں جو کچھ لکھتا۔ شام کو وہی بھائی جان کو پڑھ کر سناتا۔ بھائی جان املا اور تلفظ بھی درست فرماتے۔ اور غلطیوں کی بھی اصلاح کرتے۔ میں آج بھی حیران ہوتا ہوں کہ اس وقت بھائی جان اپنی سخت تکلیف کے باوجود میری تعلیم کا کس قدر دھیان رکھتے اور محنت صرف کرتے تھے۔ حالانکہ میری تعلیم کا خیال رکھنا نہ ان کے فرائض میں داخل تھا۔ اور نہ ذاتی طور پر میرا ان پر کوئی احسان تھا۔ کہ وہ اس کا بدلہ دینا چاہتے ہوں۔ یہ صرف بھائی جان کی محبت اور شفقت تھی۔ اور میری محنت و اخلاص کی حوصلہ افزائی۔

ہاں اس سلسلے میں ایک چیز یہ عرض کردوں کہ بھائی جان کی یہ رعایت "صرف میرے ساتھ یا عبدالماجد صاحب ندوی (جو مئی ۴۷ء میں ایک ماہ کے لئے دارالعروبہ آئے تھے) کے ساتھ تھی کہ انہوں نے میری تعلیم کا آغاز کسی عربی رسالہ کے مطالعہ سے کرایا، ورنہ ان کے پاس جتنے بھی رفقاً آئے (خواہ وہ اس سے پہلے عربی تعلیم میں کتنے ہی سال صرف کر چکے ہوں) ان سب کی تعلیم کا آغاز انہوں نے الترجمۃ العربیہ اور القراءۃ الرشیدۃ سے کرایا۔ عبدالماجد صاحب ندوہ میں سات سال تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ اور وہاں کے نہایت ذہین طلباء میں شمار ہوتے تھے۔ میں نے اگرچہ اس سے پہلے صرف دو اڑھائی سال عربی تعلیم پائی تھی۔ لیکن نحو میں شرح شذور الذہب پڑھی تھی اور وہ بھی مولانا عبدالغفار حسن صاحب سے درساً۔ بھائی جان کو یہ کتاب بہت ہی پسند تھی۔ مولانا عبدالغفار حسن صاحب سے جب ہم نے یہ کتاب ختم کی تھی۔ تو بھائی جان ہی نے ہمارے لئے اس کا پرچہ مرتب کیا تھا۔ اور میں اس میں اچھے نمبروں پر پاس ہوا تھا۔ اس لئے بھائی جان کو میری نحو پر بڑا اعتماد تھا۔ بلکہ ان کے اس اعتماد کی وجہ سے میں اکثر ڈرتا رہتا تھا۔ کہ کہیں یہ بھرم ختم نہ ہو جائے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے۔ کہ یہ اعتماد آخری وقت تک قائم رہا۔ اور اسی لئے بھائی جان نے مجھ سے الترجمۃ العربیہ مرتب کرائی۔

دو ماہ تک میری تعلیم کا سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ بتدریج کے بعد کہیں جا کر بھائی جان کی طبیعت سنبھلی۔ اب بھائی جان نے مجھ سے بعض عربی رسائل کو خطوط لکھوانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس وقت تک دارالعروبہ میں الفتح کے علاوہ کوئی عربی رسالہ نہ آتا تھا۔ بھائی جان اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے خود کسی کو خط نہ لکھ سکتے تھے۔ اور دوسرے رفقا جب تک بھائی جان املا نہ کرائیں، خط لکھنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یا لکھ نہ سکتے تھے۔ اب اگرچہ بھائی جان کی اپنی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ لیکن مجھے عربی خط نویسی کی مشق کرانے کے لئے مختلف رسالوں کو مجھ ہی سے خطوط لکھواتے۔ کہاں کسی عربی رسالہ کو دارالعروبہ کی طرف سے خط اور وہ بھی سب سے پہلا خط اور کہاں میرے جیسا عربی کا ایک مبتدی طالب علم۔ لیکن بھائی جان نے سب کچھ برداشت کیا۔ میں کافی دیر صرف کر کے ایک خط لکھتا، پھر خود ہی اس کو صاف کرتا۔ اور بھائی جان کے سامنے پڑھتا۔ بھائی جان زبان کے ساتھ املا کی بھی اصلاح فرماتے اور خط میں جن چیزوں کا آنا ضروری ہوتا ان کے بڑھانے کی بھی ہدایت کرتے۔ ہمارے خطوط کے جواب میں باہر سے جب خطوط آنا شروع ہوئے تو ان میں سے اکثر کا جواب بھی مجھ ہی سے لکھواتے۔ اس طرح میری عربی تحریر کی مشق کا آغاز ہوا۔

اس کے علاوہ دارالعروبہ میں مولانا جلیل احسن صاحب ندوی نے بھی بعض جماعتی رسالوں کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن ابھی تک بھائی جان ان کی تصحیح نہ کر سکے تھے۔ اب طبیعت سنبھلنے پر انہوں نے اس کا بھی آغاز کیا۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا کہ پہلے ایک گھنٹہ تک میں عربی ترجمہ کو بغور پڑھتا۔ پھر بھائی جان اصل اردو رسالہ اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اور میں ان کے سامنے عربی ترجمہ پڑھتا۔ بھائی جان کو بھی اس طریقہ سے تصحیح کرنے کی کبھی عادت نہ تھی۔ اس لئے مجھے ایک ایک فقرہ بار بار پڑھنا پڑتا۔ پھر جو تصحیح بھائی جان فرماتے اسے بھی لکھتا۔ رسالہ ختم ہونے کے بعد اسے صاف کرتا۔ ایک ایک مسودے کو بار بار پڑھنے، اس کی غلطیوں کو درست کرنے اور پھر پورے مسودے کو صاف کرنے بلکہ پریس سے جو پروف آتے تھے ان سب کی غلطیاں نکالنے سے مجھے جو فائدہ پہنچا وہ کسی دوسری چیز سے نہیں پہنچا۔ بھائی جان نے میرے ذمے اگرچہ صرف عربی خطوط کا کام کیا تھا۔ اردو خطوط کا جواب دینا میرے ذمہ نہ تھا۔ لیکن جب خطوط زیادہ ہوتے تو میں اکثر اردو خطوط کا جواب بھی دیتا۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا کہ جب کوئی خط آتا تو بھائی جان ہمیں اس کا جواب زبانی بتا دیتے اور کبھی نکات (HINTS) نوٹ کرا دیتے۔ پھر ہم پورا خط لکھ کر انہیں دکھاتے۔ جب بھائی جان اس میں کمی بیشی کرنے یا زبان درست کر دیتے تو ہم خط کو صاف کر کے دستخط کے لئے انہیں دے دیتے۔ عربی خطوط کی حد تک تو یہ تمام مراحل میں آسانی طے کر لیتا لیکن اردو خطوط میں بھی جب یہ مرحلے طے کرنا پڑتے تو اس سے بڑی کوفت ہوتی۔ لیکن بھائی جان اکثر مجھے فرماتے کہ خط لکھنا بھی ایک فن ہے۔ جو مضمون نویسی کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس چیز نے مجھے بڑا فائدہ دیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد مجھے اس میں یہاں تک کامیابی ہوئی کہ مجھے بعض لمبے خطوط کے جوابات بھائی جان زبانی بتا دیتے اور میں پورا جواب پیڈ یا کارڈ پر لکھ کر ان کے سامنے پیش کر دیتا۔ اور وہ اس پر دستخط فرما دیتے بھائی جان مجھے اکثر فرماتے کہ اگرچہ تمہاری اردو زبان اچھی نہیں ہے لیکن تم میرا مدعا پوری طرح ادا کر لیتے ہو۔

سنہ ۴۶ء میں بہار سے ہندوؤں کے مسلمانوں پر حملوں کی خبریں آنا شروع ہوئیں۔ ان خبروں نے بھائی جان کو سخت بے چین کر دیا۔ طبیعت پہلے ہی کمزور تھی۔ ان خبروں نے پھر سے بیمار کر دیا۔ جماعت نے بہار میں ریلیف کا کام کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور جناب عبدالجبار صاحب غازی کو اس کا انچارج مقرر کیا۔ بھائی جان چونکہ بہار ہی کے رہنے والے تھے۔ اور وہاں کے با اثر لوگوں سے ان کے تعلقات تھے۔ اس لئے غازی صاحب نے اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلیں۔ بھائی جان اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود تیار ہو گئے۔ میں بھی اس سفر میں ان کے ساتھ تھا۔ بہار کی مرطوب آب و ہوا میں طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ پٹنہ کے جس مکان میں کارکنان کا قیام تھا۔ وہ نہایت بوسیدہ یک منزلہ تھا۔ اسی میں بھائی جان بھی مقیم ہوئے۔ بھائی جان بہ جبر کر کے دن رات کام کرتے رہتے۔ میری تعلیم کا سلسلہ وہاں بھی جاری رہا۔ کسی کتاب یا رسالہ کا مضمون دن میں لغت سے حل کرتا اور مغرب کے بعد پڑھ کر سناتا۔ کاپی کا ایک ڈیڑھ صفحہ لکھنا بھی اور بھائی جان اسی کی اصلاح فرماتے۔

قیام پٹنہ کے دوران میں بھائی جان صرف ایک مرتبہ چند دن کے لئے اپنے وطن بہار شریف (ضلع پٹنہ) تشریف لے گئے۔ یہاں [illegible] اپنے والد صاحب

دہلی سے آخری ملاقات تھی۔ جاتے ہوئے مجھے ساتھ لے کر نہیں گئے۔ اس کی وجہ جو انہوں نے مجھے بعد میں بتائی وہ یہ تھی۔ اگر وہ مجھے اپنے گھر لے جاتے، تو میری مہمان نوازی نہ کر سکتے۔ کیونکہ ان کی اپنی طبیعت خراب تھی۔ والد صاحب بہت ضعیف تھے۔ اور گھر میں اوپر نیچے چیزیں لانے اور لے جانے والا کوئی نہ تھا۔ پھر یہ کہ اپنے گھر لے جا کر مجھ سے بھی کوئی خدمت نہ لے سکتے تھے۔ کیونکہ جو شخص اپنے گھر لے جا کر کسی عزیز سے خدمت لے وہ نہایت ہی کمینہ شخص ہے (بقول بھائی جان مرحوم)۔

آخر کار پٹنہ کا قیام بھائی جان کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا۔ طبیعت دن بدن خراب ہو رہی تھی اور کام کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے کچھ عرصہ کے لئے بہار ہی کے علاقے میں اپنے دوست جناب منظور احسن صاحب جامعی کے گھر (کمرڈیہی ضلع مانبھوم) چلے گئے۔ یہ جگہ بہار اور بنگال کی سرحد پر واقع ہے اور سطح مرتفع ہونے کی وجہ سے اس کی آب و ہوا نہایت لطیف ہے۔ یہاں بھائی جان کی طبیعت یکایک سنبھل گئی اور وہ سکون سے اپنا علمی کام کرنے لگے۔ میری تعلیم کے عموماً دو وقت ہوتے تھے۔ یا مغرب و عشا کے درمیان یا صبح کی نماز سے پیشتر۔ ان میں ترجموں کی تصحیح اور خطوط لکھنے کا کام رہتا۔

کمرڈیہی کے قیام ہی کے زمانے میں جب میرے قلم سے عربی خطوط باہر کافی جانے لگے تو بھائی جان نے مجھ سے فرمایا کہ تم اپنا نام بدل لو۔ اس لئے کہ تمہارا موجودہ نام عربوں کے لئے غیر مانوس ہے۔ اس وقت تک میرا نام "محمد نصرت اللہ" تھا۔ بھائی جان نے اسے بدل کر "محمد عاصم" کر دیا۔ عاصم انہوں نے والد صاحب قبلہ کے نام کی مناسبت سے تجویز فرمایا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے میں اپنا نام محمد عاصم لکھتا اور بتاتا ہوں۔ بھائی جان کا ناموں کے سلسلے میں ایک خاص ذوق تھا۔ وہ ہمیشہ صحابہ یا صحابیات کے نام پر نام رکھنا پسند کرتے تھے۔ اور وہ بھی عربی طریقے کے مطابق صرف ایک لفظ کا! ہند و پاکستان میں جو دوہرے دوہرے بلکہ بعض اوقات تہرے تہرے نام رکھنے کا رواج ہے۔ اسے بھائی جان کا ذوق پسند نہ کرتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ برکت کے خیال سے نام سے پہلے لفظ "محمد" بڑھا لینا کافی سمجھتے تھے۔ اسی ذوق کی بنا پر وہ اگرچہ اردو میں اپنا نام مسعود عالم لکھتے تھے۔ لیکن عربی میں صرف "مسعود" لکھا کرتے تھے۔

غالباً ۱۴ر ۱۵ر ۱۶ر اپریل ۱۹۴۷ء کو پٹنہ میں جماعت اسلامی کا مشرقی ہند سالانہ اجتماع تھا۔ اس میں شریک ہو کر اعظم گڑھ، سرائے میر اور لکھنؤ ٹھہرتے ہوئے ہم لوگ جالندھر پہنچے۔ چند ہی دن کے بعد دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں شمالی ہند کا سالانہ اجتماع تھا۔ اس میں شریک ہوئے۔ جالندھر واپسی کے بعد بھائی جان کی صحت اللہ کے فضل سے بہت اچھی تھی۔ بھائی جان کی صحت جب اچھی ہوتی تو پورا دن مصروف رہتے حتیٰ کہ ہمیں پڑھانے کا وقت نکال سکتے۔ چنانچہ ان گرمیوں میں بھائی جان نے خوب کام کیا۔ اپنی کتاب "تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند" (جس کا نام اس وقت تک غربۃ الاسلام فی الہند تھا) مرتب کر رہے تھے۔ میرے پڑھنے کے لئے دوپہر کا وقت مقرر کیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بھائی جان کے لئے لیٹنا طباً ضروری تھا۔ مگر سونے میں نزلہ ہو جانے کا اندیشہ رہتا۔ اس لئے لیٹتے تو ضرور مگر سوتے نہیں تھے۔ میرے پڑھنے کے لئے یہی وقت مقرر کیا گیا۔ اب میں رسالوں سے بڑھ کر کسی کتاب سے کوئی مضمون پڑھا کرتا تھا۔ ان دو اڑھائی مہینوں میں میں نے بھائی جان کے سامنے "سوق الصداقۃ اربعین سنۃ" مکمل اور "حاضر العالم الاسلامی" کے کچھ حصے پڑھے۔ "حاضر العالم الاسلامی" کتاب بھائی جان کو بے حد پسند تھی۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے اسے تین بار خود پڑھا۔ اور بعد میں بھی وقتاً وقتاً اسے دیکھتے رہتے تھے۔

۱۳ر اگست ۱۹۴۷ء کو میں بھائی جان سے جدا ہو کر عید کے لئے اپنے گھر آیا۔ ۱۷ر اگست کو عید تھی۔ خیال یہ تھا کہ عید کے اگلے ہی روز جالندھر واپس چلا جاؤں گا۔ لیکن اس کے بعد پنجاب کی دنیا ہی بدل گئی۔ ۱۴ اگست کو تقسیم کا اعلان ہوا اور اس کے بعد وہ کچھ ہوا جسے دنیا جانتی ہے۔ تمام راستے اور ذرائع آمد و رفت معطل ہو گئے۔ میں جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ کچھ معلوم نہ رہا کہ جالندھر میں بھائی جان کیسے اور کس حال میں ہیں؟ جب میں ان سے جدا ہوا تھا۔ تو ان کے ساتھ صرف عنایت الرحمان صاحب صدیقی تھے۔ تقریباً ایک ماہ تک ان کے حالات سے قطعی بے خبر رہا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ابھی جالندھر ہی

میں یہاں یا پاکستان پہنچ چکے یا کہیں اور چلے گئے۔ پاکستان سے بعض لوگ (یعنی ٹرکوں کے ساتھ اپنے کنبوں کو لینے کے لئے مالیر کوٹلہ گئے ... واقف کار کی تلاش کرتا مگر کچھ پتہ نہ چلتا۔ آخر جب میرے ایک دوست مالیر کوٹلہ سے لاہور آنے لگے۔ تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ لاہور میں بھائی جان کا پتہ کرکے ریڈیو سے اعلان کرادیں۔ اللہ ان صاحب کا بھلا کرے۔ کہ انہوں نے وعدہ پورا کیا اور چند دن کے بعد مجھے ریڈیو سے بھائی جان کے صحیح سلامت لاہور پہنچ جانے کی اطلاع ملی۔ سخت بے چینی کے بعد اطمینان نصیب ہوا۔ خوشی کے مارے آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے بعد پاکستان سے ڈاک کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ دس دس پندرہ پندرہ دن کی ڈاک ایک دن میں چھانٹی جاتی۔ ڈاک خانہ پہنچ کر انتظار کرتا کہ شاید بھائی جان کا بھی کوئی خط آیا ہو۔ کئی کئی گھنٹے انتظار کرتا مگر کبھی کوئی خط نہ ملتا۔ آخر ایک دن دو خط نکلے۔ انہیں پڑھ کر آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آئے۔ ان میں بھائی جان نے مجھے "پیارے بیٹے!" لکھ کر خطاب فرمایا تھا۔ اور اپنے جالندھر سے لاہور پہنچنے کی کیفیت لکھی تھی۔ اور مجھے جس قدر جلد ہو سکے۔ اپنے پاس پہنچ جانے کی تاکید کی تھی۔ افسوس کہ وہ دونوں خط مجھ سے ضائع ہو گئے۔ بعد کے خطوط اکثر موجود ہیں۔ مگر یہی دو خط نہیں مل سکے۔

۱۱ر دسمبر ۴۷ء کو پاکستان پہنچا۔ بھائی جان اس وقت راولپنڈی پہنچ چکے تھے۔ کیونکہ تقسیم کے بعد مرکز جماعت اسلامی کی ایک ذیلی شاخ راولپنڈی میں قائم کی گئی تھی۔ اور دار العروبہ کا بھی اسی کے ساتھ ہونا طے پایا تھا۔ راولپنڈی پہنچا۔ بھائی جان اپنے مکان کے صحن میں بیٹھے دھوپ میں بدن کی مالش کرا رہے تھے۔ یکایک جو ملاقات ہوئی۔ تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک جہان میں جدائی ہوئی تھی اور دوسرے جہان میں ملاقات ہو رہی ہے۔ بڑا اطمینان ہوا۔ کہ ان تکلیفوں اور مصیبتوں سے گذرنے کے بعد بھی بھائی جان کی صحت اچھی تھی اور وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مصروف تھے۔ میرے پہنچنے سے ایک دو روز پہلے عربی اخبارات کے لئے "مذابح المسلمین فی الہند" کے نام سے مضمون لکھ کر فارغ ہوئے تھے۔ میرے پہنچنے سے بے حد اطمینان کا اظہار فرمایا۔ اور کئی دن تک اپنے جالندھر و لاہور کے قیام کے حالات تفصیل سے سناتے رہے۔

فروری ۴۸ء میں میں نے پہلی بار "اسلام کا نظام حیات" میں سے "سیاسی نظام" کا عربی ترجمہ شروع کیا۔ بھائی جان کو ابھی امید نہ تھی کہ میں ترجمہ کر سکوں گا۔ لیکن جب میں نے ایک دو صفحہ کا ترجمہ کرکے سنایا۔ تو بہت خوش ہوئے۔ اور مزید ترجمہ کرنے کی اجازت دی۔ ایک ایک تقریر کے ترجمہ میں کافی دن لگے۔ اور غلطیاں بھی بہت ہوئیں۔ لیکن بھائی جان بڑی محنت سے ترجمہ کی تصحیح فرماتے۔ وہ خود ان دنوں دین حق، اسلام اور جاہلیت وغیرہ کا ترجمہ کر رہے تھے۔

اس سال سے میں دار العروبہ کا باقاعدہ کام کرنے لگا تھا۔ ترجمہ بھی کرتا، باہر سے خطوط بھی اچھی خاصی تعداد میں آنا شروع ہو گئے تھے ان میں سے اکثر کا جواب دیتا۔ لیکن پہلے خط لکھ کر بھائی جان کو دکھاتا۔ اور وہ اس کی اصلاح فرماتے۔ پھر اسے صاف کرکے اس پر بھائی جان کے دستخط لیتا۔ دوپہر کو ان کے سامنے "سیرۃ ابن ہشام" پڑھتا۔ بھائی جان کو یہ کتاب بہت زیادہ پسند تھی۔ فرماتے کہ قرآن و حدیث کے بعد اس کتاب کی زبان مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ یہ میری آخری کتاب تھی جو میں نے باقاعدہ بھائی جان کے سامنے پڑھی۔ اس کے بعد اگرچہ مختلف مضامین بار ہا پڑھ کر سنائے مگر کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ دراصل اس کے بعد حالات ہی کچھ اس طرح کے ہو گئے تھے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

اس سال بھائی جان کی صحت اللہ کے فضل سے بڑی اچھی تھی۔ لیکن ۲۵ر ستمبر ۴۸ء کو جب میں اپنے گھر (مالیر کوٹلہ) گیا۔ تو اس کے چند ہی دن کے بعد ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ طبیعت تو شاید چند دن میں سنبھل جاتی۔ مگر ۵ر اکتوبر کو جو مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی گرفتاری ہوئی تو غازی صاحب لاہور تشریف لے آئے۔ اور دار العروبہ کے کام کے علاوہ راولپنڈی مرکزی شاخ اور حلقہ راولپنڈی کی امارت کا بار بھی بھائی جان پر ڈال دیا گیا۔ مجھے جلد سے جلد واپس آجانے کے لئے لکھتے رہے۔ ان دنوں ہندوستان سے پاکستان آنا آسان نہ تھا۔ بڑی مشکل سے ۱۵ر نومبر کو راولپنڈی پہنچ سکا۔ عجیب اتفاق کہ جس رات میں راولپنڈی پہنچا، وہ پہلی رات تھی کہ بھائی جان کو ڈیڑھ ماہ کے بعد کوئی دورہ نہیں پڑا۔ اور اس کے بعد طبیعت دن بدن اچھی ہی ہوتی چلی گئی۔ بلکہ چند دن کے بعد اتنی اچھی ہو گئی کہ بھائی جان نے تین چار مہینوں میں اتنا کام کیا۔ جتنا انہوں نے

شائع [illegible] ہو۔ دارالعروبہ کے کاموں کے علاوہ "اشتراکیت اور اسلام" (موجودہ شکل میں) ان ہی دنوں مرتب کی۔ رحمت الٰہی صاحب اور بعض دوسرے رفقاء کو [illegible] پڑھاتے۔ مجھے رات کے آخری حصہ میں اٹھاتے۔ پہلے آدھ گھنٹہ تک مجھ سے قرآن مجید سنتے۔ پھر میں کسی کتاب یا رسالہ کا کوئی مضمون انہیں پڑھ کر سناتا۔ ناشتہ سے بھی صبح کی نماز سے پہلے ہی فارغ ہو جاتے۔ اور نماز سے فوراً بعد اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے۔

ان ہی دنوں میری شادی کا معاملہ بھی پیش آیا۔ گھر والے سخت زور دے رہے تھے۔ لیکن میں اسے ابھی قبل از وقت خیال کرتے ہوئے انکار کر رہا تھا۔ بھائی جان کا مشورہ بھی یہی تھا۔ کہ ابھی کچھ دیر اور محنت کر لو۔ بعض گذشتہ واقعات سے بھائی جان کو تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ اور وہ کسی رشتہ کے معاملہ میں درمیان میں آنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ لیکن میرے معاملہ میں وہ ہر چیز کے لئے تیار تھے۔ میرا موجودہ رشتہ ان ہی کی وساطت سے طے پایا۔

بھائی جان کی طبیعت جب چند ماہ لگاتار اچھی رہ جاتی تو ان کے عزائم بھی دوچند ہو جاتے۔ نئی نئی تجاویز ذہن میں آتیں اور وہ انہیں عملی جامہ پہنانے کی فکر میں لگ جاتے۔ طالب علمی ہی کے زمانہ سے عرب ممالک کی سیاحت کا شوق تھا۔ لیکن کچھ صحت اور کچھ دوسری رکاوٹیں اس راہ میں حائل رہیں۔ "الضیاء" کی ادارت کے زمانہ میں بھی ایک مرتبہ پاسپورٹ کی کوشش کی تھی مگر کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اب ان کے استاد ڈاکٹر تقی الدین الہلالی کئی سال کی لاعلمی اور غریب الوطنی کے بعد عراق آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ بھائی جان کو ان سے بے حد محبت تھی۔ اس لئے غازی صاحب (جو اس وقت امیر جماعت تھے۔) سے مشورہ کر کے عربی ممالک کی سیاحت کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے بھی ساتھ لیا۔ اور ۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو راولپنڈی سے کراچی روانہ ہوئے۔ سفر کا ارادہ کرتے وقت بھائی جان کے پاس چند سو روپوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور میرے پاس تو ہونے کا سوال ہی کیا؟ لیکن بھائی جان کو اللہ تعالیٰ پر اتنا بھروسہ تھا کہ پورا سفر آسانی سے طے پا گیا۔ عراق میں بھی قیام رہا اور حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔

اب تک مجھے عربی لکھنے کی تو کچھ نہ کچھ مشق بہم پہنچ چکی تھی۔ لیکن بولنے کی بالکل مشق نہ تھی۔ کراچی پہنچ کر بھائی جان نے خود بھی اکثر مجھ سے عربی میں بات چیت کرنا شروع کی۔ اور عرب ممالک کے جو نمائندے وہاں موجود تھے (فروری ہی میں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس ہوا تھا) ان کے پاس زبردستی مجھے بھیجنا شروع کیا۔ کراچی ہی میں میں نے پہلی مرتبہ کسی عرب کو دیکھا اور اس سے بات چیت کی۔

۲۸ اپریل کو بصرہ کے لئے جہاز پر سوار ہوئے۔ جہاز پر سوار ہوتے ہی میرے ساتھ اردو میں بات چیت ختم کر کے عربی میں بات چیت شروع کر دی خود تو اردو میں روزنامچہ لکھنا شروع کیا (جو بعد میں "دیار عرب" کے نام سے شائع ہوا) لیکن میری مشق کے خیال سے مجھے عربی میں روزنامچہ لکھنے کی تاکید فرمائی۔ جہاز میں جو بہت سے عرب سفر کر رہے تھے ان سے ملتے رہنے اور انہیں جماعت کی کتابیں پیش کرنے کا بھی حکم دیا۔ ہماری کوشش یہ تھی کہ ہندوستانیوں سے کم سے کم اور عربوں سے زیادہ سے زیادہ ملاقات کی جائے۔ پھر بصرہ اور بغداد بلکہ مکہ و مدینہ کے قیام کے دوران میں بھی ہماری یہی کوشش اپنی جگہ قائم رہی۔ پورے سفر میں میری اور بھائی جان کی گفتگو زیادہ تر عربی ہی میں ہوا کرتی تھی۔ الا یہ کہ کبھی اردو بولنے پر مجبور ہی ہو جائیں۔

بغداد میں اگرچہ رہائش کے لئے ہم نے اپنا ایک الگ کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ لیکن زیادہ تر ہلالی صاحب کے ہاں نشست رہتی۔ ہلالی صاحب سے استفادہ کی شکل بھائی جان نے یہ تجویز کی۔ کہ میں انہیں اپنا "نظام حیات" کا ترجمہ پڑھ کر سناؤں۔ چنانچہ ایک ڈیڑھ ماہ تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ میں ترجمہ پڑھتا، ہلالی صاحب اس کی تصحیح فرماتے۔ اور بھائی جان خود پاس بیٹھتے اور جہاں کہیں ضرورت ہوتی خود مطلب کی توضیح فرماتے اس چیز کا ہمیں دوہرا فائدہ پہنچا۔ ایک تو ہلالی صاحب کی تصحیح سے ہماری زبان کی اصلاح ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ فائدہ زیادہ تر مجھ ہی کو پہنچا۔ بھائی جان نے میری ہی عربی مشق کے خیال سے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہلالی صاحب جماعت کی دعوت سے روشناس ہوئے۔ ہلالی صاحب چونکہ کمزور نگاہ کے آدمی ہیں۔ اس لئے وہ کوئی چیز نہیں پڑھ سکتے۔ "نظام حیات" کے بعد "الجہاد فی سبیل اللہ" اور بعض دوسرے رسالے بھی ہم نے انہیں سنائے۔ اس کے علاوہ بھائی جان اکثر مجھے ہلالی صاحب کے ساتھ رہنے کی تاکید فرماتے۔ میں ہلالی صاحب کے ساتھ بازار چیزیں خریدنے جاتا۔ راستہ بھر مختلف موضوعوں پر گفتگو رہتی اس

سے مجھے بے حد فائدہ پہنچا۔ اگر ہلالی صاحب کے سوا کوئی اور عرب ہوتا تو شائد مجھے اتنا فائدہ نہ پہنچتا۔ ہلالی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بولنے اور لکھنے کی زبان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہمارے ہاں پاکستان اور ہندوستان میں تو ایسے لوگ بہت مل جاتے ہیں جو صحیح اردو بولتے اور صحیح اردو لکھتے ہیں لیکن عربوں کے ہاں تقریباً یہ چیز مفقود ہے مصر، شام اور عراق کے بڑے بڑے نامور ادباء اپنی مجلسوں میں عامی زبان بولتے ہیں بلکہ اگر وہ فصیح زبان بولتے بھی ہیں تو انکی گفتگو میں بیچ بیچ میں بہت سے الفاظ آہی جاتے ہیں۔ لیکن ہلالی صاحب عامی زبان کے سخت مخالف اور فصیح زبان بولنے کے علمبردار ہیں۔ وہ کسی حال میں عامی زبان بولنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے سفر مصر و شام کی ڈائری "مذکرات سائح فی الشرق الاوسط" میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ہلالی صاحب کے بعد صرف علامہ بہجۃ البیطار (دمشق) کو دیکھا ہے جو بولنے میں بھی فصیح زبان استعمال کرتے ہیں۔ پھر ہلالی صاحب عربی کے بہت بڑے ادیب زبان دان ہیں۔ لگاتار ساڑھے تین ماہ ان کے ساتھ رہنے سے مجھے بڑا ہی فائدہ پہنچا۔ اگرچہ فائدہ بھائی جان کو بھی پہنچا۔ لیکن استفادہ کے زیادہ تر مواقع میرے ہی حصہ میں آئے۔ بھائی جان تو لکھنؤ میں بھی ہلالی صاحب کے ساتھ دن رات تین سال تک رہ چکے تھے۔

بغداد کے دوسرے علماء ادباء اور اہل علم حضرات سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ بھائی جان کوشش کرکے ہر ملاقات اور مجلس میں مجھے اپنے ساتھ رکھتے اور بعض اوقات بولنے کا موقع دیتے۔ کبھی کبھی مختلف حضرات سے ملنے کے لئے مجھے تنہا بھی بھیجتے۔

بغداد میں ہمارا قیام ساڑھے تین ماہ رہا۔ دو ماہ تک ہمیں یہ توقع نہ تھی کہ اس سفر میں ہم حج سے بھی شرفیاب ہوسکیں گے۔ لیکن کچھ ایسے اسباب ہوئے کہ اتنی رقم مہیا ہوگئی۔ کہ ہم میں سے ایک آدمی حج کرسکے۔ میں نے بھائی جان سے اصرار کیا کہ میں یہیں سے کراچی واپس چلا جاتا ہوں۔ آپ حج کر آئیے۔ لیکن بھائی جان اس پر تیار نہ ہوتے تھے۔ کراچی سے روانہ ہوتے وقت سعودی عرب کے سفیر متعینہ پاکستان سید عبدالحمید خطیب نے بھائی جان کو سعودی عرب کے سفیر متعینہ عراق عبداللہ خیال کے نام ایک تعارفی خط دیا تھا۔ ایک دن ہم ان سے ملنے گئے۔ ہم دراصل ان سے سعودی عرب میں داخلے کا ویزا لینے گئے تھے۔ سید عبدالحمید خطیب کے خط کا اثر یہ ہوا کہ عبداللہ خیال نے ویزا دیتے وقت خود ہی ہمارے پاسپورٹوں پر "اُعفی عن رسوم الحج مجاملۃ" کی مہر لگا دی۔ ہمارا خیال تھا کہ بھائی جان کی حد تک تو شاید عبداللہ خیال صاحب نے یہ مہر اپنے اختیارات سے لگائی ہے لیکن میرے پاسپورٹ پر مہر لگانے میں شاید انہوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے یا انہوں نے غلطی کی ہے۔ اس لئے شاید سعودی عرب میں داخل ہوتے وقت ہم سے ایک آدمی کا ٹیکس وصول کیا جائے۔ اس زمانے میں حج پر حکومت کا ٹیکس ۳۷۲ روپے تھا۔ لیکن ہم اسے ادا کرنے کے لئے تیار تھے میں نے اگرچہ پھر کراچی واپس چلے جانے پر اصرار کیا۔ مگر بھائی جان سے یہ چیز برداشت نہ ہو سکی۔

بغداد سے بصرہ اور کویت ہوتے ہوئے ریاض پہنچے۔ وہاں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خاندان کے علماء سے بھائی جان کی ملاقاتیں رہیں۔ ہر ملاقات اور صحبت میں بھائی جان کوشش کرکے مجھے اپنے ساتھ رکھتے۔

جب سے ہمیں یہ توقع ہوئی تھی کہ اس سفر میں حج و زیارت بھی نصیب ہو سکے گی ہم نے مل کر مناسک حج پر مختلف کتابیں پڑھنا اور دعائیں یاد کرنا شروع کر دی تھیں۔ یہاں تک کہ جب ہم مکہ معظمہ پہنچے تو ہم مناسک حج پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔ اسی لئے بھائی جان کا آخری دنوں میں یہ ارادہ رہا کہ مناسک حج پر ایک رسالہ مرتب کیا جائے اگرچہ وہ اپنے دوسرے مشاغل کیوجہ سے ایسا نہ کر سکے۔

حج و زیارت میں بھائی جان نے سنت طریقہ کی سختی سے پابندی کی۔ عموماً جو لوگ سنت طریقہ کی سختی سے پابندی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ حج و زیارت کے موقع پر "خشک قانونی" ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن بھائی جان نے یہ سختی اس کے باوجود برقرار رکھی کہ وہ نہایت ہی نرم دل آدمی تھے! اور انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے انتہائی عشق تھا۔ وہ جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے قریب پہنچے، ان کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے۔ اور وہ دیر تک کھڑے دعا کرتے رہتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اتنی ہی محبت کسی اور شخص کو ہوتی۔ تو اس سے کوئی نہ کوئی بدعت ضرور صادر ہو جاتی اور اس کے لئے سنت طریقہ پر برقرار رہنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھائی جان

کا طرزِ عمل سنت اور عشق کو ایک ساتھ نباہنے کا ایک قابلِ قدر نمونہ تھا۔ جن لوگوں نے "دیارِ عرب" میں پڑھی ہو وہ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، اور جدہ میں ہمارا قیام تقریباً تین ماہ رہا۔ اسی عرصہ میں بڑے بڑے علماء ادباء، اور مختلف شخصیتوں سے ملاقاتیں رہیں۔ تقریباً ہر ملاقات میں اور گفتگو میں بھائی جان نے مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ بسا اوقات مجھے تنہا جاکر مصر، شام اور دوسرے عرب ممالک کے لوگوں میں کام کرنے اور انہیں جماعت کی عربی کتابیں پڑھانے کی تاکید فرماتے۔ ان ہی ملاقاتوں کا اثر تھا کہ اس زمانے میں مجھے عربی بولنے کی اچھی خاصی مشق ہوگئی تھی۔ بعض اہم شخصیتوں سے ملنے کے لئے بھی بسا اوقات بھائی جان مجھے تنہا بھیجتے۔ مجھ میں جھجک بہت تھی۔ جو ان ملاقاتوں سے بڑی حد تک کم ہوگئی۔ شیخ عبدالمجید سلیم (سابق شیخ الازہر) سے میں تنہا ہی جاکر ملا تھا۔ اور انہیں جماعت کی کتابیں دی تھیں۔ ایک مرتبہ مفتی امین الحسینی سے بھی میں نے تنہا جاکر ملاقات کی۔

دسمبر ۴۹ء میں حج سے واپسی ہوئی۔ تین ماہ تک ہمارا قیام حیدر آباد (سندھ) میں رہا۔ خیال تھا کہ آئندہ دارالعروبہ یہیں قائم کیا جائے۔ کیونکہ کراچی سے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں کے قیام میں کام کے لئے بہت سی آسانیاں ہیں۔ مگر یہاں کی آب و ہوا بھائی جان کو موافق نہ آئی۔ اس لئے مارچ ۵۰ء میں یہاں سے گوجرانوالہ منتقل ہوگئے۔

حیدر آباد کے قیام ہی کے زمانہ میں ہی میں نے اپنا پہلا عربی مضمون لکھا۔ اس وقت مولانا مودودی جیل میں تھے۔ ایک سال گذرنے کے بعد بھی جب حکومت پاکستان نے ان کی گرفتاری کی مدت میں توسیع کردی تو عراق میں جناب طٰہٰ فیاض صاحب (ایڈیٹر روزنامہ السجل) نے اپنے پرچے میں حکومت پاکستان کی پالیسی پر سخت تنقید کی۔ اس پر وہاں کے پاکستانی سفارت خانہ نے مولانا مودودی کے خلاف ایک مضمون اخبارات میں شائع کرادیا۔ جس میں ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے۔ طٰہٰ فیاض صاحب کو چونکہ یہاں کے حالات سے پوری واقفیت نہ تھی۔ اس لئے اس مضمون کے جواب کے لئے انہوں نے بھائی جان کو لکھا۔ بھائی جان نے مجھے اس کا جواب لکھنے کا حکم دیا۔ میں نے جواب لکھا اور بھائی جان نے اس کی تصحیح فرمائی اور کہیں کہیں کمی بیشی بھی کی۔ یہ جواب السجل میں شائع ہوا۔

اسی زمانہ میں بھائی جان نے مجھ سے جماعت اسلامی کا عربی تعارف نامہ بھی لکھوایا۔

مارچ ۵۰ء کو گوجرانوالہ پہنچے۔ ایک ماہ کے بعد دارالعروبہ اور ہماری رہائش کے لئے مکان ملا۔ سفرِ حج سے پہلے اگرچہ میرا نکاح ہو چکا تھا لیکن "خانہ آبادی" ابھی نہ ہوئی تھی۔ جولائی ۵۰ء میں "خانہ آبادی" ہوئی۔ اس پردیس میں جہاں میرا کوئی بزرگ، سرپرست اور رہنما نہ تھا۔ بھائی جان نے کمال شفقت و مہربانی سے یہ تمام فرائض انجام دیئے۔ قدم قدم پر ہر ہر معاملہ میں رہنمائی فرمائی۔ نازک نازک موقعوں پر مشورہ دیا اور مجھے اپنے سر پر کسی ہمدرد بزرگ کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اپنے خرچ کو آمدنی کے مطابق رکھنے اور رہائش میں سختی کا عادی رہنے کی ہمیشہ تاکید فرماتے۔ اس نالائق کو اعتراف ہے۔ کہ اس زمانہ میں یہ ان کی نصیحتوں اور مشوروں پر پوری طرح کاربند نہ ہو سکا۔ لیکن بھائی جان کبھی محبت سے کبھی نرمی سے کبھی سختی سے کبھی ناراضگی سے اور کبھی ڈانٹ سے ہمیشہ اسے سیدھے راستہ پر رکھنے کی کوشش فرماتے رہے۔

مجھے اپنی اہلیہ کو عربی پڑھانے کا حکم بھی ہوا۔ تاکہ ہم دونوں مل کر کسی کام اور مقصد میں اپنا وقت صرف کریں۔ اس حکم پر عمل شروع کردیا گیا بھائی جان خود کبھی کبھی تشریف لاکر میری اہلیہ کا امتحان لیتے۔

مجھے کبھی ایک آدھ دن کے لئے گوجرانوالہ سے باہر جانا پڑتا۔ تو بجائے ملازم کو بھیجنے کے خود میرے گھر بازار کے سودا وغیرہ کے متعلق دریافت فرماتے۔ عید اور بقرعید کے موقع پر میری اہلیہ کو عیدی عنایت فرماتے۔ مجھے بھی کوئی عربی کی کتاب بطور عیدی کے ملتی۔

اول تو ان کے سفر میں میں ان کے ساتھ ہوتا۔ لیکن اگر کبھی کام کی وجہ سے مجھے دارالعروبہ میں چھوڑ کر کراچی یا لاہور جانا پڑتا۔ تو وہاں سے محبت و شفقت کے خط لکھتے۔ اور واپسی میں میرے اور میری اہلیہ کے لئے کچھ نہ کچھ تحفہ ضرور لاتے۔ ایک مرتبہ موتمر عالم اسلامی کے سلسلہ

میں شمس الدین صاحب کے ساتھ کراچی تشریف لے گئے وہاں سے مجھے لکھتے ہیں :—

پیارے بھائی! سلام وتحیات ۔

"ابھی ابھی تمہارا خط ملا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری عدم رفاقت کا تمہیں خاصہ رنج ہے ۔ میری مجبوریوں کا تمہیں علم ہے ۔ اگر تم ساتھ ہوتے تو ذاتی آرام کے علاوہ کام بھی زیادہ ہوتا ۔ لیکن دار العروبہ کا مفاد یہی تھا ۔ امید کہ تم خیال نہ کرو گے ۔ تم نے اس "رنج" کی تصریح نہیں کی ۔ مگر حرف حرف میں اس کی غمازی ہوتی ہے ۔ مجھے اس کا بڑا دکھ ہوا ۔ انشاء اللہ جلدی ہی آیا چاہتا ہوں ۔ پھر باتیں ہوا کرینگی ۔"

مجھے یاد ہے کہ میرا موجودہ بلیک برڈ کا قلم ان ہی کا کراچی سے لایا ہوا ہے اور اسی مؤتمر کے موقع پر ۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :—

"تمہاری محبت بھری باتیں اور پیار کے مخصوص انداز یاد آتے ہیں ۔"

عزیزہ سلیمیٰ سلمہا کو سلام اور دعا ۔

مؤتمر کے موقع پر کراچی نہ جانے کا مجھے واقعی رنج تھا ۔ لیکن اس رنج کو دور کرنے کے لئے بھائی جان اپنی مصروفیتوں کی تفصیلات خود اپنے قلم سے لکھتے ۔ موتمر کے بعض نمائندے مولانا مودودی سے ملنے کے لئے لاہور آنے لگے تو بھائی جان مجھے کراچی سے لکھتے ہیں :—

"پیارے عاصم! سلام وتحیات ۔"

" مصروفیتوں کے باعث تمہیں اب تک دو حرف نہ لکھ سکا ۔ خیال نہ کرنا ۔ .... مفتی صاحب سے اچھی ملاقات ہوئی کل صبح صواف صاحب وغیرہ کی اور شام کو عزام صاحب کی دعوت تھی ۔ اپنے قیام گاہ ہی پر ۔ صواف صاحب اور سباعی اور بعض دوسرے نمائندے لاہور بھی آئیں گے .... میری رائے ہے کہ تم تین چار دن کے لئے اس موقع پر لاہور پہنچ جاؤ ...."

گوجرانوالہ میں ہمارا قیام تقریباً ایک سال رہا ۔ مگر تجربہ سے معلوم ہوا ۔ کہ یہاں کی آب وہوا بھی بھائی جان کی طبیعت کے موافق نہیں ہے ۔ اپریل ۱۹۵۸ء میں راولپنڈی منتقل ہو گئے ۔ راولپنڈی میں ابھی مکان نہ ملا تھا ۔ اس لئے مجھے گوجرانوالہ ہی میں چھوڑ دیا ۔ تاکہ جب راولپنڈی میں مکان ملے ۔ اسی وقت میں دار العروبہ کا سامان لے کر راولپنڈی پہنچوں ۔ گوجرانوالہ کے جس مکان میں دار العروبہ تھا ۔ اسی میں ہماری رہائش بھی تھی ۔

لیکن اس کمال محبت وشفقت کے باوجود اور میرے اصرار کے باوجود اس چیز پر کبھی رضامند نہ ہوئے کہ اپنا کھانے کا نظم الگ رکھنے کی بجائے میرے ہاں سے کھانا کھاتے رہیں ۔ تعلقات کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو بھی تعجب ہوتا اور میں خود بھی بہت زیادہ شرم محسوس کرتا ۔ آپ کا کہنا یہ تھا کہ مشترکہ نظم مستقل طور پر نبھنا مشکل ہوتا ہے ۔ خصوصاً جب کہ تمہارے گھر میں تمہاری اہلیہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے ۔ اور انہیں اپنے والدین کے ہاں بھی جانا پڑتا ہے ۔ پھر مجھے صرف کھانے کی ضرورت نہیں ہے ۔ میرے لئے ملازم رکھنا تو بہرحال ناگزیر ہے ۔ وہی کھانا بھی پکا سکتا ہے ۔ پھر آخر کار اس چیز پر انہوں نے خود ہی رضامندی ظاہر فرمائی ۔ کہ ہفتہ میں ایک روز تمہارے ہاں کھانا کھایا کروں ۔ اور جب کبھی کوئی خاص چیز کھانے کو طبیعت چاہا کرے تو بے تکلف پکوا لیا کروں ۔'

بہرحال مجھے بھی اس پر قانع ہونا پڑا ۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ سلسلہ آخر تک قائم رہا ۔ راولپنڈی منتقل ہو جانے کے بعد اگرچہ ہمارا گھر دار العروبہ سے فاصلہ پر تھا اور بھائی جان کا قیام دار العروبہ ہی میں رہتا تھا ۔ بھائی جان مسجد اہلحدیث میں جمعہ کی نماز پڑھتے ۔ اسی کے راستہ میں ہمارا مکان ہوتا ۔ جمعہ سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہمارے ہاں تشریف لاتے ۔ وہیں کھانا کھاتے اور آرام فرماتے ۔ بسا اوقات جمعہ کا غسل بھی وہیں فرماتے ۔ جب طبیعت خراب ہوتی ۔ اور مسجد اہل حدیث کی بجائے محلہ ہی کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھتے تو ہمیں کھانا دار العروبہ لے کر پہنچ جاتا ۔ کبھی کبھی شام

کو بھی تشریف لاتے۔ بعض اوقات اگر میں گھر پر موجود نہ ہوتا تو دروازہ کھٹکھٹا کر میری اہلیہ اور بچی سے حال دریافت کرتے اور واپس تشریف لے جاتے۔

۲۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو میری بچی کی پیدائش ہوئی۔ اس وقت بھائی جان ڈیڑھ ماہ سے سخت بیمار تھے۔ راولپنڈی کی سخت سردی لیکن جونہی میں نے صبح دارالعروبہ جاکر بھائی جان کو اطلاع دی۔ فوراً میرے ساتھ گھر آنے کو تیار ہوگئے۔ تانگے میں تشریف لائے اور بچی کے کان میں اذان دی عقیقہ کے روز مجھے دس روپے گوشت کے علاوہ مٹھائی تقسیم کرنے کے لئے دیئے۔ بچی کا نام خود اسماء تجویز فرمایا۔

گوجرانوالہ سے راولپنڈی منتقل ہو جانے کے بعد دارالعروبہ سے ہمارا مکان دور ہونے کی وجہ سے مجھے دو چیزوں کی محرومی ہوگئی۔ ایک تو مغرب کے بعد بھائی جان کی صحبتوں سے اور دوسرے صبح کی نماز کے بعد بھائی جان کو قرآن سنانے سے۔ مغرب کے بعد کی صحبتوں سے قطعی محرومی تو نہیں ہوئی۔ لیکن ان میں ناغہ ہونے لگا۔ بھائی جان کا یہ معمول تھا کہ دن بھر تو ہم بھی مصروف رہتے اور وہ بھی مصروف رہتے۔ اس لئے کوئی خاص بات چیت نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن مغرب اور عشاء کے درمیان کوئی کام نہ ہوتا۔ یہ وقت باہمی نشست اور گفتگو کے لئے مخصوص ہوتا۔ میں نے بھائی جان کا یہ معمول جالندھر سے لے کر راولپنڈی میں آخر تک دیکھا۔ البتہ سردی کے موسم میں جب دارالعروبہ کا کام زیادہ ہوتا۔ تو یہ وقت ترجموں کی تصحیح میں صرف ہوتا۔

ہمارا بھائی جان سے استفادہ کا اصل وقت مغرب و عشاء کے درمیان کی یہی نشست تھی۔ اس میں مختلف موضوعوں پر گفتگو رہتی۔ اندرون و بیرون ملک کی سیاسیات پر بھی گفتگو ہوتی۔ جماعتی امور پر بھی بات چیت ہوتی علمی و ادبی مسائل بھی چھڑتے۔ احباب اور ملنے والوں کا بھی ذکر و تعارف ہوتا۔ خاندانی اور ذاتی مسائل بھی بیان ہوتے۔ ہم میں سے کسی کو کوئی مشورہ لینا ہوتا تو اس کا بھی یہی وقت تھا۔

بھائی جان کی یہ صحبتیں بہت ہی دلچسپ اور مفید تھیں۔ اور بعض اوقات بہت لمبی ہو جاتیں۔ مگر اٹھنے کو طبیعت پھر بھی نہ چاہتی۔ گھڑی ہی اشارتی تو اٹھاتی۔ سیاسیات میں بھائی جان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ دراصل سیاسیات ان کا خاص موضوع تھا۔ بچپن ہی سے اخبار کے مطالعہ کا شوق رہا۔ سیاست میں عملی حصہ بھی لیا۔ جماعت اسلامی میں آنے سے پہلے کانگرس کے حامی اور سرگرم کارکن رہے۔ اگرچہ اس کے باضابطہ ممبر شاید کبھی نہیں رہے۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے سیاسی نقطہ نظر سے عربی اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۹۲۷ء سے سٹیٹس مین کا پابندی سے مطالعہ جاری رہا۔ اور اس کا ناغہ صرف ان ہی حالات میں ہوا جب کہ یہ اخبار مل ہی نہ سکتا ہو۔ کسی دوسرے اردو یا انگریزی اخبار سے بھائی جان کی طبیعت سیر ہی نہ ہوتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد اگرچہ یہاں کے حالات سے واقفیت کے لئے کوئی نہ کوئی اردو یا انگریزی اخبار بھی پڑھتے لیکن سٹیٹس مین کے مطالعہ میں کبھی ناغہ نہ ہونے دیا۔ اس کے اکثر مضامین اور افتتاحیے نہایت غور اور پابندی سے وقت لگا کر پڑھتے۔ جب کبھی پاکستان اور ہندوستان کی سیاست پر بحث کرتے۔ تو ایسا معلوم ہوتا کہ سیاسی لیڈر کے ذاتی و خاندانی حالات کا انہیں پورا علم ہے۔ یہی حال ان کی عرب ممالک کی تاریخ و سیاست سے واقفیت کا تھا۔

اپنے احباب کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے۔ ان کے ایک ایک دوست اور ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور تاریخ کا ہمیں پورا علم ہوتا ایک چیز جو بھائی جان کے احباب کے ذکر میں خاص ہوتی وہ یہ کہ ہمارے دلوں میں ان کے احباب کے لئے اسی طرح عزت و احترام کا جذبہ پیدا ہوتا جس طرح ہم خود بھائی جان کی عزت و احترام کرتے تھے۔ اپنے احباب میں سب سے زیادہ مولانا علی میاں، مولانا محمد ناظم صاحب، مولانا ابواللیث صاحب ... کا ذکر کرتے۔ خاص طور پر مولانا علی میاں کا تو بہت ہی زیادہ اور نہایت ہی محبت و پیار سے ذکر کرتے۔ فرماتے کہ میں جب کبھی علی میاں کو خط لکھتا ہوں۔ تو بے اختیار اس میں پیار و محبت کے الفاظ آ جاتے ہیں۔ فرماتے کہ میں نے آج تک علی میاں سے بڑھ کر کسی کو صحیح معنوں میں ... اور متقی نہیں دیکھا۔ ندوہ کے زمانہ میں جب کبھی ہماری مجلس میں کسی کی چغلی ہونے لگتی۔ تو وہ اٹھ کر چلے جاتے۔ گرم گرم مجلسوں میں جب مسجد سے اذان کی آواز آتی اور کسی کا دل اٹھنے کو نہ چاہتا تو ایک السلام علیکم کی آواز آتی۔ دیکھتے تو علی میاں مسجد جا رہے ہیں۔

یہ واقعہ بھائی جان نے ہم سے بارہا بیان کیا کہ ندوہ کے زمانے میں ایک مرتبہ علی میاں مجھ پر بہت اصرار کرنے لگے کہ کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لوں، مگر میں اس کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔ ایک دن جو انہوں نے بہت تنگ کیا۔ تو میں نے ہاں کر لی۔ علی میاں بہت خوش ہوئے اور پوچھنے لگے کہ کس کے ہاتھ پر؟ میں نے جواب دیا کہ آپ کے! کیونکہ جن لوگوں کے ہاتھ پر آپ مجھ سے بیعت کرانا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو میں آپ سے زیادہ متقی نہیں سمجھتا۔ یہ سن کر علی میاں لاحول پڑھنے لگے۔

اساتذہ میں سے بھائی جان کو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اور ہلالی صاحب مدظلہ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ ہلالی صاحب دوسری جنگ عظیم سے پہلے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لئے جرمنی چلے گئے تھے۔ جب جنگ ختم ہوئی تو کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں؟ مجھے یاد ہے کہ جالندھر کے زمانہ میں ایک دن یکایک بھائی جان کو ایک عربی پرچہ "الفتح" میں سے ہلالی صاحب کی تطوان (مراکش) میں موجودگی کا علم ہوا۔ تو بے ساختہ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ فوراً سجدہ میں گر پڑے اور بہت روئے۔ محبت کے ساتھ ساتھ اس چیز میں بھائی جان کی اس طبیعت کو بھی بڑا دخل تھا کہ وہ کسی احسان کرنے والے کا احسان فراموش نہ کرتے تھے۔ سید صاحب اور ہلالی صاحب کے احسانات کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ فرماتے کہ ہلالی صاحب اگرچہ ایک سیدھے سادے آدمی ہیں لیکن دنیا دیکھے ہوئے ہیں۔ ان سے میں نے صرف عربی زبان ہی نہیں سیکھی، بہت سی چیزیں سیکھی ہیں۔

بھائی جان کو قرآن پڑھنے اور سننے سے بڑی دلچسپی تھی فرماتے کہ مجھ پر ایسے ایسے غم کی گھڑیاں آئی ہیں جن میں صرف قرآن کی تلاوت ہی سے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا رہا ہوں۔ مشاہدہ ہے کہ جب کبھی بھائی جان کی طبیعت بہت خراب ہوئی تو وہ مجھے قرآن پڑھنے کا حکم دیتے۔ قرآن سنتے سنتے ہی کافی سکون محسوس کرنے لگتے اور کبھی تکلیف کی وجہ سے انہیں نیند نہ آتی تو نیند آنے لگتی۔

میں پہلے پہل جب جالندھر آیا تو مجھے قرآن کے چار ساڑھے چار پارے زبانی یاد تھے۔ بھائی جان کو جب معلوم ہوا تو مزید پارے یاد کرنے کی ترغیب دی۔ رمضان آتے آتے مجھے گیارہ پارے یاد ہو گئے۔ پھر نہ صرف اس رمضان بلکہ بعد میں کسی رمضان میں انہوں نے مجھے اپنے سے جدا ہونے نہیں دیا۔ بڑی پابندی اور شوق سے میرے ساتھ تراویح پڑھتے۔ صرف دو سال رمضان میں ہم ایک دوسرے سے جدا رہے۔ ایک آخری رمضان جب کہ بھائی جان جیل میں تھے اور ایک اس سے پہلے ۱۹۵۰ء میں، اگرچہ اس رمضان میں صرف نصف رمضان ان سے جدا رہا۔ میں کئی سال سے اپنے گھر (مالیر کوٹلہ) نہیں گیا تھا۔ اور جانے کے لئے پرمٹ کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے جب پرمٹ ملا۔ تو صرف بارہ تیرہ روز کا اور وہ بھی ۵ر جون سے ۱۰ر جون تک ان ہی تاریخوں میں رمضان شروع ہو رہا تھا۔ جب میں نے پرمٹ ملنے پر بھائی جان کو لاہور سے خط لکھا۔ تو جواب میں انہوں نے مجھے لکھا۔

"بہرحال جو ہوا، اچھا ہوا۔ افسوس کہ اتنی دوڑ دھوپ کے باوجود صرف بارہ تیرہ روز ملیں گے۔ اس رنج کے ساتھ اتنی تسکین بھی ہے۔ کہ رمضان کے آخری دو ہفتے قرآن سن سکوں گا۔"

جالندھر کے زمانہ سے لے کر گوجرانوالہ کے زمانہ تک میں پابندی سے صبح کی نماز کے بعد بھائی جان کے سامنے ایک پارہ کی تلاوت کرتا۔ بھائی جان بھی تمام کام چھوڑ کر نہایت توجہ سے میری تلاوت کو سنتے۔ جہاں کہیں تلفظ یا لہجہ کی غلطی ہوتی تو فوراً ٹوکتے اور تصحیح فرماتے۔ اس چیز نے مجھے اپنا عربی تلفظ اور لہجہ درست کرنے میں بڑی مدد دی۔

صبح کی تلاوت کا یہ سلسلہ گوجرانوالہ کے زمانہ تک تو پابندی سے جاری رہا لیکن راولپنڈی آنے کے بعد دار العروبہ سے ہمارے رہائشی مکان کی دوری کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر بھی جب میں گھر میں اکیلا ہوتا یعنی گھر والے گوجرانوالہ آئے ہوتے تو میں دار العروبہ میں بھائی جان کے پاس سوتا اور صبح کے وقت ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتا۔

جون ۱۹۵۱ء سے ۲۰ر مارچ ۱۹۵۳ء کا پورا عرصہ تقریباً کسی خاص واقعہ کے بغیر ہی گذرا۔ اس زمانے میں میں نے بعض جماعتی کتابوں کا ترجمہ کیا

ان میں سے بھائی جان نے منشور جماعت اسلامی، تحریک اسلامی کی بنیادیں، دو دستوری خاکے، ۲۲ علماء کے ۲۲ نکات، مولانا مودودی کی کراچی کے اجتماع عام میں اختتامی تقریر اور بعض دوسری کتابوں کے ترجمہ کی تصحیح فرمائی۔ مجھ سے بعض ایسے خطوط بھی لکھوائے۔ جو بعض عربی رسالوں میں مضمون یا نوٹ کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس زمانہ میں دارالعروبہ کا اکثر کام بھائی جان نے میرے ہی سپرد کر دیا۔ خود بھائی جان نے اس عرصہ میں اپنی کتاب "تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند و پاکستان" مکمل کی۔ "نظرۃ اجمالیہ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند و پاکستان" کے نام سے اس کا خلاصہ لکھا۔ پھر "بردہ" کا ترجمہ شروع کیا۔ ابھی اس کا پہلا باب بھی مکمل نہ کر پائے تھے کہ ۲۸ مارچ ۵۳ء کی صبح گرفتاری ہو گئی۔

اس وقت بھائی جان کی طبیعت تقریباً ایک ماہ سے سخت خراب تھی۔ سردی کم ہو جانے کے باوجود صبح کے وقت باسانی بستر سے اٹھ نہ سکتے تھے۔ خصوصاً جس صبح گرفتاری ہوئی۔ اس رات تو انہیں سخت دورہ پڑا تھا۔ لیکن جب صبح کے وقت پولیس والے لینے آئے۔ تو پورے حوصلے اور ہمت سے ان کے ساتھ ہو لئے۔ گرفتاری کے وقت میں اپنے گھر میں تھا۔ ملازم نے سورج نکلنے کے وقت مجھے آکر اطلاع دی۔ ہم لوگ بھائی جان اور غازی صاحب کا سامان لے کر جیل پہنچے۔ تھوڑی دیر میں پولیس کی ایک گاڑی میں یہ لوگ تشریف لائے۔ بھائی جان کے چہرے پر حد درجہ سکون و اطمینان نمایاں تھا۔ اس کے بعد بھائی جان اور غازی صاحب تقریباً سوا چار ماہ جیل میں رہے۔ جیل میں نظر بندوں سے صرف ان کے قریبی رشتہ دار ہی مل سکتے تھے بھائی جان سے میرے تعلقات سگے بھائیوں سے زیادہ، مگر قانون کی نگاہ میں ان کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ میرے لئے وہ گھڑی حد درجہ تکلیف دہ ہوتی جب مجھ سے کوئی یہ دریافت کرتا کہ مسعود عالم صاحب تمہارے کیا لگتے ہیں؟ اگر میں کسی کو جواب دیتا کہ "بھائی" تو اس سے بڑھ کر تکلیف دہ سوال یہ ہوتا "سگے بھائی؟"

چنانچہ ملاقات کے لئے درخواست لکھتے وقت مجھے یہی دقت پیش آئی۔ مجبوراً مجھے اپنے آپ کو بھائی جان کا "شاگرد اور ذاتی معاون" لکھنا پڑا۔ لیکن اس سے پولیس والے مطمئن نہ ہوئے۔ لیکن جب میں نے راولپنڈی کے ججوں کو بتایا۔ کہ بھائی جان کا یہاں کوئی رشتہ دار سرے سے ہے ہی نہیں۔ تو انہوں نے مجھے ملاقات کی اجازت دے دی۔

ہر چودہ دن کے بعد ایک نظر بند سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ میں بھائی جان کی ملاقات کے لئے جاتا اور غازی صاحب کے صاحبزادے ان کی ملاقات کے لئے۔ اب ہم نے آپس میں یہ طے کر لیا۔ کہ ایک ہفتہ میں بھائی جان سے ملاقات کروں اور دوسرے ہفتہ وہ غازی صاحب سے۔ اس طرح گویا ہماری ہر ہفتہ ملاقات ہو جاتی تھی۔ ضرورت کی تمام چیزیں ہم پہنچاتے۔ غازی صاحب اور بھائی جان کو خود کھانا پکانے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔ اس لئے ہم ہر ہفتہ انہیں تازہ سبزیاں، مسالے اور گھی وغیرہ بھی پہنچاتے۔ دھوبی سے دھلوانے کے لئے کپڑے ان سے لے آتے اور آئندہ ہفتہ دھلوا کر واپس دے آتے۔ اس لحاظ سے ہمارا خیال ہے۔ کہ راولپنڈی جیل میں جتنی سہولت بھائی جان اور غازی صاحب کو رہی۔ اتنی شاید کسی دوسری جیل میں ہمارے کسی رفیق کو نہ رہی ہو۔ خود جیل کی جو تکلیفیں تھیں۔ ان کا کوئی علاج نہ تھا۔ بھائی جان گھر میں چارپائی پر سونے کے عادی اور وہ بھی اس طرح کہ جب تک سونے سے پہلے ان کا جسم نہ دابا جائے انہیں نیند نہ آتی۔ سوتے میں کہیں ذرا سا شور یا روشنی ہو جاتی۔ تو ان کی آنکھ کھل جاتی۔ پھر کھانے میں یہ پرہیز کہ اگر کہیں سرخ مرچ یا خراب گھی استعمال ہو جاتے۔ تو طبیعت سخت ناساز ہو جاتی۔ مگر جیل میں بھائی جان کو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑا۔

زمین پر اور پھر وہ بھی پختہ فرش پر نہیں بلکہ ناہموار کچی مرطوب زمین پر سونا پڑا۔ جیل میں کھانے کا جو نظم ہو سکتا تھا وہ تو ظاہر ہے۔ مگر جب میں ان کی ملاقات کے لئے جاتا۔ تو اگرچہ ان کے چہرے اور جسم پر تھکان کے آثار ہوتے، مگر ثابت قدمی، استقلال اور راہ حق میں ہر تکلیف کو برداشت کرنے کے آثار بھی نمایاں ہوتے۔ سچ ہے زندگی میں اصول سے محبت بڑی انمول چیز ہے۔ مجھے بھائی جان کی تکلیف کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا۔ اور بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ میں بھائی جان کو صبر و ہمت کیا دلاتا، وہ الٹا مجھے صبر دلاتے، اور دارالعروبہ کے کاموں کو ذمہ داری و محنت سے کرتے رہنے [illegible] تقریباً ہر دس پندرہ روز کے بعد خط لکھتے۔

بھائی جان کی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جو شخص ایک مرتبہ ان کی صحبت میں بیٹھ جاتا تا ان کا معتقد، جو عقیدت مند اور گرویدہ ہو جاتا۔ اور زیادہ دن نہ گذرتے کہ اپنے انتہائی ذاتی معاملات تک میں ان سے مشورہ لینے لگتا۔ جیل کے زمانہ میں بھی گجرات کے چند نوجوان (جو جماعت اسلامی کے ہمدرد یا بھی تھے) ان کے اس قدر گرویدہ و معتقد ہو گئے کہ جیل کے اندر بھائی جان کو اپنی صحت کے سلسلہ میں جن خدمات کی ضرورت تھی۔ وہ لوگ خود ہی بڑھ کر ان سے پورا کرنے لگے۔ بھائی جان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی۔ کہ وہ کسی کا احسان نہ بھولتے تھے۔ جیل سے آنے کے بعد ہمیشہ ان لوگوں کو یاد کرتے اور جب ان کی رہائی ہوئی۔ اور بھائی جان کو کبھی لاہور وغیرہ آنا ہوتا تو آتے یا جاتے چند گھنٹوں کے لئے ضرور گجرات اترتے اور ان لوگوں سے ملاقات کرتے۔

جن دنوں بھائی جان جیل میں تھے۔ مجھے دارالعروبہ کا کام بڑی ہی محنت اور ذمہ داری سے کرنا پڑا۔ شاید آئندہ مجھ پر جو مستقل طور پر بار پڑنے والا تھا۔ ان دنوں اسے برداشت کرنے کی مشق کرائی گئی ہو۔ اب تک میں نے اردو سے عربی میں ترجمہ تو کیا تھا۔ مگر خود مضمون لکھنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ ان دنوں میں نے بعض لمبے لمبے مضامین بھی لکھے اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ اگر میں یہ کام کروں تو شاید جلدی ہی اس میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ ان ہی دنوں میں نے "قادیانی مسئلہ" کا ترجمہ کیا اور باہر چھپنے کے لئے بھیجا۔ جب وہ رسالہ میں چھپ کر آیا۔ میں نے وہ رسالہ بھائی جان کے پاس جیل بھیج دیا۔ بھائی جان ترجمہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور جب میں ان سے آئندہ مرتبہ ملنے گیا۔ تو بڑی ہی شاباش دی۔ بھائی جان نے میری اس طرح تعریف اس سے پہلے کبھی نہ کی تھی۔ وہ میری ہر تحریر یا ترجمہ دیکھ کر اس پر تنقید ہی کرتے یا زیادہ سے زیادہ خاموش رہتے۔ پھر بھائی جان کی تنقید بھی اس قدر سخت ہوتی کہ بارہا میں نے شکستہ دل ہو کر اس کام کو چھوڑ کر اپنے گھر واپس چلے جانے یا کوئی دوسری نوعیت کا کام اختیار کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ میری تعریف دوسروں کے سامنے تو کبھی کی ہو۔ لیکن میرے سامنے کبھی نہیں کی۔ اس مرتبہ بہت زیادہ تعریف کی۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ فرمایا کہ تم میری اس تعریف سے بُرا اثر نہ لینا۔ اللہ کا شکر کرو اور محنت کرتے رہو۔ بھائی جان کی تعریف سے ہم لوگ کبھی خوش نہ ہوتے تھے۔ اپنی کامیابی پر ایک فطری خوشی جو انسان کو بہرحال ہو ہی جاتی ہے۔ اسے بھی اپنے چہرے پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔ کیونکہ ہم ہمیشہ ڈرتے ہی رہتے تھے۔ کہ اگر آج تعریف کر رہے ہیں۔ اور کل لکھنے میں کوئی غلطی ہو گئی تو تمام قرضہ معہ سود وصول کر لیا جائے گا۔

بھائی جان کے جیل جانے کے بعد ہم نے دارالعروبہ کا مکان عارضی طور پر خالی کر دیا تھا۔ اور تمام کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا ضروری سامان میرے گھر ہی میں آ گیا تھا۔ اور وہیں کام شروع ہونے لگا تھا۔ ۲ر اگست ۱۹۵۵ء کی دوپہر کو میں اپنے ایک کام سے بازار آیا۔ تو دیکھا کہ بھائی جان اور قاضی صاحب ایک تانگہ میں اپنا سامان رکھے آ رہے ہیں۔ انہیں یک لخت دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ معلوم ہوا کہ آج یکا یک رہائی کے احکام آ گئے۔ بھائی جان نے جیل میں اس قدر صبر و استقلال سے کام لیا کہ اللہ کے ہاں اجر کے مستحق ہو گئے۔ رمضان میں پورا ماہ پابندی سے تراویح پڑھتے رہے۔ اور وہ بھی کھڑے ہو کر۔ بعض روز بلکہ اکثر روز حافظ صاحب تراویح میں پانچ پانچ چھ چھ پارے پڑھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا جیل جانا اور وہاں کی تمام سختیوں کو ہمت و جوانمردی سے برداشت کرنا کمزوروں اور بیماروں پر بھی اتمام حجت ہے۔

دارالعروبہ کا مکان فوری خالی نہیں ہو سکتا تھا۔ جن لوگوں کو ہم نے یہ مکان دیا تھا ان سے یہ طے کیا تھا۔ کہ ہم ایک ماہ پہلے انہیں مطلع کریں گے تب وہ مکان خالی کریں گے۔ لیکن مجھے اور بھائی جان کو کوئی فکر نہ تھی۔ میرے رہائشی مکان کے دو کمروں میں سے ایک میں ہم رہنے لگے۔ اور دوسرے میں بھائی جان۔ دونوں کمروں کے سامنے صحن تھا۔ اس میں ہم نے پردہ کر دیا۔ ملنے والے بھی اسی مکان میں آتے۔ شاید اگر میرے سوا کسی اور کا گھر ہوتا تو بھائی جان اس طریقہ سے وہاں رہنا کبھی برداشت نہ کرتے۔ اور میں بھی اگر بھائی جان کے سوا کوئی اور ہوتا۔ تو شاید اس طرح اسے اپنے ہاں نہ ٹھہرا سکتا۔

جیل سے واپس آنے کے بعد بھائی جان کئی روز تک ہمیں جیل کے حالات سناتے رہے۔ بھائی جان کی عادت تھی کہ جب کہیں ہم سے جدا ہوتے تو واپس آنے کے بعد ہمیں اپنے کاموں کی پوری تفصیل ہمارے کہے بغیر خود بخود بیان فرماتے۔

جیل سے آنے کے بعد بھائی جان کی عادتوں میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ فرماتے کہ جیل بڑی تربیت گاہ ہے۔ جیل جانے سے پہلے رات کو جب تک کوئی ان کا جسم نہ دباتا۔ انہیں نیند نہ آسکتی تھی۔ لیکن اب میرے سخت اصرار کے باوجود سوائے ایک دو راتوں کے مجھے کبھی اپنا جسم دبانے کی اجازت نہیں دی۔ اکثر فرماتے کہ اب میں آہستہ آہستہ کھانے میں سرخ مرچ کا بھی عادی نہوں گا۔

گھر میں جس طرح کا کھانا یا ناشتہ یا کوئی چیز جب چاہتے طلب فرمالیتے۔ بھائی جان کا میرے ساتھ یہ ایک "امتیازی سلوک" تھا۔ حالانکہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے بھائی جان "بخشش سو سو، حساب جو جو" کے قائل تھے۔ اور اس پر صحیح معنوں پر عامل تھے۔ دوسری طرف میں ان سے جو وہ مجھے دیتے، بلا تکلف ان سے لے لیتا۔ حالانکہ اس طرح کا معاملہ میں نے آج تک نہ کسی سے کیا ہے۔ اور نہ میری طبیعت اسے کسی طرح سے برداشت کر سکتی ہے۔ کسی کو اپنے ہاں مہمان رکھنا اور پھر اس سے کچھ قبول کرنا میرے لئے بالکل ہی ناقابل عمل بلکہ ناقابل تصوّر چیز ہے

بھائی جان مجھے اکثر فرماتے کہ اب میں تم سے معاملہ نہیں کرتا۔ میرا اصول یہی ہے کہ جب کسی شخص کو سمجھ لیتا ہوں تو اس سے معاملہ نہیں کرتا مجھے ہمیشہ "تم" لکھتے اور "تم" سے خطاب فرماتے۔ میں اگر کبھی دیکھتا کہ آج "تم" کے بجائے "آپ" کہہ رہے ہیں تو سمجھ لیتا کہ ناراض ہیں۔

بھائی جان کو جہاں میری تعلیم و تربیت، مالی حالت اور دوسری چیزوں کا خیال رہتا۔ وہاں میری صحت کا بھی بڑا ہی خیال رہتا تھا۔ فرماتے کہ مجھے اپنی بیماری دیکھ کر دوسروں کی صحت کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ بھائی جان کی عدم موجودگی میں مجھے دن رات کام بھی کرنا پڑا۔ اور پھر بعض ذاتی ضروریات کی وجہ سے کھانے پینے میں بھی کمی کرنا پڑی۔ اس کا میری صحت پر برا اثر پڑا۔ جب بھائی جان تشریف لائے اور انہوں نے میری حالت دیکھی تو سخت رنج و افسوس کا اظہار فرمایا۔ مجھے زبردستی روپے دیئے۔ کہ ان کا میری طرف سے دودھ پیو۔ حالانکہ میں نے بارہا عرض کیا۔ کہ میں خود اپنی غذا درست کرونگا۔ اور صحت کی فکر کروں گا۔ مگر بھائی جان یہ روپے دے کر ہی رہے۔ پھر اسی طرح ستمبر اور اکتوبر میں بھی دس دس روپے مجھے زبردستی دیئے۔

۲۰ر دسمبر کو دار العروبہ کے اصل مکان میں منتقل ہوئے۔ ڈیڑھ ماہ ہمارے ہاں رہے تو میری بچی ان سے بہت زیادہ مانوس ہوگئی اور انہیں "بڑے آبا جان" کہہ کر پکارتی۔ بھائی جان بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اور اپنے فارغ اوقات میں اسے خود اپنے پاس بلاتے دار العروبہ کے مکان میں آجانے کے بعد بھی اسے بلایا کرتے۔ فرماتے کہ میں نے صرف دو ہی بچوں سے پیار کیا ہے۔ ایک اس سے اور ایک اپنی بڑی بھانجی سے۔

جیل سے آتے وقت تو بھائی جان کی صحت اچھی تھی۔ لیکن اب جو آرام و سکون حاصل ہوا تو جیل کی تکالیف کا ردّ عمل شروع ہوا۔ اور طبیعت کافی خراب ہوگئی۔ میرے ترجموں میں صرف قادیانی مسئلہ تصحیح کر سکے۔ تحقیقاتی عدالت میں مولانا مودودی کے پہلے بیان کے ترجمہ پر صرف سرسری نظر ڈال سکے۔

۸ار اکتوبر کو میں اپنے گھر مالیر کوٹلہ گیا۔ تو بعد میں بھائی جان کی طبیعت بڑی ہی خراب ہوگئی۔ بعض روز تو بے ہوشی کے بھی دورے پڑے ان دنوں ان کے پاس ہمارے رفیق محمد افضل لقمانی صاحب تھے۔ انہوں نے بڑی خدمت کی۔ بھائی جان ہمیشہ ان کی اس خدمت کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ۲۴ر نومبر کو میں واپس راولپنڈی آیا۔ میں آتو پہلے ہی جاتا۔ مگر مجھے اطلاع بالکل آخر میں ہوسکی۔ جب میں راولپنڈی واپس پہنچا تو بھائی جان کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔

اب کی مرتبہ پھر بھائی جان کا ارادہ مصر و شام جانے کا ہوگیا تھا۔ طے یہ تھا۔ کہ بھائی جان کے ساتھ میرے علاوہ کوئی دوسرے رفیق جائیں گے۔ کیونکہ بھائی جان چاہتے تھے۔ کہ ایک تو دار العروبہ کا کام بھی چلتا رہے۔ دوسرے میرے علاوہ کسی دوسرے رفیق کو بھی عربی بولنے اور لکھنے کی مشق ہو جائے۔ میں خود بھی اردو سے عربی ترجمہ کرتے کرتے اور خطوط کا جواب دیتے دیتے تنگ گیا تھا۔ چاہتا تھا کہ کچھ مدت سکون سے مطالعہ

کرنے کے لئے ملے۔ لیکن بھائی جان چاہتے کہ کوئی ایسا رفیق ساتھ جائے۔ جو آئندہ مستقل طور پر دارالعروبہ رہنے اور کام کرنے کا عزم رکھتا ہو۔ لیکن جب کوئی ایسا رفیق نہ ملا۔ تو بالآخر یہی طے ہوا۔ کہ میں ہی ساتھ چلوں۔ دسمبر میں بھائی جان اور میں سلطان احمد صاحب (جو ان دنوں امیر جماعت تھے) سے مشورہ کرنے کے لئے کراچی گئے۔ لیکن اس سفر میں میری بعض کوتاہیوں کی وجہ سے بھائی جان کو یہ محسوس ہوا کہ دارالعروبہ کا کام بہرحال چلتے رہنا ضروری ہے۔ اور یہ کہ اگر سفر میں ان کے ساتھ میرے بجائے افضل صاحب ہوں تو انہیں زیادہ آسانی رہے گی۔

میں نے جب بھائی جان کا یہ جذبہ محسوس کیا تو خود ہی ساتھ جانے کے ارادے سے دستبردار ہوگیا۔ کیونکہ میں تو صرف بھائی جان ہی کے آرام و آسانی کے خیال سے جانا چاہتا تھا۔ ورنہ میری خواہش تو یہی تھی کہ مجھے چند ماہ سکون سے مطالعہ کرنے کا موقع ملے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ بھائی جان مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تیار تھے۔ مگر میں نے اسی پر اطمینان ظاہر کیا کہ وہ مجھے یہیں چھوڑ کر کسی اور کو اپنے ساتھ لے جائیں مجھے ڈر تھا کہ اس چیز سے بھائی جان کے دل پر بُرا اثر نہ پڑے۔ مگر بھائی جان میں انتہائی ترفع اور بے نیازی تھی۔ انہوں نے اس سے کوئی بُرا اثر نہیں لیا۔ بلکہ پھر دو تین ماہ تک جب تک راولپنڈی میں رہے مجھے بعد میں تنہا رہ کر مطالعہ کرنے کے متعلق مشورے دیتے رہے۔

دسمبر کے آخر میں کراچی سے راولپنڈی واپسی ہوئی۔ طے یہ تھا کہ بھائی جان آئندہ مارچ میں کراچی روانہ ہو جائیں گے۔ اور وہاں اپنے پاسپورٹ میں توسیع کی کوشش کریں گے۔ بھائی جان کے پاس مصر، شام، عراق اور سعودی عرب وغیرہ کا پاسپورٹ تو موجود تھا۔ مگر اس کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ اس لئے اس میں توسیع کرانا ضروری تھی۔

اب بھائی جان نے سفر کی دن رات تیاری شروع کی۔ مجھے بھی بعض کتابوں کا ترجمہ مکمل کرنے میں دن رات مصروف کیا۔ مغرب کے بعد ترجموں کی تصحیح فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھائی جان نے "مسلمانوں کا ماضی اور حال اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل" کے ترجمہ کی تصحیح کی پھر رسالہ دینیات کے ترجمہ کی تصحیح بھی شروع کی۔ مگر وقت کم ہونے کی وجہ سے ایک باب سے زیادہ کی تصحیح نہ ہوسکی۔ رسالہ دینیات کے ترجمہ سے بھائی جان بہت خوش ہوئے۔ ایک دن ترجمہ سن کر معمول سے زیادہ خوش ہوئے اور فرمایا "لوکان ابوک رجلاً عالماً لصنفہ بنجاحک" پھر فرمایا کہ اب باقی کتاب کے ترجمہ پر تم خود ہی نظر ثانی کر کے مسودہ میرے پاس کراچی یا جہاں میں ہوں بھیج دینا۔ ایک دن فرمایا کہ ہمارے معیار سے تم ترجمہ کرنے میں بالکل کامیاب ہو چکے ہو۔ لیکن تم نے خود لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اب خود لکھنے کی بھی کوشش کرو۔

یکم مارچ کو راولپنڈی سے کراچی روانہ ہوئے۔ مجھے بھی اپنے گھر مالیر کوٹلہ جانا تھا۔ بھائی جان نے فرمایا کہ تم ابھی اپنے گھر ہو آؤ۔ اس لئے کہ اگر ہم لوگ سفر پر چلے گئے تو تم دارالعروبہ میں تنہا رہ جاؤ گے۔ اور تمہارا دارالعروبہ کو ایک دن کیلئے بھی چھوڑنا مشکل ہو جائے گا۔

اب کی مرتبہ بھائی جان کی طبیعت اچھی تھی۔ اس لئے انہوں نے تنہا سفر کرنے پر اصرار کیا۔ مجھے گھر جانا تھا اور دارالعروبہ میں ایک آدمی کا رہنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے افضل صاحب کو دارالعروبہ میں چھوڑا۔ پروگرام یہ تھا کہ میں ۱۳، ۱۴ مارچ تک واپس راولپنڈی پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت افضل صاحب اپنے پاسپورٹ کے لئے اپنے وطن خان پور روانہ ہو جائیں گے۔ اور پھر پاسپورٹ ملنے پر کراچی پہنچ جائیں گے۔

راولپنڈی سے بھائی جان اور میں دونوں ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ ایک رات گوجرانوالہ میں ٹھہرتے ہوئے لاہور تک ہمارا ساتھ رہا۔ یہاں آکر میں مالیر کوٹلہ جانے کے لئے گاڑی سے اتر گیا۔ اور بھائی جان کراچی جانے کے لئے گاڑی میں بیٹھے رہے۔ اسٹیشن پر مرکز جماعت کے بہت سے رفقاء بھائی جان سے ملنے آئے تھے۔ کافی دیر تک ان سے گفتگو کرتے رہے۔ بھائی جان کو تنہا سفر کرتے دیکھ کر تمام لوگ ڈر رہے تھے۔ مگر خود بھائی جان مطمئن تھے۔ فرماتے: "دیکھو! اگر ملتان پہنچنے تک طبیعت میں اضمحلال معلوم ہوا۔ تو وہاں اتر جاؤنگا۔ ورنہ سیدھا چلا جاؤں گا۔"

یہ تھی بھائی جان سے میری آخری ملاقات کسی کو کیا معلوم کہ آج بھائی جان کراچی نہیں جا رہے بلکہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہیں۔ ایسے ہی موقعوں پر تمنا ہوتی ہے کہ کاش انسان کو بھی علم الغیب کا کچھ حصہ ملا ہوتا۔ آٹھ سال کے عرصہ میں بھائی جان نے جتنے سفر کئے ان میں میں ساتھ

[illegible] میرے علاوہ ۔ ان دو دوسرے رفقاء ساتھ تھے۔ ایسا سفر کوئی نہ تھا۔ جس میں بھائی جان تنہا ہوں۔ مگر افسوس! ہائے افسوس! [illegible] سفر ——— جس میں کوئی ساتھ نہ تھا۔ اپنی بدقسمتی اور نالائقی پر جتنا رووں کم ہے۔ بھائی جان! مجھے معاف فرمایئے! مجھے [illegible] آپ یوں جدا ہو رہے ہیں!!

[illegible] حسرت عمر بھر رہے گی!

میں ماہیر کوٹلہ پہنچا اور بھائی جان کراچی۔ کراچی سے انہوں نے مجھے اپنے بخیریت پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ جس سے بے حد اطمینان ہوا۔ ۱۰ مارچ کو میں واپس راولپنڈی پہنچا۔ تو ڈاک میں میرے نام سے بھائی جان کے دو خط آئے ہوئے تھے۔ ان میں اگرچہ انہوں نے اپنی طبیعت کے مضمحل ہونے کی اطلاع دی تھی۔ مگر ہمیں اس سے زیادہ تشویش نہ ہوئی۔ کیونکہ اس طرح کا اضمحلال بھائی جان کو اکثر ہو جایا کرتا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ———

"برادرم! سلمک اللہ۔ سلام و تحیات!

امید کہ تم بخیریت واپس آ چکے ہو گے۔ غالباً اہل و عیال تو گوجرانوالہ ہی ہوں گے۔ میں اچھا ہوں۔ لیکن بہت مضمحل۔ یہاں کا موسم بہت خراب ہے۔ اس آب و ہوا میں دمہ کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ پرانے مریض کا کیا حال ہوگا؟ الحمدللہ اب تک دوروں سے محفوظ ہوں۔ مگر سستی اور کاہلی بہت ہے۔ کوئی کام نہیں ہوتا۔ احتیاطاً اسلم صاحب رات کو یہیں ہوتے ہیں۔

امید ہے تم ہر طرح اچھے ہو گے ——— افضل صاحب اگر اس وقت تک ہوں تو ان سے کہو کہ فوراً بہاولپور چلے جائیں۔"

دوسرے خط میں لکھتے ہیں: ———

"برادرم! سلام مسنون!!

توقع ہے کہ اب تم بخیر و عافیت واپس آ گئے ہو گے۔ میرا سفر تو اچھی طرح کٹا۔ مگر یہاں کی آب و ہوا آج کل بہت خراب ہے۔ وہ دسمبر کی بات نہیں رہی۔ مہدی کا کام[1] تو غالباً آسانی سے اور جلد ہو جائے گا۔ ہفتہ عشرہ میں پتہ چلے گا۔ ۱۵ مارچ سے شوریٰ ہے اور شاید ۲۱/۲۲ تک جائے ہی میں "فیصلہ"[2] ہو گا۔ اگر فیصلہ فوری طور پر عدم سفر کا ہوا۔ تب تو فوراً واپس آ جاؤں گا۔ البتہ اگر سفر کے حق میں ہوا۔ جیسا کہ رجحان ہے تو اب تک طے نہیں کر سکا ہوں۔ افضل صاحب کا ایک مہینہ یہاں انتظار کروں یا بہاولپور یا پنڈی ہی چلا آؤں۔ ہر شکل میں کچھ نہ کچھ پریشانی ہے۔ یہاں سب سے بڑی تکلیف آب و ہوا کی ہے۔ بہرحال آئندہ جمعہ تک پھر لکھوں گا۔

اب تم عام طور پر جواب لکھ کر ہفتہ وار ڈاک بھیج دیا کرو۔ پیر کا دن مقرر کر لو۔ میں جمعہ کے دن لکھا کروں گا۔

امید کہ دلہن سلمہا اچھی ہوں گی۔ بیٹی بھی اچھی ہو گی۔ انشاء اللہ۔ اسے "بڑے ابا جان" کی دعا بھیج دینا۔" والسلام۔ عاجز مسعود عالم ندوی!

۱۷ مارچ کی صبح نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کسی نے دار العروبہ کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھولا تو حفیظ اللہ صاحب رکن جماعت اسلامی راولپنڈی [illegible] چہرہ اترا ہوا اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں سمجھا کہ کچھ مزید رفقاء کی گرفتاری ہو گئی۔ یا کوئی اور تکلیف دہ واقعہ پیش آ گیا۔ اصل وجہ ذہن میں [illegible] نہیں۔ لیکن جب انہوں نے بتایا کہ مولانا کا انتقال ہو گیا۔ کراچی سے رات ٹیلیفون آیا تھا۔ تو جسم پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ [illegible] بھی زبان سے نہ نکل سکا۔ کچھ دیر ویسے کا ویسا ہی کھڑا رہا۔ پھر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اگرچہ معلوم تھا کہ ۲۴ گھنٹوں کا سفر ہے اور ابھی پہلی گاڑی میں بھی کئی گھنٹے ہیں۔ اب کراچی جا کر کیا ہو سکتا ہے۔ مگر طبیعت نہ صرف یہ کہ

---

[1] پاسپورٹ کا کام۔ [2] مصر و شام کے سفر کے متعلق۔

مانی نہیں۔ بلکہ جن لوگوں نے اس طرح کا اشاروں اشاروں میں مشورہ بھی دیا۔ ان کی بات سے سخت جھنجھناہٹ پیدا ہوئی اور ایسا معلوم ہوا۔ کہ ان لوگوں کا دل محبت و احترام کے جذبات سے خالی ہے۔ راستے بھر گاڑی میں نہ کسی سے بات کرنے کو طبیعت چاہی نہ کچھ کھانے کو۔ اور نہ گاڑی سے نیچے اترنے کو۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات ابھرتے۔ اور حسرتیں آتیں۔ آٹھ سال کے تمام واقعات ایک ایک کرکے سامنے آتے رہے کبھی ذہن میں آتا کہ اس قسم کا حادثہ پیش نہیں آسکتا۔ میں نے خواب دیکھا ہے یا کسی نے غلط بات اڑا دی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ خیال آجاتا کہ کسی کو غلط بات اڑا دینے سے کیا فائدہ؟ آخر کراچی والوں نے ٹیلیفون یونہی کردیا؟ اخبارات نے بلاوجہ یہ خبر شائع کردی؟ الغرض عجیب حالت تھی جس کا اندازہ ان ہی لوگوں کو ہوسکتا ہے جنہیں کبھی اس قسم کا حادثہ پیش آیا ہو۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا جو مجھے یکایک پہنچا۔

یوں تو بہت سی چیزوں کا خیال آتا۔ کبھی سوچتا کہ اب دارالعروبہ کا کام کیسے چلے گا؟ دارالعروبہ راولپنڈی ہی میں رہے گا یا کہیں اور منتقل ہو جائے گا؟ بھائی جان کے بعد دارالعروبہ کا سرپرست اور نگراں کون ہوگا؟ آیا میں کسی اور سے مل کر کام بھی کرسکونگا یا نہیں! وغیرہ وغیرہ!

لیکن ان تمام سے بڑھ کر مجھے بھائی جان کے بوڑھے والد صاحب (اللہ ان کی عمر دراز کرے) کا خیال آتا۔ بیچاروں پر کیا گذری ہوگی؟ بھائی جان کی ان سے آخری ملاقات مارچ یا اپریل ۴۶ء میں ہوئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد بھائی جان ان سے ملنے کے لئے پاسپورٹ کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ لیکن ہماری مہربان حکومت کو ان کا پاکستان چھوڑ کر ہندوستان جانا کسی قیمت گوارا نہ ہوا۔ والد صاحب ملاقات کے لئے ہمیشہ بلاتے رہے۔ دوستوں کے بھی بھائی جان کے نام خطوط آتے کہ والد صاحب سے آکر ضرور مل جائیں۔ جب کوئی ایسا خط آتا۔ بھائی جان آہ بھر لینے کے سوا کچھ نہ کرسکے۔ والد صاحب کا ذکر آتے ہی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے۔ مگر پاسپورٹ تھا کہ بننے ہی میں نہ آتا تھا۔ اب کی مرتبہ کراچی جاتے وقت بھائی جان کا پختہ ارادہ تھا۔ کہ اگر بین الاقوامی پاسپورٹ کی توسیع نہ ہوئی۔ یا اس میں دیر ہوئی۔ تو کراچی سے ہندوستان کا پاسپورٹ لے کر وہیں سے والد صاحب کی ملاقات کے لئے ہندوستان چلے جائیں گے۔ کیونکہ سنا تھا۔ کہ کراچی میں دوسرے شہروں کی نسبت ہندوستان کا پاسپورٹ آسانی سے بن جاتا ہے۔ ورنہ مصر و شام کے سفر کے بعد اپنے بین الاقوامی پاسپورٹ ہی پر ہندوستان کا اضافہ کرکے والد صاحب سے ملنے جائیں گے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

۱۸ مارچ کی رات کراچی پہنچا۔ سٹیشن سے اترتے ہی پیر الٰہی بخش کالونی گیا۔ کیونکہ خیال تھا کہ شوریٰ وہیں ہو رہی ہوگی اور تمام لوگ وہیں مل سکیں گے۔ مگر وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ شوریٰ کل سے یہاں کی بجائے کشمیر ہوٹل میں ہو رہی ہے۔ رات سلطان صاحب ہی کے ہاں رہا۔ اب تک اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ مگر سلطان صاحب کا وہ کمرہ دیکھ کر صبر برقرار نہ رہ سکا۔ جس میں کراچی آکر بارہا بھائی جان کے ساتھ قیام کر چکا تھا۔ اور جس میں آخری مرتبہ بھائی جان کا قیام رہا تھا۔

اگلے روز صبح کشمیر ہوٹل پہنچا۔ ایک کمرے میں تمام ارکان شوریٰ کا قیام تھا۔ اس کمرے میں ایک کنارے بھائی جان کا بستر اور دوسرا سامان بندھا پڑا تھا۔ کوشش کے باوجود اس طرف نگاہ نہ اٹھ سکی۔ اس کے بعد کراچی میں کئی روز تک قیام رہا۔ مگر آخری دن کے سوا کسی دن سامان کے قریب جانے کی ہمت نہ ہو سکی۔

جنازہ ۱۷ ہی صبح کو ہو چکا تھا۔ اپنی بدقسمتی سے اس میں شریک نہ ہو سکا اور نہ ہو سکتا تھا۔ ایک دن مولانا عبدالغفار حسن صاحب چودھری علی احمد خاں صاحب اور عبدالمجید قریشی صاحب اور میں قبرستان جانے کے لئے نکلے۔ مگر بڑی کوشش اور گھوم پھرنے کے باوجود قبرستان نہ مل سکا۔ چند گھنٹے کے بعد مایوس ہو کر ہوٹل واپس آگئے۔ اگلے روز جناب عبدالقوی صاحب نے مہربانی فرمائی۔ اور مجھے اپنے ساتھ قبرستان لے گئے۔ قبر پر تنہا نماز جنازہ ادا کی۔ قبر کو دیکھ کر ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔

اے مرد مومن! تیرے لئے اسی سرزمین میں سونا لکھا تھا۔ تو کہاں پیدا ہوا۔ کہاں پلا، کہاں رہا اور کہاں اپنے رب کی پکار کو لبیک کہا؟

یہی ہے پردیس میں پردیس!

اے اللہ کی راہ کے سچے مجاہد! تو اپنی کمزور جان اور نحیف بدن کے ساتھ عمر بھر جہاد میں معروف رہا۔ تونے مایوسی اور بے ہمتی کو کبھی اپنی طرف راہ پانے کا موقع نہ دیا۔

اے صدق و وفا کے پیکر! تیری عمر اگرچہ اس دنیا میں زیادہ نہ ہوئی۔ مگر جب تک اس ملک میں دعوت اسلامی کا نام لینے والا ایک شخص بھی موجود ہے، تیرا نام زندہ اور باقی رہے گا۔

اس ملک میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھنے والوں پر تیرے کتنے احسانات ہیں۔ تو ہی نے اس دعوت سے عربی دنیا کے لوگوں کو روشناس کرایا۔ اور اس راہ میں بیماری اور خرابی صحت تک کو حائل ہونے نہ دیا۔ اخوان کی دعوت سے بھی تو ہی نے سب سے پہلے صحیح معنوں میں اس ملک کے لوگوں کو روشناس کرایا۔ تو حقیقی معنوں میں اپنے وقت کا عربی ممالک کے حالات پر آخری مرجع تھا۔ اللہ تعالیٰ تیری کوششوں کو قبول فرمائے۔ اور اپنے نیک اور مجاہد بندوں کے ساتھ تجھے اٹھائے۔

تو اپنی زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں اپنے دوستوں اور رفیقوں کے لئے ایک قابل قدر اور بے نظیر نمونہ رکھتا تھا۔

تونے سچی بات کہنے میں کبھی مجاملت اور مداہنت سے کام لینا پسند نہیں کیا۔ لیکن یہ تیرا اخلاص تھا جس نے تیری ہر تنقید سے دوسرو کو نہ صرف ناراض نہیں کیا۔ بلکہ انہیں تیرا ممنون و شکر گذار بنایا۔

تونے ہر معاملہ میں عزیمت اور ترفع کی راہ اختیار کی۔ تونے اپنے علم کو کبھی دنیا کمانے کا ذریعہ بنانا پسند نہیں کیا۔ تونے اپنی چسنند تصنیفات سے علمی تحقیق کا ایک عملی نمونہ پیش کیا۔

محنت و جفاکشی اور پابندی اوقات میں تیری زندگی صحیح معنوں میں قابل رشک تھی۔ تونے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بیکار ضائع نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی اس کم عمر میں انتہائی خرابی صحت کے باوجود تونے وہ کام انجام دیئے۔ جو اچھی اچھی صحت رکھنے والے لمبی لمبی عمروں میں انجام نہیں دے پاتے۔

وفا شعاری اور وضع داری میں تو اپنا ایک مقام رکھتا تھا جس کی مثال کم از کم اس زمانہ میں ملنا مشکل ہے۔ اپنے پر احسان کرنے والوں کے احسانات کا جس طرح تو عمر بھر تذکرہ کرتا اور پھر ان کا بدلہ ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس میں تو اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔

تو صحیح معنوں میں متقی اور خدا سے ڈرنے والا تھا۔ تونے دیانت اور حسن معاملگی کا ایک عملی اور قابل قدر نمونہ پیش کیا۔ آج کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ تونے اس سے قرض لیا اور وقت پر ادا نہیں کیا۔ بلکہ صرف یہی دعویٰ کر سکے کہ تونے اس سے کبھی قرض لیا۔ اس کے برعکس کتنے ہیں جن کو تونے قرض دیا۔ اور کتنے ہیں جن کی تونے مالی اعانت کی۔ تو مالدار نہ تھا مگر سب سے زیادہ مالدار تھا۔

اللہ تیری قبر کو نور سے بھرے اور تجھے کروٹ کروٹ جنت داخل کرے۔ وانا للہ وانا الیہ راجعون!

---

(۱) وان کنت ذا رأی فکن ذا عزیمۃ — فان فساد الرأی ان تترددا

(۲) واجرأ من رأیت بظہر غیب — علی عیب الرجال ذووا العیوب

ترجمہ:- (۱) اگر تو کوئی رائے رکھتا ہے، تو صاحب عزیمت بھی بن، اس لئے کہ ہر کام میں متردد رہنا خرابی رائے کی علامت ہے۔

(۲) لوگوں کی پیٹھ پیچھے انہیں کوسنے اور برا بھلا کہنے میں وہ لوگ سب سے زیادہ جری ہوتے ہیں، جن کا دامن خود عیوب سے آلودہ ہوتا ہے

(ماخوذ از ذاتی ڈائری مولانا مرحوم)

میرے تاثرات

نذیر حسین ایم اے

پندرہ یا سولہ برس گزرے ہوں گے کہ معارف اعظم گڑھ میں سید رشید رضا مرحوم و مغفور کی سیرت مؤلفہ امیر شکیب ارسلان پر مولانا مسعود عالم کا تبصرہ پڑھا تھا۔ تبصرہ نگار نے تبصرہ بڑی قابلیت سے لکھا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ تبصرہ نگاری کا پورا حق ادا کر دیا تھا۔ میں اس سے قبل سید رشید رضا کی کتاب الوحی المحمدیؐ کا اُردو ترجمہ دیکھ چکا تھا جس کی وجہ سے اُن سے محبت اور عقیدت پیدا ہو چکی تھی۔ لہذا کئی کئی بار یہ تبصرہ پڑھا پھر خیال پیدا ہُوا کہ تبصرہ نگار کا پتہ چلایا جائے۔ کسی نے بتلایا کہ مولانا عربی کے بڑے انشاپرداز ہیں۔ لکھنؤ سے الضیاء نامی عربی کا ایک ماہوار رسالہ بھی نکالتے رہے ہیں اور آج کل پٹنہ کے مشہور کتب خانہ خدا بخش اورینٹل لائبریری کی قلمی کتابوں کی فہرست مرتب کر رہے ہیں۔ اس کے بعد مولانا کے تبصرے مختلف کتابوں پر معارف میں نکلتے رہے جن کو میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا رہا۔

پاکستان بننے کے بعد قیام منٹگمری کے دوران میں مجھے عربی سیکھنے کا شوق پیدا ہُوا ایک صاحب علم سے عربی صرف و نحو شروع کی اور چند ماہ میں ہدایۃ النحو تک پہنچ گیا اس سے قبل میں اپنے وطن میں رسالہ الندوہ اور ندوۃ العلماء کی سالانہ رپورٹیں پڑھ چکا تھا اور ندوۃ العلماء کے اصلاحی و علمی خیالات کا مرید اور پُرجوش حامی تھا جس کی وجہ سے درس نظامی کی بعض کتب کی طرف طبیعت مائل نہیں تھی۔ ہدایۃ النحو ختم کرنے کے بعد میں امام زمخشری کی مفصل پڑھنا چاہتا تھا لیکن میرے استاد کافیہ پڑھانے پر مصر تھے چنانچہ کافیہ پڑھنا شروع کیا اس کی عبارت مختصر اور ادق ہے۔ جلد ہی طبیعت گھبرا اٹھی چنانچہ ایک دن خیال پیدا ہُوا کہ مولانا مسعود عالم سے جو اب جماعت اسلامی کے دار العروبہ کے انچارج کی حیثیت سے راولپنڈی میں قیام فرما تھے اس بارہ میں مشورہ طلب کیا جائے اور ان سے تعلیمی رہنمائی حاصل کی جائے چنانچہ میں نے مولانا کو خط لکھا اور انھوں نے حسب ذیل جواب دیا:-

" آپ نے جو طریقہ تعلیم شروع کیا ہے وہ قدیم عربی مدارس کا طریقہ تعلیم ہے اس سے آپ کو جو الجھنیں اور دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں وہ قدرتی اور لازمی ہیں اس میں ایک نوجوان مسلمان کے وقت ضائع ہو جانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میرا تو خیال یہاں تک ہے کہ اس ملک میں عربی تعلیم کے پست اور کم رائج ہونے کا سب سے بڑا سبب یہی طریق تعلیم ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس کے سیکھنے کے لئے پہلے تین سال محض گرامر کے پڑھنے میں صرف کر دیئے جائیں۔ اس طویل عرصہ میں یا تو زبان پڑھائی ہی نہ جائے اور اگر پڑھائی جائے تو بجائے نام فطری طریقہ یہ ہے کہ پہلے آسان زبان پڑھائی جائے اور اس کے بعد جب طالب علم میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ عبارت آسانی سے پڑھ سکے تو اسے اس وقت صرف و نحو کی ایک دو معیاری اور مفید کتابیں پڑھا دی جائیں بہر حال آپ کافی وقت لگا چکے ہیں اور کافی کچھ حاصل کر چکے ہیں اب آپ نحو کی کتاب شرح شذور الذہب لابن ہشام پڑھ سکتے ہیں۔ یہ کتاب نحو کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں بہت مفید اور آسان ہے۔ کافیہ کا تو آپ نام ہی نہ لیجئے۔ الفیہ ابن مالک کے اشعار آپ کو بہت دقیق اور مشکل پڑیں گے بلا کسی مفید شرح

کے آپ اسے نہیں پڑھ سکیں گے ۔ المفصل بہت جامع اور نحوی معلومات سے پُر کتاب ہے مگر طویل اتنی ہے کہ آپ کے لئے اسے ختم کرنا بہت مشکل ہے اور بلا کسی اچھے استاد کی مدد کے آپ اسے نہیں پڑھ سکیں گے غالباً آپ کے ہاں کوئی ایسا استاد بھی نہ مل سکے گا جو یہ کتاب پڑھا سکے ۔
(۲) عربی ادب کے دو سلسلے ہوسکتے ہیں ایک جو آپ درساً پڑھیں اس کے لئے اب تک ہمیں سب سے اچھی کتاب القرآۃ الرشیدہ ہی معلوم ہو سکی ہے دوسرا سلسلہ (RAPID READING) کا ہے اس کے لئے سب سے بہتر کتاب کامل کیلانی کی حکایات الاطفال اور قصص الاطفال ہے۔"
یہ طویل خط میں نے من وعن اس واسطے درج کر دیا ہے کہ میری طرح جو طالب علم اس وقت صرف و نحو کی بھول بھلیوں میں پڑے ہوں ان کے لئے مشعل راہ کا کام دے اس کے بعد خط و کتابت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا میں اُلٹے سیدھے سوالات لکھ بھیجتا اور مولانا از راہ شفقت میرے خطوط کا جواب بسرعت فرما کر میری رہنمائی کرتے ۔ وہ کلیلہ و دمنہ کی سادہ عبارت کے بہت مداح، قائل اور معترف تھے اور مبتدیوں کو اس کتاب کے مطالعہ اور درساً پڑھنے کی تاکید فرماتے اس کے بعد وہ "مجموعۃ من النظم والنثر" یا سید ابو الحسن علی الندوی کی مقامات من ادب العرب کی سفارش کرتے اس درجہ پر پہنچنے کے بعد وہ عام مطالعہ کے لئے طالب علم کو سیرت ابن ہشام اور تاریخ طبری کا مشورہ دیتے قصص النبیین (حصہ سوم) اور انشائے عربی پر انہوں نے جو مقدمات لکھے ہیں وہ اُن کے اصلاحی تعلیمی خیالات کے آئینہ دار ہیں ۔

کہا کرتے تھے کہ حدیث شریف کی کتابیں (صحاح ستہ) تعلیمات اسلامیہ کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ عربی زبان و ادب کا بڑا سرمایہ ہیں جن کی زبان بہت سادہ اور سلیس ہے اور تصنع و تکلف سے پاک ۔ افسوس ہے کہ لوگوں نے کتب احادیث کی طرف اس نقطۂ نگاہ سے توجہ نہیں کی اور تصنع و تکلف سے لبریز زبان اور اظہارِ بیان کو ادب کا نام دے دیا گیا ہے خصوصاً ہمارے ملک میں صرف مقامات حریری نثر میں اور سبع معلقہ نظم میں معیاری کتب سمجھی گئیں یہ دونوں کتابیں اپنی اپنی جگہ پر اہم ہونے کے باوجود زبان کی صرف دو شاخوں کی نمائندگی کرتی ہیں "آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ زبان و ادب صرف وہ نہیں جو شعراء یا ادباء یا صرف اونچے طبقے کے لوگ لکھتے ہیں ہر زبان کا سرمایہ زندگی کے تمام شعبوں پر مشتمل ہوتا ہے"

مولانا جدید عربی ادب پر ماہرانہ اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے ۔ نئی مطبوعات اُن کی نظر سے برابر گزرتی رہتی تھیں سو وہ جدید ادبی رجحانات سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے تھے ۔ وہ زیادہ تر جدید ادب کے کلاسیکل سکول سے متاثر تھے ۔ مرحومین میں سے وہ سید رشید رضا، صادق الرافعی اور امیر شکیب ارسلان کے طرزِ تحریر کو بہت پسند کرتے تھے اور زندوں میں کرد علی ۔ عبد القادر المغربی ۔ شفیق جبری ۔ احمد حسن الزیات اور محمود محمد شاکر کے اسلوب انشاء کے مداح تھے ۔ عباس محمود العقاد طٰہٰ حسین اور ڈاکٹر احمد امین وغیرہ کا جدید ادب میں جو مقام و مرتبہ ہے وہ عربی کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں لیکن وہ ان ادباء کو ناپسند کرتے تھے ۔ عباس محمود العقاد کی بابت کہا کرتے کہ وہ تو ایک صحافت ادیب ہے ۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین جن کے اسلوب بیان سے ایک دنیا مسحور ہے کی بے راہ روی اور آزاد خیالی سے متنفر تھے ۔ ڈاکٹر احمد امین کی بابت ان کا خیال تھا کہ وہ مستشرقین کی عبارتیں اپنے مضامین اور کتابوں میں بلا حوالہ نقل کرتے جاتے ہیں ۔ اور معلمین امت اور خادمانِ ملت کے لئے اپنے دل میں کوئی احترام نہیں رکھتے ہاں ان تینوں پر ڈاکٹر زکی مبارک کو ترجیح دیا کرتے تھے کہ ان کے مضامین و تصانیف میں زبان کا چٹخارہ پایا جاتا ہے اگرچہ وہ فرنچ اسلوب بیان کی تقلید کرتے ہیں ۔ سب سے زیادہ وہ امیر شکیب ارسلان سے متاثر تھے کہا کرتے تھے کہ امیر کا اسلوب بیان ابن خلدون سے ملتا جلتا ہے لیکن ابن خلدون بچے تلے الفاظ استعمال کرتا ہے اور امیر ہر ایک بات کو کھول کر اور پھیلا کر لکھتے ہیں ۔ حاضر العالم الاسلامی کو اسلامی سیاست کی انسائیکلوپیڈیا بتلایا کرتے تھے ۔

عربی انشاء پر انہیں اہل زبان جیسی قدرت حاصل تھی ۔ الضیاء کی صحت زبان کی داد استاذ کرد علی جیسے مشہور لغوی اور ادیب تک نے دی تھی ۔

المسلمون۔ الرسالہ اور منبر الشرق میں ان کے مضامین برابر نکلا کرتے تھے۔ یہ نظرۃ اجمالیۃً دیکھنے کو تو اسلامی ہند کی اصلاحی اور سیاسی تحریکوں کی مختصر سی تاریخ ہے لیکن ادب و افکار کے لحاظ سے بہت اونچی ہے۔ وہ دنیائے اسلام کی سیاسی اور اصلاحی تحریکات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ممالک اسلامیہ کے اکابر رجال سیاست سے ذاتی واقفیت اور مراسلت تھی۔ ترک اور عرب کی آویزش تاریخ اسلام کا خونیں باب ہے۔ ہمارے لئے یہ امر ابھی تک باعثِ حیرت ہے کہ عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کیوں کی تھی۔ اخبار مدینہ بجنور کی ادارت کے زمانہ میں انہوں نے ایک سلسلہ مضمون عرب و ترک کی آویزش پر لکھا تھا اور ان حالات و اسباب کا تجزیہ کیا تھا جن کے تحت عرب ترکوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اُن کو نہ صرف عربی زبان بلکہ عربوں سے عشق تھا اس واسطے وہ ترکوں کو ظالم اور عربوں کو مظلوم ٹھہراتے تھے۔ ہلال پٹنہ میں ایک سلسلہ مضمون "وہابیت ایک دینی و سیاسی تاریخ" پر لکھا تھا یہ دونوں مضامین ان کی مؤرخانہ ژرف نگاہی کا پتہ دیتے ہیں۔

مصلحین امت میں امام احمدؒ۔ امام ابن تیمیہؒ۔ سید احمد شہید بریلویؒ۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ۔ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ اور امیر عبدالقادر الجزائری سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور ملنے جلنے والوں کو ان کے حالات پڑھنے کی ترغیب دیتے۔ اسی جذبہ کے تحت انھوں نے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کے حالات میں ایک گمنام اور مظلوم مصلح کے نام سے ایک محققانہ کتاب لکھی اور دوستوں اور دشمنوں کی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کو جو ان کی ذات سے پیدا ہو چکی تھیں، احسن طریقہ سے دور کیا اور ان کی تعلیمات کو صحیح رنگ میں پیش کیا۔ سید احمد شہیدؒ کے خلفاء کے حالات میں ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک لکھی۔ مولانا اُردو کے شستہ اور شگفتہ انشاپرداز تھے۔ طرزِ تحریر باوقار، متین، عالمانہ اور سادہ ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ انہیں امیر شکیب ارسلان سے محبت اور عقیدت نہیں بلکہ عشق ہے۔ وہ اپنی ہر تصنیف میں کسی نہ کسی مناسبت سے ان کا ضرور ذکر کریں گے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"سید جمال الدین کے شاگرد اور ان کے طریق فکر و عمل کے داعی۔ امیر شکیب ارسلان سے کون واقف نہیں۔ ساری عمر علمی و عملی جدوجہد میں بسر ہوئی۔ عربی کا تو کیا کہنا کہ یہ دورِ حاضر میں عربی زبان و ادب کے امام تھے۔ جرمن اور دوسری یورپی زبانوں سے واقف تھے۔ لبنان کے ایک خوشحال اور خاندانی امراء کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گھرانے کی روایات کے مطابق جلد ہی عربی نثر نگاری اور شاعری میں اپنی جگہ پیدا کر لی پھر سیاسیات میں دلچسپی لی تو عثمانی حکومت کے چوٹی کے اہلِ سیاست میں شمار ہونے لگا۔ بزم کے ساتھ رزم کے بھی مرد میدان تھے۔ طرابلس میں اپنے خاص دوست انور مرحوم کے ساتھ خوب مردانگی کے جوہر دکھلائے۔ پہلی لڑائی کے خاتمہ پر عربستان کی سرزمین اُن پر حرام قرار دے دی گئی۔ اس لئے عمر کے آخری تیس سال جلا وطنی میں گزارے مگر یہ اللہ کا مجاہد بندہ تمام مشکلات کے باوجود اپنے کام میں لگا رہا۔ دوسری بڑی لڑائی کے ختم ہوتے ہی لبنان کی جمہوریت نے آزادی کا سانس لیا تو وطن مالوف کو واپس ہوئے لیکن قسمت میں وطن کی صرف مٹی ہی لکھی تھی تھوڑے عرصہ کے بعد دارِ آخرت کی راہ لی"

یہ اقتباس اُن کے طرزِ تحریر کا نمونہ ہے۔ لیکن یہ رنگ ان کے سفرنامہ "دیارِ عرب میں چند ماہ" میں زیادہ نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اسلوب بیان میں سلاست اور طرزِ ادا میں بے ساختگی پیدا ہو گئی ہے اور قلم زیادہ منجھا ہوا نظر آتا ہے موصوف نے ۱۹۴۹ء میں عراق اور حجاز مقدس کا سفر کیا تھا سفر کا مقصد خالص دینی اور تبلیغی تھا انھوں نے ان دونوں ملکوں کے مذہبی اداروں کو دیکھا وہاں کے کارکنوں سے ملاقات کی۔ علماء مشائخ، ارباب قلم و اصحاب قلم سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کیا۔ اس کتاب پر ایک دلآویز تبصرہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے

الفرقان لکھنؤ میں شائع ہوچکا ہے جو بقول ان کے دو دہائیوں کی زندگی کی سرگزشت بھی ہے ۔ ان کی رائے کے مطابق یہ سفرنامہ اُن کی جدوجہد ۔ انہماک ۔ جذبہ ۔ دعوت اور ان کی ذہنی و علمی صلاحیتوں کی ناطق شہادت ہے۔ اِس کتاب میں وہ بولتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کے ذہن و مزاج کی پوری تصویر آگئی ہے" وہی صاف گوئی وہی تلخ نوائی" مدینہ طیبہ کی حاضری کا باب خاص طور پر دلآویز اور کیف انگیز ہے بلکہ میرے خیال میں کتاب کا وہی جاندار حصہ ہے ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے عاشق اور اس کی زبان کے سچے خادم اور دین کے مخلص سپاہی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

۱۰۸

بقیہ :۔ بوڑھے والد پہ کیا گزری ص

صابر و شاکر تھے ایک رفیق کو دوسری ملاقات میں بتایا کہ اندرونی کرب بہت محسوس کرتا ہوں ۔

۱۵ اپریل کی صبح کو بہار شریف ، مولانا مرحوم کے والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بزرگ موصوف سے راستہ ہی میں ملاقات ہوگئی۔ ضعف ضعیفی سے لڑکھڑاتے عصا کے سہارے راستہ ٹٹولتے ہوئے قدم آگے بڑھا رہے تھے اور مدرسہ اسلامیہ بہار شریف درس کے لئے جا رہے تھے۔ میں نے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ غالباً میری آواز سے انہوں نے مجھ کو فوراً پہچان لیا اور میرے چہرے پر نظر جمائے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولے مسعود انتقال کر گئے اور آخری ملاقات نہ ہو سکی ، اور ان کی آنکھوں سے سیل رواں ہو گیا ۔

میری زبان سے نکلا اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں اللہ اس پر آپ کو اجر اور صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کی مغفرت کرے۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ ضعف و غم سے گر نہ پڑیں ان سے درخواست کی مدرسہ ہی چلیں ۔ وہیں پہنچ کر باتیں کریں گے ہم آہستہ آہستہ چل کر مدرسہ پہنچے ، ہم مل بیٹھے تو بزرگ موصوف مولانا مرحوم کی لیاقت و سعادت مندی کا حال سناتے رہے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش جاری رہی ۔ فرمایا کہ کراچی سے عاصم میاں کا خط آیا ہے کہ " مولانا مرحوم کا کچھ سامان ہے ، کتابیں ہیں ان کو کیا کیا جائے ؟ حکم ہو تو ان کو آپ کے پاس بھجوانے کی کوشش کی جائے " میں نے ان کو لکھا ہے کہ یہاں کسی چیز کو بھجوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب دار العروبہ میں دے دی جائیں ۔ میں کتابوں کی وہاں ضرورت نہ ہو وہ یہاں مدرسہ میں بھیج سکتے ہیں ۔ پھر فرمایا کہ اس ضعیفی میں مسعودؒ ، میرے بڑا سہارا تھے وہ باوجود اپنی والی علالت اور معاشی تنگی کے وہ برابر روپیوں سے میری مدد کرتے رہے ۔ میں ہے میرے مصارف پورے ہوتے رہے اب تو میں دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہوں اور کام کرنے کی صلاحیت ختم ہوتی جا رہی ہے ۔ میں نے ان کو تسلی دی کہ مولانا مرحوم کی زندگی میں جو مالی مدد آپ کو ملتی رہتی تھی ان کی وفات کے بعد بھی ان کے رفقاء کے ذریعہ ملتی رہے گی ۔ کم سے کم مولانا مرحوم کی تصانیف کی رائلٹی اور کاروبار میں جو ان کے روپے لگے ہوئے ہیں ۔ ان کے منافع تو آپ کو ملتے رہنا چاہیئے بلکہ میں وہاں کے رفقاء سے گزارش کروں گا کہ وہ آپ کے لئے اتنے کا انتظام کر دیں کہ آپ کو اس ضعیفی میں خود کمانے کی حاجت نہیں رہے ۔ میں نے محسوس کیا کہ میری موجودگی میں بزرگ موصوف مولانا مرحوم کے گزرے ہوئے حالات اور واقعات کو بیان کر کے اور بے قرار ہو رہے ہیں میں نے تسلی کے کلمات کہنے چاہے مگر میری آواز بھی گلوگیر ہو کر رہ گئی پھر میں نے محسوس کیا کہ غالباً درس کے اوقات میں احساس ذمہ داری کی بنا پر میری ملاقات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے ۔ میں نے رخصت چاہی اور انہوں نے اجازت

محسن کی یاد میں

عبدالماجد ندوی
(دارالعلوم ندوہ لکھنؤ)

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

آہ! کہ ایک حادثۂ جانگاہ کو ابھی پورے چار ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک دوسرا حادثہ پیش آگیا —— آہ! کہ ندوہ کا ایک لائق ترین فرزند، دعوتِ اسلامی کا مردِ مجاہد۔ ملک و ملت کا دردمند۔ دین کا داعی۔ اسلام کا سپاہی۔ دینی غیرت و اسلامی حمیت کا پیکر۔ اردو اور عربی کا ایک بلند پایہ انشا پرداز و باکمال صحافی۔ اخلاص و عمل کا نمونہ۔ سنتِ رسولؐ کا شیدائی مسعود عالم ندوی ۱۶۔ مارچ کی شب کو یکایک ہم سے جدا ہوگیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ !

مولانا مسعود عالم ندوی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ مولانا مرحوم کا مفصل تذکرہ تو بعد میں شائع ہوگا۔ ان کی مختصر سوانح حیات لکھنے والوں میں بھی اہل تر لوگوں کی کمی نہیں۔ خصوصیت کے ساتھ ان کے صدیقِ حمیم مولانا ابوالحسن علی میاں اور ان کے دوسرے سوگوار رفیق مولانا محمد ناظم صاحب ندوی ان کی مجاہدانہ زندگی پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔ راقم الحروف یہاں صرف اپنے تاثرات اور خصوصاً ان کی زندگی کے بعض ان پہلوؤں کا ذکر کرنا چاہتا ہے۔ جن سے یہ ناچیز خصوصیت کے ساتھ متاثر ہوا۔

مولانا سے میری پہلی ملاقات

مولانا سے میری پہلی ملاقات خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں۔ جہاں وہ کیٹلاگر (Cataloguer) کی حیثیت سے کام کرتے تھے سنہ ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ گاڑھے کا پائجامہ، گاڑھے کا سفید کرتہ۔ اور غالباً ٹوپی بھی گاڑھے ہی کی تھی۔ شیروانی جو دیوار میں ایک کھونٹی پر لٹک رہی تھی وہ بھی کھدر ہی کی تھی۔ یہ سادگی دیکھنے کے قابل تھی گو کہ لباس سر سے پیر تک کھدر ہی کا تھا مگر وضع قطع میں وہ کانگریسی نہ تھا۔ مولانا ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ سامنے بڑی سی میز تھی اور میز کے دونوں جانب دو شلف۔ جن پر قرینہ کے ساتھ کتابیں بھی تھیں۔ پیچھے کی الماریوں میں بھی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ آگے پیچھے۔ دائیں بائیں۔ ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ میز پر سامنے کچھ کاغذات رکھے تھے۔ چہرے سے وقار اور جلال ٹپک رہا تھا۔

پہلے تو میں بہت مرعوب ہوا۔ مگر چند منٹ کی گفتگو کے بعد میری مرعوبیت موانست میں بدل گئی۔ میرے ہاتھ میں سید صاحب مرحوم اور ان کی مشترک تالیف لغات جدیدہ کا ایک نسخہ تھا۔ جسے میں نے ندوہ ہی آنے کے خیال سے خریدا تھا۔ فرمایا "یہ کیا ہے؟" میں نے ان کی طرف کتاب بڑھاتے ہوئے کہا "لغاتِ جدیدہ" کہنے لگے "اس سے کیا ہوتا ہے؟" پھر ایک موٹی سی کتاب جو غالباً مختصر یا بیروت کی چھپی ہوئی تھی۔ میرے سامنے کھول کر رکھ دی۔ غرض صرف و نحو کا امتحان لینا مقصود تھا۔ اس سے پہلے میں نے مصری چھاپے کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی۔ اب تک صرف و نحو حدیث و فقہ اور تفسیر و ادب کی جتنی کتابیں میں نے پڑھی تھیں وہ سب ہندوستانی چھاپہ خانوں کی تھیں۔ اس لئے پہلے تو مجھے کچھ تامل ہوا۔ پھر تعمیل حکم کے بطلے

پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک پیراگراف سے کچھ کم ہی پڑھا ہوگا کہ "بس بس" کہتے ہوئے کتاب بند کر دی۔ پھر سید صاحب مرحوم کے نام ایک سفارشی مکتوب لکھ دیا "صرف و نحو اچھی ہے اور ہونہار طالب علم ہیں"

یہ مولانا سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد سے اب تک برابر تعلقات قائم رہے۔ مراسلت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۲۰ فروری کا لکھا ہوا ان کا آخری مکتوب تھا۔ آہ! کسے معلوم تھا کہ یہ آخری مکتوب ہوگا۔

استاذ مرحوم کا قیام جب تک پٹنہ میں رہا، یہ ناچیز ندوہ سے جاتے اور آتے ہوئے ضرور حاضری دیتا۔ اکثر و بیشتر قیام بھی کرتا۔ مولانا بھی ندوہ تشریف لاتے تھے۔ آتے تو اپنے رفیق و استاذ محترم مولانا محمد ناظم صاحب کے ساتھ مہمان خانہ میں قیام فرماتے۔ گھنٹوں ملاقاتیں رہتیں۔ شہر کے متعارف اور تعلیمی طبقہ کے لوگ بھی آتے۔ طلباء کی جماعت بھی گھیرے رہتی۔ ہر قسم کے علمی۔ ادبی۔ تاریخی۔ سیاسی اور دینی موضوع پر گفتگو فرماتے۔

۱۹۴۶ء میں جب دار العلوم ندوہ سے میری فراغت میں ایک سال باقی تھا۔ دار العروبہ کے لئے مولانا کو ایک رفیق کی ضرورت تھی۔ مولانا نے مجھے لکھا کہ دار العروبہ کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ ایک رفیق کی مجھے سخت ضرورت ہے۔ کیا تم ندوہ سے فراغت اور وہاں کی سند اپنے لئے ضروری سمجھتے ہو؟ میں نے لکھا کہ کوئی ضروری نہیں۔ آپ جیسا حکم فرمائیں۔

ان دنوں مولانا کا قیام کرتپلی میں تھا اور پٹنہ میں جماعت اسلامی کا کل ہند اجتماع ہونے والا تھا۔ جو بعد میں صرف شمالی ہند کا اجتماع ہوا۔ مولانا نے لکھا کہ تم اجتماع کے موقع پر پٹنہ آجاؤ۔ یہیں پر بالمشافہ گفتگو ہو جائے گی۔ وقت معین پر میں حاضر خدمت ہوا۔ گفتگو مکمل ہو گئی تاہم مولانا مودودی سے استصواب رائے باقی تھا۔ پٹھان کوٹ واپس جا کر استاذ مرحوم نے لکھا کہ مولانا مودودی سے تمہارے لئے گفتگو کر لی۔ اب تم فوراً چلے آؤ۔ حسب حکم ۱۱ر مئی کو جالندھر پہنچا۔ مولانا منتظر تھے پُرتپاک خیر مقدم فرمایا۔ اس کے بعد پھر دوسرے ہی دن ہمارے اور عاصم صاحب کے درمیان دار العروبہ کے کام تقسیم کر دیئے۔ عاصم صاحب کو مولانا کے ساتھ دار العروبہ میں رہتے ہوئے غالباً سال ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ میں نے مولانا کی رہنمائی میں کام شروع کر دیا۔ زیادہ تر کام پڑھنے لکھنے ہی کا تھا۔ ہر روز ایک انشاء بھی لکھ کر دکھانی پڑتی۔ دو ہفتہ کے بعد ایک روز بڑی مسرت کے ساتھ فرمایا "تم میرے کام کے ہو سکتے ہو۔ میں نے تم کو پاس کر دیا۔ اتنی جلدی میں کسی کو پاس نہیں کرتا۔ میرے یہاں اس کے لئے کم از کم چھ ماہ کی مدت مقرر ہے۔۔۔۔۔"——

مولانا کے یہ جملے میرے لئے بہت ہی حوصلہ افزا تھے۔ میں اپنی جگہ سمجھتا تھا کہ ترجمہ کا کام تو شاید میں کر سکتا ہوں۔ مگر انشاء کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو بہت ہی کم —— بہرحال مولانا کے بتائے ہوئے نقشہ پر میں کام کرنے لگا۔ مگر افسوس کہ یہ قیمتی رفاقت زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکی۔ میری صحت دن بدن گرنے لگی۔ میں بہت گھبرا گیا۔ مولانا کو میری یہ حالت دیکھ کر سخت تشویش ہوئی علاج و معالجہ کی فکر کرنے لگے۔ مگر میں نے اس سلسلہ میں مولانا کو زحمت دینا پسند نہ کیا اور اجازت لے کر گھر چلا آیا۔

مولانا کو اس کا بڑا افسوس ہوا۔ جس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک مضمون میں بھی کیا۔ اس کے فوراً بعد ہی پورا پنجاب فسادات کی آگ سے بھڑک اٹھا۔ اللہ تعالیٰ کو مولانا سے اپنے دین کے لئے کچھ دن اور کام لینا تھا۔ موت کے منہ سے بچ نکلے اور لاہور پہنچ گئے۔ ایک عرصہ تک ہم ہندوستان والوں کو کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کون زندہ رہا اور کون ان خونیں فسادات کی نذر ہو گیا۔

جالندھر میں مسلمانوں کی اگرچہ کثیر آبادی تھی۔ مگر چاروں طرف کی دوسری کثیر آبادیوں کے درمیان وہ قلیل تعداد میں تھے۔ آگ اور خون کے سمندر کو پار کر کے مولانا کا اور جماعت کے دوسرے سربراہ کاروں کا لاہور پہنچنا قدرت الٰہی کا محض ایک کرشمہ تھا۔ اس وقت میں اپنے وطن پٹنہ میں تھا۔ [illegible] میں اگرچہ امن قائم ہو چکا تھا تاہم فرقہ وارانہ عصبیت میں ابھی تک جنون کی آمیزش تھی۔ مشرق سے مغرب تک آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔

ہر شخص اپنی جگہ ڈرا ڈرا اور سہما سہما سا تھا۔ کوئی بھی اپنے کو محفوظ خیال نہیں کرتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ فکر اس جماعت کے سربراہ کاروں کے لئے تھی۔ جن کے استاذ مرحوم ایک رکن رکین تھے۔ مصائب و خطرات میں خشیت اور تضرع کا کچھ اور ہی عالم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس عالم میں جو دعائیں دل و زبان سے نکلیں ان کی لذت اور دردناکی کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں

اس کے بعد سب سے پہلے استاذ محترم مولانا ناظم صاحب نے مجھے خوشخبری کا خط لکھا کہ صدیق مکرم مولانا مسعود عالم اور مولانا مودودی مدظلہ مع اپنے جمیع رفقاء کے لاہور پہنچ گئے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ پھر جب مولانا مرحوم کا پتہ حاصل ہوا تو خط و کتابت کا براہ راست سلسلہ شروع ہو گیا۔

استاذ محترم مولانا ناظم صاحب کے مشورہ سے میں پھر ندوہ چلا آیا۔ اور ایک سال رہ کر اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اب کیا کروں؟ استاذی مولانا محمد ناظم صاحب کا اصرار تھا۔ کہ دو سال رہ کر یہیں ادب عربی کی تکمیل کروں۔ لیکن خود وہ پاکستان کے لئے رخت سفر باندھ رہے تھے۔ میں نے استاذ مرحوم کو لکھا اور اپنے مستقبل کے بارے میں مشورہ چاہا، مولانا نے اسی محبت اور شفقت کے ساتھ جواب دیا ۔۔۔۔ "دار العروبہ میں اب بھی تمہارے لئے جگہ ہے۔ جب چاہو آجاؤ مگر ہندوستان سے بالکل کٹ جانا پڑے گا" دونوں ملکوں کے درمیان ابھی پاسپورٹ سسٹم جاری نہیں ہوا تھا۔ لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر تابکے۔ ایک نہ ایک دن یہ سب کچھ ہونا تھا۔ گھر والے اس پر کب راضی تھے۔ بالآخر استاذی مولانا محمد ناظم صاحب کی ہدایت اور مولانا علی میاں صاحب کے ایماء سے تکمیل کے لئے پھر میں ندوہ آگیا۔ افسوس کہ مشیت الٰہی نے استاذ مرحوم سے مزید استفادہ کا موقع نہیں دیا۔

استاذ مرحوم جسمانی طور پر تو ہم سب سے پہلے ہی جدا ہو چکے تھے۔ مگر ملاقات کا امکان ہر وقت باقی تھا۔ پچھلے سال جب معلوم ہوا کہ مارچ اپریل تک کچھ دنوں کے لئے وہ ہندوستان آرہے ہیں۔ صرف پرمٹ ملنے کی دیر ہے تو ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ مولانا مرحوم کے وہ تمام احباب جو ہندوستان میں رہ گئے تھے اُن کی آمد کے لئے چشم براہ تھے، مولانا کے والد محترم حکیم مولانا عبد الشکور صاحب لائق بیٹے کے دیکھنے کے مشتاق تو تھے ہی۔ اب سراپا انتظار بن گئے۔ مولانا علی میاں نے مجھ سے فرمایا کہ ندوہ کے لئے تم بھی مولانا کو دعوت دو۔ میں خط لکھ چکا تھا۔ غالباً مولانا علی میاں کے کہنے پر ایک دوسرا خط بھی لکھا۔ مولانا آتے تو علی میاں صاحب کے بعد میرے ہی مہمان ہوتے۔ مگر پاکستان کی حکومت کو وہ شاید زیادہ عزیز تھے۔ اس نے پرمٹ دینے کی بجائے اپنا مہمان بنانا زیادہ بہتر سمجھا۔

تقریباً سات ماہ جیل کی تکلیف اور شدائد سے جب رہائی پائی تو بیماری نے آگھیرا۔ پھر وہ اتنے سخت بیمار ہوئے کہ ۲۲ برس کی مدت میں ضیق النفس کی اتنی تکلیف کبھی نہ اٹھائی تھی۔ اسی زمانے میں سید صاحب علیہ الرحمتہ کا انتقال ہوا۔ استاذ مرحوم پر اس کا بہت اثر ہوا۔ بیمار تو تھے ہی اخبار والوں نے یہ خبر چھاپ دی کہ مولانا مسعود عالم کی حالت غیر ہے۔ مولانا مرحوم کو اپنے استاذ سید صاحب علیہ الرحمتہ سے غیر معمولی تعلق تھا۔ ان کے انتقال سے پہلے میں نے اپنے ایک خط میں ذکر کیا تھا کہ سید صاحب قبلہ اب کی مرتبہ جب ندوہ تشریف لائے تھے۔ تو بہت ہی زیادہ بجھے بجھے سے تھے۔ ابھی میرے خط کا جواب بھی نہ آیا تھا کہ اچانک سید صاحب انتقال فرما گئے۔ مولانا نے مجھے لکھا کہ آپ نے سید صاحب قبلہ کا ذکر کیا ہے کہ وہ بہت ہی بجھے بجھے سے تھے۔ لیجئے اب وہ شمع ہی گل ہو گئی ؎

ایتھا النفس اجملی جزعا
ان ماتحذرین قد وقعا

مولانا نے یہ خط میرے تعزیتی خط کے لکھنے سے پہلے ہی لکھا تھا پھر جب میرا خط ملا تو دوسرا جواب لکھا۔ محبت وعقیدت ایک ایک سطر سے جھلکتی تھی۔ سید صاحب علیہ الرحمۃ سے استاذ مرحوم کا رشتہ صرف استاذ و شاگرد کا نہ تھا۔ بلکہ سید صاحب علیہ الرحمۃ ان کے محسن و مربی تھے۔ ان کے سرپرست و اتالیق بھی تھے اور معلم و استاذ بھی۔ مولانا مسعود عالم صاحب سید صاحب ہی کے ساختہ و پرداختہ تھے اور یہ پودا انہیں کی لگائی ہوئی تھی ؎

صنائع فاق صانعہا فغاقت　　　وغرس طاب غارسہ فطابا

وکنا کا سہام اذا اصابت　　　مرامیہا فرامیہا اصابا

یہی وجہ ہے کہ استاذ مرحوم کو سید صاحبؒ سے غیر معمولی محبت تھی۔ ان کی محبت کا اندازہ کچھ اس خط سے ہو سکتا ہے کہ جو انہوں نے مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے نام سید صاحب علیہ الرحمۃ کی وفات پر لکھا تھا۔ یہ خط صدق میں شائع ہو چکا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "...... یہ لوگ مجھ سے انٹرویو چاہتے تھے۔ بیٹا باپ سے متعلق کیا انٹرویو دے۔ آپ کو استاذ مرحوم ——— آہ کہ مرحوم لکھتے ہوئے قلم کا جگر شق ہوا جاتا ہے ——— سے جو تعلق تھا اس کی بنا پر تعزیت کا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اگرچہ تعزیت کا مستحق میں خود ہوں"۔

یہ عبارت استاذ مرحوم مولانا مسعود عالم ندوی نے سید صاحبؒ کی وفات پر لکھی تھی۔ مگر آہ آج بعینہٖ یہی صورت مولانا مرحوم کے عقیدت مندوں کو پیش آ رہی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ابھی راولپنڈی سے ۲۸ رفروری کے لکھے ہوئے تین خطوط میرے، مولانا علی میاں صاحب اور مولوی مطیع الرحمان سیوانی (آخری درجہ کے ایک ہونہار طالب علم) کے نام مارچ کے پہلے ہفتہ میں موصول ہوئے تھے۔ ۲۰ رمارچ کو وہ کراچی گئے تھے۔ کراچی میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا جلسہ تھا۔ ویزا اور پاسپورٹ وغیرہ کے سلسلہ میں کچھ کام باقی تھے۔ شوریٰ کے بعد وہیں سے مصر و شام کے لئے روانگی کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر کسے معلوم تھا کراچی پہنچنے کے بعد سفر کا رُخ یکایک بدل جائے گا۔ خود اس مسافر کو بھی اس کی کیا خبر تھی کہ اس کے لئے کوئی اور ہی ویزا تیار ہو رہا ہے۔ مصر و شام کے بجائے اب وہ اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہنے والے ہیں۔

دن بھر شوریٰ کے اجلاس میں شریک رہے۔ نئے امیر کے انتخاب کے بعد رکنیت شوریٰ کا حلف اٹھایا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی وفاداری کا عہد کیا۔ رات کو آرام کے خیال سے لیٹ گئے۔ ایک معمولی سا دورہ پڑا۔ دورے کے بعد دو ہچکیاں آئیں۔ لوگ ڈاکٹر کے یہاں دوڑے۔ مگر جب تک ڈاکٹر آئے ایک تیسری ہچکی آئی اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

موت کے وقت جو لوگ موجود تھے ان کا بیان ہے کہ چہرے پہ شگفتگی اور نور برس رہا تھا۔ جیسے ابھی سوئے ہوں۔ اور سو کر اٹھنے ہی والے ہوں۔ چودہ گھنٹے کے بعد جب تجہیز و تکفین عمل میں لائی جا رہی تھی اس وقت بھی چہرہ اسی طرح کھلا ہوا اور متبسم تھا ؏

مرگے کہ زاہداں ہمت‌ا ہمی کنند!

کیوں نہ ہو وہ راہِ حق کے ایک مسافر تھے اور راہِ حق میں ہی کام آئے۔ اللہ تعالیٰ استاذ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور اپنے انعامات سے نوازے۔

فطری مواہب اور ذاتی خصوصیات

قدرت کی طرف سے بڑے اچھے دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ روشن فکر، دردمند دل اور سلجھا ہوا دماغ پایا تھا۔ ذہن و ذکاوت کے ساتھ قوتِ حافظہ بھی بہت قوی تھی۔ ۲۷ سال سے ضیق النفس کے مریض تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر بہت زیادہ کمزور اور نحیف تھے۔ مگر اس نحیف و ناتوان جسم میں وہ ایک چیتے کا جگر اور

شیر کی طرح مضبوط دل رکھتے تھے ۔

[illegible]

[illegible]

عزم و ہمت کے فولاد کے پہاڑ تھے۔ محنت سے سخت دورے پڑتے ۔ مگر افاقہ ہوتے ہی پہلے کی طرح کام میں لگ جاتے ۔ یہ انہیں کی ہمت تھی۔ دوسرا کوئی ان شدید دوروں کے بعد اپنے اندر اُٹھنے کی سکت نہ پاتا ——— ٹھوس اور تحقیقی مطالعہ ان کا سرمایہ علم تھا۔ تاریخ پر گہری اور تنقیدی نظر رکھتے تھے۔ اور ملکی سیاسیات سے نہ صرف یہ کہ باخبر تھے بلکہ اس پر اپنی ناقدانہ رائے بھی رکھتے تھے۔ سیاسی اور غیر سیاسی تحریکات کے پس منظر سے واقف تھے ۔ ادب عربی کا بہت اعلیٰ اور ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ لغت و قواعد پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اس کی باریکیوں کے مبصر تھے۔ الفاظ کی تحقیق میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ عربی کے وہ بلند پایہ اور فطری انشا پرداز تھے۔ قلم برداشتہ تحریر کا ان کو عجیب ملکہ تھا۔ تحریر میں برجستگی۔ سلاست اور روانی ہوتی۔ نپے تلے الفاظ، چست ترکیبیں۔ اچھوتے استعارات۔ نادر تشبیہیں مولانا کی تحریر کی خاص خصوصیت تھی۔ تحریر حشو و زوائد سے پاک ہوتی ۔ موقع موقع سے محاورات و امثال بھی استعمال کرتے مگر اس میں کوئی تکلف نہ ہوتا۔ پڑھنے والا محسوس کرتا کہ جیسے جگہ جگہ موتی جڑ دیئے گئے ہیں ——— آج سے بائیس سال پہلے ۳۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے "الضیاء" نام کا ایک عربی رسالہ نکالتے تھے۔ "الضیاء" کے فائل اب بھی یہاں موجود ہیں۔ مصر و عرب کے چوٹی کے علما۔ اور فضلائے ادب نے اس کی تعریف کی۔ استاذ مرحوم کی تحریروں کو سراہا اور ان کے نام تعریفی خطوط لکھے ۔ رسائل و جرائد نے بھی تقریظیں لکھیں اور دل کھول کر داد دی۔ تحسین کرنے والوں میں ایک مشہور شخصیت امیر البیان علامہ شکیب ارسلان کی بھی تھی ۔

مولانا مسعود عالم ندوی کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مثالی تخیل کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اور فی الواقع وہ تھے بھی ۔ مولانا مسعود عالم جدید و قدیم کی جامعیت کی نمائندگی کرتے تھے ۔ اور ندوہ کے فقہی مسلک اعتدال کی بھی! وہ مسلکاً سلفی العقیدہ تھے۔ مگر گروہی اہل حدیث نہ تھے۔ وہ ہر قسم کی گروہی عصبیتوں سے پاک تھے۔ ان کا فقہی مذہب حضرت شاہ ولی اللہ کا "مسلک اعتدال" تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

> "راقم کو اگر کوئی طنز سے وہابی کہتا ہے تو تردید کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر کوئی اہل حدیث کے نام سے یاد کرے تو اس سے برأت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ "اہل حدیث" سے تحزب اور گروہ بندی کی بو آتی ہے ۔ بالکل ویسے ہی جیسے موجودہ دور میں حنفیت اور شافعیت وغیرہ فقہی مذہب ہونے کی جگہ مستقل "دین" بن کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف تحزب اور فرقہ بندی کا زور ہے۔ ضرورت اصول پر زور دینے اور فروع میں رواداری برتنے کی ہے"
>
> (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص۲۵)

دینی غیرت و حمیت میں مولانا ایک زندہ مثال تھے ۔ حق کے معاملہ میں کسی قسم کی معمولی مداہنت کو بھی وہ جائز نہیں سمجھتے تھے، حق گوئی و بیباکی اُن کی امتیازی صفت تھی۔ لگی لپٹی بات کہنے کے عادی نہ تھے ۔ ہمیشہ کھری اور دو ٹوک بات کہتے۔ جس بات کو حق سمجھتے اس کو پوری قوت اور زور کے ساتھ پیش کرتے اور اسی شدت کے ساتھ اس پر قائم بھی رہتے۔ اور جس بات کو وہ غلط سمجھتے برملا اس کو غلط کہتے۔ اس معاملہ میں کسی عزیز اور دوست کی بھی رعایت نہ کرتے ۔ اللہ تعالےٰ نے ان کے قلب کو مداہنت فی الدین سے پاک بنایا تھا۔ یہ ان کی سیرت و کردار کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ تملق و چاپلوسی کی باتوں سے انہیں سخت نفرت تھی۔ وہ اپنی مدح و ستائش سننا پسند نہیں فرماتے تھے ۔ اس لئے ان کے یہاں خوشامدیوں اور

قصیدہ خوانوں کا مجمع کم تھا۔ اللہ نے ان کو ایمان کی فراست بخشی تھی۔ وہ بڑے مردم شناس بھی تھے۔ پہلی ہی نظر میں افراد کو بھانپ لیتے۔ اس لئے غلط قسم کے لوگ ان کے اردگرد جمع نہ ہو سکتے تھے۔

وہ سستی شہرت کے قائل نہ تھے۔ اسی کی وہ اپنے شاگردوں کو بھی نصیحت فرماتے۔ "چھپنے" کی خواہش کو بُری نظر سے دیکھتے اور اس کی بڑی مذمت فرماتے۔ وہ اکثر کہتے کہ طلباء دماغ کے کسی گوشہ میں چھپنے کا خیال پیدا ہی نہ ہونا چاہیے۔ بس لکھتے اور پھاڑتے جاؤ۔ مگر ساتھ ہی اپنے طلبہ کی ہمت افزائی میں کوتاہی بھی نہ کرتے کہ نشوونما کی صلاحیت کہیں دب کر نہ رہ جائے۔ اس لئے وہ ان کے اچھے کاموں کو سراہتے اور ان کی فطری صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کرتے۔ شاگردوں کے ساتھ ایک بڑی خصوصیت مولانا کی یہ تھی کہ ان کے درمیان عدل و انصاف کو پورے طور پر ملحوظ رکھتے اور اس میں بڑی باریک بینی سے کام لیتے۔ نہ کسی سے دوسروں کے مقابلہ میں اس طرح صرف نظر کرتے کہ وہ اپنے لئے اس فضا میں تنگی محسوس کرنے لگے اور نہ کسی کو باقی دوسروں سے اتنا بڑھاتے کہ اسے اپنی برتری اور بے جا تفوق کا پندار ہو جائے۔ وہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے اور ایک ہی طرح سب کی دلجوئی ضروری خیال کرتے۔ ہر ایک کے لئے ترقی کے مواقع یکساں فراہم کرتے۔

اخلاق و عادات

مولانا ایک کریم النفس اور شریف الطبع انسان تھے۔ اپنے پہلو میں ایک درد مند دل رکھتے تھے۔ دوستوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ ان کی راحت و تکلیف کا خیال رکھتے وہ بہت زیادہ خوددار بھی تھے۔ عفاف و استغنار کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا —— طبیعت میں قناعت تھی۔ جاہ و ریاست کے طالب نہ تھے۔ اپنی قیمت پہچانتے تھے اور اس کا صحیح اندازہ لگاتے تھے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ کریمانہ اخلاق اور ستودہ صفات کے حامل تھے۔ ان کے اتنے کھرے اور صاف گو ہونے کے باوجود احباب اور عقیدت مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ یہ ان کے وسعتِ اخلاق کی بڑی دلیل تھی۔ آج ان کے غم میں سینکڑوں دل زخمی اور بہت سی آنکھیں پُرنم ہیں۔

عزیزوں اور شاگردوں کے ساتھ دوستانہ اور برابری کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کی تکلیف و مصیبت میں کام آتے۔ ان کی تربیت کا خاص خیال رکھتے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی اور جزوی باتوں پر بھی نظر رہتی۔ شاگردوں کے ساتھ جذبۂ اخلاص و خیرخواہی اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ ان کی پوری زندگی پر وہ حاوی ہونا چاہتے۔ آزاد اور بے راہ رو طبائع پر یہ چیز بار ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ کم لوگ مولانا کے پاس ٹک پاتے تھے۔ مولانا دائم المریض تھے۔ بیماری کی وجہ سے غصہ جلد آتا تھا۔ بات بات پر بگڑ جاتے۔ مگر فوراً ہی رجوع بھی فرما لیتے۔ اور پھر نرمی و ملاطفت کی وہی باتیں شروع ہو جاتیں یہ عاصم صاحب! —— مولانا کے عزیز تر شاگرد۔ جنہیں استاذ مرحوم "بیٹا" کہہ کر پکارتے تھے اور بیٹا ہی سمجھتے بھی تھے۔ نہ جانے اُن کی کتنی خفگیوں کے بعد کام کے آدمی بنے ہیں۔ مگر یہ ساری خفگی اور تمام تر عتاب شاگردوں تک ہی محدود رہتا۔ میں نے کبھی کسی اور پر اس طرح انہیں خفا ہوتے نہ دیکھا۔ شاگردوں پر بھی یہ خفگی محض بیماری کے سبب سے تھی۔ مولانا خود بھی فرماتے تھے کہ بیماری کی وجہ سے مجھے غصہ جلد آجاتا ہے۔ ویسے مولانا بے حد متواضع واقع ہوئے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ "عاجز" لکھا کرتے تھے۔ چھوٹوں کے نام بھی جو خطوط لکھتے ان میں بھی اپنے کو عاجز ہی لکھتے۔ اور انہیں "آپ" کے لفظ سے خطاب کرتے ——!

مولانا اپنے ماتحتوں اور شاگرد پیشہ ملازمین کے ساتھ بھی بالکل مساوات کا برتاؤ کرتے۔ بیس پچیس سال کی عمر کا ایک پنجابی ملازم تھا جو کھانا پکاتا تھا۔ کھانا پکانے والے ملازم عموماً اپنے کپڑے صاف نہیں رکھتے۔ مولانا کا یہ پنجابی ملازم بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھا۔ بلکہ اس بارے میں شاید وہ اوروں سے دو قدم آگے ہی تھا۔ مگر اس کے باوجود مولانا اسے اپنے برابر چارپائی پر ساتھ بٹھاتے۔ کھانا بھی اکثر و بیشتر وہ ساتھ ہی کھاتا۔ اسوۂ فاروقی پر تقریریں تو بہت سنی ہیں مگر اس پر عمل کرتے ہوئے کم ہی لوگوں کو دیکھا۔ افسوس کہ علماء تک میں یہ صفت مفقود ہے۔

استاذ مرحوم اپنے احباب و متعلقین کے تعلقات کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ نباہتے تھے اپنے محبین اور دوستوں کا اکثر ذکر کرتے رہتے خصوصیت کے ساتھ مولانا ابوالحسن۔ علی میاں صاحب ندوی اور مولانا محمد ناظم صاحب ندوی کا ذکر ہمیشہ کرتے۔ مولانا علی میاں صاحب کے بہت زیادہ مداح تھے۔ کوئی بزم اور کوئی محفل ان کے ذکر سے شاید ہی خالی رہتی ہو۔ اپنے دوست اور احباب کے علاوہ ہر صاحب جوہر کی قدر اور اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ذاتی بغض و عداوت کسی سے نہ تھی۔ لوگوں پر سخت سے سخت تنقیدیں کرتے مگر دل میں جذبۂ حقارت کسی کے لئے بھی نہ ہوتا۔

مولانا اپنے اساتذہ اور محسنین کے بڑے قدر شناس اور شکر گزار تھے۔ خصوصیت کے ساتھ سید صاحب علیہ الرحمۃ اور مولانا تقی الدین ہلالی[1] کے احسانات کو اکثر یاد کرتے رہتے تھے۔ مولانا ہلالی کے فضل و کمال کے ہمیشہ معترف رہے اور ان کے احسان کو وہ کبھی نہ بھولے۔ زمانۂ جنگ میں برلن ریڈیو سے ہلالی صاحب کی تقریریں نشر ہوتی تھیں۔ جرمنی کی شکست کے بعد کچھ دنوں تک مولانا ہلالی مفقود الخبر رہے۔ مولانا کو اس کا بہت دیا قلق رہا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے استاذ کی شکر گزاری اور محسن کی قدر شناسی کے لئے "الجائزة الهلالية" کے نام سے ایک انعام مقرر فرمایا۔ اور پچاس روپے کی ایک رقم دارالعلوم ندوہ کو دی کہ جو طالب علم عربی تقریر و تحریر میں اوّل آئے اسے انعام میں یہ رقم دے دی جائے۔ استاذ مرحوم میں ادب عربی کا اعلیٰ مذاق ہلالی ہی صاحب کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا۔

سید صاحب علیہ الرحمۃ کو تو وہ اپنا باپ ہی سمجھتے تھے۔ سید صاحب سے ان کو جس قدر تعلق تھا اس کا ذکر کچھ پچھلے صفحات میں بھی آچکا ہے۔ باقی اس کا اندازہ خود ان کے ان مضامین سے جو مختلف رسائل کے لئے انھوں نے سید صاحب کی وفات پر لکھے تھے کیا جاسکتا ہے ———

استاذ مرحوم نے ٹھوس اور تحقیقی مطالعہ کا ذوق سید صاحب ہی سے پایا تھا۔ یہ شمع بھی درحقیقت اسی شمع فروزاں سے روشن ہوئی تھی۔ مگر آہ! کہ فرشتۂ اجل نے اسے زیادہ دن تک روشن رہنے نہ دیا۔ اور چار ماہ کے اندر ہی اندر یہ شمع بھی گل ہوگئی ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے!

مبارک ہے کراچی کی وہ خاک جس کے لئے سرزمین بہار و ندوہ کا یہ دوسرا گوہر شب چراغ بھی مقدر تھا۔ اللہ تعالیٰ استاذ و شاگرد کی قبروں پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔ ندوی برادری کے لئے یہ دونوں حادثے بہت سنگین ہیں۔

استاذ مرحوم صفائی ستھرائی کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور بعض دفعہ اس میں غلو کی حد تک مبالغہ فرماتے۔ مشکل سے کوئی تنکا زمین پر نظر آتا۔ ہر روز کتابیں جھاڑی اور پونچھی جاتیں۔ جوتے خود ہی روز صاف کرتے، ہر چیز قرینہ سے رکھی ہوتی۔ جس چیز کی جو جگہ ہوتی اُسے وہیں رکھواتے تاکہ تلاش کرنے میں وقت نہ ہو۔ طبیعت میں بے حد نظافت تھی۔ ہر چیز میں اعلیٰ ذوق اور ستھرے مذاق کے قائل تھے۔ مگر تزئین و آرائش اور "بناؤ سنگھار"

---

[1] مولانا تقی الدین الہلالی المراکشی استاذ مرحوم کے تکمیل ادب کے زمانے میں استاذ ہو کر ندوہ آئے تھے اور شعبۂ ادب عربی کے انچارج تھے۔ ہلالی صاحب کا شمار ان اساتذہ کبار میں ہوتا ہے۔ جن کی تحقیق زبان و ادب کے معاملہ میں سند مانی جاتی ہے۔ مولانا ناظم صاحب۔ مولانا علی میاں اور استاذ مرحوم کی متفقہ روایت ہے کہ ہلالی صاحب جب بات کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ عربی زبان کی کوئی معیاری کتاب پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ ہلالی صاحب کا قیام ندوہ میں تین سال سے زائد نہ رہا (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء / [illegible])۔ مگر اس مدت میں انھوں نے اپنے فیض تربیت سے تین ایسے لائق ترین شاگرد پیدا کر دیئے جو عربیت کے صحیح ذوق سے نہ صرف آشنا ہیں بلکہ آج کی معیاری زبان لکھنے پڑھنے پر اہل زبان اور ادبا کی طرح قدرت رکھتے ہیں۔

سے ان کو سخت نفرت تھی۔ وہ اپنے طلبا کو متنعم پسند اور تن آسان دیکھنے کے بجائے جفاکش و محنتی دیکھنا چاہتے تھے۔ سادہ اور آسان معیشت کو پسند کرتے تھے۔ فرماتے: میں نے بہت سارے تکلفات سے اپنے کو پاک کر لیا ہے۔ زمانے میں صابن استعمال نہیں کرتے۔ موٹا اور معمولی لباس پہنتے تھے۔ آخر وقت تک مولانا کا معیارِ زندگی یہی رہا۔

مولانا کے اوقات بڑے منضبط تھے۔ وہ اصولی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ نظم و ضبط پر اتنا زور دیتے کہ جیسے زندگی کو مشین بنا دینا چاہتے ہوں۔ غالباً اس معاملہ میں وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے پیرو تھے۔ مولانا مرحوم اگر اپنے اوقات میں ضبط و نظم کا اتنا اہتمام نہ کرتے تو وہ اپنی جانگسل بیماری کے باوجود علم و ادب کی اتنی خدمت نہ کر سکتے تھے۔ بے نظمی اور بے قاعدگی سے وہ سخت کوفت محسوس کرتے۔ "حساب جو جو اور بخشش سو سو" کے قائل تھے۔

مولانا کی تصنیفات

مولانا نے اپنے پیچھے چند یادگار تصنیفیں چھوڑی ہیں۔ ان کی سب سے اہم تصنیف "تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند و باکستان" ہے۔ جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہے۔ اس کا ایک خلاصہ "نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ" کے نام سے حال ہی میں طبع ہوا ہے۔ اردو میں "اسلام اور اشتراکیت"۔ "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک"۔ "ایک بدنام و مظلوم مصلح محمد بن عبدالوہاب"۔ "مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار پر ایک نظر"۔ "دیارِ عرب میں چند ماہ"۔ اہم تصنیفات ہیں۔ عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمہ کے لئے "الترجمۃ العصریۃ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ جو دوسرے ایڈیشن کے بعد ایک عرصہ سے ناپید تھی۔ اب دوبارہ اس پر نظرِ ثانی کر کے دو حصوں میں شائع کرا رہے تھے۔ پہلا حصہ چھپ چکا تھا اور دوسرے کی کتابت ہو رہی تھی۔ سید صاحب علیہ الرحمۃ نے ایک کتاب "لغاتِ جدیدہ" کے نام سے تالیف فرمائی تھی۔ زمانے کی ضروریات اور اس کی روز افزوں ترقی سے نئے نئے الفاظ اور مصطلحات پیدا ہو رہے تھے۔ اس لئے کچھ عرصہ کے بعد اس میں اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سید صاحب علیہ الرحمۃ نے یہ خدمت استاذ مرحوم کے سپرد کی۔ استاذ مرحوم نے اس پر معقول اضافہ کیا اور نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں کے ورود اختیار اور حسن و قبح پر ایک مبسوط مقدمہ بھی سپردِ قلم فرمایا۔ جس سے کتاب کی معنوی حیثیت بہت بڑھ گئی ——— سید صاحب کے بعض مضامین کے ترجمے مولانا مرحوم کے قلم سے "الضیاء" میں شائع ہوئے تھے۔ اسی طرح مولانا مودودی کے بعض رسائل کا ترجمہ استاذ مرحوم نے خود ہی اپنے قلم سے کیا تھا۔ ادھر دس سال سے تو ان کا قلم دارالعروبہ ہی کے کاموں کے لئے وقف ہو چکا تھا۔ مضامین، خطوط، تالیف اور ترجمے سب دعوتِ اسلامی ہی کے سلسلہ کی چیزیں تھیں۔ ایک عربی رسالہ کا اجرا بھی پیشِ نظر تھا۔ سات آٹھ سال پہلے ڈیکلریشن کے لئے فارم بھی داخل کر چکے تھے۔ مگر متعدد رکاوٹوں کے باعث اب تک یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا تھا۔ اور مولانا اس دنیا سے چل بسے۔ کاش یہ رسالہ مولانا کی زندگی میں نکل گیا ہوتا تو عاصم صاحب کو اس کے جاری رکھنے میں سہولتیں ہوتیں۔

استاذ مرحوم کی وفات جماعتِ اسلامی کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان اور سانحۂ عظیم ہے۔ استاذ مرحوم جماعتِ اسلامی کے نہ صرف اہم رکن تھے بلکہ اس کے تین بڑے اساطین میں سے ایک تھے۔ مولانا مودودی کے دست و بازو تھے۔ افسوس کہ استاذ مرحوم کی موت سے مولانا کا ایک بازو کٹ گیا۔ بلا مبالغہ عربیہ سے جماعتِ اسلامی کا ربط تنہا ان کی ذات سے قائم تھا اور ان سے بڑھ کر زیادہ موزوں اس کام کے لئے دوسرا ہو بھی کون سکتا تھا؟ مگر قضاء و قدر کا فیصلہ یہی تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ انسان جس کی نظر اسباب و علل سے آگے نہیں جاتی۔ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو کیا جانے۔ استاذ مرحوم کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کے پُر ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں۔ وہ اپنے فطری مواہب اور ذاتی خصوصیات کی وجہ سے عالمِ اسلام کا ایک قیمتی سرمایہ تھے۔ معدودے ایسے آدمی کہاں پیدا

چند یادیں

عبدالحمید صدیقی ایم اے

کائنات نے اپنی بقا کے لئے کبھی اشخاص کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں جو زندگی بھی نظر آتی ہے وہ چند باہمت اشخاص ہی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ شخصیتیں اگرچہ دنیا سے اٹھ جاتی ہیں۔ مگر ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے موت اُن کے جسموں کو فنا کر دینے پر قدرت رکھتی ہے مگر ان کی عظمت اس کی دستبرد سے ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ یہ لوگ اپنے پیراہن خاکی میں زندہ نہ سہی مگر اپنے اعمال و افعال، خیالات و تصورات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جیتے ہیں۔ اپنے رفیق اعلیٰ کی قربت انہیں اس دنیا سے دُور نہیں کرتی۔ انسانیت کے قافلے اُن کے نقشِ پا کو دیکھ کر فوراً پکار اٹھتے ہیں۔ ع

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

مرحوم مولینا مسعود عالم ندوی کا بھی انہی چند خوش نصیب لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ ایک فرد نہیں تھے بلکہ اپنی ذات میں ایک تحریک۔ ایک انجمن تھے۔ اس لئے اُن کی موت ایک فرد کی موت، نہیں بلکہ ایک ادارہ کی موت ہے۔

میری مرحوم سے پہلی ملاقات غالباً جنوری ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ ہم کوئی آٹھ دس آدمی شام کے وقت اپنے ایک محسن حافظ عبدالعالی صاحب کے ہاں چودھری علی احمد صاحب کے خیالات سے مستفید ہو رہے تھے کہ اچانک ایک نحیف صورت انسان اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ میں داخل ہوا۔ اُس کا وقار کچھ اس قسم کا تھا کہ ہم سب کھڑے ہو گئے۔ یہ صاحب چودھری علی احمد صاحب سے بغلگیر ہوئے اور اس کے بعد ہم سب کا تعارف ہوا۔ "یہ ہیں مولینا مسعود عالم صاحب" چودھری صاحب نے کہا۔ میں نے بڑی ہی عاجزی سے ہاتھ کو مصافحہ کیلئے آگے بڑھایا۔ مولینا نے محبت بھرے انداز میں اسے جھٹکا دیا۔ اُن کے اس انداز میں معلوم ہوا کہ مولینا اگرچہ جسمانی طور پر نحیف اور کمزور ہیں۔ مگر مسلسل بیماری اُن کے عزائم کو نڈھال نہیں کر سکی۔ اُن میں زندگی کی حرارت بدرجہ اتم موجود ہے، ان کی آنکھوں میں ذہانت کی اتنی چمک تھی کہ میں بار بار اُن کی آنکھوں کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا۔ مگر مقابلہ کی ہمت نہ پا کر پھر پسپا ہو جاتا۔ ہم دیر تک بیٹھے مولینا کی باتیں سنتے رہے۔ کبھی تقسیم اور اس سے پیدا شدہ صورتِ حالات پر وہ بڑے ہی اعتماد سے تبصرہ فرماتے۔ کبھی مسلمانوں کی مظلومیت اور اُن بے بس عورتوں کا تذکرہ کرتے جو ہندوستان رہ گئی تھیں۔ یہاں آکر اُن کی آواز پست ہو جاتی اور بعض اوقات آنکھوں میں آنسو بھی امڈ آتے۔ عشاء کی نماز کے بعد میں وہاں سے رخصت لے کر گھر آیا۔ راستے میں یہ سوال اپنے سے بار بار پوچھتا کیا یہی وہ دائم المریض انسان ہے جسے پوری اسلامی دنیا عربی کے ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے جانتی ہے"؟ کیا یہی وہ کمزور شخص ہے جو تحریک اسلامی کا ایک سرگرم مجاہد ہے'؟ کیا یہی مولینا مودودی کا دستِ راست ہے؟ کیا اسی کی علمیت کے اپنے اور پرائے سب معترف ہیں۔ خیالات کی اس دنیا میں گھومتا ہوا۔ میں کبھی کبھی مابعد الطبعی مسائل پر بھی سوچنا شروع کرتا' مجھے اس وقت احساس ہوتا کہ عالم طبیعی اور عالم اخلاق ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کتنے دُور ہیں۔ مال و اسباب' قوت و دولت کے سہارے جنہیں ہم اپنی مادی زندگی میں بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ انسان کی اخلاقی زندگی میں کس قدر حقیر اور غیر اہم ہیں۔ مسبب الاسباب

کس طرح اپنے محبوب بندوں کو اُن سے بے نیاز کر دیتا ہے ۔ اس لئے ان کے ہاتھوں میں، اُن کی حیثیت ذرائع کی ہی رہتی ہے، یہ مقصد نہیں بننے پاتے ۔ یہ کرہ وری اور یہ عزم ۔ یہ بیماری اور یہ ریاضت، یہ قوت و جبروت اور یہ فقر و انکسار اضداد کا یہ حسین امتزاج ——— یہی مولینا کی اصل شخصیت تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہماری خوش نصیبی کہ کچھ عرصہ کے بعد مولینا گوجرانوالہ میں ہی اقامت پذیر ہو گئے اور ہمیں انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ ان کی سیرت میں مجھے جو چیز سب سے نمایاں نظر آئی وہ ان کا "بے ساختہ پن" ہے ۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے گرد پُراسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ دوست ہو یا دشمن، بڑا ہو یا چھوٹا، عالم ہو یا جاہل سب سے پوری فراخدلی کے ساتھ ہمکلام ہوتے ۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رکھا جس کو دیکھنے کے لئے کوئی بیتاب ہو، مگر مولینا اُس کی راہ میں مزاحم ہوئے ہوں ۔ اُن کی اس خوبی کی وجہ سے انہیں نقصان بھی پہنچا ۔ بعض دوستوں نے باتوں باتوں میں انہیں یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ یہ روش اس زمانے میں ٹھیک نہیں مگر انہوں نے ان سب چیزوں کو پر کاہ کے برابر بھی نہ سمجھا اور اُسی راستے پر گامزن رہے ۔ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا نہ دیکھا کہ انہوں نے اپنی علمیت کی وجہ سے کسی شخص پر اجنبیت اور ہیبت طاری کرنے کی کوشش کی ہو ۔ آپ اُن کے پاس جایئے چند ثانیے ان کی باتیں سُنیئے ۔ اور پھر یوں معلوم ہوگا کہ جیسے مولینا آپ کے کئی سالوں سے ہمراز چلے آتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص جسے کبھی انہیں ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کے ساتھ بالکل بجا طور پر دوستی کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔ وہ ہر ایک کے ساتھی تھے ۔ ہر ایک کے دُکھ درد میں شریک ہوتے ۔ انہوں نے اپنے تعلقات میں کبھی مغربی قسم کی بازیگری روا نہیں رکھی ۔ ان کی باتیں ابہام پرستی اور رمزیت سے کوسوں دُور رہتیں ۔

دوسری بات جو مجھے ان کی ذات میں سب پسندیدہ نظر آئی وہ ان کی حق پرستی تھی ۔ اس مختصر سی زندگی میں مجھے بہت کم ایسے لوگ نظر آئے ہیں جو اپنے خلاف بھی حق بات بغیر کسی تامل کے کہہ دیں ۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک صاحب علم دوسروں کی علمیت کا اعتراف کرنے میں ذرا بخل سے کام لیتا ہے، ایک رائے جس کا اُس نے اظہار کر دیا ہے، اُس کو غلط جان لینے کے باوجود اُس کے بدلنے میں دشواری محسوس کرتا ہے ۔ مگر مولینا اس معاملہ میں بہت ممتاز تھے ۔ ایک دن میں مولینا کے پاس قرآن پاک کی چند آیات سمجھنے کے لئے حاضر ہوا ۔ مولینا نے بکمال مہربانی میری مشکلات میں راہنمائی فرمائی ۔ مگر اٹھتے وقت فرمانے لگے کہ اگر قرآن سمجھنا ہے تو مولینا امین احسن اصلاحی کی طرف رجوع کرو ۔ وہی میرے نزدیک ہم میں سے اس وقت اس کام کے سب سے زیادہ اہل ہیں ۔ پھر ارشاد کیا کہ میں بات کسی قسم کے تکلف کے بغیر کہہ رہا ہوں ۔

ایک دوسرے موقع پر مولینا مودودی کا ذکر چھڑ گیا ۔ کہنے لگے ۔ بھائی مولینا کا کیا ذکر کرتے ہو ۔ وہ تو ہم سے کوسوں آگے ہیں ۔ دین میں جتنا انہیں تفقہ حاصل ہے ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ اس سلسلہ کلام میں مَیں نے عرض کیا ۔ مولینا مودودی صاحب میں آپ کو سب سے نمایاں خوبی کونسی نظر آتی ہے ؟ ۔ فرمانے لگے "حلم" ۔ بھئی وہ تو حلم کا ایک پہاڑ ہیں ۔"

مولینا مسعود عالم مرحوم کو اپنے شفیق استاد مولینا سید سلیمان ندوی اور محترم دوست مولینا ابوالحسن ندوی سے بے پناہ محبت تھی ۔ جب کبھی ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ بالکل والہانہ انداز میں ان کی خوبیاں بیان فرماتے ۔ استاد محترم کے بارے میں کہا کرتے تھے " اُن جیسا مقدس عالم اس وقت مشرق و مغرب میں کوئی نہیں ۔ مجھے ان سے بڑی عقیدت ہے ۔ میرے نزدیک اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت یہی ہے کہ وہ میرے شفیق استاد ہیں " ۔ مولینا ابوالحسن ندوی سے انہیں عقیدت کے علاوہ محبت بھی تھی ۔ ان کی سیرت و کردار کے وہ بے حد مداح تھے ۔ میں نے یہ فقرہ کئی بار اُن سے سنا ہے " علی میاں ایسا شریف النفس اور نیک انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا"

علم اور تقویٰ جن حضرات میں بھی انہیں نظر آتا۔ وہ بڑی فیاضی کے ساتھ ان کا اعتراف کرتے۔ بزرگوں اور دوستوں کے متعلق ہی نہیں بلکہ اپنے عقیدت مندوں تک کے معاملہ میں اُن کا یہی رویہ تھا۔ ابوالسلام نعیم صدیقی کی خداداد صلاحیتوں کا میں شروع ہی سے معترف رہا ہوں۔ انہوں نے جس بے مثال محنت اور ایثار سے مولینا مودودی اور ان کے رفقا کار مولینا امین احسن اصلاحی۔ اور میاں طفیل محمد کی نظر بندی کے زمانہ میں تحریک اسلامی کو اپنا طرز جگر دے کر غذا فراہم کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا سخت ناانصافی ہے۔ مولینا سے بھی ان کا کئی بار تذکرہ ہوا اور انہوں نے مجھ سے پورا پورا اتفاق کیا۔ نعیم صاحب کے وہ اداریے جو وہ ترجمان القرآن میں لکھتے تھے۔ مولینا انہیں خاص شوق سے مطالعہ فرماتے اور کہتے۔" یہ شخص دیکھتے دیکھتے کہیں کا کہیں جا پہنچا ہے" اس سلسلہ کی ایک بات مجھے ہمیشہ یاد رہیگی۔ کراچی میں جماعت اسلامی کا سالانہ اجتماع تھا۔ مولینا بھی شرکت کی غرض سے وہاں تشریف لے گئے۔ نعیم صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں "تحریک اسلامی کا دوسری تحریکات سے تقابل" کے موضوع میں ایک عالمانہ تقریر فرمائی۔ وہ تقریر کیا تھی۔ خیالات کا ایک سیل بے پناہ امڈ رہا تھا۔ سامعین اس میں پوری طرح غرق تھے۔ تقریر کے خاتمہ پر مولینا سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ نعیم صاحب کی اس تقریر کی تعریف کر رہے تھے مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے نعیم تو "GENIUS ہے GENIUS"

یہ چند باتیں جو مولینا مرحوم نے دوسرے کے بارے میں کہیں۔ اُن کی اپنی شخصیت کے ایک پہلو کو بھی اُجاگر کرتی ہیں۔ علمی امتیاز و تبحر اور عالمی شہرت و وقعت حقیقت کے اعتراف میں کبھی مانع نہیں ہوئے۔ وہ حق کی طرف بڑی جرأت کے ساتھ بڑھتے۔ جب انہیں جماعت اسلامی کے مقصد اور طریق کار سے اتفاق ہوا تو پھر ندوہ بیت اور تحریک دارالسلام کا فاصلہ۔ مولینا سید سلیمان ندویؒ اور مولینا مودودی کے طرز فکر کا فرق اور بہت سے مسائل میں خود اپنی رائے اور تحقیق کا اختلاف جیسے جو بہت سے حجابات سدِّ راہ ہو سکتے تھے۔ اُن میں سے کوئی بھی ان کا راستہ نہ روک سکا اور اللہ کے اس نیک بندے نے جس طرف جانے میں خیر دیکھا۔ اُسی طرف بڑھتا چلا گیا۔ پرانی دلچسپیاں۔ دیرینہ رفاقتیں کسی طرح بھی اُن کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔

جماعت میں شریک ہونے کے بعد بھی اُن کے اُس طرز عمل میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ اس حامئ توحید و سنت وماحئ شرک و بدعت نے جہاں کہیں بھی کسی لحاظ میں کوئی کمی محسوس کی، فوراً ٹوکا اور اس معاملہ میں کسی دوستی اور تعلق کی پرواہ نہ کی۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ آنکھیں بند کر کے سمعنا و اطعنا تو صرف نبی معصوم ہی کے قول پر کہا جا سکتا ہے۔ باقی کسی دوسرے کے معاملہ میں یہ روش اختیار نہیں کی جا سکتی۔

مرحوم سے میری آخری ملاقات اُس دن ہوئی جب وہ کراچی میں مجلس شوریٰ کی شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ راستہ میں گوجرانوالہ رُک گئے۔ رات کو دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ سیاست، فلسفہ، تاریخ سے لے کر نجی سے نجی مسائل زیر بحث آئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ مولینا شاید اسی ملاقات کے منتظر تھے فرمانے لگے۔" حمید صاحب آجکل کیا کرتے ہو" میں نے عرض کیا " جناب ملازمت" چند ثانیہ کے سکوت کے بعد پھر کہا۔ "کسی طرح اس ملازمت سے چھٹکارا حاصل کرو اور یکسوئی کے ساتھ دین کی خدمت کرو۔ میں بھی کچھ دیر ملازم رہا۔ مگر جلد اکتا گیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ انسان کی پرواز میں حائل ہوتی ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں اس سے نقصان پہنچتا ہے، رازق تو اللہ ہی ہے۔ وہ رزق کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ بس چھلانگ لگانا مشکل ہے چودھری علی احمد اور ملک سعید صاحب نے ان بندھنوں سے آزاد ہو کر علمی و عملی دونوں لحاظ سے بہت ترقی کی ہے، کیا تمہاری ملک سعید سے ملاقات نہیں ہوئی"؟ میں نے عرض کیا" جناب کئی بار وہ آپ کی "جبری غیر حاضری" کے زمانہ میں صوبے کے امیر رہے اور میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ بڑے ہی شریف اور زہین انسان ہیں۔ انہوں نے اس خدمت کو خوب نبھایا" یہ سُن کر بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے "میں اُن کی صلاحیتوں اور

([illegible])

استاد کی یاد میں

عنایت الرحمٰن صدیقی بی اے

زندگی کے دن یوں تو کتنے طویل ہیں مگر جب گزر جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کل کی بات ہے، مجھے استاد مکرم مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی خدمت میں کم و بیش ایک سال رہنے کا موقع ملا، یہ سال جو میں نے اس سخت گیر مگر باپ سے زیادہ شفیق استاد کے زیر سایہ بسر کیا، میری زندگی کے اور بہت سے سالوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور اس وقت کی ایک ایک چیز غالباً اس لئے ذہن میں نقش ہے کہ وہ زندگی کے آنے والے دور میں روشنی کا کام دے گی، استاذ مکرم کو ہم سے جدا ہوئے ایک عرصہ ہوا اور عجب تو یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ ہمارے دلوں کے قریب ہو رہے ہیں، اب میں اس شعر کا اصل مطلب سمجھا جو وہ کبھی کبھی ہمیں سناتے تھے

سَأَطْلُبُ بُعْدَ الدَّارِ عَنْكُمْ لِتَقْرُبُوا
وَتَسْكُبُ عَيْنَايَ الدُّمُوعَ لِتَجْمُدَا

مولانا مرحوم شاگردوں کی تربیت میں انتہائی شدت سے کام لیتے تھے اور جو شاگرد ان کی اس سختی کو برداشت کر لیتے تھے ان پر انتہائی مہربان بھی تھے اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو ان کی میزان میں پورے اترے، مولانا مرحوم کے سب سے قدیم اور عزیز شاگرد جناب سید نقی الحسن تھے جو نہایت مخلص رفیق اور بہترین کارکن تھے، اس کے بعد بندہ کو ایک سال تک آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع حاصل ہوا اور الحمد للہ کہ مولانا تا حین حیات اپنے قیمتی مشوروں اور ہدایات سے نوازتے رہے، بعد ازاں عاصم صاحب آئے اور ماشاء اللہ مکمل طور پر تربیت یافتہ ہو کر اس قابل ہو گئے کہ اب دار العروبہ انہی کی نگرانی میں چل رہا ہے! اس کے علاوہ اور بھی کئی ایک حضرات خصوصی تربیت کے لئے مولانا کے پاس وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہے اور فیضیاب ہوتے رہے۔

ہمارے استاد مرحوم کی درشتی طبعی کا ایک سبب ان کا مستقل طور پر بیمار رہنا بھی تھا، وہ ہمیشہ دوا کا استعمال کرتے اور سخت پرہیز کی بدولت وہ حد درجہ کے ذکی الحس ہو گئے تھے، اس کا اثر ان کے شاگردوں اور ساتھیوں پر بھی پڑتا، مگر جہاں تک میرے ذاتی تجربہ کا تعلق ہے، مولانا مرحوم کی سختی کی اصل وجہ ان کا اللہ کے دین کے بارے میں متشدد ہونا ہے، بہت سے لوگ ایسے دیکھنے میں آتے ہیں جو دین کی فروعات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے لیکن مولانا بنیادی مسائل کے علاوہ دین کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خود بھی سختی سے عمل پیرا ہوتے اور ہم سب کو اس کی تلقین کرتے تھے، اگر آپ کی سختی کی وجہ محض بیماری ہوتی تو شدید سے شدید بیماری کے عالم میں ہم سے اکثر دفعہ ایسا سلوک نہ کرتے، جیسے ایک باپ اپنے بیٹے سے سلوک کرتا ہے، جہاں آپ اتنے متشدد تھے وہاں اتنے حلیم الطبع بھی تھے کہ بڑے سے بڑے نقصان پر بھی کسی ملازم یا کسی رفیق کو سرزنش نہ کرتے، اور پھر ان کی سختی ان لوگوں تک محدود تھی جو ان کی سختی کو سختی نہ سمجھتے تھے۔ عام لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ انتہائی ہمدردانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا، وہ ہم سب کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے اور کھانے کے آداب بتاتے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں پہلے دن مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے سر پر انگریزی بال دیکھ کر مسکراتے ہوئے گراس (Grass) سے فرمانے لگے۔

[illegible] چنانچہ میں نے سر تسلیم خم کیا اور جگہ کو صاف کرا دیا، اس پر بہت خوش ہوئے فرمانے لگے: ابھی جگہ بنا ہے۔ اس بیماری کے عالم میں بھی نماز پابندی سے ادا کرتے اور اگر طبیعت ذرا بحال ہوتی تو نماز با جماعت ادا کرتے، صفائی کا اتنا خیال کہ کم و بیش پندرہ منٹ صاف موجود رہتے اور سادگی کا یہ عالم کہ کھدر کے سوا کوئی کپڑا استعمال نہ فرماتے۔

مولانا کی معیت میں رہنے والے جملہ رفقاء ان کی عادات و خصائل اور سرگرمیوں سے پوری واقفیت رکھتے ہوں گے اور اس خاص نمبر میں یقیناً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی مگر ایک مختصر سا مگر تاریخی زمانہ ایسا بھی ہے۔ جب کہ مولانا مرحوم کے ساتھ رہنے کا شرف صرف بندہ کو حاصل ہوا ہے یا نہیں انتہائی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ ایسے وقت میں قدرت نے ایسے وسائل مہیا کر دیئے کہ مجھے اس نازک وقت میں استاذ مرحوم کی خدمت کا پورا پورا موقع ملا۔ یہ زمانہ تقسیم ملک کا تھا جب کہ ہندوستان کی سرزمین دو مختلف حصوں میں بٹ گئی اور ہر قوم کو خصوصاً مسلمانوں کو اپنی آزادی کی خاطر کیا کیا قربانیاں کرنا پڑیں؟ اعلان آزادی سے چند دن قبل میں مدرسۃ الاصلاح اعظم گڈھ سے بذریعہ پنجاب ایکسپریس اپنے وطن راولپنڈی کو واپس آ رہا تھا کہ میرے دل میں استاذ مرحوم سے ملنے کا شوق پیدا ہوا جو اس وقت اڈہ گوردوارہ (جالندھر) میں قیام پذیر تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں ایک دو دن ان کے پاس رہ کر پھر پنڈی کو روانہ ہوں گا، چنانچہ میں جالندھر اترا عاصم صاحب مالیر کوٹلہ گئے ہوئے تھے، ایک ملازم تھا سو وہ بھی اتفاق سے چھٹی پر چلا گیا وہاں صرف مولانا مرحوم تھے اور میں!———

ہاں تو وہی رات تھی جب کہ فضا اچانک نعروں سے گونج اٹھی، ہر طرف شور برپا ہوا، کہیں مکانوں کو آگ لگ رہی ہے، کہیں مارو پکڑو کی آوازیں ہیں، کہیں بچے چیخ رہے ہیں الغرض ایک قیامت صغریٰ کا نمونہ تھا، جالندھر میں اس آوے کا اور اچانک پریشانی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے لوگ اپنی اکثریت پر نازاں تھے اور مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ جالندھر اور گورداسپور کے علاقے پاکستان سے جدا نہیں رہ سکتے مگر ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور ان کے لئے تقسیم کی موجودہ صورت ایک آفت ناگہانی بن گئی——— مولانا مرحوم کی طبیعت پہلے سے کچھ ناساز تھی مگر ان حالات سے نہ تو خوف زدہ ہوئے اور نہ ہی ان کی بیماری میں اضافہ ہوا بلکہ مجھے پوری تسلی دیتے رہے، دوسرے دن کی صبح تھی کہ ہمارے مکان کے پھاٹک کے آگے بلوچ رجمنٹ کے کچھ سپاہی کھڑے تھے اور مسلمان جوق در جوق اپنے بچوں اور عورتوں سمیت شہر کو خیرآباد کہہ رہے تھے، یہ منظر دیکھ کر مولانا کو انتہائی قلق ہوا اور فرمانے لگے۔

"اللہ اس قوم پر رحم کرے"۔

دار الصحوہ کا آفس جس مکان میں تھا اور جہاں ہم رہتے تھے وہ ایک سکھ کا مکان تھا اور اس کے چاروں طرف ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی تھی۔ وہ لوگ ہمیں بار بار یقین دلاتے تھے کہ آپ اطمینان رکھیں، اس مکان کی ہم خود حفاظت کریں گے اور یہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا اس لئے کہ آپ کا استاذ ہمیشہ ہمارے ساتھ اچھا رہا، لیکن مولانا فرماتے کہ جہاں قومیں آپس میں ٹکرا رہی ہوں افراد پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور کم از کم اس وقت تک جب تک یہ کشمکش جاری ہے، بھروسہ و اعتماد پیدا کرنے والی چیزیں صرف ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالکتاب ہے، اسی عالم محصوری میں ہم نے سات دن بسر کئے، نکلنا امکان سے باہر تھا، اگر مولانا کو تازہ پانی کی ضرورت ہوتی تو دروازے کے باہر کا سپاہی میرے ساتھ جاتا اور میں اسی ہنگامے میں کوئیں سے پانی لاتا، اتنا توشہ تھا کہ ہم چھ سات دن تک اسے استعمال کرتے رہے۔ اس کے بعد جب فضا میں کچھ سکون پیدا ہوا اور مدرسۃ البنات کے لئے کچھ لاریاں پاکستان کی جانب سے آئیں تو مدرسۃ البنات کے مہتمم مولوی عبد الحق صاحب نے مولانا مرحوم کو ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ مولانا آمادہ تھے اور مجھے فرمایا کہ میری تمام کتابوں کو الماری میں بند کر دو اور ضروری کتابیں و کپڑے ساتھ لے لو، ہم نے ایسا ہی کیا اور ہم دروازے بند کر کے مدرسۃ البنات جو پاس ہی تھا پہنچے، وہاں سے ایک ٹرک پر سوار ہو گئے، گرمی زیادہ تھی اور دھوپ کی کافی تیزی تھی، میں نے ایک چھتری تان کر مولانا پر سایہ کیا۔ سفر کی اس شدید کلفت کے باوجود الحمد للہ راستے میں کوئی

تکلیف نہیں ہوئی اور ہم سب بخیریت تمام لاہور پہنچے ——————!

استاد مرحوم ملکی و غیر ملکی حالات پر اکثر تبصرہ فرماتے اور پوری طرح باخبر رہتے وہ انگریزی، اردو اور عربی اخبارات و رسائل کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے اور ان کے فائل رکھتے تھے اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اس لئے کہ سیاست شروع سے آپ کی زندگی کا ایک حصہ رہی اور جب تک صحت نے آپ کو اجازت دی اس میں عملی طور پر بھی حصہ لیتے رہے۔

مولانا مرحوم راہنماؤں میں سے سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے استادوں میں سلیمان ندوی عطا ربانی، دوستوں میں سید علی الندوی، ادیبوں میں نعیم صدیقی، شاگردوں میں سید قطبی الحسنی اور کارکنوں میں محمد عاصم کا ذکر اکثر فرماتے اور یاد کرتے تھے مگر آپ کی تنقید سے کوئی نہ بچتا۔ جہاں کہیں آپ کسی میں خامی پاتے، خواہ وہ کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو اُسے بروقت ٹوک دیتے، اپنے لین دین میں کھرے اور معاملے کے بالکل صاف تھے، با اخلاق، خوش طبع اور صاحب ذوق تھے۔ مگر کسی کی خوشامد نہیں کرتے تھے۔

استاذ مرحوم کی زندگی کا واحد مقصد اعلائے کلمۃ اللہ تھا۔ جس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اور تادم زلیست اس مقصد کو پورا کرتے رہے۔ —————— مگر افسوس صد افسوس کہ عالم اسلام کا یہ درخشندہ ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ جب کہ قوم کو اس کی اشد ضرورت تھی۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ؕ

فَكَأَنَّهَا وَكَأَنَّهُمْ أَحْلَامُ ، ثُمَّ انْقَضَتْ تِلْكَ السُّنُونُ وَأَهْلُهَا

(بقیہ اپنی یادیں صفحہ ۱۱۹)

خوبیوں کو دیر سے جانتا تھا۔ اور اس انتظار میں تھا کہ یہ کب اجاگر ہوں۔ خدا نے موقع پیدا کر ہی دیا۔ مجلس شوریٰ کے تمام ارکان بجز ملک صاحب کے گرفتار ہو گئے اور اللہ نے اس خدمت کے لئے انہیں منتخب کیا۔ اس بوجھ نے اُن کی طبیعت کو جلا دی ہے۔ اس زمانہ میں ان کی وہ وہ خوبیاں اُبھر کر سامنے آئی ہیں، جن سے میں بھی ناشناسا تھا۔ اس گفتگو میں رات کے دس بج گئے۔ میں نے اس خیال سے کہ مولینا کا اب آرام کا وقت ہے اجازت چاہی۔ لطیف صاحب بھی میرے ساتھ اُٹھنے لگے۔ فرمانے لگے۔ بیٹھو بھائی۔ کچھ دیر تو اور بیٹھو۔ کون سی جلدی ہے ہم کچھ دیر کے لئے اور بیٹھ گئے۔ چند منٹوں کے بعد جب رخصت لے کر گھر جانے لگے تو مولینا بھی اُٹھ بیٹھے اور ہمارے اصرار کے باوجود ہمارے ساتھ چل دیئے۔ جب مین گیٹ سے باہر نکلنے لگے۔ تو میں نے عرض کیا۔ مولینا اب تو آپ کی صحت نسبتاً اچھی معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا۔ "صحت اچھی کیا ہونی ہے۔ بس لائیف کے خلاف STRUGGLE کر رہا ہوں (STRUGGLE) باہر نکل کر میں نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ مولینا بغلگیر ہوئے۔ اس دن مجھے ان میں غیر معمولی مسرت اور مسرت دکھائی دی۔ پھر بڑے ہی محبت بھرے انداز میں فرمایا۔ "خدا حافظ"۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ "خدا حافظ" وہ آخری بار کہہ رہے ہیں اور کہہ کہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہونے والے ہیں۔ مجھے اس کا تصور بھی نہ تھا۔ کہ حوادث روزگار کے، امواج سمندر میں چٹان کی طرح استقلال کے ساتھ کھڑا رہنے والا یہ شخص اب موت کے سامنے سپر ڈالنے کے لئے تیار ہو چکا ہے۔ چند دنوں کے بعد یہ روح فرسا خبر سنائی دی کہ مولینا مسعود عالم اپنے خالق سے جا ملے ہیں ——!

اُن کی یاد میں رونا بھی بے سود ہے۔ مگر بن روئے رہنا بھی ناممکن۔

مولینا: آپ کے نیاز مندوں اور چاہنے والوں نے آپ کی موت پہ مرثیے لکھے۔ آپ کے احباب نے آپ کے مزاق میں آہ جگر سوز کھینچی۔ جاننے والوں نے آپ کے اوصاف گنائے۔ ماننے والوں نے آپ کے احسانات یاد کئے۔ مگر یہ سب کچھ انہوں نے خود اپنے لئے کیا۔ ان کا یہ حق تھا جس کو ادا کرنے کی انہوں نے کسی حد تک کوشش کی۔ مگر آپ کی ذات کے

سوانح اور شخصیات و کردار کا مطالعہ

——— مولانا امین احسن اصلاحی

——— محمد عاصم

——— لالۂ صحرائی

مولانا مسعود عالم ندویؒ کی بعض ناقابلِ فراموش خوبیاں

امین احسن اصلاحی

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم سے میرے تعلقات بہت کم رہے۔ میں نے ان کو پہلی بار غالباً ۱۹۳۲ء میں دیکھا جب کہ وہ دارالعلوم ندوہ (لکھنؤ) میں شیخ تقی الدین ہلالی سے عربی ادب کی تکمیل کر رہے تھے۔ یہ سرسری ملاقات باہمی تعارف سے آگے نہیں بڑھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مرحوم نے دارالعلوم ندوہ ہی سے "الضیاء" کے نام سے ایک عربی رسالہ نکالا۔ اس رسالہ میں مضمون لکھنے کے لئے انہوں نے مجھے بھی دعوت دی۔ مضمون تو میں اپنی مصروفیتوں کے سبب سے ایک دو سے زیادہ نہ لکھ سکا۔ لیکن اس کے نکلنے کے بعد مرحوم کی ادبی صلاحیتوں کے سبب سے دل میں ان کے لئے ایک خاص جگہ پیدا ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد بھی تعلقات کچھ زیادہ نہیں بڑھے۔ بہت ہوا تو کبھی کبھار قرآن مجید سے متعلق کوئی مراسلت ہو گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے زیادہ قریب اس زمانہ سے ہوئے ہیں جب جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا ہے اور اقامت دین کی جدوجہد نے ہم دونوں کو ہم سفر بنا دیا ہے۔ لیکن اس ہم سفری کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ میرے اور ان کے تعلقات کی نوعیت اس کے بعد بھی محض علمی اور سیاسی ہی رہی۔ یہ ضرور تھا کہ میں ان کی حد درجہ قدر کرتا تھا اور وہ بھی میری راؤں اور میرے خیالات کی عزت کرتے تھے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا کہ ہم دونوں کو محض ذاتی تعلق کی کشش نے کبھی مجتمع کیا ہو۔ بیشتر ہم جماعتی یا علمی مسائل ہی پر غور و بحث کے لئے یکجا ہوتے تھے اور اس سے فارغ ہوتے ہی الگ ہو جاتے تھے۔ کچھ عرصہ ہم راولپنڈی میں ایک ہی شہر میں رہے لیکن وہاں بھی ملنا جلنا عموماً اجتماعی مقاصد ہی کے تحت ہوتا تھا۔ نجی اور ذاتی قسم کے روابط بہت کم رہے۔ لیکن اس ظاہری کم آمیزی کے باوجود اگر میں یہ کہوں کہ وہ میرے نہایت محبوب دوستوں میں سے ایک تھے تو اس میں سر مو مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کے ساتھ مجھے یہ خاموش محبت محض ان کی علمی و ادبی قابلیتوں کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس میں زیادہ دخل ان کی بعض اخلاقی خوبیوں کو تھا جن کا میں نے مختلف مواقع پر خود تجربہ کیا اور میں ان کی ان خوبیوں کا اس درجہ گرویدہ ہوا کہ مجھے بار بار یہ تمنا ہوئی کہ کاش یہ خوبیاں میں اپنے اندر بھی پیدا کر سکتا۔

میں مرحوم کی ان خوبیوں کو جن سے میں ذاتی طور پر بہت متاثر ہوا ہوں یہاں اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کروں گا اور ان کے بیان کرنے سے میرا مقصد محض مرحوم کے مداحوں میں شامل ہونا نہیں ہے اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ اب وہ وہاں ہیں جہاں وہ ہماری ہر قسم کی مدح و منقبت سے بالکل بے نیاز ہیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہمارے دوسرے ساتھیوں کو ان خوبیوں کے اپنانے کا شوق پیدا ہو۔

دل کی صفائی | مرحوم کی جن خوبیوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں سے ایک چیز ان کے دل کی صفائی تھی۔ میں نے ان کی اس خوبی کا بار بار تجربہ کیا۔ اس سلسلہ کے متعدد واقعات قابل ذکر ہیں۔ لیکن میں اختصار کے پیش نظر

مزید ایک واقعہ کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

ایک مرتبہ ایک مجلس میں مرحوم کی زبان سے اس ناچیز کی نسبت ایک ایسی بات نکل گئی جو میرے نزدیک صریحاً غلط بھی تھی اور بالکل بے سوچی سمجھی بھی تھی۔ میں نے اس کی سختی سے تردید کی اور مرحوم اس کی صحت پر اصرار کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مجلس بدمزگی پر ختم ہوئی اور مجھے ان سے ایک کبیدگی سی پیدا ہو گئی۔ اگرچہ میری اس کبیدگی کا علم چند احباب خاص کے سوا کسی کو نہیں تھا لیکن مرحوم کو اندازہ ہو گیا کہ مجھے ان کی بات کے سبب سے رنج پہنچا ہے۔ چند دنوں کے بعد غالباً انہوں نے حاضرین مجلس سے معاملہ کی تحقیق کی جس سے انہیں معلوم ہوا کہ اپنی رائے پر ان کا اصرار بجا نہیں تھا۔ چنانچہ فوراً انہوں نے مجھے معذرت کا ایک خط لکھا۔ جس میں اصل واقعہ سے متعلق اپنی غلط فہمی کا اقرار کرتے ہوئے دبی زبان سے انہوں نے اس بات کی شکایت بھی کی کہ میرے اپنے الفاظ بھی جو میں نے بھری مجلس میں ان کی تردید میں کہے کافی سخت تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ میرے الفاظ ناگوار بلکہ قابل اعتراض حد تک سخت تھے اور انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی جانب سے معذرت کے بعد میں بھی اپنے الفاظ کے لئے معافی خواہ ہوتا۔ لیکن میرا معافی خواہ ہونا تو الگ رہا میں نے اپنے رنج کا مزید اظہار یوں کیا کہ سرے سے ان کے خط کا جواب ہی نہیں دیا۔

چند دن انہوں نے میرے جواب کا انتظار کیا۔ میرے اور ان کے تعلقات کتنے ہی سادہ قسم کے سہی لیکن اس بات کا تو وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ مجھے کوئی خط لکھیں گے اور میں اس کا جواب بھی نہیں دوں گا۔ چنانچہ میرے جواب نہ دینے سے ان کے اس اعتماد کو بڑا صدمہ پہنچا جو ان کو مجھ پر تھا۔ اس سے متاثر ہو کر انہوں نے مجھے ایک خط لکھا جو بہت طویل تو نہیں تھا لیکن اس کا ایک ایک حرف درد محبت تھا۔ میں نے جب ان کے خط کو پڑھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے اپنے غصہ پر سخت شرمندگی ہوئی اور میں نے نہایت نمایاں طور پر یہ محسوس کیا کہ ان کا دل میرے دل کی نسبت سے کہیں زیادہ نرم اور محبت کرنے والا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے محبت نامے کا آخری فقرہ نہایت بلیغ اور مؤثر تھا۔ جس سے میرے دل کا نہ صرف سارا رنج و ملال دھل گیا بلکہ مجھے تنبیہ ہوئی کہ آئندہ مجھے اس قسم کی تنگ ظرفی کا مظاہرہ کبھی نہیں کرنا چاہیئے۔ افسوس ہے کہ میں کسی کے خطوط محفوظ رکھنے کا عادی نہیں ہوں ورنہ یہ مؤثر خط میں یہاں ضرور نقل کرتا۔ اس میں مرحوم نے اپنے دل کی صفائی کی ایسی اچھی شہادتیں جمع کر دی تھیں کہ ان کو پڑھ کر ہر شخص متاثر ہوتا اس کے بعد سے میں مرحوم کی بے نفسی کا برابر قائل رہا۔

دلیل کا احترام

ان کی دوسری خوبی جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ وہ یہ تھی کہ وہ دلیل کی قوت کو جوں ہی محسوس کر لیتے فوراً اس کے آگے سر جھکا دیتے۔ وہ جماعت کے اندر ایک صاحب الرائے آدمی تھے اور ہمیشہ اپنی رائے پورے زور و قوت کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ لیکن اگر دلیل سے ان پر واضح ہو جائے کہ ان کی بات کمزور ہے تو خواہ اس بات کو انہوں نے کتنے ہی زور کے ساتھ پیش کیا ہو۔ لیکن اس پر اصرار نہیں کرتے تھے بلکہ فوراً اپنی غلطی اور مخالف کی بات کی صحت و صداقت کا اعتراف کر لیتے تھے اور اندازِ اعتراف ایسا ہوتا تھا جس سے مخاطب کو یہ احساس ہوتا کہ وہ اس اعتراف میں ایک قسم کی لذت اور خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ ان کی صحت کمزور تھی۔ اس وجہ سے وہ بعض چیزوں سے زیادہ متاثر ہو جاتے اور غیر معمولی تاثر کی حالت میں آدمی کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے ہٹ کر کسی بات کو قبول کرنے کے لئے مشکل ہی سے تیار ہوتا ہے۔ لیکن مولانا مسعود عالم مرحوم میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ دلیل کے سامنے کبھی ضد نہیں کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اگر ایک بات کو ان کا دل نہ بھی قبول کرتا لیکن وہ اس کی دلیل کا توڑ نہ کر سکتے تو بڑی صفائی کے ساتھ کہہ دیتے کہ ہر چند کہ اس بات کو میرا دل قبول نہیں کر رہا ہے لیکن جو دلیل اس کے حق میں دی جا رہی ہے وہ بظاہر معلوم ہوتی ہے اس وجہ سے میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

جماعتی زندگی کے اس پورے دور میں بہت سے نشیب و فراز پیش آئے ہیں اور ہم دونوں ایک دوسرے سے اس طرح الجھے ہیں کہ بحث کے پہلے مرحلے میں نیت شبہ محسوس ہوا کہ شاید ہم اس الجھاؤ کو سلجھا نہ سکیں۔ لیکن الحمد للہ ہر الجھاؤ سلجھ کے رہا اور ہر بحث ایک نتیجہ تک پہنچی۔ اس کی بڑی وجہ ان کی یہی خوبی تھی کہ وہ دلیل کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اور اس کے آگے جھک جانے میں ذرا بھی کسر شان نہیں سمجھتے تھے۔

عدم مداہنت } مرحوم جماعتی احتساب میں بڑے بے رورعایت آدمی تھے۔ ایک عام رکن جماعت سے لے کر جماعت کے امیر تک جس میں بھی کوئی قابل اعتراض بات پاتے اس کو ضرور ٹوک دیتے۔ بعض اوقات ٹوکنے کا انداز درشت ہو جاتا جس سے لوگوں کو شکایتیں بھی پیدا ہو جاتیں۔ لیکن مرحوم اپنے انداز کی اصلاح پر قابو نہ پا سکے۔ البتہ کسی زیادتی کا احساس ہونے پر ساتھیوں سے معافی مانگ لینے میں بڑے فیاض تھے۔ اس معاملہ میں ان کی بے لوثی اور بے خوفی لا یخافون لومۃ لائم کی ٹھیک ٹھیک مصداق تھی۔ وہ اپنے خاص دوستوں اور ساتھیوں کو بھی کبھی بخشنے والے نہیں تھے بلکہ غالباً وہ ان کے احتساب کی زد میں دوسروں سے زیادہ ہی آتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں جن لوگوں کے بارے میں یہ گمان رکھتا تھا کہ یہ مولانا سے زیادہ قربت رکھتے ہیں۔ بھری مجلس میں انہوں نے اس طرح ان پر تنبیہ کی ہے کہ حیرت ہو گئی ہے اس کی بھی متعدد مثالیں میرے علم میں ہیں کہ انہوں نے جب کبھی یہ محسوس کیا ہے کہ ان کی تنقید غیر معتدل ہو گئی ہے اور اس سے مخاطب کی دل آزاری ہوئی ہے تو انہوں نے اس سے فوراً معافی مانگ لی ہے۔

معاملات کی صفائی } معاملہ کے بڑے صاف تھے۔ پائی پائی کا حساب رکھتے تھے۔ ممکن نہیں تھا کہ کسی ایک کا دھیلا بھی ان کے ذمہ باقی رہ جائے۔ اس طرح وہ دوسروں سے اپنے مطالبات وصول کرنے میں بھی سخت اور کھرے تھے اگرچہ ذاتی طور پر مجھے ان سے اس قسم کا کوئی سابقہ پیش نہیں آیا۔ لیکن جب کبھی چند گھنٹوں کے لئے بھی سفر یا حضر میں ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ ان کی یہ صفت نمایاں ہو کر میرے سامنے آئی۔ راولپنڈی کے زمانہ قیام میں جماعت کا فنڈ ان کی تحویل میں تھا اور یہ عاجز جماعت کا امیر تھا۔ اس دوران میں میں نے بار بار یہ محسوس کیا کہ قومی اور جماعتی امانتوں کے جو لوگ امین بنائے جائیں۔ ان کو مولانا ہی کی طرح ہونا چاہیئے۔

ہمت } مولانا کی ہمت بھی دوسروں کے لئے بڑی ہی سبق آموز تھی۔ وہ تنفس کے مریض تھے اور یہ مرض ان کی صحت کو اس طرح چاٹ گیا تھا کہ وہ استعارہ کی زبان میں نہیں بلکہ حقیقت کی زبان میں صرف پوست اور استخوان رہ گئے تھے۔ بالخصوص اس مرض کے دورہ کی حالت ان کے لئے بڑی ہی خطرناک ہوتی تھی۔ دو ایک بار مجھے مرض کے دورہ کی حالت میں ان کے بستر کے پاس موجود رہنے کا اتفاق پیش آیا۔ بلا مبالغہ مجھے ہر لمحہ یہ گمان گزرتا تھا کہ یہ ان کا آخری سانس ہے۔ اس طرح کے خطرناک دورے ان پر پڑتے رہتے تھے۔ میرا اپنا اندازہ ہمیشہ یہ رہا کہ اس قسم کی تکلیف کے ساتھ جس میں وہ مبتلا تھے کوئی دوسرا شخص کوئی کام بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ تکلیف ان کو آج نہیں پیدا ہوئی تھی۔ میں نے تو ان کو شروع ہی سے اس میں گرفتار دیکھا۔ لیکن حیرت ہے ان کی جوانمردی اور ہمت پر کہ باایں ہمہ اسقام و امراض اور باایں ہمہ ضعف و نقاہت انہوں نے نہ صرف مختلف قسم کے تعلیمی و ادارتی فرائض انجام دیئے۔ نہ صرف کتابیں لکھیں، اور ترجمے کئے بلکہ نجد و حجاز تک سفر کر آئے اور اقامت دین کی جد و جہد کے سلسلہ میں جب ان کو قید و بند کی آزمائش پیش آئی تو اس کو جھیلنے میں بھی ہم میں سے بہتوں سے مضبوط ثابت ہوئے اور اس سے بھی زیادہ سخت آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔

وفاداری } مولانا اپنے بعض مخدوموں کے مدت العمر بڑے وفادار رہے۔ حالانکہ خیالات اور مسلک میں مولانا کی راہ ان کے مخدوموں کی راہ سے بالکل الگ رہی۔ عام حالات میں یہ چیز کچھ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سی معلوم ہوتی ہے کہ آدمی بیک وقت دو بالکل مختلف طرز کے اشخاص سے یکساں قسم کے تعلقات قائم رکھے اور ان کو پورے اخلاص کے ساتھ نباہ سکے حضرت

(باقی صفحہ ۱۴۰ پر)

حالاتِ زندگی

محمد عاصم

مسعود عالم ندوی کی پیدائش ۱۲ محرم ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۹۱۰ء کو صوبہ بہار کے ایک گاؤں "ارگانواں" میں ہوئی۔ یہ گاؤں ضلع پٹنہ کے ایک قصبہ بہار شریف کے مضافات میں واقع ہے۔ اسی کے قریب علامہ سید سلیمان ندوی کا وطن دیسنہ بھی واقع ہے۔

مسعود عالم صاحب ایک سید خاندان کے چشم و چراغ تھے، جو گرد و نواح میں اپنی علمیت اور دینداری کی بنا پر مشہور تھا۔ آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید ابوالفتح عبدالشکور صاحب مدظلہ (مولود ۱۲۹۰ھ) کا شمار صوبہ بہار کے چند بلند پایہ علماء میں ہوتا ہے۔ بنارس میں تعلیم پائی اور ایک عرصہ تک مئو ضلع اعظم گڑھ کے ایک عربی مدرسہ کے صدر مدرس رہے۔ اب اپنے وطن بہار شریف میں مقیم ہیں۔ مشہور طبیب ہیں اور ایک عربی مدرسہ "مدرسہ اسلامیہ" میں تعلیم بھی دیتے ہیں۔ بہار کے اکثر علماء آپ کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔

آپ کے دادا مولانا سید خدا بخش صاحب اپنے وقت کے اچھے عالم تھے اور دین کی خدمت و اشاعت کا انتہائی جذبہ رکھتے تھے۔ سال میں چھ ماہ اپنی زمین کی دیکھ بھال کرتے اور چھ ماہ ایک دوسرے شخص کی مدد سے دینی کتابیں بغرضِ تبلیغ دین کی غرض سے اردگرد کی تمام بستیوں میں چکر لگاتے۔ مسلک کے اعتبار سے اہلِ حدیث تھے۔

آپ کے نانا مولانا سید   صوبہ بہار کے ایک اچھے طبیب اور مشہور اہلِ حدیث عالم، ذی صلاحیت واعظ تھے۔ مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے۔

مسعود صاحب کی پیدائش سے پہلے ان کے پانچ بھائیوں کا بچپن ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔ پیدائش کے وقت آپ سے بڑے ایک بھائی اور ایک بہن تھیں۔ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچ کر ان بڑے بھائی صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ بہن جو عمر میں آپ سے صرف دو سال بڑی تھیں، شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد انتقال کر گئیں اور اپنے پیچھے دو بچیاں چھوڑ گئیں۔

ہوش سنبھالتے ہی والد صاحب قبلہ نے اپنی زیرِ نگرانی آپ کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ گاؤں کی رہائش کی وجہ سے کسی مدرسہ یا سکول میں داخلہ بھی مشکل تھا۔ چند سال کے بعد والد صاحب اپنے گھر والوں سمیت گاؤں سے شہر (بہار شریف) منتقل ہو گئے اور مسعود صاحب کو ایک ہائی سکول میں داخل کر دیا، لیکن گھر پر عربی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان میں انگریزوں سے عدمِ تعاون اور عدمِ موالات کی تحریک زوروں پر تھی۔ ابھی میٹرک پاس بھی نہ کیا تھا کہ والد صاحب نے آپ کو سکول سے علیحدہ کر کے ایک مقامی عربی مدرسہ "مدرسہ عزیزیہ" میں داخل کر دیا۔ اس مدرسہ سے آپ نے "ملا" اور "مولوی" کی سند بھی حاصل کی۔

اس کے بعد آپ کو تعلیم کی غرض سے پٹنہ بھیج دیا گیا، جہاں مدرسہ شمس الہدیٰ (جو بہار کا سب سے بڑا عربی مدرسہ ہے) میں آپ داخل ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر آپ دن رات اپنی تعلیم میں محنت کرنے لگے۔ اس زمانہ میں عربی ادب سے بھی آپ مانوس ہوئے اور جو عربی رسالے مدرسہ میں آیا کرتے تھے، انہیں شوق سے پڑھنے لگے۔

آپ کا قیام پٹنہ ہی میں تھا کہ ایک ایسا حادثہ پیش آیا، جس نے آپ کی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ اب تک آپ نہایت بے فکری اور آرام

وہ آخر تک اپنے آپ کو طالب علم سمجھتے اور مزید علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ جب انہیں ہلالی صاحب کے دار العلوم آنے کی اطلاع ہوئی، تو ندوہ واپس آنے کے لئے بے تاب رہنے لگے۔

سنہ ۱۳۵۰ھ کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب نے دار العلوم ندوہ سے ایک عربی ماہنامہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ادارت کے لئے مسعود صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔ مسعود صاحب کو جب اس کی اطلاع ہوئی، تو گویا دل کی کلی کھل گئی۔ انگریزی تعلیم کی بساط لپیٹ اور امتحانات کے آئندہ تمام ارادے ترک کر کے فوراً ندوہ پہنچ گئے۔ انہوں نے ہلالی صاحب کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہلالی صاحب سے اگرچہ ندوہ کے دوسرے طلبہ نے بھی فائدہ اٹھایا لیکن جو فائدہ ان سے مسعود صاحب نے اٹھایا، وہ کسی نے نہیں اٹھایا۔

محرم ۱۳۵۱ھ (مئی ۱۹۳۲ء) سے عربی ماہنامہ "الضیاء" کا آغاز ہوا۔ رسالہ کے مضمون نگار اگرچہ کم تھے اور رسالہ چھپتا بھی پتھر پر تھا، جس سے عبارت کا پڑھنا عرب قارئین کے مذاق طبع کے بہت خلاف اور ان کی نگاہوں پر سخت بار ہوتا ہے لیکن زبان کی صحت، حسن انشاء اور مضامین کی بلندی کے لحاظ سے عرب ممالک کے سنجیدہ، علمی اور ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوا[1]

"الضیاء" کل چار سال جاری رہا۔ شروع کے دو سال مسعود صاحب اس کے مدیر (منشی) اور ہلالی صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اس کے سرپرست تھے۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں ہلالی صاحب ندوہ سے استعفا دے کر زبیر (عراق) چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مسعود صاحب پر یہ جدائی انتہائی گراں گزری۔ انہیں اپنے استاذ سے انتہائی محبت و عقیدت تھی۔ انہوں نے عزم کر لیا کہ ندوہ سے ایک ڈیڑھ سال کی چھٹی لے کر کچھ عرصہ مزید اپنے استاد کی صحبت میں رہیں۔ بغداد، دمشق، فلسطین اور مصر وغیرہ کی سیاحت اور وہاں کے علماء و ادباء سے استفادہ کرنے کا بھی ارادہ تھا۔ سید سلیمان ندوی اور دار العلوم کے دوسرے ذمہ دار کارکنوں نے اس شرط پر عراق جانے کی اجازت بھی دے دی کہ ان کی غیر حاضری میں "الضیاء" پابندی سے جاری رکھنے کا انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ مسعود صاحب نے مولانا ابو الحسن علی ندوی کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ ان کے بعد وہ "الضیاء" کی ادارت کرتے رہیں گے۔ مولانا علی میاں اپنے وطن رائے بریلی سے ندوہ بھی پہنچ گئے، لیکن صوبہ یو پی کی حکومت نے اپنی خفیہ پولیس کی رپورٹ پر پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔ مسعود صاحب عراق نہ جا سکے۔ اب "الضیاء" کا پورا بار آپ ہی کے کندھوں پر آن پڑا۔ رسالہ کو ترتیب دینے، اس کے مضامین کی زبان درست کرنے میں ان کا کوئی مشیر نہ تھا، لیکن اس کے باوجود "الضیاء" پوری شان سے چلتا رہا۔ بلکہ اگر چاروں سال کی جلدوں کو ایک نظر سے دیکھا جائے، تو آخری دو سال کے پرچے زبان و انشاء ہر لحاظ سے پہلے دو سال کے پرچوں کی نسبت ممتاز نظر آئیں گے۔ اب مسعود صاحب خود ہی رسالے کے مدیر تھے، خود ہی مضامین کی تصحیح کرتے، خود ہی اس کو ترتیب دیتے، خود ہی لوگوں سے مضامین طلب کرتے، خود ہی کتابت سے نپٹتے۔ خود ہی باہر سے آنے والے تمام خطوط کا جواب دیتے۔ خود ہی حساب کتاب رکھتے۔ چپراسی تک مدد کے لئے نہ تھا۔ ڈاک خانہ بھی خود ہی جاتے۔ اور خود ہی تمام پرچوں پر پتے لکھ کر روانہ کرتے۔ صرف اپنے بعض مانوس شاگردوں اور عزیزوں سے خط و کتابت وغیرہ کے کام میں مدد لے لیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ حیرت میں ڈالنے والی چیز یہ ہے کہ پرچے کے تبادلے میں باہر سے جو عربی پرچے آتے۔ ان سب کو پورے اہتمام سے پڑھتے اور جہاں کہیں کسی مضمون کی تردید کرنا ضروری سمجھتے۔ اس پرچہ میں اس کی تردید بھی کرتے۔ عربی ادب کی تمام نئی کتابوں پر بھی ان کی نگاہ رہتی۔ بلکہ اسی زمانہ میں مصر کے دینی و اصلاحی ہفتہ وار رسالہ "الفتح" کے ایڈیٹر سید محب الدین الخطیب کی فرمائش پر "حاضر مسلمی الہند و غابرہم" کے نام سے ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ بھی عربی میں لکھنا شروع کی، جو اسی زمانہ میں اور کچھ دیر بعد تک "الفتح" میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ اسی زمانہ میں العرب (فلسطین) میں بھی ہندوستانی سیاست پر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا۔
دمہ کا عارضہ پہلے ہی سے تھا۔ اس پر یہ سخت محنت۔ غور کیجئے اس محنت کا ان کی صحت پر کس قدر برا اثر پڑا ہوگا۔ دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ مسعود صاحب

---

[1] "الضیاء" میں کے مضامین اور اس میں لکھنے والوں کا مکمل تعارف جناب ملک غلام علی صاحب اپنے مضمون میں کرا چکے ہیں (دیکھئے صفحہ ۱۶۵) نیز دیکھئے مضمون مولانا ابو الحسن علی ندوی صفحہ ۱۹۵۔

کی پھرتی اور مصروفیت اس زمانہ میں تمام لوگوں کے لئے حیرت انگیز تھی ۔ دن رات میں ایک منٹ ضائع نہ کرتے ۔ صحت کی ان میں دوپہر کے وقت چند منٹ سے زیادہ آرام نہ کرتے ۔ عصر کے بعد مغرب تک پڑھتے رہتے ۔

جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے ہر اچھے کام کے لئے مددگار کم ہوتے ہیں، اس کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اسے ختم کرنے کی کوشش کرنے والے زیادہ، "الضیاء" بھی اسی ستم ظریفی کا شکار ہوا ۔ اسے نکلتے چار سال ہو رہے تھے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ سخت بیمار پڑ گئے ۔ اشاعت پہلے ہی کم تھی، بعض لوگوں سے سید صاحبؒ امداد حاصل کرتے رہتے تھے ۔ اب امداد کی رقم بہت کم رہ گئی ۔ دوسرے مخالفین پہلے ہی اس رسالہ کو دیکھ دیکھ کر جل رہے تھے اور دن رات اسے ختم کرنے کی فکر میں رہتے تھے ۔ سید صاحبؒ کی علالت کو ان لوگوں نے غنیمت جانا اور اسے "الضیاء" اور مدیر "الضیاء" پر اپنا عتاب نازل کرنے کا بہترین موقع خیال کیا ۔ اہل ندوہ نے رائے قائم کی کہ مدیر "الضیاء" کی شوخیاں اسی رسالے کے بل پر ہیں، کیوں نہ اسے ہونے دیا جائے ان دانش مندوں کو یہ خیال تک نہ آیا کہ ذاتی پرخاش میں وہ اپنے آرگن ہی کو ختم کر رہے ہیں ۔ چنانچہ چار سال تک ہندوستان کا یہ واحد عربی رسالہ جو عربی دنیا کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کا بہترین پیام وسلام تھا، جاری رہنے کے بعد ختم ہوگیا ۔ اس کے بعد اگرچہ مسعود صاحب نے بعض ندوی اصحاب کی مدد سے "الضیاء" کو بطور خود جاری رکھنا چاہا اور اس کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر کامیابی نہیں ہو سکی ۔ ندوہ میں تاریخ وادب کے ایک مدرس ہو کر رہ گئے ۔

مسعود صاحب ندوہ میں اعتدال، مذہبی رواداری اور تعلیم کے طریقوں میں تمام مفید ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے حامی تھے ۔ حقیقت میں ندوہ قائم کرنے کی غرض وغایت بھی یہی تھی ۔ لیکن ادھر چند سال سے ندوہ کے نظم ونسق اور سیاست پر کچھ ایسے لوگ آگئے تھے جو طلبہ پر اپنا علمی رعب نہ رکھنے کے باوجود یہاں کے نظم ونسق میں من مانی کارروائیاں کرنا چاہتے تھے ۔ ندوہ کو اپنے اصولوں سے ہٹا کر دیوبند کی قسم کا ایک خالص مذہبی مدرسہ بنانے کی کوشش کی جارہی تھی ۔ مدرسین اور طلبہ میں کچھ لوگ اس رجحان کو بری طرح محسوس کر رہے تھے ۔ مسعود صاحب ان سب میں پیش پیش تھے ۔ دوسری طرف ارباب ندوہ ان کی ایک نہ سنتے ہوئے اپنی روش پر قائم ومصر تھے، جس کا نتیجہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں ایک اسٹرائک کی شکل میں ظاہر ہوا ۔ اس اسٹرائک کا اثر اگرچہ کسی نہ کسی حد تک ہوا، مگر بعض مذبذب قسم کے لوگوں کی وجہ سے پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی ۔ تین طلبہ اور ایک مدرس کو دارالعلوم سے خارج کر دیا گیا ۔ مسعود صاحب کو جو اسٹرائک میں سب سے پیش پیش تھے، خارج تو نہ کیا گیا، لیکن دارالعلوم کے احاطہ سے باہر رہائش رکھنے کا حکم دے دیا گیا ۔

تقریباً ڈیڑھ سال تک یہی سلسلہ چلتا رہا ۔ مسعود صاحب ندوہ کی زندگی سے تنگ آچکے تھے ۔ ارباب ندوہ کا عتاب اپنی جگہ قائم تھا ۔ مسعود صاحب موقع کی تلاش میں تھے اور وہاں سے نکل بھاگنا چاہتے تھے ۔ جون ۱۹۳۴ء میں انہیں موقع ملا، اور وہ تین ماہ کی رخصت لے کر بجنور چلے گئے اور مدینہ کے سٹاف میں شامل ہوگئے ۔ انہوں نے یہ اقدام سید صاحبؒ کی اطلاع اور اجازت کے بغیر کیا، حالانکہ اب تک انہوں نے اپنی زندگی میں جو بھی اقدام کیا سید صاحبؒ سے اس کے متعلق مشورہ ضرور کر لیا ۔ سید صاحبؒ کو جب اس کی اطلاع ہوئی، تو انہیں سخت تکلیف پہنچی، اور انہیں یقین دلایا کہ ندوہ سے ان کی بیزاری کی وجہ ارباب اقتدار کا عتاب اور وہ اچھوت کی سی زندگی تھی، جو وہ عرصہ دو سال سے بسر کر رہے تھے ۔ وہ کسی طرح ندوہ واپس آنے پر تیار نہ تھے ۔ لیکن جب سید صاحبؒ نے بہت اصرار کیا، تو اس شرط سے واپس آگئے کہ سید صاحب ناظم دارالعلوم کو از خود یہ لکھیں کہ مسعود صاحب میرے حکم سے ندوہ واپس آرہے ہیں ۔

مسعود صاحب آنے کو تو ندوہ واپس آگئے لیکن ان کا دل وہاں کی زندگی سے اکھڑ چکا تھا ۔ اسی اثناء میں پٹنہ کی اورینٹل لائبریری کے مرتب فہرست (کیٹلاگر) مولوی عبدالحمید صاحب کا انتقال ہوگیا ۔ لائبریری کے سیکرٹری نے سید صاحبؒ کو ایک آدمی کے لئے لکھا ۔ سید صاحبؒ نے مسعود صاحب کو اس کام کے لئے بہترین آدمی پایا ۔ یوں بھی وہ جانتے تھے کہ مسعود صاحب محض ان کے حکم سے ندوہ واپس آگئے ہیں، ورنہ وہ وہاں کے ماحول سے دور ہی رہنا چاہتے ہیں ۔ سید صاحبؒ نے مسعود صاحب کو خط لکھا کہ لائبریری کے سیکرٹری کو درخواست بھیج دیں، جس میں اپنی عربی انگریزی کی لیاقت

اور اپنے علمی کارناموں کا ذکر کریں ۔ چنانچہ مسعود صاحب نے درخواست دی اور وہ منظور ہو گئی ۔ اس طرح وہ ندوہ کے ماحول سے دور ہو گئے ۔
لیکن اپنی اصلاحی کوششوں میں مایوس نہ ہوئے ۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو مسعود صاحب نے پٹنہ آ کر لائبریری کا کام شروع کیا ۔ لیکن وہ اپنے اصل کام سے غافل نہ ہوئے ۔ وہ ندوہ کو اپنے مقصد کا صحیح معنوں میں علمبردار دیکھنا چاہتے تھے اور ہر ممکن طریق سے اس کے لئے کوشاں تھے ۔

پٹنہ پہنچ کر مسعود صاحب نے انجمن طلبہ قدیم ندوۃ کی بنیاد رکھی ، جس کا پہلا اجلاس ۱۹۳۶ء میں پھلواری شریف (پٹنہ) میں نہایت کامیاب رہا ۔ اسی طرح انہوں نے ندوہ کی صوبہ بہار سے اعانت جمع کرنے کے لئے انجمن معین الندوہ کے نام سے بھی ایک انجمن قائم کی ۔ مسعود صاحب انجمن طلبہ قدیم ندوہ (بہار) کے نمائندے کی حیثیت سے ندوہ کی مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے ، اس لئے ندوہ کی اصلاح کے لئے انہوں نے اتنا دور رہتے ہوئے بھی اپنی کوشش جاری رکھیں ۔

مسعود صاحب کا قیام پٹنہ میں تقریباً سات سال دسمبر ۱۹۳۵ء تا اکتوبر ۱۹۴۲ء رہا ۔ اس عرصہ میں ندوہ کی اصلاح کی کوششوں کے علاوہ انہوں نے بہت سے علمی کام بھی انجام دیئے ۔

لائبریری کے کام کے علاوہ مصر و شام کے عربی پرچوں میں مضامین لکھنے کا سلسلہ انہوں نے برابر جاری رکھا ۔ قاہرہ کے ہفتہ وار رسالہ "الفتح" کے وہ مستقل مضمون نگار تھے اور آپ کا شمار اس کے ممتاز اور پابندی سے لکھنے والوں میں ہوتا تھا ۔ جنگ شروع ہونے بلکہ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک انہوں نے اپنے عربی مضامین کا یہ سلسلہ جاری رکھا ۔ جنگ کے زمانہ میں جب عربی ڈاک میں بالکل تعطل پیدا ہو گیا ، یہ سلسلہ مجبوراً ختم کرنا پڑا ۔

عربی کے علاوہ مسعود صاحب نے اب پہلی مرتبہ اردو میں مضمون لکھنے کا سلسلہ بھی شروع کیا ۔ نومبر و دسمبر ۱۹۳۸ء کے معارف میں انہوں نے امیر شکیب ارسلان کی کتاب "السید رشید رضا او اخاء اربعین سنۃ" کا خلاصہ اور اس پر تبصرہ شائع کیا ، جو غالباً اردو میں ان کا سب سے پہلا مضمون تھا اور انہوں نے اسے نہایت ڈرتے ڈرتے لکھا ، لیکن اہل علم نے حوصلہ افزائی کی ۔ خصوصاً مولانا عبدالماجد دریابادی کی داد سے بڑی تسلی ہوئی ۔ اس کے بعد انہوں نے اردو میں بھی مضامین لکھنے کا ارادہ کیا ۔

جولائی ۱۹۳۹ء کے معارف میں انہوں نے ڈاکٹر زکی علی مصری کی انگریزی کتاب "دنیا میں اسلام" کا خلاصہ اور اس پر تبصرہ شائع کیا ۔

مسعود صاحب کو مشہور خلافتی لیڈر مولانا محمد سجاد بہاری مرحوم سے بڑی عقیدت تھی ۔ وہ ان کی اصابت رائے ، اخلاص اور فہم کے از حد قائل تھے ۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں مولانا کی انڈی پینڈنٹ پارٹی کے ہفتہ وار آرگن کی خفیہ ادارت اپنے ذمہ لی ۔ بظاہر اس کے ذمہ دار کارکن دوسرے صاحب تھے ۔ ملازمت کی وجہ سے مسعود صاحب کھل کر پرچہ کی ادارت نہ کر سکتے تھے ۔

شوال ۱۳۵۹ھ (نومبر ۱۹۴۰ء) کو مولانا محمد سجاد صاحب بہاری انتقال فرما گئے ۔ مسعود صاحب کا دل اس حادثہ سے سخت متاثر ہوا ۔ مولانا کی وفات پر مختلف لوگوں نے جو مقالات لکھے ، انہیں یکجا جمع کرنے ، نیز ان کی زندگی اور کارناموں کے متعلق ایک کتابچہ مرتب کرنے کا مسعود صاحب نے عزم کیا ۔ مختلف لوگوں سے مضامین طلب کئے ۔ خود بھی ایک دردناک مضمون لکھا اور جلدی ہی سب کو "محاسن سجاد" کے نام سے ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا اور اس کتاب کو پورے ہندوستان میں مفت تقسیم کرنے کی کوشش کی ۔

پٹنہ آ کر مسعود صاحب کا حلقۂ ملاقات بہت وسیع ہو گیا تھا ۔ یوں بھی وہ جہاں رہے ، اپنے فرائض منصبی اور علمی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی فکری اصلاح اور علمی تربیت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے ۔ پٹنہ میں بھی انہوں نے یہ سلسلہ شروع کیا ۔ آنے والوں میں بہت سے کمیونسٹ اور سوشلسٹ خیالات رکھنے والے نوجوان اور لیڈر بھی ہوتے ۔ مسعود صاحب کو ان سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا ۔ ان سے اسلام ، کمیونزم اور سوشلزم وغیرہ کے متعلق بحثیں رہتیں ۔ یہاں پہنچ کر مسعود صاحب کو احساس ہوا کہ اس زمانہ میں کمیونزم سے پوری طرح واقف ہونا اشد ضروری ہے تاکہ مسلمان

نوجوانوں کو اس کی تباہ کاریوں اور اسلام کی خوبیوں سے متعارف کرایا جاسکے۔ چنانچہ انہوں نے کمیونزم کی مختلف کتابیں کو پڑھنا اور کمیونسٹ خیالات رکھنے والے بہت سے لیڈروں سے ملنا اور تبادلۂ خیال کرنا شروع کیا جس کے نتیجہ میں انہوں نے "اشتراکیت اور اسلام" کے نام سے ایک مفصل مضمون معارف میں شائع کرایا، جو پورے کا پورا اس طرح شائع ہوا کہ پرچہ میں اس کے سوا کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ اسی زمانہ میں "عربوں کی قومی تحریک" سے متعلق انہوں نے ایک طویل مقالہ الہلال (پٹنہ) میں شائع کیا، جسے بعد میں مکتبہ احمد (پٹنہ) والوں نے ان کی اجازت و اطلاع کے بغیر پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا۔

ندوہ ہی میں کام کی وجہ سے مسعود صاحب میں علمی اور تحقیقی کام سے بڑی دلچسپی ہو گئی تھی۔ ندوہ ہی کے زمانہ میں اپنے دوست مولانا ابوالحسن علی ندوی سے یہ طے کر دیا تھا کہ وہ سید احمد شہید اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی شہادت کے بعد کی تاریخ اور ان کی مجاہدانہ کوششوں کی روداد لکھیں گے۔ بعض لوگ ہندوستان کی اس پہلی اسلامی تحریک اور نجد کے مجدد و مصلح شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک کو ایک یا آپس میں متعاون تحریکیں سمجھ رہے تھے۔ مسعود صاحب نے جب اس بارے میں تحقیق کرنا شروع کی اور محمد بن عبدالوہاب اور ان کی تحریک اور عقائد کے متعلق بہت سی کتابیں پڑھنے کا انہیں اتفاق ہوا تو ان کے سامنے بہت سی ایسی چیزیں آئیں، جن سے عدم واقفیت کی بنا پر نجد کی اس اصلاحی تحریک کے متعلق خود مسلمانوں میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ مسعود صاحب نے ارادہ کیا کہ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک کے متعلق کتاب لکھنے سے پہلے محمد بن عبدالوہاب کی سیرت اور ان کی تحریک کے متعلق خالص علمی اور تحقیقی رنگ میں ایک کتاب لکھی جائے۔ انہوں نے یہ کام شروع کیا اسی زمانہ میں یہ کتاب مکمل ہوئی اور اس کے پہلے دو باب معارف میں بھی شائع ہوئے۔ یہی کتاب بعد میں "محمد بن عبدالوہاب: ایک بدنام اور مظلوم مصلح" کے نام سے شائع ہوئی۔

اگرچہ اس کتاب کے لکھنے کی تحریک بھی ندوہ ہی کے زمانہ سے ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہابی تحریک کے متعلق مسعود صاحب نے "الضیاء" میں "الحرکۃ الوھابیۃ الھندیۃ السیاسیۃ" میں ایک مضمون بھی لکھا تھا، جو بعد میں الہلال وغیرہ کے مختلف نمبروں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ لیکن پوری کتاب لکھنے کا ارادہ پٹنہ ہی کے زمانہ میں ہوا۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک کے سلسلہ میں معلومات حاصل کرنے کے لئے مسعود صاحب اہلِ صادق پور سے برابر ملتے رہے اس کے ساتھ ساتھ اپنا مطالعہ بھی جاری رکھا، یہاں تک کہ کتاب کے متعلق پورا مواد جمع ہو گیا مگر اس کی ترتیب انہوں نے بعد میں جالندھر کے زمانہ میں دی۔

اسی زمانہ میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اپنے ماہانہ پرچہ "الفرقان" کا شاہ ولی اللہ نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا اور مسعود صاحب سے بھی مضمون طلب کیا۔ مسعود صاحب نے نمبر کے لئے ایک طویل اور محققانہ مضمون لکھا، جو الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر (   ) کا سب سے پہلا مضمون ہے۔

اسی عرصہ میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" شائع ہوئی جس میں بعض ایسے نئے "حقائق و انکشافات" تاریخی رنگ میں پیش کئے گئے تھے، جو سب لوگوں کے لئے موجب حیرت بھی تھے اور باعث تکلیف بھی۔[1]

بعض احباب کی توجہ دلانے پر مسعود صاحب نے اس کتاب کی تردید میں مسلسل تین مضامین لکھ کر معارف میں شائع کرائے، جو بعد میں "مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر" کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے (دسمبر ۱۹۴۳ء)

دارالعلوم ندوہ کے قیام ہی کے زمانہ میں مسعود صاحب، مولانا مودودی کے ماہانہ رسالہ "ترجمان القرآن" کے مضامین کے مداح اور مولانا مودودی کے قائل و معترف تھے۔ ان کی ثقافت، تعلیم و تربیت اور مطالعہ نے ان کو جماعت اسلامی کے فکری و دینی مزاج سے بہت کچھ ہم آہنگ کر دیا تھا۔ وہ خود بھی فطرتاً حساس اور نقاد واقع ہوئے تھے، وہ اپنی تحریروں میں بھی اسلام اور مسلمانوں کا فرق ملحوظ رکھتے تھے۔ وہ بھی تجدید کے حامی اور چند جد حامی اور تجدد کے مخالف تھے۔ فقہی مذاہب و مسائل میں وہ شروع سے رواداری اور تحقیقی مسلک رکھنے والے تھے۔ ان کا ذوق کسی ایک فقہی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے مولانا ابوالحسن علی ندوی کا مضمون صفحہ ۵۲۔

مذہب کے التزام و تقلید سے "ابا" کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہلانا کبھی پسند نہ کرتے تھے بلکہ ہمیشہ اہل حدیث حضرات کے تحزب اور جماعتی عصبیت کے شاکی رہے۔ اگست ۱۹۴۱ء میں جب جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی۔ تو وہ بھی جماعت کے ارکان میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ لیکن اپنی کمزوری اور خرابی صحت کی بنا پر قدم آگے بڑھانے میں تساہل تھے۔ لیکن مولانا مودودی کے ایک خط نے ان کے تمام تذبذب کو ختم کر دیا اور اسی سال انہوں نے اپنے آپ کو جماعت کی رکنیت کے لئے پیش کر دیا۔ امیر جماعت نے انہیں صوبہ بہار کی جماعت کا امیر مقرر کر دیا۔

مولانا مودودی کا ارادہ تھا کہ مرکز جماعت اسلامی سے ایک عربی ماہنامہ کا اجراء کیا جائے۔ انہوں نے اپنی اس تجویز کا اظہار مولانا ابوالحسن علی ندوی سے کیا (جو اس زمانہ میں جماعت اسلامی کے رکن تھے) اور ان سے اس کام کی ذمہ داری قبول کرنے کی فرمائش کی لیکن مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے مسعود صاحب کا نام پیش کیا اور انہیں اس کام پر رضامند کر لینے کی ذمہ داری بھی خود ہی لے لی۔ مسعود صاحب کے لئے اپنی خرابی صحت کے باعث اپنا وطن چھوڑ کر پنجاب آنا بڑا مشکل تھا۔ صحت سے زیادہ ایک اور چیز ان کی راہ میں حائل تھی، اور وہ تھی اپنے بوڑھے والد ماجد اور شفیق استاذ مولانا سید سلیمان ندوی (جن کی اجازت کے بغیر وہ کوئی بڑا قدم نہ اٹھاتے تھے) کی رضامندی۔ والد صاحب تو خیر جلد رضامند ہو گئے۔ سید صاحب نے اگرچہ صاف صاف منع کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن وہ ان کے سفر پنجاب سے خوش نہ تھے۔ مسعود صاحب کی زندگی میں اس سے بڑی کوئی آزمائش نہ آئی تھی۔ ایک طرف اپنا عقیدہ و مسلک جسے انہوں نے نہایت سوچ سمجھ کر اور پورے انشراح صدر کے ساتھ قبول کیا تھا اور دوسری طرف سید صاحبؒ کے تعلقات۔ لیکن آخرکار مسعود صاحبؒ نے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کا پختہ تہیہ کر لیا۔ ملازمت سے علیحدہ ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ گھر کا سامان آہستہ آہستہ پٹنہ سے بہار شریف پہنچانا شروع کر دیا۔ آئندہ مالی مشکلات سے محفوظ رہنے کے خیال سے ایک مکتبہ کی داغ بیل ڈالی، جو مکتبہ دین و دانش کے نام سے ابھی قائم ہے۔ اسی طرح اپنے ایک اور دوست کے ساتھ ایک تجارت میں بھی شرکت کا معاملہ طے کیا۔

شوال ۱۳۶۳ھ (نومبر ۱۹۴۴ء) کی آخری تاریخوں میں پٹنہ سے پنجاب روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے اپنے دوست مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (حال شیخ الحدیث مدرسہ تقویۃ الاسلام۔ لاہور) کے پاس فیروزپور آئے۔ مولانا نے مسعود صاحب کی مولانا عبیداللہ سندھی کی کتاب پر تبصرہ لکھنے کے زمانہ میں خط و کتابت اور واقفیت ہوئی تھی۔ وہاں چند دن قیام کرکے لاہور آئے۔ وہاں سے مرکز جماعت اسلامی (پٹھانکوٹ) پہنچے۔ خیال تھا کہ یہاں مستقل قیام کیا جائے اور یہیں سے جماعت اسلامی کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے اور ایک عربی ماہنامہ جاری کرنے کے لئے ایک مستقل شعبہ قائم کیا جائے، لیکن پٹھانکوٹ کی مرطوب آب و ہوا مسعود صاحب کو راس نہ آسکی۔ طبیعت انتہائی خراب ہو گئی۔ مولانا مودودی اور دوسرے رفقاء کار کی بھی رائے ہوئی کہ پنجاب ہی کے کسی قریب ترین شہر میں رہائش رکھی جائے اور وہیں عربی ترجمہ وغیرہ کا کام کیا جائے۔ چنانچہ مسعود صاحب اپنے ایک رفیق سید محمد قطبی صاحب ندوی کے ساتھ پٹھانکوٹ سے جالندھر آ گئے، اور مولانا عبدالحق خاں عباس بانی مدرسۃ البنات کے توسط سے جالندھر کے نواح میں بستی دانشمنداں میں قیام عمل میں آیا۔ یہاں آکر طبیعت سنبھل گئی۔ یہیں کام شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ سید محمد قطبی صاحب کے علاوہ اپنے ساتھ مولانا جلیل احسن صاحب ندوی اور حافظ فتح اللہ صاحب (حال مقیم حافظ آباد) کو بھی بلا لیا۔ مولانا جلیل احسن صاحب کی تجویز کے مطابق شعبے اور ادارے کا نام "دارالعروبۃ للدعوۃ الاسلامیۃ" طے پایا۔ عروبۃ دراصل عربی تہذیب (جو دینی تہذیب کے ہم معنی ہے) کو کہتے ہیں، لیکن آج کل یہ لفظ عربی قومیت کے لئے بھی استعمال ہونے لگا ہے، اس لئے دارالعروبۃ کے ساتھ للدعوۃ الاسلامیۃ کا بھی اضافہ کیا گیا، تاکہ قومیت کا اگر شبہ بھی پیدا ہو، تو اس کا ازالہ ہو سکے۔ دارالعروبہ سے جو عربی ماہنامہ جاری کرنے کا ارادہ تھا، اس کا نام بھی "الہدیٰ" طے کر لیا گیا۔

لیکن بستی دانشمنداں میں مستقل قیام ممکن نہ تھا۔ ایک تو یہ شہر اور ریلوے سٹیشن سے بہت دور تھی، دوسرے یہاں بھی مستقل قیام کے لئے کوئی مکان کرایہ پر نہ مل سکا تھا۔ ایک دوست کے ہاں عارضی قیام تھا۔ مکان کی تلاش میں کچھ عرصہ کے لئے نا بھل اور پھلور بھی منتقل ہوئے۔ لیکن یہاں بھی وُہی دقت تھی۔ نہ یہاں کا قیام دارالعروبہ جیسے ادارے کے لئے موزوں تھا اور نہ یہاں کوئی مستقل مکان کرایہ پر ملا۔ جالندھر شہر ہی میں مکان کی تلاش جاری رہی، تاآنکہ مارچ ۴۶ء میں جالندھر میں ایک اچھا اور ستھرا مکان کرایہ پر مل گیا۔ چنانچہ دارالعروبہ یہیں منتقل کر لیا گیا اور کام شروع ہوا۔

مسعود صاحب کا قیام جالندھر میں اگست ۴۷ء تک رہا۔ اس عرصہ میں انہوں نے متعدد کام انجام دیئے۔

جیسا کہ اوپر کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے، ندوہ چھوڑنے کے ایک ڈیڑھ سال بعد تک تو مسعود صاحب نے اپنی عربی تحریر کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن جنگِ عظیم کے زمانہ میں جب عربی ڈاک کا سلسلہ منقطع ہوا، تو مسعود صاحب نے بھی مجبوراً عربی پرچوں میں اپنے مضامین کا سلسلہ ختم کر دیا، اور معارف اور دوسرے رسالوں میں اپنے اردو مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اب پنجاب آنے کے بعد انہیں عربی لکھنے میں وہ روانی محسوس نہ ہوئی، جو انہیں "الضیاء" کے زمانے میں محسوس ہوتی تھی۔ اس لئے انہوں نے تہیہ کیا کہ کچھ مدت عربی پڑھنے اور صرف عربی پڑھنے کا سلسلہ رکھا جائے۔ چنانچہ ایک سال تک "الفتح" اور دوسرے عربی رسالوں کے پرانے فائل اور ادبی کتابیں پڑھتے رہے۔ کوئی اہم قابلِ ذکر تحریری کام نہیں کیا۔ صرف مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب القراءۃ الراشدۃ کا مقدمہ لکھا۔ اس کی وجہ اگرچہ بے اطمینانی، بار بار نقل مکانی اور صحت کی مسلسل خرابی بھی تھی، لیکن اصل وجہ یہی تھی کہ مسعود صاحب اپنے قلم میں وہی روانی لانا چاہتے تھے، جو الضیاء کے زمانہ میں وہ محسوس کرتے تھے۔ اس زمانہ میں انہوں نے اپنی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" بھی مرتب کی، جس کا مواد اگرچہ پٹنہ ہی کے زمانہ میں جمع کر لیا تھا، لیکن اسے ترتیب نہ دی جا سکی تھی۔ یہ کتاب ۱۹۴۶ء کے شروع میں "محمد بن عبدالوہاب: ایک بدنام اور مظلوم مصلح" کے ساتھ پہلی بار حیدرآباد (دکن) سے شائع ہوئی۔

جالندھر منتقل ہونے کے بعد پہلی بار سکونِ خاطر حاصل ہوا۔ جس کا صحت پر بھی اچھا اثر پڑا، اور مسعود صاحب نے "غربۃ الاسلام فی الہند" (ہندوستان میں اسلام کی بیگانگی) کے نام سے ہندوستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ لکھنا شروع کی۔ ستمبر یا اکتوبر ۴۶ء میں یہ عاجز دارالعروبہ آیا، اس وقت مسعود صاحب غالباً اپنی اسی کتاب کی ترتیب میں مصروف تھے۔ سخت محنت کا ان کی صحت پر اچھا اثر نہ پڑا۔ پھر اس سال رمضان کے بھی اکثر روزے رکھے۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ دو ماہ تک کوئی کام نہ ہو سکا۔ اس کے بعد عربی ممالک کے پرچوں سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اسی طرح مولانا جلیل احسن صاحب ندوی نے "اسلام کا نظریۂ سیاسی" اور "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" وغیرہ کا ترجمہ کیا تھا۔ طبیعت سنبھلتے ہی مسعود صاحب نے ان کی تصحیح کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

نومبر ۴۶ء میں بہار سے مسلمانوں پر ہندوؤں کے حملوں کی خبریں آنا شروع ہوئیں، جن میں مسلمانوں کا بے تحاشہ جانی و مالی نقصان ہوا۔ بستیوں کی بستیاں اُجڑ گئیں اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان گھروں سے بے گھر ہو گئے۔ جماعتِ اسلامی نے بہار میں کیمپ لگانے اور وہاں ریلیف کا کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ جناب عبدالجبار صاحب غازی اس کے انچارج بنائے گئے۔ غازی صاحب نے مسعود صاحب پر زور دیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ بہار چلیں۔ مسعود صاحب کی طبیعت اگرچہ حال ہی میں سنبھلی تھی، لیکن غازی صاحب کے کہنے پر وہ تیار ہو گئے۔ ۱۷ جنوری ۴۷ء کو پٹنہ پہنچے۔ دن رات لوگوں سے ملنے ملانے، انہیں حوصلہ دلانے، اور جن بستیوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی، ان میں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو جمع کرنے کا کام شروع ہوا۔ حکومت کے ذمہ دار رکنوں سے ملنے اور ان سے اس کام میں تعاون حاصل کرنے کا کام بھی ضروری تھا۔ مسعود صاحب غازی صاحب کے ساتھ دن رات اس کام میں مصروف رہے، بلکہ ایک مرتبہ پٹنہ سے باہر ایک بستی "معافی" بھی گئے اور وہاں چند دن قیام کیا۔ اس کے بعد پٹنہ آتے۔ "معافی" سے آتے ہوئے "بہار شریف" میں اپنے والد ماجد مدظلہ سے بھی ملاقات کی، جو ان کی ان سے آخری ملاقات تھی۔

پٹنہ میں مسعود صاحب کا قیام دو ڈھائی ماہ رہا جس مکان میں قیام تھا، وہ ایک منزلہ اور نہایت خستہ تھا۔ پٹنہ میں نچلی منزل میں رہنا عام صحت مند لوگوں کے لئے بھی ناممکن ہوتا ہے، لیکن مسعود صاحب کی صحت پر تو اس کا بہت ہی برا اثر پڑا، مجبوراً غازی صاحب سے اجازت لے کر اپنے ایک دوست جناب منظور احسن عباسی کے پاس کھوڈبلی (ضلع مانبھوم) چلے گئے۔ یہاں پہنچ کر مسعود صاحب کی صحت پر نہایت اچھا اثر پڑا۔ یہ مقام بہار و بنگال کی عین سرحد پر واقع ہے اور سطح مرتفع ہونے کی وجہ سے اس کی آب و ہوا نہایت اعلیٰ ہے۔ مسعود صاحب کا قیام یہاں تقریباً ڈیڑھ ماہ رہا۔ اس قیام میں وہ دارالعروبہ کا علمی کام یعنی ترجموں کی تصحیح وغیرہ کرتے رہے۔

مئی ۱۹۴۷ء میں پٹنہ، اعظم گڑھ، سرائے میر اور لکھنؤ ٹھہرتے ہوئے جالندھر واپس آئے۔ اسی ماہ دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں شمالی ہند کا سالانہ اجتماع تھا۔ اس میں شرکت کی۔ پھر جالندھر واپس آکر کچھ ترجموں کی تصحیح اور کچھ اپنی کتاب "غربۃ الاسلام فی الہند" کی ترتیب میں لگ گئے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا، تو آپ جالندھر ہی میں مقیم تھے۔ جس مکان میں رہائش تھی۔ وہ ایک سکھ کا مکان تھا، جو کرایہ پر لیا ہوا تھا۔ ۱۴؍ اگست کو جب تقسیم کا اعلان ہوا، تو آپ کے ساتھ صرف ایک رفیق عنایت الرحمان صاحب تھے، جو عارضی طور پر مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) سے رمضان کی چھٹیاں یہاں گزارنے آئے ہوئے تھے۔ میں عید کی وجہ سے ۱۳؍ اگست کو اپنے گھر مالیر کوٹلہ چلا گیا تھا۔ مسعود صاحب ان دنوں جن میں بڑے بڑے سورماؤں کے دل ہل گئے تھے، نہایت جوانمردی اور حوصلہ سے اپنے اس مکان میں مقیم رہے کھانے پینے کی بھی سخت تکلیف رہی، لیکن سب کچھ ہمت و جوانمردی سے برداشت کیا۔ چند دن کے بعد احباب کی رائے سے مدرسۃ البنات کی عمارت میں (جو وہاں سے قریب ہی تھی) منتقل ہو گئے۔ اپنی کتابیں اور ضروری سامان بھی منتقل کر لیا۔ اگست کے آخر میں جناب عبدالجبار صاحب غازی لاہور سے اپنے عزیزوں کو لینے جالندھر آئے ان کے ساتھ دو فوجی ٹرک تھے۔ مسعود صاحب بھی ان ہی کے ساتھ جالندھر سے لاہور آگئے۔

لاہور آنے کے دو ماحب مرکز جماعت اسلامی کے دوسرے رفقاء کے ساتھ سوہن لال بلڈنگ اور اسلامیہ پارک وغیرہ میں قیام رہا کھانے پینے اور سونے میں سخت تکلیف اور بے احتیاطی ہوتی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مسعود صاحب کی صحت ان دنوں نہایت اچھی رہی اور نہایت صبر و ہمت سے وہ یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے۔

حکومت کی "نوازشوں" سے تنگ آکر جب مولانا مودودی نے یہ فیصلہ کیا کہ اب کوئی مکان جماعت کے لئے الاٹ نہ کرایا جائے گا۔ اسی وقت یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اگرچہ جماعت کا مرکز لاہور ہی میں رہے گا، لیکن اس کی ایک شاخ راولپنڈی میں ہوگی مولانا اصلاحی، غازی صاحب اور بعض دوسرے رفقاء راولپنڈی منتقل ہو گئے۔ دارالعروبہ کے بھی راولپنڈی میں قائم کرنے کا فیصلہ ہوا

۱۲؍ نومبر ۱۹۴۸ء کو مسعود صاحب راولپنڈی پہنچے اور کوچہ شام سنگھ کے ایک مکان میں سکونت اختیار کی وہیں دارالعروبہ بھی قائم کیا مسعود صاحب کی صحت ان دنوں اچھی تھی۔ "مذابح المسلمین فی الہند" (ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل) کے نام سے روزنامہ اخوان المسلمون (قاہرہ) اور بعض دوسرے پرچوں میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

مسعود صاحب نے اگرچہ دارالعروبہ کی ذمہ داری یہ طے کر کے لی تھی کہ وہ کسی کتاب یا رسالہ کا ترجمہ نہ کریں گے، خود مستقل تصانیف لکھیں گے اور اسی لئے انہوں نے اپنی کتاب "غربۃ الاسلام فی الہند" شروع کی تھی ترجموں کا کام اپنے دوسرے ساتھیوں سے کرانے کا پروگرام تھا، مگر یہاں پہنچ کر مسعود صاحب کو محسوس ہوا کہ ترجمہ کا کام بھی ان ہی کو کرنا پڑے گا، کیونکہ سخت تلاش کے باوجود اب تک صحیح عربی لکھنے والے باصلاحیت رفقاء نہ مل سکے تھے۔ اب تک جو ترجمے ہوئے تھے۔ وہ بھی بہت اچھے نہ تھے "اسلام کا نظریہ سیاسی" اور "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کی تصحیح ہو چکی تھی۔ اب آئندہ نئے رسالوں کا ترجمہ مسعود صاحب نے خود کرنا شروع کیا۔ ایک سوا سال کے عرصہ میں انہوں نے "دین حق"، "اسلام اور جاہلیت"، "شہادت حق" اور "جہاد فی سبیل اللہ" کا ترجمہ کیا۔ میں نے "نظام حیات" کا ترجمہ کیا تھا اس کی انہوں نے

اور نئے تصحیح کی۔ مولانا محمد ناظم صاحب ندوی (حال پرنسپل جامعہ عباسیہ بہاولپور) نے "معاشی مسئلہ" کا ترجمہ کیا تھا، اس پر نظر ثانی کی۔ اپنی کتاب "اشتراکیت اور اسلام" کا دوسرا ایڈیشن مرتب کیا۔ "محمد بن عبدالوہاب" اور "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں بھی جگہ جگہ اضافے اور ترمیمیں کیں۔ عربی ممالک سے مراسلت کا دائرہ وسیع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کتاب "غربۃ الاسلام فی الھند" کے لئے مواد جمع کرنے میں باقاعدہ رہے، بلکہ جب موقع ملتا، اس کتاب کو ترتیب دیتے رہے۔ ان کاموں کے علاوہ اپنے کئی شاگردوں اور عزیزوں کو عربی پڑھانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس سال مسعود صاحب کی صحت بہت اچھی رہی اور وہ دن رات ہمہ تن کام میں مشغول رہے۔

مسعود صاحب کی طبیعت جن دنوں اچھی ہوتی، ان کے ارادے دوبارہ جوان ہو جاتے، طرح طرح کی سکیمیں ذہن میں آتیں اور وہ انہیں عملی جامہ پہنانے کی فکر میں لگ جاتے۔ دو اڑھائی سال کی کوششوں کے بعد اندازہ ہوا کہ جب تک عربی ممالک کا دورہ نہ کیا جائے، یہاں رہتے ہوئے ان ممالک میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ عربی رسالے کئی کئی ہزار کی تعداد میں چھپ گئے تھے۔ مگر باہر کہیں نہیں جا رہے تھے۔ لہذا مسعود صاحب نے عزم کیا کہ عرب ممالک کا ایک دورہ کیا جائے۔ بغداد میں ان کے استاذ شیخ تقی الدین الہلالی (جو اب جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لے آئے تھے) آکر مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے تھے۔ مسعود صاحب نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے عراق جایا جائے، اس کے بعد اگر حالات سازگار ہوئے اور مالی وسائل نے اجازت دی، تو دوسرے ممالک میں بھی جایا جا سکتا ہے۔ فروری ۱۹۴۹ء کے وسط میں امیر جماعت سے اجازت لینے اور دار العروبہ کے کام کو سمجھانے کے لئے راولپنڈی سے لاہور آئے۔ چھ ماہ کا معاوضہ پیشگی لیا، یعنی مصارف سفر کے لئے جماعت سے کوئی رقم نہ لی اور یکم مارچ ۱۹۴۹ء کو کراچی روانہ ہو گئے۔ ڈیڑھ ماہ تک پاسپورٹ کی کوشش کرتے رہے، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر عراق کے لئے زیارت کا عارضی پاسپورٹ لے کر ۲۸ اپریل ۱۹۴۹ء کو کراچی سے بصرہ روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ یہ عاجز بھی تھا۔

۵ مئی کو بصرہ اور ۱۰ مئی کو بغداد پہنچے۔ ۱۶ اگست تک بغداد ہی میں قیام رہا، اگرچہ اس دوران میں چند دنوں کے لئے شمالی عراق کے مشہور شہر "موصل" بھی گئے۔ راستے میں کرکوک اور اربیل بھی ٹھہرے، لیکن زیادہ تر قیام بغداد ہی میں رہا۔ بغداد میں ہمارا قیام شارع الرشید میں روزنامہ "السجل" کے دفتر کے ساتھ ہی ایک کمرے میں تھا، لیکن ہم لوگ ہر روز ہلالی صاحب (جن کا قیام اعظمیہ میں تھا) کے ہاں جاتے۔ انہیں اپنے عربی رسالے پڑھ کر سناتے، جس سے ہمارے رسالوں کی تصحیح بھی ہوتی، ہمیں علمی فائدہ بھی پہنچتا اور ہلالی صاحب بھی دعوت سے متعارف ہوتے۔ بغداد کے دوسرے علماء، ادباء اور صاحب علم حضرات سے ملاقاتیں رہتیں، جن میں مسعود صاحب ان لوگوں کو ہندو پاکستان کے حالات اور یہاں کی اسلامی تحریک سے روشناس کراتے، جس کے نتیجہ میں ان لوگوں نے دار العروبہ کے بہت سے رسالے مرکزی مکتبہ (لاہور) سے طلب کئے اور اپنے ہاں کے نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں میں پھیلائے۔ روزنامہ اخبار "السجل" میں کشمیر اور ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا۔

بغداد کے قیام تک ہمیں یہ امید نہ تھی کہ اس سفر میں ہم لوگ حج و زیارت سے بھی مشرف یاب ہو سکیں گے، لیکن ایک تو ہلالی صاحب نے بہت زور دیا اور دوسرے جماعت نے بھی دو ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا، اس لئے مسعود صاحب نے عزم کر لیا کہ حج و زیارت سے مشرف ہو کر پاکستان واپس جائیں گے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ رکھنے پر اصرار کیا۔

پاکستان سے روانہ ہوتے وقت سعودی عرب کے سفیر مقیم پاکستان سید عبدالحمید خطیب نے مسعود صاحب کو سعودی عرب کے سفیر مقیم عراق عبداللہ خیال کے نام ایک تعارفی خط دے دیا تھا۔ ہم لوگ جب سعودی عرب کا ویزا لینے کے لئے عبداللہ خیال کے ہاں گئے، تو عبدالحمید الخطیب کا خط دیکھ کر انہوں نے خود ہی ہمارے پاسپورٹ پر ویزا کے ساتھ "اعفی عن رسوم الحج جملۃ" (حج کے ٹیکسوں سے معاف) کی مہر لگا دی۔ اس زمانہ میں حج کا ٹیکس ۲۷،۲ روپے فی کس تھا۔ اس سے ہمارے مصارف میں کافی کمی آگئی۔

بغداد سے بصرہ اور بصرہ سے کویت پہنچے۔ وہاں گیارہ روز قیام کیا۔ کویت سے باربرداری کے ایک ٹرک کے ذریعے ریاض پہنچے۔ وہاں چند دن قیام کر کے مکہ معظمہ پہنچے، مدینہ منورہ اور جدہ میں ہمارا قیام تقریباً تین ماہ رہا۔ اس طرح ۱۳ دسمبر ۴۹ء کو ہم لوگ بحری جہاز کے ذریعے واپس کراچی پہنچ گئے۔

اس سفر کے دوران میں مسعود صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ دارالعروبہ کا کام مستقل طور پر دمشق یا قاہرہ میں رہ کر کیا جائے، مگر امیر جماعت اور دوسرے رفقاء سے صلاح مشورہ کے خیال سے واپس آ گئے۔

واپسی کے بعد تین ماہ تک (مارچ ۵۰ء) حیدرآباد (سندھ) میں قیام رہا۔ دارالعروبہ کے کام کے لئے مناسب ترین جگہ کراچی تھی لیکن کراچی کی آب و ہوا مسعود صاحب کو موافق نہ آتی تھی، اس لئے انہوں نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا، تاکہ کراچی سے قریب بھی رہیں اور اس کی مرطوب آب و ہوا سے محفوظ بھی رہیں۔ لیکن تین ماہ کے قیام سے تجربہ ہوا کہ یہاں کی آب و ہوا بھی طبیعت کے موافق نہیں ہے۔ مارچ ۵۰ء میں گوجرانوالہ منتقل ہو گئے تاکہ اگر کراچی نہیں تو کم از کم لاہور ہی سے قریب رہا جائے۔

گوجرانوالہ پہنچ کر مسعود صاحب نے اطمینان سے کام کرنا چاہا، مگر طبیعت بہت خراب رہی۔ سفر تو خیر جوش اور حوصلہ کے بل پر کٹ گیا لیکن اب اس کا ردعمل شروع ہوا۔ اس لئے یہاں سوائے اپنی کتاب "غربۃ الاسلام فی الھند" (جس کا نام انہوں نے بغداد کے دوران میں بدل کر "تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند و باکستان" رکھ دیا تھا) کا کچھ حصہ مکمل کرنے کے کوئی اہم کام نہیں ہو سکا۔

اس وقت تک مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی (جن کی ۴ اکتوبر ۴۸ء کو گرفتاری ہوئی تھی) جیل سے رہا ہو کر نہیں آئے تھے۔ جناب عبدالجبار صاحب غازی امارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مئی ۵۰ء میں غازی صاحب نے اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر جماعت کی امارت سے استعفا دے دیا۔ ارکان شوریٰ نے متفقہ طور پر مسعود صاحب کو جماعت کا امیر منتخب کر لیا۔ اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر مسعود صاحب نے بہت معذرت کی، پھر دارالعروبہ کی ذمہ داری بھی ان کے کندھوں پر تھی، لیکن رفقائے جماعت نے ان سے بہتر کوئی دوسرا آدمی امارت کے لئے مسعود صاحب سے موزوں نہ پایا۔ مجبوراً مسعود صاحب کو یہ ذمہ داری بھی قبول کرنا پڑی۔ گوجرانوالہ واپس آ گئے، اس ارادے سے کہ چند دن کے بعد مستقل طور پر لاہور منتقل ہو کر اس ذمہ داری کا باقاعدہ چارج لے لیں گے۔ لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جس دن رفقاء نے مسعود صاحب کو امیر منتخب کیا، اس سے دو ہی روز کے بعد ملتان جیل سے مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب کی رہائی ہو گئی۔ مسعود صاحب کے سر سے گویا ایک بارِ عظیم ہل گیا۔

گوجرانوالہ کے قیام کے دوران میں مسعود صاحب ایک دو مرتبہ مؤتمر عالم اسلامی کے سلسلہ میں کراچی بھی گئے اور عرب ممالک کے نمائندوں سے ملاقات کر کے ان پر جماعت کی دعوت پیش کی۔

سوا سال تک گوجرانوالہ میں قیام رکھنے کے بعد مسعود صاحب کو تجربہ ہوا کہ یہاں کی آب و ہوا بھی انہیں موافق نہیں آئی۔ مجبوراً راولپنڈی میں دوبارہ مستقل قیام کا فیصلہ کیا، اگرچہ وہ راولپنڈی کے دور افتادہ شہر میں رہنا اپنے کام کے لئے موزوں نہ سمجھتے تھے۔

مئی ۵۱ء میں گوجرانوالہ سے راولپنڈی منتقل ہو گئے۔ ایک دو ماہ کی تلاش کے بعد کمیٹی محلہ میں دارالعروبہ اور اپنی رہائش کے لئے مکان ملا۔ یہاں آنے کے بعد مسعود صاحب کی طبیعت کافی حد تک سنبھل گئی، مگر تکلیف کبھی زیادہ ہو جاتی، کبھی کم۔ برابر چند ماہ تک طبیعت کبھی اچھی نہیں رہ سکی۔ اب انہوں نے اپنی کتاب "تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند و باکستان" کو جلد از جلد مکمل کرنے کی کوشش کی۔ المسلمون اور بعض دوسرے عربی پرچوں میں بعض مضامین لکھے۔ اردو پرچوں میں بھی کبھی کبھی کوئی مضمون شائع کرتے۔ نومبر ۵۱ء میں جماعت اسلامی پاکستان کا سالانہ اجتماع

ہُوا، اس کے لئے مسعود صاحب نے دو مقالے لکھے، ایک "دنیا میں اسلامی تحریکیں" اور دوسرا "ہندوستان میں دعوتِ اسلامی کی مختصر تاریخ"۔ ۱۹۵۱ء کے شروع میں انہوں نے اپنی کتاب "تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند و باکستان" مکمل کر لی[1]۔ اس کے بعد عربی ہی میں اس کا خلاصہ "نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند و باکستان" کے نام سے لکھنا شروع کیا، جو نومبر یا دسمبر ۱۹۵۱ء میں مکمل ہُوا۔ اس کا کچھ حصہ مسعود صاحب قیام بغداد ہی کے زمانہ سے ماہنامہ "لسان الدین" (مراکش) کو بھیجنے لگے تھے، جو اس کے کئی پرچوں میں قسط وار شائع ہُوا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۱ء کے ترجمان القرآن کے پرچوں میں بعض نئی مصری کتابوں کا تعارف کرایا۔ فاران اور چراغِ راہ کے پرچوں میں بعض عرب شخصیتوں کا تعارف کرایا۔

اس عرصہ میں دار العروبہ کی کتابوں کا قاہرہ میں چھپنے اور وہیں پھیلنے کا نظم ہو گیا تھا۔ مسعود صاحب نے دار العروبہ کے تمام رسالوں کی دوبارہ تصحیح کی۔ ان پر مقدمے لکھے اور ایک پر مولانا مودودی کا مختصر تعارف نامہ بھی لکھا۔ اس کے علاوہ اس عرصہ میں اس عاجز نے جن کتابوں کا ترجمہ کیا تھا، ان کی تصحیح بھی کی، مثلاً: دو دستوری خاکے، منشور جماعتِ اسلامی، انتخابی جدوجہد، تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں، مسئلہ ملکیتِ زمین، دنیا میں اسلامی تحریکیں، سود کے بعض ابواب، دستورِ اسلامی کی تدوین وغیرہ۔ ان کے علاوہ سید محمد کاظم صاحب (بہاولپور) نے بعض کتابوں کا ترجمہ کیا تھا۔ مسعود صاحب نے انہیں دو مرتبہ اپنے پاس راولپنڈی بلایا اور ان کے ترجمہ کی تصحیح کی مثلاً: اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر، دستورِ اسلامی کی بنیادیں اور چار بنیادی اصطلاحیں وغیرہ۔

اس کے علاوہ انہوں نے مجھ سے اپنی کتاب "الترجمۃ العربیۃ" کی از سرِ نو ترتیب دلانا شروع کی۔ میں نے ان کی ہدایت کے مطابق اس کتاب کے دونوں حصے لکھے، اور انہوں نے ان کی تصحیح کی اور مقدمہ لکھا۔

جنوری ۱۹۵۳ء میں مسعود صاحب نے مولانا مودودی کی فرمائش پر "پردہ" کا ترجمہ خود کرنا شروع کیا۔ ابھی اس کے پہلے باب کا بھی ترجمہ مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کی صبح جماعتِ اسلامی کے دوسرے رفقاء سمیت ان کی گرفتاری عمل میں آ گئی۔

جس روز مسعود صاحب کی گرفتاری ہوئی ہے۔ اس سے ایک ماہ پہلے سے ان کی طبیعت سخت خراب تھی، خصوصاً ۲۷ اور ۲۸ مارچ کی درمیانی رات کو تو انہیں مرض کا سخت دورہ پڑا اور اسی لئے صبح کے وقت اپنے معمول کے خلاف بستر میں نڈھال لیٹے ہوئے تھے کہ دروازے پر پولیس والوں نے دستک دی۔ مسعود صاحب اسی حال میں پوری ہمت اور حوصلہ کے ساتھ پولیس والوں کے ساتھ روانہ ہو گئے، پھر انہیں ایک جیپ کار میں بٹھا کر تھانے لے آئے۔ یہیں غازی صاحب بھی موجود تھے۔ گیارہ بجے دوپہر جیل میں داخل ہوئے۔

مسعود صاحب ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو گرفتار اور ۲ اگست ۱۹۵۳ء کو رہا ہوئے یعنی کل چار سوا چار ماہ جیل میں رہے۔ ان چار مہینوں میں قید و بند کی آزمائشوں کو انہوں نے جس خندہ پیشانی، ہمت اور جوانمردی سے برداشت کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس ہمت و جوانمردی میں نہ صرف یہ کہ وہ دوسروں سے کم نہیں تھے، بلکہ بہت سوں سے آگے تھے۔ پلنگ کے بغیر غیر ہموار اور مرطوب زمین پر بستر بچھا کر سونا، اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا، برتن دھونا، الغرض اس طرح کی تمام تکالیف انہوں نے جیل کی زندگی میں برداشت کیں۔ گھر میں کھانے پینے، لکھنے پڑھنے، سونے اور آرام کرنے میں جو آسانیاں انہیں فراہم تھیں، وہ سب کی سب ان سے اسی روز چھن گئیں جس روز وہ جیل میں داخل ہوئے۔ جیل ہی کے زمانہ میں رمضان کا مہینہ آیا۔ گرمی انتہائی سخت تھی اور مسعود صاحب دمہ کے مریض، اس لئے وہ اگرچہ روزہ کوئی نہ رکھ سکے، لیکن قرآن

---

[1] افسوس یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی۔ کوشش ہو رہی ہے۔ امید ہے عنقریب دمشق سے شائع ہو جائے گی (انشاء اللہ) اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔ اس نمبر میں جناب طٰہٰ یٰسین صاحب اس کے ایک باب کا ترجمہ دے رہے ہیں۔

کی تلاوت اور رات کے قیام میں کسی صحت مند انسان سے پیچھے نہ رہے۔ ہر نماز جماعت سے ادا کرتے اور ہر روز پابندی سے کھڑے ہو کر تراویح کی نماز ادا کرتے۔ جیل میں جو حافظ صاحب تراویح پڑھاتے تھے، وہ پانچ پارے روزانہ پڑھتے تھے۔ مسعود صاحب ان ہی کے پیچھے نماز پڑھتے اور اکثر کھڑے ہو کر پڑھتے۔

جیل کے زمانہ میں مسعود صاحب کی صحت اگرچہ توقع سے بہت زیادہ اچھی رہی۔ مگر وہ اپنے روزنامچہ کے سوا کوئی علمی چیز لکھ نہ سکے۔[1] "مناسکِ حج" پر ایک رسالہ لکھنا بھی چاہا، بلکہ اس کے لئے تمام ضروری کتابیں طلب بھی کر لیں، مگر زمین پر بیٹھ کر لکھنے میں انشراح خاطر نہ ہوا۔ صرف پڑھنے پر اکتفا کیا۔ نیل الاوطار کے کئی حصے پڑھ ڈالے۔ تفسیر اور بعض ادبی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔

جیل سے آنے کے بعد مسعود صاحب کی طبیعت بہت خراب ہو گئی، بلکہ نومبر کے شروع میں تو انہیں مرض کے ایسے ایسے دورے پڑے کہ عمر میں کبھی ایسے دورے نہ پڑے تھے۔ بسا اوقات کئی کئی گھنٹے تک مسلسل بے ہوش رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیل سے آنے کے بعد ان کی طبیعت پوری طرح کبھی نہ سنبھلی۔ یہ ان کی ہمت اور قوتِ ارادی تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے۔ دسمبر میں کراچی کا سفر بھی کر ڈالا، ورنہ وہ اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ کوئی کام کرنا ان کے لئے سخت مشکل تھا۔

جیل سے آنے کے بعد وہ کوئی بڑی کتاب نہ لکھ سکے اور نہ کسی کتاب کا ترجمہ شروع کر سکے۔ صرف چند عربی رسالوں کے ترجمہ کی تصحیح کی۔ "الاخوان المسلمون" کی تاریخ اور کارناموں کے متعلق ایک کتاب مرتب کرنا چاہتے تھے، لیکن ایک تو ان کی مرضی کے مطابق پورا مواد جمع نہ ہو سکا تھا، دوسرے طبیعت بھی مسلسل خراب رہی۔ اس لئے یہ کام انجام نہ دے سکے۔

۲۲ نومبر ۵۳ء کو انہیں اپنے شفیق و محترم استاذ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے انتقال کی خبر عین اس حال میں ملی، جب کہ وہ خود سخت بیمار تھے۔ اس کا ان کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ سید صاحبؒ سے انہیں انتہائی محبت و عقیدت تھی۔ صبر کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ بیماری سے سنبھلتے ہی تین کام انجام دیئے: ایک سید صاحبؒ کی وفات پر اپنے ذاتی تاثرات قلمبند کئے، جو چراغِ راہ ماہ اپریل ۵۴ء میں شائع ہوئے۔ دوسرے سید صاحبؒ کی سوانح عمری مرتب کی، جو معارف کے "سید سلیمان نمبر" کے لئے اعظم گڑھ روانہ کی۔[2] تیسرے گذشتہ پچیس چھبیس سال کے عرصہ میں سید صاحبؒ کے جو خطوط ان کے نام موصول ہوئے تھے اور جنہیں انہوں نے حد درجہ احتیاط و ترتیب کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا، ان کے کتابی شکل میں شائع ہونے کا نظم کیا۔ پہلے ان تمام خطوط کو الگ کاپی میں نقل کرایا۔ پھر ہر خط کو پڑھا اور جہاں ضرورت سمجھی، حاشیے میں اس کے متعلق توضیحی نوٹ دیا۔ جب مسودہ تیار ہو گیا، تو کتاب کا مقدمہ لکھا۔ اگرچہ کتابت ہو چکی تھی، لیکن افسوس کہ یہ کتاب آپ کی زندگی میں زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکی۔ انڈکس بھی آپ کے بعد ہی مرتب ہوا۔

اسی طرح سید صاحب پر ایک مضمون عربی میں لکھا اور "المسلمون" میں چھپنے کے لئے قاہرہ بھیجا، مگر مصر کے حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ یہ مضمون المسلمون میں شائع نہ ہو سکا۔ اس کی نقل محفوظ ہے، ان شاء اللہ جلدی ہی کسی دوسرے عربی ماہنامہ میں شائع ہو جائے گا۔

یکم مارچ ۵۴ء کو مسعود صاحب اس ارادے سے کراچی روانہ ہوئے کہ وہاں اپنے مصر و شام کے پاسپورٹ میں توسیع کرائیں گے (کیوں کہ ۲۴ جون ۵۴ء کو اس کی مدت ختم ہو رہی تھی) اور اس کے بعد اگر رفقائے جماعت نے اپنے مالی وسائل کو دیکھتے ہوئے اس چیز پر اتفاق ظاہر کیا کہ وہ یعنی مسعود صاحب مصر و شام کے دورے پر روانہ ہو جائیں، تب تو وہ وہیں سے روانہ ہو جائیں گے، ورنہ راولپنڈی واپس آجائیں گے یا

---

[1] اس روزنامچہ کا کچھ حصہ ماہنامہ فاران (اکتوبر ۵۳ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] یہ نمبر ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ (ان شاء اللہ)

اپنے والد صاحب قبلہ کی ملاقات کے لئے بھارت جانے کی کوشش کریں گے۔

۳ مارچ کی صبح کو کراچی پہنچے، طبیعت اچھی تھی، اور اسی لئے اپنے معمول کے خلاف اپنے کسی رفیق کو سفر میں ساتھ بھی نہ لائے تھے۔ اپنے دوست حکیم محمد نصیر الدین صاحب ندوی (مالک نظامی دواخانہ۔ فریئر روڈ) کے ہاں قیام کیا۔ یہاں آنے کے بعد طبیعت کچھ مضمحل رہنے لگی، کوئی کام بھی نہ ہو پاتا۔

کراچی ہی میں اپنے ایک شاگرد محمد اسلم صاحب الہ آبادی (رکن جماعت اسلامی) کو رات کو اپنے پاس سلاتے، طبیعت کچھ خراب ہی ہوتی گئی، لیکن تشویش ناک حد تک خراب نہ تھی۔ پاسپورٹ میں توسیع کی درخواست دے دی۔ ۱۴ مارچ سے جناب سلطان احمد صاحب کے گھر (پیر الٰہی بخش کالونی) میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہونا تھا۔ اس لئے مقررہ دن سے ایک روز پہلے حکیم صاحب کے ہاں سے سلطان احمد صاحب کے ہاں منتقل ہو گئے۔ اسی شوریٰ میں آپ کے سفر پر روانہ ہونے یا نہ ہونے کا بھی فیصلہ ہونا تھا۔ تین دن تک شوریٰ کی کارروائیوں میں باقاعدہ حصہ لیتے رہے۔ ۱۶ مارچ کی شام کو مغرب کے بعد مالیاتی کمیٹی کی ایک میٹنگ تھی۔ مسعود صاحب بھی اس کے ایک رکن تھے۔ مغرب کے بعد دوسرے ارکان نے آپ کو بلایا، مگر آپ نے یہ کہ کر معذرت کر دی کہ "آج بہت تکان محسوس کر رہا ہوں، اس لئے مجھے کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت سے معذور سمجھا جائے تاکہ کل صبح شوریٰ کی کارروائی میں پورے سکون سے حصہ لے سکوں"۔ اس کے بعد اپنے بعض دوستوں سے اپنے بستر میں بیٹھے ہوئے بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے کے قریب آپ کو مرض کا ایک دورہ پڑا، جو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ معمول سے کافی سخت تھا۔ نو بجے کے قریب کسی کی مدد یا سہارے کے بغیر بیت الخلا گئے۔ واپس آکر بستر پر لیٹ گئے۔ طبیعت بہت زیادہ نڈھال محسوس ہو رہی تھی معمول کے بالکل خلاف لیٹے رہے۔ دیکھتے دیکھتے تین ہچکیاں آئیں، جن میں سے ہر ایک جسم کی طاقت کو کم سے کم تر ہی کرتی گئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا، لیکن ڈاکٹر کے پہنچنے تک اللہ کا یہ مجاہد بندہ اپنے رب کو لبیک کہہ چکا تھا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہ راجعون۔

ایتھا النفس اجملی جزعاً
فان ماتحذرین قد وقعا

۱۷ مارچ کی صبح ۱۰ بجے کے قریب دہلی کے پنجابی سوداگران کے قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

آپ کے پیچھے رہنے والوں میں آپ کے بوڑھے والد ماجد مدظلہ، آپ کی سوتیلی والدہ، ایک بھائی، ایک بہن (دوسری والدہ سے) اور دو بھانجیاں ہیں۔ والد صاحب، والدہ، بھائی اور بہن کا قیام بہار میں ہے۔ بڑی بھانجی ملتان میں رہتی ہیں اور چھوٹی ڈھاکہ میں۔ اولاد کوئی نہیں، اہلیہ کو پاکستان بننے کے بعد فروری ۴۹ء میں بعض ذاتی اسباب کی بنا پر طلاق دے دی تھی۔

علو فی الحیاۃ و فی الممات   الحق انت احدی المعجزات
علیک تحیۃ الرحمن تتری   برحمات غواد و رائحات

بقیہ: مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی چند ناقابلِ فراموش خوبیاں صفحہ ۱۲۶

مسیح نے فرمایا ہے کہ تم دو آقاؤں کو بیک وقت خوش نہیں رکھ سکتے۔ اس آسمانی صداقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مولانا کے متعلق میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جن مختلف المسلک بزرگوں کو وہ بیک وقت راضی رکھنے کے لئے کوشاں رہے، ان کو راضی رکھنے میں وہ کامیاب ہوئے یا نہیں اور اگر کامیاب ہوئے تو کس حد تک ہوئے، لیکن مجھے اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں بالکل مخلص تھے۔ کم از کم جماعت اسلامی کے ساتھ ان کا اخلاص ہم سب کے لئے نمونہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خوبیوں اور نیکیوں کو قبول فرمائے، ان کی لغزشوں کو معاف کرے اور جماعت اسلامی کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

مولانا مسعود عالم ندوی خود اپنی نظر میں

لالہ صحرائی

مندرجہ بالا عنوان کے باب میں قدرتاً مولانا مرحوم کا شہرۂ آفاق سفرنامہ "دیارِ عرب میں چند ماہ" ہی موزوں نظر آتا ہے۔ لیکن میں نے جب اس کتاب میں سے متعلقہ مواد فراہم کرنے کا ارادہ کیا، تو بڑی دقت پیش آئی، وجہ یہ کہ، مولانا مرحوم نے اپنی بے حد و نہایت تواضع اور فراوانیٔ انکسار کے باعث اس کتاب میں بہت ہی کم اشارات اپنی ذاتِ گرامی کے متعلق رقم فرمائے ہیں، حالانکہ اکثر اہلِ قلم روزنامچوں اور سفرناموں کو بس اپنی ہی ذات کی جلوہ گاہ بناکر رکھ دیا کرتے ہیں، اپنے روزنامچہ کو "ذکرِ ذات" سے ایک غیر معمولی اور حیرت انگیز حد تک خالی رکھنا، مولانا مرحوم کی بے نفسی، عالی ظرفی، اور شگفتگیٔ طبع کی ایک مزید دلیل ہے، چنانچہ مجبوراً میں نے اس عنوان کے تحت "دیارِ عرب" کے وہ مندرجات بھی جمع کر دیئے ہیں، جن کے ذریعے مولانا کی ذاتِ گرامی کے علاوہ اُن کی سیرت، عادات، عقائد یا کسی مخصوص نفسیاتی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے۔

حوالے کے طور پر ہر اقتباس کے آخر میں کتاب کے متعلقہ صفحہ کا شمارہ اور مقامِ تحریر دے دیا گیا ہے۔

اللہ کرے میری یہ حقیر سی کاوش، کسی اہلِ نظر کو مولانا کی سیرت نگاری کی سعادت اندوزی پر مائل کر دے!

سوانحی اشارے :-

خلیج جھیل کی طرح ساکن ہے، ..... گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں ..... عمر چالیس کے قریب ہونے کو آئی، بار ہا سوال پیدا ہوتا ہے، پایا کیا؟ ندوہ کی زندگی علم و ادب کی زندگی تھی، مگر نام و نمود، جتھہ بندی، اور جوڑ توڑ کی برائیوں سے خالی نہ تھی، پٹنہ میں سات سال گذارے، سکون اور علمی سکون کی زندگی تھی، کتابوں اور ان کے عالی مرتبت مصنفین کی صحبت تھی، طالب علموں کے نقطۂ نگاہ سے قابلِ رشک زندگی تھی، مگر اس سکون کی قیمت بہت گراں، دل اندر سے بھنچتا تھا، سرکاری ملازمت اور آگے پیچھے نا اہلوں سے واسطہ، بر آں مجاملت، بر نقطہ مدارات، اپنی دنیا آپ بسانے کی کوشش کی، تو پٹنہ میں بھی ندوہ کے نام پر جتھہ بندی شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے معرکے ہوئے اور اللہ معاف کرے، جاہلیت کا آخری معرکہ اس وقت گرم ہوا، جب جماعت اسلامی قائم ہو چکی تھی اور خاکسار اس کا رکن تھا۔ جولائی ۴۲ء [میں] انجمن ترقی اردو کی صوبائی کانفرنس تھی۔ صوبائی انجمن، ذاتی اغراض کی بنا پر مرکز سے باغی ہو رہی تھی، ہم لوگوں نے مرکز کی حمایت کا بیڑا اٹھایا۔ ہماری فوج میں اکثر و بیشتر سوشلسٹ اور کانگریسی نوجوان تھے۔ اس لئے غیر شعوری طور پر، پارٹی لیڈر، کی حیثیت سے عاجز آگے کر دیا گیا ــــ اللہ معاف کرے، ذاتی اغراض اور پارٹی بندی کی یہ آخری جنگ تھی۔ جس کی شرکت کا داغ آج تک دل میں

ہے۔ میرے عزیز رفیق تقی الدین نعمانی بار بار کہتے۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ قوتیں کہاں ضائع ہو رہی ہیں؟" میں کہتا۔ "بھائی! یہ آخری جنگ ہے۔ ہمیں ...... سے ندوہ کا انتقام لینا ہے۔"

کتاب زندگی کا نیا باب اکتوبر ۱۹۴۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ نامرادیوں نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ناکامیوں سے اس راہ میں بھی دوچار ہونا پڑا، حوصلے اور منصوبے پورے نہ ہوئے، اور تو اور عربی ماہنامے کی تجویز بھی ابھی تک عملی جامہ نہیں پہن سکی، صرف چھ پمفلٹ طبع ہو سکے ہیں، "غربۃ الاسلام فی الہند"[1] کا مسودہ دو برس سے ادھورا پڑا ہے۔ حج اور عالم اسلام کی سیاحت کا پروگرام ذاتی مجبوریوں کے باعث پورا نہ ہوسکا۔ تقسیم سے پہلے بالکل تیار تھا۔ ضروری زادِ راہ کا بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انتظام ہوگیا تھا۔ مگر اس ٹریجیڈی نے دنیا ہی بدل دی۔ بیس سال میں جو کچھ جمع کیا تھا۔ غالباً ردی کے نرخ فروخت ہوا ہوگا۔ وہ کتابیں اگر دوبارہ خریدی جائیں۔ تو بھی وہ کام نہیں کرسکتیں۔ ان کتابوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہوا، حاشیوں پر یادداشتیں، اُن کے صفحے اور سطریں ایسی مانوس، گویا نگاہوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اور حاضر العالم الاسلامی، اور الفتح کی جلدیں، اُن کے خاص مضامین اور ابواب نگاہوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں —— کہنا یہ ہے کہ یہاں بھی دشواریاں پیش آئیں اور آ رہی ہیں۔ لیکن ضمیر مطمئن ہے دوستوں اور رفیقوں سے اختلاف ہوتا ہے۔ مگر ذاتی غرض کے لئے نہیں۔ بعض مسئلوں میں رفیقوں سے الگ رائے ہوتی ہے لیکن اس پر اصرار نہیں ہوتا۔ کام تھوڑا ہو یا بہت۔ بس دعا ہوتی ہے کہ اللہ کے لئے ہو اور صرف اللہ کے لئے۔

سوچ بچار کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور غالباً بصرہ تک جاری رہے گا۔ ہمارے بزرگ اس محاسبۂ نفس کو تصوف کی شاخ بتاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں تم بھی عملاً تصوف کے قائل ہو۔ عاجز عرض کرتا ہے۔ "یہ تو آپ کے اختیار میں ہے، ہر اچھے فعل کو تصوف کا نام دے دیں اور پھر کہیں تم تصوف کے قائل ہو۔ ہم تو اس دجل و فریب سے براءت کرتے ہیں۔ جو آج عام طور پر تصوف کے پردے میں رونما ہوتا ہے۔ ہم ان بدعات کے منکر ہیں۔ جو تصوف کی راہ سے دین خالص میں داخل ہوگئی ہیں۔ باقی احسان اور تعلق باللہ کا کون کافر منکر ہوگا؟

○

نجد اور اس کے موجودہ امیر...... کی زندگی اوروں کے لئے کتنی ہی جاذب ہو، لیکن راقم کو کوئی اور ہی چیز نجد لائی ہے۔ دو سو برس سے نجد کی زمین ایک عظیم الشان دعوت کی مرکز رہی ہے، اور اس کے متعلق دنیا کی مختلف زبانوں میں موافق و مخالف لٹریچر کا ایک انبار موجود ہے، راقم کو اس دعوت سے دلچسپی تھی، اپنی طالب علمانہ زندگی کے دو تین اچھے اور اطمینان بخش سال اس کی نذر کئے، اور اس تلاش و جستجو کا نتیجہ محمد بن عبد الوہاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے، لیکن اپنی سی پوری کوشش کے باوجود محمد بن عبد الوہاب کی زندگی کے بعض پہلو مزید روشنی کے محتاج رہ گئے، عرصے سے بلاد نجد کی زیارت کا شوق تھا۔ قصہ زمین برزمین کے طور پر چل طلب

---

[1] اب راقم نے اس کا نام تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند رکھ دیا ہے۔ اور اللہ کے فضل سے زیر تکمیل ہے۔

مسائل کو مقامی علماء کی مدد سے حل کرنے کو جی چاہتا تھا۔

(ریاض) ——————————— (۱۹۴ - ۱۹۵)

O

کل سے دو گھنٹوں کے لئے جہاز کا لاؤڈ سپیکر ہمارے تصرف میں رہے گا۔ پر اس سے فائدہ کون اُٹھائے، میں تو تنفس اور لکنت کی وجہ سے تقریر نہیں کرتا۔

(جہاز میں) ——————————— (۳۷۵)

O

ہوا تیز ہے، سمندر حرکت میں ہے۔ الحمد اللہ راقم بالکل چاق و چست اور تندرست ہے۔ ..... سمندر کا سفر راقم کے مزاج کے سازگار نظر آتا ہے۔

(جہاز میں) ——————————— (۳۷۸)

O

زندگی میں پہلی مرتبہ راقم کا عوام سے ربط (بشکل امیر الحج) ہوا ہے، اپنی صحت کی خرابی اور طالب علمانہ مذاق کے باعث دیہاتیوں میں کام کا موقع نہیں ملا۔ اس جہاز پر احساس ہوا کہ پنجاب میں پانچ سال رہنے کے باوجود پنجابی نہیں سمجھتا، جالندھر کی پنجابی تو بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ لیتا، بلکہ بسا اوقات پنجابی تقریروں میں لطف بھی آتا تھا، مگر یہاں پنجاب کے اضلاع اور خاص کر دیہاتوں کے رہنے والے جو بولی بولتے ہیں، ان سے راقم بالکل ناآشنا ہے۔

(جہاز میں) ——————————— (۳۸۰)

عادات و خصائل :-

دس بجے دن سے پانچ بجے شام تک ہم لوگ لق و دق بیابان میں پڑے رہے، دونوں موٹروں کے درمیان اوپر پردہ ڈال کر لیٹنے کا انتظام کیا گیا، عاصم تو خوب سوئے، مگر مجھ غریب کو نیند کہاں آتی ہے، ذرا سی نقل و حرکت ہو۔ تو گھر پر نیند اچٹ جائے، تپتی ہوئی ریت پر دری اور تو شک بچھا کر نیند کی دعوت دینا مشکل تھا، بہر کیف لیٹا رہا، اور دنیا کے تغیرات اپنی زندگی، اور اسلامی تحریک کے آئندہ مرحلے اور ان کے مختلف امکانات پر غور کرتا رہا۔

(کویت کا صحرا) ——————————— (۱۹۱)

O

ہم لوگ بھی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اتر پڑے ..... راقم خشکی کے خوف سے اندر لیٹا ..... عاصم تو سوتے ۔ ہے۔ مگر اس نازک جسم کو نیند کہاں آتی، کچھ دیر خیالات کے دریا میں غوطے لگاتا رہا، طبیعت گھبراتی، تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا، ایک بے زاد و راحلہ اور

کمزور وناتواں انسان صرف اللہ کے فضل و توفیق سے کشاں کشاں بیت اللہ کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ نعمت اپنی جگہ پر مسلسل شکر کی مستحق ہے۔

(مکہ مکرمہ کے راستے میں) ———— (۲۲۴)

○

راقم بچپن ہی سے اخبار بینی کا عادی رہا ہے، مولانا محمد علیؒ کے ہمدرد سے اس شوق کا آغاز ہوا، اور رفتہ رفتہ یہ شوق طبیعت ثانیہ بن گیا متعدد پرانے اخباروں کے فائل پڑھ ڈالے، اردو، عربی، انگریزی زبانوں میں اتنے اخبار پڑھے، کہ جی اکتا گیا، اور دس پانچ برس سے بالکل ضروری اور ناگزیر اخباروں پر اکتفا کرنے لگا ہوں، مگر اس سفر میں یہ سلسلہ بالکل ٹوٹ گیا، ہر طرف اندھیرا معلوم ہوتا ہے، ..... دنیا اور پاکستان کے حالات سے بالکل بے خبر اپنے کام میں مشغول ہوں، اب کراچی پہنچ کر چھ سات مہینوں کے پرانے پرچے پڑھنا پڑیں گے اگر کہیں فائل مل گیا۔

(مکہ مکرمہ) ———— ۲۴۸

○

کمزوری کے باوجود سفیر مصر کی ملاقات کو جانے کے لئے تیار ہو گیا، اور یہ راقم کی فطری کمزوری ہے، مرض کا حملہ ہوتا ہے، تو کراہتا رہتا ہے، اور جونہی ذرا افاقہ ہوا مطلق خیال نہیں کرتا۔

(مکہ مکرمہ) ———— (۲۸۵)

○

کھانسی پھر بڑھ گئی، بار بار ارادہ کرتا ہوں، کہ دو چار دن مکمل آرام کروں، مگر طبیعت پر قابو نہیں، سوچتا ہوں، یہ موقع پھر کب ہاتھ آئیگا؟

(مکہ مکرمہ) ———— (۲۹۱)

○

عصر کے بعد پھر نزلے کی ہلکی سی تحریک ہوئی، اور رات ہوتے ہوتے کھانسی کی تکلیف عود کر آئی ہے، راضی برضا ہوں، الحمدللہ مرض کی کسی منزل میں یاس یا ناشکری کا وہم بھی ذہن میں نہیں آیا۔

(مکہ مکرمہ) ———— (۲۹۹)

○

ہم نے ہندوستان اور پاکستان میں کبھی رشوت نہیں دی، ..... مگر اس پاک سرزمین پر ایک دفعہ یہ معصیت بھی کرنا پڑی ..... اے اللہ، تو بہتر جانتا ہے، یہ کمزور وناتواں مجبور تھا، اور بے بسی محسوس کرتا تھا، اب تیرے عفو کا طلبگار اور تیری رحمت کا بھروسہ ہے۔

(مدینہ منورہ) ———— (۳۴۹)

○

عقائد و نظریات :-

بصرہ میں احباب نے گروپ تصویر کشی کی خواہش کی، اور بعضوں نے اس پر اصرار کیا، علمائے عرب نے تو فوٹو پر اجماع کرلیا ہے،... ......دوستوں کے اصرار پر، راقم نے بڑی نرمی سے عرض کیا، "افسوس اس باب میں ہم لوگوں کو علمائے مصر و شام کے اجتہاد سے اتفاق نہیں" سالم جلی نے بڑے دلائل دیئے، مگر انہوں نے اعتراف کیا کہ مجھے خود اس مسئلے میں انشراح نہیں۔ تو میں نے کہا دع ما یریبک الی ما لا یریبک پر عمل کیجئے۔ آخر انہوں نے تجویز واپس لے لی۔

(بصرہ) —————————— (۳۰)

○

سات آٹھ برس پہلے بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ امیر شکیب ارسلان کی کتابیں تلاوت کیا کرتا تھا، اب ان میں مزاج نہیں ملتا ...... دل کچھ اور ڈھونڈتا ہے، اب کہ عمر کا قافلہ چالیس کی سرحد عبور کیا چاہتا ہے، اور چھ سات برسوں سے توجہات کا مرکز اقامت دین کی تحریک ہے، ان یکسر مادی چیزوں سے پیاس نہیں بجھتی، علم اگر دینی روح سے خالی ہے، تو وہ علم کس کام کا؟

(بغداد) —————————— (۴۷)

○

فروع میں راقم بھی ایک رائے رکھتا ہے لیکن اسے دوسروں پر تھوپتا نہیں، اور یہی توقع ہم دوسروں سے کرتے ہیں۔

(بغداد) —————————— (۷۷)

○

کراچی میں ہمارے مخلص دوست محمد ناظم صاحب ندوی ...... نے "نظریۃ الاسلام السیاسیۃ" کے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا، کہ "انگریزی طرز بیان ہے، عربی طرز کا نام ہوتا، تو اچھا تھا، میں نے عرض کیا، کہ آپ کا کہنا ایک حد تک صحیح ہے، مگر "نظریۃ الاسلام السیاسیۃ" کا فقرہ پڑھنے والے کو کچھ سوچنے پر آمادہ کرتا ہے، اگر ہم "النظریۃ السیاسیۃ فی الاسلام" نام رکھتے تو ایک عادی اور جانی پہچانی چیز ہوتی، نام سنتے ہی، سننے والے کی قوت فکر کو جھٹکا نہیں لگتا...... زبان کی صحت اور محاوروں کی پابندی حسن بیان کی ابتدائی شرط ہے۔ البتہ اسالیب بیان اور مجاز و کنایہ میں کچھ وسعت نکالنا پڑے گی۔

(بغداد) —————————— (۸۱)

○

راقم کا بھی عجب حال ہے، حنفی اور عام مسلمان کٹر وہابی، بلکہ اہل حدیث سمجھتے ہیں، اور اہل حدیث حنفی؛

—————————— (۱۰۳)

"..... مصنف موجودہ مصر کے روشناس ادیب ہیں، اس لحاظ سے ان کا اسلام کی ترجمانی کے لئے میدان میں آنا فال نیک ہے۔
..... ان کے زور بیان میں شک نہیں مگر عربی الفاظ میں فرنگی اسالیب بیان چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، عربی زبان وادب میں قدیم وجدید کی کشمکش اسلوب و زبان میں بھی نمایاں ہے، راقم قدرتی طور پر "قدیم" طرز کا آدمی ہے، اور عربی ادب کو قرآنی زبان سے زیادہ قریب دیکھنا چاہتا ہے"۔

(بغداد) ———————— (۱۱۰)

O

چاہتا ہوں "کہ مناسک حج" پر اچھی طرح تیار ہو جاؤں، تاکہ جاہل مطوفوں اور ان کے خدام جنہیں اصطلاح میں قبیان کہتے ہیں کے شر سے محفوظ رہ سکوں (انشاء اللہ)

(بغداد) ———————— (۱۳۷)

O

عبدالرحمٰن الصدیق الملاح صاحب نے پھر رفع یدین نہ کرنے پر تنبیہ کی، ..... تنگ آکر راقم نے کہا فروع میں جھگڑنا ہمارا شیوہ نہیں، اور نہ میں اہل حدیث حضرات کا مقلد ہوں، براہ کرم ہمیں ان بحثوں سے معاف رکھیں"

(بغداد) ———————— (۱۴۵)

O

آج سفر (مکہ) کا آغاز ہے ..... صوفی اور تصوف زدہ حضرات اس مبارک سفر کے لئے عشق ومحبت کا پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں۔ راقم اپنی بے عملی وگنہگاری کے باوجود سنت کا عاشق اور اتباع سنت کا دلدادہ ہے، فرسودہ اور رسوائے عالم جنونِ عشق اور پامال وصلِ محبوب اور فراقِ لیلیٰ کا انداز بیان، اللہ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اپنا اپنا ذوق ہے۔ کسی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے لئے ابروئے پرنم چشم سرمگیں، اور کاکل پیچاں جیسی ترکیبیں اور فقرے استعمال کرنے میں لطف آتا ہے، راقم کو ان شاعرانہ ترکیبوں سے بے ادبی کی جھلک نظر آتی ہے، اسے وہابیت کہئے یا نجدیت، ..... اس گنہگار کا ذوق یہی ہے۔

(مکہ مکرمہ کے راستے میں) ———————— (۲۲۱)

O

(مسجد نبوی میں) نماز کے بعد شباک نبویؐ ..... کے پاس مؤدبانہ قدم بڑھاتے ہوئے آیا، ..... علماء اور صوفیوں نے لمبے لمبے سلام ایجاد کر لئے ہیں ..... لیکن کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات اور فضائل ومحامد دس پندرہ سطروں کے سلام سے ادا ہو سکتے ہیں؟ ہم تو سنتِ رسول کے عاشق ہیں، اور جہاں سنت رسول نہیں، وہاں صحابہؓ کی سنت ہمارے لئے مشعل راہ ہے، اور اس باب میں اکابر صحابہؓ ہی کا طریقہ صحیح اور قابل اتباع کہا جا سکتا ہے، ..... چنانچہ خاکسار نے ابن عمرؓ اور امام مالکؒ کے طریقے پر مختصر سلام پر اکتفا کیا۔

(مدینہ منورہ) ———————— (۳۱۱، ۳۱۲)

○

اس نوجوان پر اس زندگی میں جذب کا اثر معلوم ہوتا ہے ...... کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہیں، میں تصوف سے اس لئے ڈرتا ہوں، جو طریق تزکیہ جوانوں کو وقت سے پہلے بوڑھا بنا دے، کم سے کم وہ جہاد کے لئے آدمی تیار نہیں کر سکتا۔

(۳۵۹) ———————————— (مدینہ منورہ)

اخلاق و سیرت:-

آج نظریہ سیاسی کی قرآت کے دوران میں ایک بات ہماری انتہائی شرمندگی کا باعث ہوئی۔ سورۂ مومنوں کی دو آیتوں میں "تعملون" کی بجائے "مومنین" چھپ گیا ہے، غلطی جس کی بھی ہو، ذمہ داری یکسر میری ہے، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے ...... دو تین زبان کی فاش غلطیاں بھی نکلیں، جو متوقع نہیں تھیں، ...... گو نظریہ سیاسی کا ترجمہ راقم کا نہیں لیکن تصحیح و نظرثانی عاجز ہی نے کی ہے، اس لئے ذمہ داری بہر حال اس گنہگار کی ہے۔"

(۱۰۰ - ۱۰۱) ———————————— (بغداد)

○

(آج) اتفاق سے (الجہاد فی سبیل اللہ) کا مسودہ نظرثانی کے لئے آگیا ہے۔ اس لئے اس کی قرأت شروع ہوئی ہے ہلالی صاحب کہیں کہیں اپنی رائے دیئے جاتے ہیں، الحمد للہ اس میں کوئی بھونڈی غلطی نہیں نکل رہی ہے۔ اسلوب بیان بھی (APPEALING) ہے۔ اللہ تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔

(۱۱۲) ———————————— (بغداد)

○

عرصہ کے بعد والد ماجد مدظلہ کا گرامی نامہ ملا۔ کراچی چھوڑ دینے کے بعد یہ پہلا خط ہے، اس دوران میں تشویش رہی۔ خط سے اندازہ ہوا کہ تشویش ٹھیک ہے۔ دو ماہ بستر علالت پر دراز رہنے کے بعد اب دو سطریں لکھنے کے قابل ہوتے ہیں، ...... یہ ان کی طبیعت ہے، بارہا ایسے حالات پیش آتے ہیں، لیکن مجھے وقت گذر جانے کے بعد اطلاع ہوئی، میری صحت کے پیش نظر انہوں نے اپنا یہ معمول بنا لیا ہے، مگر مجھ پر کیا گذرتی ہے، اس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کل سہ پہر بڑا حصہ اسی تاثر میں گذارا۔ بہر حال اللہ کارساز ہے، ہمارا کام تو کچھ بھی نہیں، لیکن الحمد للہ نیت خالص اور ارادے بلند ہیں، ......

(۱۱۴) ———————————— (بغداد)

○

جونہی موٹر چلنے لگی، سبحان الذی سخر لنا ہذا وما کنا لہ مقرنین، ماثور دعا پڑھتا ہوا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا (فرنٹ سیٹ نہیں

[illegible] (دکومت کے صحرا میں) —— (۱۸۸)

O

ان صاحب سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، وہ اپنی ہمہ دانی کا مظاہرہ کرتے رہے، اور عاجز اُن کے پندار کو ٹھیس لگاتا رہا۔
(سبحان اللہ، حفظ عاجز یہاں کس طرح نگینے میں جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے!۔ (مرتب)

(ریاض) ——————— (۲۷۱)

O

شیخ عبدالعزیز قاضی الخرج نے مزید پوچھا حدیث میں کیا پڑھا ہے، اور کن اساتذہ سے؟ "اساتذہ کی حد تک تو اس گنہگار کے پاس بڑے بڑے نام ہیں، مگر اساتذہ کی بڑائی سے نالائق شاگرد کی عزت تو نہیں بڑھ جاتی"۔

(ریاض) ——————— (۲۷۵)

O

الحمد للہ، کہ حج سے فراغت ہوئی...... مکہ مکرمہ سے واپس ہوتے ہی کھانسی اور نزلہ کا سخت حملہ ہوا...... ساری رات تکلیف اور کرب میں کٹی، لیکن تکلیف کے باوجود دل جذباتِ شکر سے لبریز تھا...... بار بار سوچتا، اگر یہ حملہ حج کے دوران میں ہوتا تو کیا ہوتا۔

(مکہ مکرمہ) ——————— (۲۷۹)

O

واپسی پر معلوم ہوا، کہ ہمارے رامپوری رفیق آج جا رہے ہیں۔ عاصم صاحب ان لوگوں کی عجلت پر کچھ آزردہ بھی ہوئے۔ لیکن الحمد للہ راقم ان منزلوں سے گذر چکا ہے۔ کسی سے خواہ مخواہ توقع ہی کیوں باندھی جائے، کہ بعد میں آزردگی ہو۔

(مکہ مکرمہ) ——————— (۳۰۱)

O

البلاد السعودیۃ کے ایڈیٹر سے ملاقات کی،...... انہوں نے فوراً ہی تازہ اشاعت میں راقم سے متعلق ایک خبر لکھ کر پریس کو دے دی، عاجز نے اُن پر ظاہر کر دیا کہ ہم چھپنے کے شائق نہیں۔ ہماری خواہش یہ ہے، کہ آپ ان رسالوں کو پڑھ کر اُن پر لکھیں۔ انہوں نے ریویو کا پختہ وعدہ کیا۔

(مکہ مکرمہ) ——————— (۳۶۴)

O

مسجد حرام میں یہ آخری نماز تھی۔ اللہ کرے یہ آخری نہ ثابت ہو...... دل میں عزم ہونا چاہئے، اور طلب بھی، الحمد للہ، اس مجہور و ناتواں جسم کے اندر قوی دل ہے، اور اس میں عزم و طلب کی بھی کمی نہیں۔

(مکہ مکرمہ) ——————— (۳۶۷)

O

راقم اپنی صحت اور ذوق کے لحاظ سے امیر الحج کی ذمہ داریوں سے الگ ہی رہنا چاہتا تھا، مگر جب یہ ذمہ داری ڈال دی

گئی ہے، تو اسے کماحقہٗ پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ..... دوڑ دھوپ میں کوتاہی نہیں کرتا، صبح سے شام تک شکایتیں سنتا رہتا ہوں، اور اُن کے تدارک کی ممکن کوشش سے باز نہیں آتا۔

(جہاز میں) ——————————— (۳۸۳)

غیرت و حریت:-

کچھ دیر بعد طٰہٰ فیاض (ایڈیٹر السجل) اور اُن کے دوست جعفر مال اللہ تشریف لائے، مجھ سے حالات زندگی دریافت کئے، اپنے اخبار میں میرا تعارف کرانا چاہتے ہیں۔ عاجز نے صفائی سے کہا، میری کوئی زندگی نہیں، اور نہ سوانح حیات قابلِ ذکر ہیں، بس ایک طالب علم کی زندگی بسر ہو رہی ہے، اس کے بعد تصویر کی فرمائش ہوئی، میں نے اپنا مسلک بتا دیا، .....
طٰہٰ فیاض بولے سید رشید رضا جیسے عالم اور محدث بھی تصویر کے جواز کے قائل ہیں، میں نے کہا واقعی یہ تعجب کی بات ہے، ان کے علم و فضل کا مجھ سے زیادہ کون معترف ہوگا، لیکن فوٹو کے متعلق جواز کی کوئی شکل سمجھ میں نہیں آتی"۔

(بغداد) ——————————— (۷۳)

○

راستے میں شیخ عبداللہ الحسو کے ہاں حاضری دی، یہ عجیب و غریب آدمی ہیں، پہلے خوش عقیدہ یا عام اصطلاح میں "بدعتی" تھے، اب کٹر وہابی ہیں، مگر یہ انقلاب ان کے لئے مصیبتوں کا باعث بن گیا ہے۔ جتنی کتابیں انہوں نے اپنی "پہلی زندگی" میں عقیدت سلف کے خلاف پڑھی تھیں، ان میں سے ہر کتاب کی ایک ایک سطر پڑھ کر توبہ کرتے رہتے ہیں یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے اور ختم ہونے کو نہیں آتا اس وہم پرستی کے باعث اُن کے خیال میں ساری دنیا کافر ہے، اور وہ سب سے الگ تھلگ توبہ استغفار کرتے رہتے ہیں راقم کو اُن کے خیالات کا علم تھا۔ اور اُن کے حملوں کا جواب دینے کے لئے بالکل تیار، علیک سلیک کے بعد گفتگو چھڑ گئی۔ اتفاق سے ابن فورک کی مشکل الحدیث کا ذکر آگیا۔ راقم نے اظہار واقعہ کے طور پر بیان کیا کہ "مشکل الحدیث" دائرۃ المعارف۔ حیدرآباد سے شائع ہو گئی ہے۔ اور اصل نسخہ کی تصحیح میں راقم نے بھی شرکت کی تھی۔ ابن فورک متکلم تھے اور "مشکل الحدیث" میں انہوں نے متکلمین کے طرز پر احادیث صفات کی تاویل کی ہے۔ اور یہ گناہ شیخ عبداللہ الحسو کے نزدیک کفر کے لئے کافی ہے، اور ایسی کتاب کی تصحیح اگر کفر نہیں تو "اثم عظیم" ضرور ہے۔ بس غضب ہو گیا تھا! یہ سنتے ہی عبداللہ الحسو نے کہا "تم نے اس گناہ میں کیوں شرکت کی؟" ——— میں نے صفائی کے ساتھ عرض کیا۔ اہل قبلہ کی تکفیر ہمارا مسلک نہیں۔ پھر اشعریوں اور متکلمین کا مسلک میرے نزدیک "اثم عظیم" بھی نہیں، گو ذاتی طور پر راقم "عقیدت سلف" ہی کا قائل ہے اور اسی عقیدے پر روزِ جزا میں پیش ہونے کی تمنا رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس امام الحرمین، امام اشعری، ابن فورک، رازی جیسے ائمہ کلام کی تکفیر کے لئے کوئی حجت نہیں اور نہ ہم سے اُن کے عقائد و اعمال کی باز پرس ہوگی۔ ہم ان بزرگوں کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ "اور خذ ما صفا" کے اصول پر کام کی باتیں لے لیتے ہیں۔ بحث لمبی ہو گئی۔ آخر میں اسلامی دعوت اور اس کے اصول مفصل طور پر بیان کرنے کے بعد راقم نے سوال کیا؟ "خطابت و امامت کی نوکری کے باب میں سلفیت کیا کہتی ہے؟" بیچارے چپ ہو گئے، اور کہنے لگے: "کوئی دوسرا ذریعہ معاش

نہیں"۔ میں نے عرض کیا، مسجد کے دروازے پر جوتا گانٹھئے یا آبِ گلاس شربت بیچئے، اور نماز کے وقت امامت کیجئے، پھر دیکھئے آپ کے خطبوں میں کتنی تاثیر ہے"! بولے "یہ تو مشکل کام ہے اور طبیعت آرام کی عادی ہے"۔ میں نے عرض کیا "تو پھر اتباعِ سنت کا نام نہ لیجئے"۔ بات تو بہت تلخ تھی، لیکن تیر نشانے پر بیٹھا۔ شیخ خاموش ہو گئے، اور دوسری ملاقاتوں میں بھی خاموش ہی رہے۔ لیکن اسمٰعیل مصطفےٰ ابوالبلادی کے دیرینہ شیخ عبداللہ الحسو کے، نوجوان صاحبزادے جو ازہر کے فارغ اور مدرسہ ثانویہ میں مدرس ہیں۔ بے حد متاثر ہوئے۔ ان کے صاحبزادے تو باپ کے سامنے بول اٹھے۔ "بغداد اور عراق کے علماء اس ایمان سے خالی ہیں"۔ اسمٰعیل مصطفےٰ بھی بہت متاثر ہوئے، اور دوسرے دن اپنے دوستوں سے رات کی روداد دہراتے رہے۔

(موصل)

(۱۴۰-۱۴۲)

○

ہم زائر کا پاس لے کر آئے ہیں لہٰذا اس سے صرف عراق کی اجازت ہے، خیال تھا کہ پاکستانی قنصل خانہ دمشق اور حجاز کی اجازت دے دے گا۔ مگر یہ کام کون کرائے؟ اپنی طبیعت اس قسم کے رگڑوں جھگڑوں سے دوری ہی پسند کرتی ہے۔

(بغداد)

(۹۰)

○

عید میں تزاور، مسنون ہے، لیکن ہم اس نعمت سے عرصہ سے محروم ہیں، جالندھر والے بھی اس کے عادی نہیں تھے، راولپنڈی میں ہمارا حلقۂ جماعت کے افراد تک محدود تھا...... یہاں تعارف تو خاصا ہو چکا ہے، لیکن ظاہر پرستوں کے ہاں شان و شکوہ کی ضرورت ہے۔ اور یک طرفہ زیارت پر طبیعت کبھی آمادہ نہیں ہوئی، تبلیغِ حق یا اہلِ علم و فضل کے ہاں استفادہ کے خیال سے سو بار جانا منظور، لیکن اہلِ جاہ کے دروازے پر حاضری دینا، اس گنہگار کے بس کی بات نہیں۔

(بغداد)

(۱۲۷)

○

(پاکستان میں سفیر سعودی عبدالحمید خطیب نے تو اپنی عنایت و محبت سے ہمارے آرام و آسائش کا ہر ممکن انتظام کر دیا تھا، مگر ہماری طبیعت ولی عہد اور بادشاہ کے دربار میں حاضری کے لئے تیار نہیں تھی، صرف علماء سے ملنا مطلوب تھا، وہ بھی کسی ٹھکانے پہنچ کر۔

(ریاض)

(۱۹۶)

○

سلطان کے دائیں جانب ایک کرسی چھوڑ کر بیٹھا، ابن سعود پر ضعیفی طاری ہو چکی ہے، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئیں، اور ضعف کے آثار نمایاں، دبی آواز سے حال دریافت کیا، کیف حالک، رسمی طور پر علیک سلیک کے سوا اور کسی گفتگو کا توقع نہیں تھا۔ مدح اور ستائش کے الفاظ میری زبان سے نکلنا مشکل، اور کسی تنقید و تبادلۂ خیال کے لئے سلطان اور اس کے مصاحب تیار نہیں، بس سکوت کے عالم میں ایک آدھ گھنٹہ بیٹھا رہا، اتنے میں ہمارے رہنما نے اشارہ کیا، اور "السلام علیکم" کہہ کر راقم پہلے دروازے سے نکل گیا۔

(ریاض)

(۱۹۸)

○

آخر سوچ بچار کے بعد ولی عہد کے نام ایک رقعہ لکھا۔ اور معمولی القاب کے ساتھ ...... راقم نے رقعہ میں یہ بھی تصریح کر دی، کہ ہم کچھ چاہتے نہیں، صرف کرایہ دے کر ہوائی جہاز یا ٹیکسی میں دو نشستیں مطلوب ہیں، یہ حضرات اس طرز خطاب کے عادی نہیں، ان کے ہاں صرف تملق اور جھوٹی تعریفیں کرنے والے مقبول ہیں ...... بعض ملنے والوں نے منع بھی کیا۔ کہ کرائے کا ذکر نہ کرو، اسے وہ اپنی توہین خیال کریں گے، میں نے عرض کیا، انشاءاللہ زیادہ سے زیادہ مہذب اور شائستہ الفاظ میں ذکر کروں گا، لیکن اس کی تصریح ضروری ہے۔ خوشامدی اور مصاحب قسم کے لوگوں سے اپنے آپ کو الگ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

(ریاض) ——————— (۲۰۹)

○

عبدالرحمٰن مظہر صاحب سے معلوم ہوا کہ استاذ مکرم مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ، مع اہل وعیال تشریف فرما ہیں۔ اور قریب ہی بھوپال کے رباط میں قیام پذیر ہیں، ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا، "وہیں ٹھہر جاؤ سید صاحب ایک آدھ کمرہ دلوا دیں گے" میں نے اُن سے صفائی کے ساتھ عرض کیا، کسی کے کہنے اور زبان کھولنے کے لئے تو بندہ تیار نہیں، ہاں! اگر پیش کش ہوئی، تو اور بات ہے! (یاد رہے، کہ مولانا صاحب کے تعلقات سید صاحب کے ساتھ نہایت ہی گہرے اور دیرینہ تھے۔ مرتب)

(مکہ مکرمہ) ——————— (۲۳۵-۲۳۴)

○

جائے قیام کی تلاش میں حرم سے باہر جا رہے تھے، کہ سید صاحب قبلہ نظر آئے، پاس بلا کر دریافت فرمایا۔ جائے رہائش کا انتظام ہوا؟ یہاں مکان بہت گراں ہیں "عرض کیا ابھی تو نہیں ہوا۔ ہو جائے گا"۔ دریافت کیا "مدرسہ فخریہ میں ٹھہرو گے، علی میاں یہاں ٹھہرے تھے" عرض کیا، اگر وہ خود کہیں تو اور بات ہے، ورنہ درخواست پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی (اللہ اکبر! غریبی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور تھے! مرتب)

(مکہ مکرمہ) ——————— (۲۳۷)

○

عصر کے بعد بادشاہ سلامت کی آمد تھی، مطاف خالی کیا جا رہا ہے، عاصم صاحب دوڑتے ہوئے آئے، اور بولے چلیں، بادشاہ طواف کرے گا۔ میں نے کہا "میاں جاؤ اور ان کی زیارت کرو، راقم اس تماشہ بینی سے باز آیا"...... عاصم بولے آپ کے سید صاحب بھی حرم میں ہیں، اور دیکھ رہے ہیں"۔ میں نے کہا راقم نے کب کسی کی تقلید کی ہے؟ سید صاحب قبلہ کا ادب و احترام اپنی جگہ پر، لیکن ابن سعود کا جلوس اور فوج اور پولیس کے جلو میں اس کا طواف دیکھنے حرم جاؤں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا!

(مکہ مکرمہ) (۲۴۹)

○

راستے میں اہل وطن حجاج پھلواری کی خدمت میں حاضر ہوا، پھلواری کے سجادہ نشین ایک بڑے قافلے کے ساتھ حج کے لئے تشریف

لائے ہیں.......... راقم حاضر ہوا، تو وہاں بیری کا دربار نظر آیا،...... ان کے چچا زاد بھائی...... بار بار کہتے رہے، ابھی حضور مصروف ہیں، میں نے کہا جب حضور مصروف ہی ہیں، تو عاجز رخصت ہوتا ہے۔

(مکہ مکرمہ) ـــــــــــــــــــــــــــــ (۲۵۳)

○

شنقیطی صاحب "ام القریٰ" کا تازہ پرچہ لائے، اس میں اہل قلم اور ارباب صحافت حجاج کا تذکرہ ہے، راقم کا بھی کسی صاحب نے ذکر کیا ہے، اسی لئے وہ اخبار لائے تھے، الحمدللہ ہم لوگ چھپنے چھپانے کی منزل سے آگے بڑھ چکے ہیں، اقبال کا ایک شعر اس سلسلہ میں ہمیشہ یاد آتا ہے، جینا وہ کیا، جو ہو نفس غیر پر مدار۔ شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے۔

(مکہ مکرمہ) ـــــــــــــــــــــــــــــ (۲۹۵)

○

ہمارے مخلص دوست اور بھائی علی میاں نے نصیحت کی تھی...... حجاز میں اپنی عادت کے مطابق زیادہ باتیں نہ بنانا، ورنہ حج و عمرہ کے بدلے جہاد کا ثواب ملنا شروع ہو جائے گا، لیکن بگڑی ہوئی عادتیں ایک آدھ نصیحت سے کہاں سدھرتی ہیں۔ راقم نے تو کبھی احتیاط نہیں برتی، حج و عمرہ کے ساتھ جہاد کا ثواب ملنا شروع ہوا یا نہیں، یہ اللہ بہتر جانتا ہے، باقی اس گنہگار نے جہاد کا ثواب حاصل کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

(مکہ مکرمہ) ـــــــــــــــــــــــــــــ (۳۴۰)

نگارخانہ احساس:-

ہلالی صاحب "الانصاف" کے تین پرچے اور مظفر شاہ صاحب کا مفصل خط ساتھ لیتے آئے تھے، شاہ صاحب کے خط نے بہت مسرور کیا، دل پر اُن کی محبت اور اخلاص کا گہرا نقش پڑ گیا، "الانصاف" اور اس کے کارکنوں کے لئے دل سے دعائیں نکلیں، دل کہتا ہے "مسعود! تیری جگہ لکھنؤ یا پٹنہ ہے، اہل عزیمت کے لئے وہاں میدان عمل ہے"۔ مگر دار العروبہ کا کام کیسے ہو؟ عراق کے سفر سے کام کا نیا نقشہ بن رہا ہے، اور جانے ابھی اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم کہاں کہاں لے جائے، اس کشمکش سے جب طبیعت گھبراتی ہے، تو "افوض امری الی اللہ" کہہ کر پیچھا چھڑاتا ہوں۔

(بغداد) ـــــــــــــــــــــــــــــ (۷۸)

○

آج رمضان المبارک کا تیسرا روز ہے، لیکن گنہگار روزہ کی سعادت سے محروم ہے...... انتہائی الجھن اور استاذ محترم علامہ ہلالی اور عزیزی محمد عاصم سلمہ اللہ سے مشورہ کے بعد یہی طے کرنا پڑا، کہ سفر اور مرض کی رخصت سے فائدہ اٹھاؤں، اللہ تعالیٰ دلوں کا حال بہتر جانتا ہے، لیکن اپنی روزہ شکستگی کے باوجود شہر کی عام حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے

○

شام کو رسالہ "لسان الدین" کا تازہ نمبر ملا...... فاضل اڈیٹر نے ہمارے تین رسالوں کا ذکر خیر کیا ہے...... (اور بڑی محبت اور کمال متانت کے ساتھ دعوت کی حرف بہ حرف تائید کی ہے...... لسان الدین کی رائے پڑھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، دنیا میں خوشی اور مسرت کے مختلف نظریے ہیں، ہماری خوشی اسی میں ہے۔ کہ اللہ کے بندے دعوت حق کو سمجھیں، اور اس پر لبیک کہیں"

(بغداد) —————————— (۱۲۱)

○

آج عید ہے، پردیس کی عید خاکسار کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ گھر کی عید کا کوئی تصور بھی اب ذہن میں نہیں رہا، دس سال کی عمر میں گاؤں سے باہر نکلا، اور دن بہ دن وطنِ مالوف سے دور ہی ہوتا گیا، اس لئے اس پہلو سے راقم پر کوئی اثر نہیں۔

(بغداد) —————————— (۱۲۶)

○

بغداد میں تین ماہ بسر کرنے کے بعد بصرہ کی طرف جا رہا ہوں، ڈبہ خالی ہے، پوری نشست قبضہ میں ہے، ظاہری طور پر کوئی تکلیف نہیں، لیکن دماغ مشغول ہے، سہ ماہی رپورٹ زیر غور ہے، الحمد اللہ! اپنی جد و جہد کی تنگ دامانی سے پشیمانی نہیں۔ مزید توفیق کی طلب ہے۔ والامر بید اللہ۔

(بغداد) —————————— (۱۶۳)

○

یہ صحرا کی تیسری شب تھی، آج اچھی نیند آئی، اور صبح تک سوتا رہا، اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے (آخری فقرہ میں خلوص کا کس قدر بے پناہ زور ہے۔ مرتب)

(کویت کا صحرا) —————————— (۱۹۳)

○

ہائے! کیا دردناک منظر تھا، عاصم کسی ضرورت سے جھونپڑے سے باہر لئے، عاجز نے ایک بچے کو بلا کر تمام سوکھی روٹیاں دے دیں، بس پھر کیا تھا، دو تین منٹ کے اندر ہمارے جھونپڑے پر دس بارہ بچوں نے مل کر حملہ کر دیا، اور طرح طرح کی دعائیں دے کر گڑگڑا کر روٹی کا ایک ٹکڑا مانگنے لگے، لاکھ کہوں بابا! اب ہمارے پاس کچھ نہیں" مگر وہ نہیں مانتے، زنبیل (جھبیا) کی طرف اشارہ کرتے، بدقسمتی سے ہمارے پاس چھوٹے سکے بھی نہ تھے...... ہر ایک کو سالم ریال دینا ہماری حیثیت سے باہر تھا، بڑا پریشان ہوا، عربوں کا عاشق، عربی عظمت کے خواب دیکھنے والا، عربی نخوت و حمیت کا نغمہ سنج، یہ گنہگار ایک عجیب کیفیت سے دوچار تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھوٹی، جان تو چھوٹی مگر دل پر ایک داغ رہ گیا۔

(مکہ مکرمہ کے راستے میں) —————————— (۲۲۷)

○

اب حجاز سے قریب ہو رہے ہیں، اور ست کی سوئی ہوئی تمنائیں جاگ رہی ہیں، ...... یہ مشت خاک اور دیارِ حرم کی آبلہ پائی، یہ سب اس کے فضل کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ جب یہ جذبات امنڈتے، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا، جو مناسب حال آیتیں یا دآتیں، پڑھتا، تسکین ہو جاتی اور انشراح حاصل ہو جاتا۔

(مکہ مکرمہ کے راستے میں) —————————— (۲۲۸)

○

کوئی نو بجے ہم طائف پہنچ گئے ...... کہتے ہیں نزدیکی سے آتش شوق تیز ہو جاتی ہے لیکن ہمارا دل مطمئن تھا، محبت اور شوق میں تیزی کے ساتھ ٹھنڈک بھی ہوتی ہے، شاید مزاجوں کے اعتبار سے اثر ہوتا ہے۔

(مکہ مکرمہ کے راستے میں) —————————— (۲۳۰)

○

تین بجے سہ پہر کو طائف سے روانہ ہوئے، ...... ہماری نگاہیں شہر کی عمارتوں پر تھیں، اور دل جذبات شوق سے معمور، ایک ایک اینٹ کو شوق اور تجسس کی راہ سے دیکھ رہے تھے، کیا یہی وہ طائف ہے، جس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ٹھکرا دی تھی، ...... موٹر دو متوازی پہاڑی سلسلوں اور پُرپیچ گھاٹیوں سے ہو کر جا رہی تھی، اور یہ گنہگار بار بار دل میں کہتا ہے، یہ راستہ تو موٹر سے روندنے کے قابل نہیں، ہم اپنے آپ کو داعی کہتے ہیں، تو پھر کیوں سب سے بڑے داعی حق کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت نہیں کرتے؟

(مکہ مکرمہ کے راستے میں) —————————— (۲۳۰)

○

صبح ہوئی، قافلہ روانہ ہوا، اور مدینہ منورہ کی قربت طبیعت کو اکسانے لگی، ...... دل دھمی سے لرزنے لگا ہے، ...... وہ کیا ساعت ہوگی، جب یہ گنہگار در بدر حضرت عالی میں سلام عرض کرے گا۔ جب کبھی یہ خیال آتا، آنکھیں پُرنم ہو جاتیں، درود پڑھتا، اور عربی و اردو کے مناسب حال شعر زبان پر جاری ہو جاتے، ...... بحیدہ سے بھی آگے قافلہ روانہ ہوا، اب یہ گنہگار ہمہ تن شوق ہے، وہابیت کی خشکی کے باوجود دل پیچ رہا ہے، جانے ان راستوں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی گذر ہوا ہو۔ موٹر نہ ہوتی تو گرد و راہ سے پوچھتا، شاید نقش پاکے بکھرے ہوئے اثرات کا سراغ لگتا، شاعر کی زبان میں محبوب کے گذرنے سے تمام وادی نعمان معطر ہو گئی تھی، تو کیا سرورِ عالم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی گذر گاہیں جو دیں مشک آمیز اور عنبر بیز پسینے کی خوشبو سے خالی ہوں گی؟ —— مدینے کی پاک سرزمین قریب ہوتی جا رہی ہے، اور خاکسار کھانسی کے حملوں سے چور، کھویا ہوا گنگناتا اور درود پڑھتا چلا جا رہا ہے، موٹر میں بتیس مسافروں میں سب کے سب حج سے فارغ ہو کر مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو جا رہے ہیں لیکن کہیں گداز و شوق کا نام نہیں، ...... دل ہی دل میں کڑھتا مگر کرتا کیا؟ اپنے دل کا جائزہ لیتا، وہ بھی پتھر نظر آتا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے دعوے خالی خولی معلوم ہوتے ہیں، اپنے متعلق تو بدگمانی کی جا سکتی ہے، دوسروں کے ساتھ کیوں بدگمانی سے کام لیا جائے۔

(مدینے کے راستے میں) —————————— (۲۰۸)

○

بڑی مدت سے تمنا تھی، کہ مدینہ پاپیادہ داخل ہوں ..... مگر جب اس تمنا کے پورا ہونے کا وقت آیا، تو مرض نے بے بس کر دیا ..... آخر مجبور کر کے بیٹھ رہا، لیکن دل کے اندر سے آواز آرہی تھی، ۔ نگاہیں فرش راہ ہوں خمیدہ سر کے بل چلو — ادب، ادب! یہ کوچہ حبیب کردگار ہے! — مگر سنے کون؟ مسعود بے نوا، تو کھانسی سے چور قہوہ خانہ میں بیٹھا اپنے ساتھیوں کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے ......
پہلی بار مدینہ کے انگور کھائے، اچھے اور لذیذ تھے، شوق محبت نے انہیں اور لذیذ بنا دیا۔

مدینہ منورہ کے راستہ میں ——————

(۳۰۹)

○

پہلا مرحلہ مسجد نبوی میں حاضری کا تھا ..... دروازے پر پہنچے، تو اہل مکہ کی خشونت اور مسجد حرام کی سادگی کے برعکس ساری فضا لطیف اور مسجد عروس المساجد معلوم ہوئی، جدھر نگاہ اٹھے خطاطی اور فن کاری کے بہترین نمونے نظر آئیں، لیکن اس وقت خطاطی اور فن کاری پر نگاہ ڈالنے کی کسے فرصت؟ ایک محویت اور تاثر کے عالم میں روضہ میں تحیۃ المسجد ادا کی، ہجوم اور شور میں دل پُرشوق کیا کہئے!

(مدینہ منورہ) ——————

(۳۱۰)

○

مولانا ظفر علی خاں کی نعتوں کا مجھ پر بڑا اثر ہے ..... صبح کو ..... شباک نبویؐ کے پاس مؤدبانہ حاضر ہوا ..... یہ دوسری حاضری تھی ..... آنکھیں کبھی کبھی غمازی کر جاتی ہیں، لیکن محبت کے آئین نرالے ہیں، طبیعت اور مزاجوں کے اختلاف سے اثر بھی مختلف ہوتا ہے۔

(مدینہ منورہ) ——————

(۳۱۵)

○

ابتدائی تاریخ اسلام میں ..... حضرت حمزہؓ کی شہادت سے زیادہ کوئی دوسرا واقعہ راقم پر اثر انداز نہیں ہو سکا ہے، جب بھی حضرت حمزہ کی شہادت کا واقعہ نظر سے گذرا، اپنی سنگ دلی کے باوجود آنکھیں پرنم ہو گئیں ..... جب حضرت حمزہؓ کی قبر پر حاضر ہوا تو آنسو خشک ہو چکے تھے، دل پر اثر تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ بڑھاپا طاری ہو گیا ہے، چھڑی کی ٹیک لی۔

(مدینہ منورہ) ——————

(۳۴۹)

○

مدینہ منورہ میں آج ہمیں دو ہفتے ہو جائیں گے ..... جی چاہتا ہے سال دو سال یہیں رہ جاؤں، جماعت سے وابستگی، ذمہ داریاں اور بوڑھے شفیق باپ (اللہ ان کا سایہ سر پر قائم رکھے) کی خدمت کی حاضری کا خیال نہ ہوتا، تو شاید سال بھر کے لئے ابھی نیت کر لیتا۔

(مدینہ منورہ) ——————

(۳۴۲)

(بقیہ بر صفحہ ۲۲)

علمی و فکری کارنامے

- طٰہٰ یٰسین
- ملک غلام علی
- عبداللہ عباس ندوی
- محمد کاظم سباق
- اسعد گیلانی
- آباد شاہ پوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نیا انقلاب
اور مسلمانوں کے دینی اور اخلاقی انحطاط میں اس کا دخل

(مولانا مسعود عالم ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ)

• مترجمہ: طہ یٰسین •

(غیر مطبوعہ کتاب تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند وپاکستان کا ایک باب)

ہندوستان میں دعوت اسلامی کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اب ہم موجودہ دور تک آپہنچے ہیں۔ اس باب میں ہمیں ماضی قریب اور حال کے حالات کا جائزہ لینا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہاں ہم کسی قدر تفصیل سے تمام گوشوں پر گفتگو کریں تاکہ حقیقت حال پوری طرح واضح ہو کر سامنے آئے۔

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے چند اہم باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ وہ اسباب سمجھ میں آسکیں، جن کے نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کی دینی حالت میں موجودہ افسوسناک انقلاب رونما ہوا۔

سب سے پہلی اور اہم بات یہ کہ اس صدی کے ابتدائی تیس سال میں یہاں کے سیاسی حالات میں ایسی عظیم تبدیلیاں ہوئیں کہ پچھلے تین دہوں میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ سب سے اہم یہ کہ انڈین نیشنل کانگریس میں ہندو عصبیت اور قدیم بت پرستانہ قومیت کے احیا کا جذبہ پیدا ہوتا گیا۔ اس کے پروگراموں سے صاف ہندوانہ رنگ جھلکنے لگا۔ ہندو لیڈر کھلے بندوں قدیم برہمنی تہذیب کے داعی بن گئے۔ آسان اور عام فہم ہندوستانی زبان کے بجائے مردہ سنسکرت کو رواج دینے کی کوششیں ہونے لگیں۔ یوں تو کانگریس کے کرتا دھرتا ہندو تہذیب کے احیاء کے خواب بہت پہلے ہی سے دیکھتے آرہے تھے اور پچھلے پچاس سال بلکہ اس سے بھی پہلے سے یہ کوششیں ہو رہی تھیں کہ اس مردہ تہذیب کو زندہ کیا جائے، لیکن اس صدی کے ابتدائی تیس سال گزر جانے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آئی اور اب کانگریس کے پروگراموں اور طریق کار سے صاف طور پر ان کے ارادے ظاہر ہونے لگے۔

دوسرے یہ کہ ۱۹۲۶ء (م ۱۳۴۴ھ) میں ادھر ابن سعود حجاز میں فاتحانہ داخل ہوا، اور ادھر ہندوستان کے مسلمان لیڈروں میں باہمی سرپھٹول شروع ہوئی۔ مسلمانوں کی قوت دو گروہوں میں بٹ گئی اور آپس میں بڑے زبردست معرکے رہے۔ ایک گروہ ابن سعود اور اس کے قبوں کے گرانے کی پالیسی کا حامی تھا تو دوسرا اس کا سخت مخالف اور مقابر اور آثار مقدسہ کی بے حرمتی سے چیں بجبیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ۲۹-۱۹۲۸ء (م ۱۳۴۷ھ) میں دستوری حقوق کے سلسلہ میں ایک نیا فتنہ اور پیدا ہوا۔ حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں سے دستوری اصلاحات اور کچھ حقوق و اختیارات کا وعدہ کیا تھا۔ کانگریس نے اس سلسلہ میں اپنی رپورٹ پیش کی جو ایک سب کمیٹی کی مرتب کردہ تھی۔ بھارت کے موجودہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے باپ موتی لال نہرو اس کمیٹی کے صدر تھے اور اسی تعلق سے یہ رپورٹ "نہرو رپورٹ" کہلاتی ہے۔ مسلمانان ہند کے زعیم اکبر مولانا محمد علی جوہر مرحوم اور ان کے ساتھیوں کی رائے یہ تھی کہ اس رپورٹ سے مسلمانوں کے مطالبات پورے نہیں ہوتے اور اس میں ان کے حقوق اس بری طرح پامال کئے گئے ہیں کہ ایک قومی جماعت سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں مولانا ابوالکلام اور ان کے ساتھی مسلمانوں کی رائے میں یہ رپورٹ ہندو مسلم کی تفریق کے بغیر ہندوستانیوں کے پورے مطالبات پر مشتمل اور درست تھی۔ پھر یہ اختلاف ایک اصولی اور نظری اختلاف ہی نہیں رہا، بلکہ نزاع اس حد تک بڑھی کہ سارے حدود و اخلاق نظر انداز ہو گئے۔

دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر خوب کیچڑ اچھالی۔ اس باہمی سر پھٹول نے مسلمانوں کے وقار کو سخت نقصان پہنچایا اور غیر قوموں کی نظروں میں بہت ذلیل کیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کا افتراق و انتشار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔

تیسرے یہ کہ اس صدی کے ابتدائی تیس سال بعد جمعیتہ علمائے ہند کی سیاسی پالیسی میں بھی عظیم تبدیلیاں ہوئیں۔ جمعیتہ علمائے ہند وہ تھی جس کے ارکان ملک کے عوام پر بڑا اثر رکھتے تھے اور ان کی بات کا وزن تھا۔ ملک بھر میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اور ہر طبقہ خیال کے علماء کی ایک بڑی تعداد اس میں شامل تھی۔ جمعیتہ اب پالیسی کی حیثیت سے پوری طرح کانگریس کا ساتھ دینے لگی اور اس کے مقصد اور طریق کار کی تائید کو اپنا اصول بنا لیا۔ اس سے تعلق رکھنے والے علماء سیاسی امور میں ہندو لیڈروں کے دوش بدوش تھے۔ اور اپنے اثر اور نفوذ سے ان کی تقویت کا باعث ہو رہے تھے۔ حالات کی یہ بھی عجیب ستم ظریفی تھی کہ جوں جوں مسلمان کانگریس سے بدظن ہوتے جا رہے تھے، علماء کا اس سے اشتراک و تعاون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے بیشتر اخبارات علماء کے خلاف ہو گئے۔ جمعیتہ پر سخت حملے کئے جانے لگے اور اس کے تعلق سے بہت سی بے سروپا باتیں بھی مشہور کی جانے لگیں۔ کانگریس اور اس کی سیاسی پالیسی کے مخالف مسلم زعماء بھی علماء کی مخالفت کرنے لگے اور کانگریس سے ان کی تعاون کی پالیسی پر اپنی تقریروں اور بیانات میں سخت سے سخت تنقیدیں کیں۔ نتیجۃً لوگوں کے دلوں سے علماء کا سارا وقار جاتا رہا۔

عوام میں دین اور علم برداران دین سے سخت بدظنی پیدا ہو گئی اور قوم کی قیادت کے منصب پر فرنگیت زدہ لیڈر فائز ہو گئے۔ بھولے بھالے عوام اب ان لوگوں کے پیچھے تھے جنھیں دین سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

چوتھے یہ کہ جب اس طرح عوام پر علماء کا اثر و نفوذ کم ہو گیا تو موقع سے فائدہ اٹھا کر فرنگیت زدہ طبقہ میدان میں آ گیا۔ اور عوام کو اپنے پیچھے لے کر کانگریس کے خلاف لڑائی شروع کی۔ اس نے محسوس کیا کہ جب تک عوام پر علماء کا تھوڑا بہت بھی اثر ہے اور ان میں ان کے بارے میں خوش گمانی ہے، ان کا اپنے اقتدار کا سکہ جمانا ممکن نہیں اور ان کی قیادت ہمیشہ معرض خطر میں رہے گی۔ چنانچہ انھوں نے علماء کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ان کی شہرت اور نیک نامی کو خاک میں ملانے کے لیے ہر قسم کی تدبیریں کیں اور ایسی رکیک حرکتوں سے بھی دریغ نہیں کیا جو انسانیت کے دامن پر بدنما داغ رہیں گی۔ یہ ملک گیر فتنہ ایسا تھا جس نے قوم کے اخلاقی زوال کی انتہا کر دی۔ اس سیلاب کی رَو میں اس کا بچا کھچا اخلاقی سرمایہ بھی جاتا رہا۔

پانچویں یہ کہ جب مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا تعصب مسلسل بڑھتا گیا اور کانگریس کی یہ مستقل پالیسی ہو گئی کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کو قطعاً درخور اعتنا نہ سمجھے، ان کے جائز سیاسی مطالبات خاص طور پر ۱۹۳۶ء (م ۱۳۵۵ھ) میں داخلی خود اختیاری ملنے کے بعد بھی نظر انداز کئے جانے لگے۔ اس اعراض و بے توجہی سے آگے بڑھ کر یہ ہوا ہندوؤں کے سب سے بڑے لیڈر گاندھی نے ۱۹۳۶ء (م ۱۳۵۵ھ) میں اردو کے خلاف باقاعدہ مہم کا بھی آغاز کیا[1] تو اس کے رد عمل کے طور پر مسلمانوں میں بھی سخت اشتعال

---

[1] اس طرز عمل کے لیے گاندھی جی کی دلیل یہ تھی کہ اردو قرآنی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور یہ مسلمانوں کا اپنا فریضہ ہے کہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ حالانکہ یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ اردو کوئی عربستان سے درآمد شدہ زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی اور زبانوں کی طرح سرزمین ہند ہی اس کی جنم بھومی ہے۔ یہیں وہ پلی، بڑھی اور اپنے شباب کو پہنچی۔ یہ درست ہے کہ اس میں پچاس فیصد سے زیادہ الفاظ عربی اور فارسی کے ہیں اور یہ ایک امر طبعی ہے کیونکہ ایک ایسی زبان میں جو مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد پروان چڑھی ہو۔ ایسا ہونا لازمات سے ہے۔ تعصب اور تنگ نظری کا برا ہو کہ اس کا مارا ہوا انسان کھلی ہوئی حقیقتوں تک کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ان ہی گاندھی جی کے چیلوں نے اب ہندوستان میں اردو کے خلاف باقاعدہ مہم چلا رکھی ہے اور اس کو پھیلنے اور بڑھنے سے روکنے کے لیے ہر قسم کے آئینی اور غیر آئینی

پیدا ہوا، اور ان میں بھی ہندوؤں کے خلاف سخت نفرت و بیزاری کا جذبہ پھیلا۔ مسلمان زعماء کی اکثریت کانگریس سے مستعفی ہو گئی۔ اور اس وطنی جماعت کی ہندو نواز سیاست کے علی الرغم ان کی اپنی قومی تحریک کا آغاز ہوا۔ ہندوؤں کے مذموم ارادوں کے دفاع اور مسلمانوں کے حقوق و مطالب کے تحفظ کے لیے قائم ہونے والی یہ جماعت "مسلم لیگ" تھی اور اس تحریک کے روح رواں مشہور بیرسٹر اور بیدار مغز سیاست دان محمد علی جناح تھے جنھیں سنہ ۱۹۳۶ء میں پھر سے مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔

یہ چند اہم اسباب و عوامل ہیں جن کے زیر اثر اس صدی کے ابتدائی تین دہوں کے بعد سے مسلمانوں میں مسلسل دینی و اخلاقی انحطاط رونما ہونا شروع ہوا ہے۔ انحطاط کا یہ عمل ان ہی اسباب کے زیر اثر ابھی تک جاری ہے، اور مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ اس دینی و اخلاقی انحطاط کا اثر صرف ظاہری شعائر ہی میں رونما ہوا ہے اور صرف عورتوں کی بے پردگی و بے حیائی کی صورت ہی میں اس کا اثر ظاہر ہوا ہے۔ نہیں! بلکہ دین کی اساسی فکر کا انحطاط اور عقائد کی کمزوری اور اخلاقی معیارات و اقدار کی تبدیلی اپنے زیادہ گہرے اور دیرپا اثرات رکھتی ہے۔ یہ ایک عظیم فتنہ ہے۔ جو قوم بھی اس سے دوچار ہوئی، وہ ضرور ہلاکت اور تباہی سے دوچار ہوئی۔

اب ہم کسی قدر تفصیل سے اس مسئلہ کے ایک ایک جزئیہ پر بحث کریں گے اور پوری وضاحت سے بتائیں گے کہ افکار و نظریات کی اس کجی اور اس کے نشو و نما پانے کے اسباب کیا تھے۔ اس طرح ہم سمجھ سکیں گے کہ اس انقلاب، قوم کی پوری زندگی کے رنگ ڈھنگ کے یکسر بدل جانے اور اس کے افکار و نظریات اور علمی و اخلاقی معیارات کی اس تبدیلی کے کتنے گہرے اثرات ہیں۔

مسلم قومیت

ابھی ابھی ہم نے یہ معلوم کیا ہے کہ کانگریس کی ہندوانہ سیاست کے علی الرغم، مسلمانوں کی اپنی ایک سیاسی تحریک کی ابتدا ہوئی۔ اس تحریک کی ابتدا اگرچہ اس صدی کے ابتدائی تین دہوں کے بعد ہی ہو چکی تھی، تاہم سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد کہیں جاکر اس نے اپنا اثر پیدا کرنا شروع کیا اور اسے قبولِ عام حاصل ہوا جب کہ محمد علی جناح جیسے دستوری اور قانونی مسائل کے ماہر نے اس کی باگ ڈور سنبھالی۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ ان کا قائد محمد علی جناح دستوری قانونی مسائل میں مہارتِ تامہ رکھنے اور انگریز اور ہندو سیاست کی ساری گہرائیوں اور باریکیوں سے واقف ہونے کے باوجود، اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبیوں سے قطعاً نابلد تھا۔ جناح مرحوم کو اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردی سہی، لیکن فی الحقیقت وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے لیے بہترین اصول بھی بتائے ہیں جو انسانیت کو برکتوں سے مالا مال کرنے کے ضامن ہیں۔ یہ کچھ ان کا اپنا قصور نہیں تھا، بلکہ جس ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے، یہ اس کا فطری لازمی نتیجہ تھا۔ ایک اسماعیلی گھرانے میں خالص فرنگی طرز پر انھوں نے نشو و نما پائی ــــ اسماعیلی گروہ اپنے افکار و عقائد کے اعتبار سے دراصل عام مسلمانوں سے بالکل الگ ہے۔ اور سوائے اس کے کہ دونوں بھی "اسلام" ہی کا نام لیتے ہیں ان میں باہم اور کوئی ربط نہیں۔ تبرک اور تقدس کی حیثیت سے تو بھی اسلام کا نام لیتے ہیں۔ حالانکہ نہ انھیں اس کی صاف اور سلیم فکر سے کوئی واقفیت ہوتی ہے اور نہ اس کے بتائے ہوئے دستورِ حیات سے۔ یہی حال ان تمام لوگوں کا بھی تھا، جو ان کی دعوت پر کانگریس کے خلاف ایک جھنڈے تلے جمع ہوئے تھے۔ یہ سب کے سب فرنگی تہذیب ثقافت میں رنگے ہوئے اور کالجوں سے نکلے ہوئے تھے۔ ان کی نشو و نما ایسے ماحول میں ہوئی تھی، جسے دین اور علم دین سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ اس صورت حال کے منطقی نتیجہ کے طور پر محمد علی جناح اور ان کے پیچھے چلنے والوں کے سارے کام، سیاسی مطالبات کو منوانے کے سارے طور طریقے بالکل عام سیاسی پارٹیوں ہی کی طرح کے تھے۔ وہی ان کے جلسوں اور کانفرنسوں کا رنگ ڈھنگ تھا، ان کے جلوسوں اور مظاہروں کی بھی وہی نوعیت تھی۔ دینی و اخلاقی قیود سے وہ یکسر آزاد تھے۔ ان کی کارروائیوں اور جلسوں میں اسلام کا کوئی اثر نہیں تھا، جو غیر مسلموں سے

انھیں ممتاز رکھتا۔ ملک کے دوسرے حصوں اور مختلف گاؤں اور شہروں میں بھی مسلم لیگ کی قیادت ایسے ہی ہاتھوں میں آئی جو اپنے اسلاف اکابر کی طرح دین سے دور اور جن کی زندگیاں مختلف اخلاقی برائیوں میں آلودہ تھی۔ ان کے جلسوں اور کانفرنسوں میں بے پردہ اور زیب وزینت سے آراستہ عورتیں بے محابا شرکت کرتی تھیں۔ جن ذمہ داریوں کے لیے اللہ نے انھیں بنایا ہی نہیں تھا ان میں وہ مردوں سے کچھ آگے بڑھ کر ہی حصہ لیتی تھیں۔ نماز اور فرائض کے پابند ان میں بس انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔

یہ تو عملی لحاظ سے تھا۔ فکری اعتبار سے دیکھا جائے۔ تو ان میں محض ہندو قومیت کے ردعمل کے طور پر مسلم قومیت کا تصور پیدا ہوا، اور یہ فکر پروان چڑھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابتداءً میں ہندوؤں کی طرح جن کے نزدیک ان کے آباؤ اجداد کی تہذیبی و ثقافتی میراث ہی سب کچھ ہے اور وہ ان کے گن گاتے رہتے ہیں۔ ان میں بھی اپنے اسلاف کی تہذیب اور ان کے علوم وآداب سے چمٹے رہنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ مسلمان بادشاہوں اور امراء کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ان کے لیے سرمایۂ نازش تھیں۔ اور ادب و ثقافت میں انھوں نے جو کچھ کیا وہ اسے بطور سند پیش کرتے تھے۔ اس انداز کی انتہا یہ ہوئی کہ اسلاف کے سارے کام، خواہ وہ واضح طور پر غلط، شریعت سے ہٹے ہوئے، اور سنت سے دور ہی کیوں نہ ہوں قابل فخر تاریخی سرمایہ قرار پا گئے۔ اس قومیت کے اندھے جذبہ کے اثرات تھے کہ قائد اعظم کے عام عقیدت مند اور ان کے جھنڈے تلے جمع ہونے والے ان کے اور مسلم لیگ کے دوسرے اکابر کی صریح غیر اسلامی حرکات کے لیے عجیب عجیب عذر تراشتے تھے۔ ان کی نمازوں کی عدم محافظت، شراب نوشی اور عورتوں کی بے پردگی اور بے حیائی کی ترغیب جیسی برائیوں کے لیے وہ مضحکہ خیز تاویلیں کرتے تھے۔ بہرحال مسلم لیگ کا اور اس کے زعماء کا مسلم قومیت کے نظریہ کے فروغ پانے اور مسلمان بادشاہوں اور امراء کے ہر قسم کے جائز اور ناجائز کاموں پر فخر و غرور کے جذبہ کے

ابھارنے اور پروان چڑھانے میں بڑا دخل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے "اسلام اور مسلمان" کے فرق کو سمجھا نہیں یا سمجھنا چاہا نہیں "اسلام" دین و دنیا کی سعادتوں کا ضامن ایک جامع دین ہے جس کے اندر اصول و عقائد، عبادات و مراسم، قوانین و معاملات اور دستور مملکت مختصراً پوری زندگی کا نظام ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کے لیے ہر چیز کی واضح حدود بتا دی ہیں۔ اور حلال و حرام کی مکمل وضاحت کر دی ہے۔ اور مسلمان وہ ہے جو ان اصول و عقائد پر ایمان لائے ان قوانین پر عمل کرے اور اس کے بتائے ہوئے حدود کی نگہداشت کرے۔ کھلے اور چھپے اللہ سے ڈرے، اس کی رضا کا طالب ہو اور آخرت میں اجر و ثواب کا امیدوار، اس کے برخلاف وہ شخص جس کے ماں باپ تو مسلمان ہوں اور وہ خود بھی مسلمانوں کے سے نام رکھے لیکن اپنی عملی زندگی میں وہ شتر بے مہار ہو اور اپنے نفس کی پیروی میں غلط اصول و نظریات کو اپنائے۔ تو اس کا اسلام سے کوئی علاقہ نہیں خواہ مردم شماری کے کاغذات میں اس کا نام مسلمان کی حیثیت سے سرفہرست ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، نہ جس میں دو رائیں ممکن ہیں۔ بہرحال "اسلام" اور "مسلمان" کے اس عظیم فرق کو نظر انداز کر جانا ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا ارتکاب محمد علی جناح اور ان کے ماننے والوں نے کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر وہ شخص مسلم لیگ کے نظام میں جگہ پا گیا جو بس مسلمانوں کے سے نام رکھتا، لیگ کا سالانہ چار آنے چندہ ادا کرتا تھا، اور مطالبہ آزادی اور کانگریس دشمنی میں ان کا ہم نوا تھا۔ اس کے عقائد و اخلاق اور لوگوں سے معاملات میں اس کے رویہ سے کوئی بحث نہیں تھی۔ نتیجۃً مسلم لیگ میں ہر طرح کے لوگ جمع ہو گئے۔ انگریزی استعمار کے آلۂ کار، روسی اشتراکیت کے پرستار "کمالی" تفریح کے علم بردار، نسلی قومیت کے مبلغ، جغرافیائی وطنیت کے داعی، غرض عجیب مختلف اور متضاد قسم کے عناصر، جو بس مسلمانوں کے جیسے ظاہری تہذیبی شعار کے پابند اور ان کے سے نام رکھتے تھے، اس نظام میں گھس گئے۔ ظاہر بات تھی کہ ان مختلف اور متضاد قسم کے

عناصر کا اتحاد صرف ہنگامی حالات، جلسوں، جلوسوں اور انقلابی شور وغوغا کی حد تک ہی ممکن تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آزادی کی جدوجہد اور کانگریس سے کشمکش کے دوران میں تو کسی نہ کسی طرح یہ اتحاد قائم رہا۔ اس کے بعد جب یہ اپنی مہم میں کامیاب ہو گئے اور آزادی کے بعد متحدہ ہندوستان سے کٹ کر حکومت کی کرسیاں سنبھالیں تو ایک ایک کرکے ساری خرابیاں ظاہر ہونے لگیں اور ان کے کردار کا کھوکھلا پن کھلا۔ پہلے جوش وخروش کے بجائے مقصد سے دوری مسلسل بڑھتی گئی اور پورے نظام جماعت پر ایک ضعف چھا گیا۔ ہمیں اس باب میں اپنی گفتگو کو صرف اسی حد تک محدود رکھنا ہے کہ مسلم قومیت کی اس تحریک کا اسلامی فکر کے زوال میں کس حد تک دخل رہا، ورنہ ہم یہاں ان برائیوں کو بھی گناتے جو آزادی کے بعد مسلم لیگ میں ظاہر ہوئیں۔ بہر حال جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ان بھانت بھانت کے لوگوں کا زیادہ عرصہ تک متحد رہنا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ ایسے ایک گروہ سے جو اشتراکیت کے ملحدانہ افکار، جغرافی قومیت کے غلط نظریات اور کمالی تفرنج کے باطل اصولوں کا معجون مرکب ہو کوئی اخلاقی اصلاح کا کام ہوتا، یا یہ کہ اسلامی انقلاب کے لیے راہ ہموار ہوتی۔ عیاں راچہ بیاں۔ دنیا والوں نے بچشم سر دیکھ لیا کہ کس طرح آزادی کے بعد مختلف مقاصد اور اغراض رکھنے والوں کا یہ گروہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ انھیں متحد رکھنے کے لیے کوئی نظریاتی بنیاد ہی باقی نہیں رہی۔ ان میں سے کوئی تو کھلے بندوں اشتراکیت کا حامی بن گیا، کوئی سرمایہ داروں کا پشت پناہ۔ کوئی جلسوں اور پارلیمنٹ میں تو اسلام کا نعرہ بلند کرنے والا لیکن ع

چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

اس مسلم قومیت کا سب سے بڑا المیہ یہی ہوا کہ مسلم لیگ سے منسلک دین بیزار طبقہ میں کمالی نظریات — یعنی تفرنج، الحاد اور زندقہ کے جراثیم تیزی سے پھیلتے پائے گئے۔ اس فتنہ کو ہوا دینے والا مسلم لیگ کے [illegible] صحافتی حلقوں کا یہ سوچا سمجھا رویہ تھا کہ وہ علمائے اسلام پر طعن

کرتے تھے، دین اور علمبرداران دین کا مذاق اڑاتے تھے، مولوی اور ملا ان کے تمسخر واستہزاء کا ہدف بنے رہتے تھے۔ اور اسلام کے اوامر ونواہی کا انھیں کوئی پاس ولحاظ نہیں تھا۔ یہ گروہ حالات کے بدلنے کے باوجود ابھی تک موجود ہے۔

متحدہ قومیت

مسلم لیگ کی اس تحریک کے بالمقابل متحدہ وطنی قومیت کی تحریک بھی تھی جو پچھلی صدی کے آخری حصہ میں انڈین نیشنل کانگریس کی صورت میں شروع ہوئی تھی۔ ابتداء ہی سے مسلمانوں میں سے بھی اسے اعوان وانصار مل گئے تھے جن کی تعداد حالات کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ کانگریس کے ہندو لیڈروں کا مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کے ساتھ طرز عمل پر اس کا انحصار تھا۔ مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ان کی کوششوں میں کمی بیشی کے لحاظ سے یہ کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم تک یہی صورت حال رہی۔ جنگ کے بعد انگریز کے آزادی دینے سے گریز اور اپنے وعدوں سے انحراف کے نتیجہ کے طور پر دو طاقت ور تحریکیں اٹھیں۔ ایک تحریک خلافت اور دوسری تحریک آزادئ ہند۔ ان دونوں تحریکوں نے برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے ایوان ہائے عشرت میں زلزلہ ڈال دیا۔ اس موقع پر مسلمانوں نے کانگریس کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور اس کی تنظیم و استحکام میں اس قدر زیادہ قابل لحاظ حصہ ادا کیا کہ اس نظام جماعت کے اندر وہ مؤثر حیثیت کے مالک ہو گئے۔ پالیسی بنانے اور پروگرام ترتیب دینے میں ان کی رائے خاص وزنی سمجھی جانے لگی۔ سنہ ۱۹۲۹ء تک یہی حال رہا۔ اس کے بعد نہرو رپورٹ کے نتیجہ کے طور پر جس میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مذہبی مطالبات کے ساتھ سخت بے انصافی کی گئی تھی۔ مسلمان عوام اور خواص کی ایک کثیر تعداد کانگریس سے الگ ہو گئی۔ ایک ایک کرکے تمام مسلم اہم شخصیتوں نے کانگریس سے اپنا تعلق توڑ لیا۔ ایک مولانا ابوالکلام، ان کے معدودے چند ساتھی اور جمعیۃ علماء ہند کے ارکان البتہ آخر دم تک کانگریس کے ساتھ چپکے رہے۔ یہیں سے مسلمانوں کے دو فریقوں کے درمیان مناقشت کی

اجتماعی اصول۔ ایک فریق علماء اور وطن پرستوں کا تھا جو انگریز دشمنی کی وجہ سے متحدہ قومیت کی طرف مائل اور اس کا داعی تھا۔ کانگریس اپنے پروپیگنڈے کے وسیع ذرائع و وسائل کے ساتھ اس کی پشت پر تھی۔ دوسرا فریق ان مسلمان زعماء کا تھا جو قائداعظم محمد علی جناح کے زیر قیادت ہندوؤں سے علیحدگی کے جذبہ کے تحت مسلم قومیت کا داعی تھا۔ اس فریق کا کہنا یہ تھا کہ مسلمان ایک بالکل علیحدہ قوم ہیں اور ہندوؤں اور ان میں قومی خصوصیات کے سلسلہ کی کوئی چیز ما بہ الاشتراک نہیں جس کی بنا پر ان دونوں کو ایک ایک قوم قرار دیا جا سکے۔ ہندوستان کا مسئلہ کسی ایک قوم کا مسئلہ نہیں بلکہ دو علیحدہ علیحدہ اور مستقل حیثیت رکھنے والی قوموں کا مسئلہ ہے۔ اس کے برخلاف کانگریس کے طرف دار، اس کی وطنی سیاست کے حامی اور ہندوستانی قومیت کے داعی فریق کے دلائل یہ تھے کہ تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ زبان معیشت اور معاشرت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ایک بنگالی مسلمان اپنے ایک پڑوسی بنگالی ہندو سے زیادہ قریب اور اس کا زیادہ ہمدرد ہوتا ہے۔ ایک پنجابی یا افغانی مسلمان کے ساتھ اس کی ہمدردیاں اس پایہ کی نہیں ہو سکتیں۔ اس دور میں قومیں مذہب کی بنیاد پر نہیں بنتیں۔ مذہب تو خدا اور بندہ کے درمیان کا بس ایک ذاتی معاملہ ہے۔ عملی سیاسیات میں اس کا کوئی دخل نہیں۔

اس متحدہ قومیت کے داعی بھی مسلم قومیت کے علم برداروں سے دینی اور اخلاقی اعتبار سے کچھ زیادہ بہتر نہیں تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ علمائے کرام جو اس تحریک کے علم بردار اور مسلم لیگ کے سخت خلاف تھے، ذاتی طور پر تو بہت دین دار تھے۔ اور ہمارے ملک کے طبقہ علماء کے عام دستور کے مطابق دینی شعائر کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ لیکن اس ثرذمۂ قلیل سے ہٹ کر متحدہ قومیت کی دعوت پر لبیک کہنے والے دوسرے عام مسلمانوں کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل تھی جو اسلام کے سخت دشمن اور اس دین مبین کے خلاف اپنے دل میں بغض رکھنے والے تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جن کا خدا و رسول پر قطعاً بھی ایمان نہیں تھا۔ دین اشتراکیت کے مومنین قانتین اور توحید، رسالت اور آخرت کے منکرین بھی ان میں تھے۔ ایسے لوگ بھی ان میں تھے جو بظاہر تو اسلام سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے تھے۔ اور اسلام شعائر کی کسی نہ کسی درجہ میں پابندی کرتے تھے لیکن دل سے وہ اسلام کی حقانیت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اسلام کے مستقبل سے وہ بالکل مایوس تھے اکبر کے دین الٰہی کے رنگ میں اسلام اور برہمنیت کے معجون مرکب کے سوچنے والے بھی ان میں تھے۔ ایسے بھان متی کے کنبہ سے کب اس بات کی توقع ہو سکتی تھی کہ اسلام کے لیے وہ کسی درجہ میں بھی مفید ہوگا۔ اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں جسے ہر ایرا غیرا اپنی خواہشات کے لیے کھلونا بنا سکے۔ بندگان اغراض کی خود غرض پرستیوں کی تسکین کا یہاں کوئی سامان نہیں۔ یہ خالق کائنات کا پسند کردہ ایک جامع اور ہمہ گیر دین ہے، جو دین و آخرت کی سعادتوں کا ضامن ہے۔ اس کے اپنے خاص قوانین و ضوابط اور اصول و مبادی ہیں۔ اور مسلمان وہ ہے جو ان پر قلب کے پورے انشراح کے ساتھ ایمان لائے، ان پر عمل کرے اور اس رشتہ کے ساتھ بندھ جائے۔ دنیا والوں کا معیار خواہ کچھ ہو، اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک تو مسلمان ہونے کا یہی معیار ہے۔ ایسے شخص کا اسلام سے کوئی علاقہ نہیں جو مسلمانوں کا سا نام تو رکھے اور وضع قطع میں بھی مسلمان ہو لیکن اس کے احکام کا پابند نہ ہو۔ اس کے افکار و نظریات اسلام کے علاوہ کچھ اور ہی ہوں اور جو خواہشاتِ نفس کو اپنا الٰہ بنا لے۔

مختصر یہ کہ متحدہ قومیت کے داعی مسلمان مسلم قومیت کے حامیوں سے کسی معاملہ میں بھی بہتر نہیں تھے۔ بلکہ اسلام کے لیے یہ کچھ زیادہ ہی خطرناک کہے جا سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ انتہائی بدقسمتی اور ایسی بدقسمتی کہ جس پر دل خون کے آنسو روتا ہے کہ جمعیتہ علماء سے تعلق رکھنے والے ہمارے علمائے کرام عام مسلمانوں کے رجحان اور خواص اہل الرائے کے برخلاف آخر وقت تک کانگریس سے چمٹے رہے پچھلے بیس سالوں میں اسے اسلام کے لیے ایک عظیم حادثہ کہا جا سکتا ہے اس کے نتیجہ کے طور پر علماء کا وقار بری طرح متاثر ہوا۔ عوام کی نظروں

ان کی کچھ وقعت نہیں رہی۔ فرنگیت زدہ نوجوانوں پر سے بھی ان کا رعب اٹھ گیا۔ اور دین اور علمبرداران دین کے ساتھ تمسخر و استہزاء بہت بڑھ گیا۔ یہ ایک تکلیف دہ صورت حال تھی جو پیدا ہو گئی۔ یہ کسی فرد واحد کا نقصان نہیں تھا بلکہ پوری قوم پر اس کے اثرات پڑے اس کی اسی اہمیت کے لحاظ سے ہم نے متعدد مرتبہ اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

عجیب بات یہ تھی کہ پچھلے دس سالوں میں جمعیۃ علماء کے ان محترم ارکان کی خدمت میں ہم نے جب کبھی یہ بات پیش کی کہ کانگریس کی حمایت و سرپرستی کوئی دینی فریضہ تو نہیں۔ اس سے دست کش ہو کر کیوں نہیں فریضہ اقامت دین کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ مسلم قومیت کے غلط تصور کے خلاف جہاد کرنے اور کمالی الحاد و تفرنج کی رو کو روکنے کے لیے ضرورت ہے کہ آپ ہمارا ساتھ دیں اور دینی محاذ کی تقویت کا باعث ہوں۔ تو ہمیشہ یہی جواب ملا کہ ہمیں سب سے پہلے آزادی کے حصول کے لیے بیرونی سامراجی طاقت سے جنگ کرنی ہے! احیائے اسلام کا کام ہم کریں گے لیکن اس کے بعد تعجب ہے کہ دین کی یہ ذمہ دار شخصیتیں کس قدر غیر ذمہ دارانہ بات اپنی زبان سے نکال رہی تھیں۔ شیطان نے انہیں عجیب طرح فریب نفس میں مبتلا کر رکھا تھا، آج ہم ان کی غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان تباہی کی آخری حد کو پہنچ چکے ہیں۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ابھی تک کانگریس ہی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اور اس کی ظالمانہ اور غیر عادلانہ قیادت ہی سے ان کی امیدیں وابستہ ہیں اور ان کی یہ امیدیں کبھی پوری ہونے کی نہیں۔

خلاصہ بحث یہ کہ اس صدی کے ابتدائی تیس سال بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں دو مکاتب فکر پیدا ہوئے۔ پہلا مکتب فکر مسلم قومیت کے تصور کا حامل تھا۔ اور ہندوؤں سے کلی طور پر منقطع ہو کر ہندوستان کے ایک حصہ میں مسلمانوں کی قومی حکومت کا قیام چاہتا تھا۔ کسی بھی جغرافی وطنیت یا نسلی قومیت کے داعی جس طرح غلطی پر ہو سکتے تھے اسی طرح مسلم قومیت کے یہ علمبردار بھی غلطی پر تھے۔ ہمارے پاس معاملات کو جانچنے کا ایک ہی پیمانہ تھا اور وہ ہے اسلام۔ اور اس کا یہی فیصلہ ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام میں نسلی قومیت یا جغرافی قومیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اسلام چند محکم اصول و مبادی اور ایک واضح نظام فکر و عمل رکھتا ہے۔ جو مسلمان رہنا چاہتا ہے اس کے لیے واحد طریق عمل بس یہی ہے کہ وہ ان اصول و مبادی پر ایمان لائے۔ عملی طور پر اس کے تقاضوں کو پورا کرے اور ایک ایسے معاشرہ کو وجود میں لانے اور ایک ایسے ماحول کو پیدا کرنے کے لیے اس کی ساری تگ و دو ہو۔ جس میں اسلام کا عادلانہ نظام بالفعل جاری ہو۔ اور اس دین حق کے سلیم اور معتدل قوانین عملاً نفاذ پذیر۔ اس کے بجائے ایسا طرز عمل کہ نام تو مسلمانوں کا سا ہو اور اسلام کے بلند بانگ دعوے بھی ہوں۔ لیکن عملی زندگی بالکل ان دعووں کے برعکس اور اسلام کے نام کو بٹہ لگانے والی رہے تو اس کا اسلام سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ تو ان لوگوں کا شیوہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ان کے یہ جھوٹے دعوے اور ان کی یہ کھوکھلی تدبیریں چلنے کی نہیں۔ باطل دعاوی کی یہ تاریکیاں خواہ کتنی دیر تک بھی ڈیرا ڈالے رہیں بہرحال حقیقت و صواب کی نورانی صبح نمودار ہوگی۔ کذب و دروغ سے خواہ حقیقت کو چھپانے کی کتنی ہی کوشش کی جائے۔ حقیقت کا روشن چہرہ چھپ نہیں سکتا۔

دوسرا مکتب فکر ہندوستانی وطنی قومیت کا علمبردار تھا۔ اور یہ مسلمانوں کی سیاسی حقیقت اور ان کی تہذیب و ثقافت کے ہندوؤں میں انضمام کا حامی تھا۔ جن کی تہذیب و ثقافت اور جن کے اجتماعی اور سیاسی نظریات قدیم وطنیت کی پیداوار تھے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اس فکر کے معنی مسلمانوں کے ہندوؤں اور ہندوؤں کی کانگریس کی پناہ میں جانے، ان کی قیادت کے تحت اپنے آپ کو دینے اور ہندو تہذیب و ثقافت میں رنگ جانے کے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح یہ نظریہ مسلم قومیت کے تصور سے کہیں زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ضرر رساں تھا۔

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ ہندوستانی مسلمان اس

(باقی بر صفحہ ۱۸۲)

"الضیاء"

ملک غلام علی

برادرم محمد عاصم صاحب آجکل اپنے شفیق استاد اور مربی اور ہمارے محترم اور عزیز رفیق مولانا مسعود عالم مرحوم و مغفور کی یاد میں "چراغ راہ" کی ایک خصوصی اشاعت مرتب کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مجھ سے ماہنامہ "الضیاء" کا ایک مختصر تعارف لکھنے کی فرمائش کی ہے میں سمجھتا ہوں کہ مولانا ابوالحسن علی صاحب نے جو مضمون "چراغ راہ" ہی میں "دوست کی یاد میں" کے زیر عنوان تحریر کیا تھا۔ اس میں "الضیاء" کا بھی عمدہ تعارف کرا دیا گیا تھا اور اس کام کے لئے مولانا موصوف ہی موزوں ترین آدمی تھے۔ تاہم مولانا مرحوم کی اس اہم معنوی یادگار کے بارے میں اگر میں دوبارہ الگ سے بھی کچھ لکھ سکوں تو یہ اُس جدا ہونے والے رفیق گرامی کی نہ مٹنے والی یاد کا ایک ادنیٰ حق اور تقاضا ہے۔ اس تعارف لکھنے کا ایک بڑا فائدہ تو خود مجھے یہ حاصل ہو رہا ہے کہ اس بہانے سے "الضیاء" کا خاصا تعارف نصیب ہو گیا ورنہ اس سے پہلے ایسا موقع میسر نہ آسکا تھا۔

اس رسالے کا پہلا پرچہ مولانا کی زیر ادارت محرم ۱۳۵۱ھ میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ چار سال بمشکل زندہ رہ کر بالآخر اسے عربیت کے فقدان کی نذر ہونا پڑا اور محرم ۱۳۵۵ھ کے آنے سے قبل ہی یہ ماہنامہ مدیر مرحوم کی زندگی ہی میں مرحوم ہو گیا۔ آج اس کی وفات پر قریب بیس سال گزر چکے ہیں۔ لیکن آج بھی اگر اس کے فائل دیکھے جائیں تو باغ و بہار کا عالم نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ یہ مجلہ میانہ تقطیع کے چالیس صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ اس میں مدیر کے علاوہ نمایاں اور مستقل لکھنے والوں میں سے چند ایک شیخ تقی الدین ہلالی، مولانا سید سلیمان صاحب مرحوم، مولانا ابوالحسن علی صاحب، مولانا محمد ناظم صاحب (حال شیخ الجامعہ عباسیہ) تھے۔ گاہے گاہے مولانا حمید الدین فراہی اور اُن کے شاگردان رشید کے مضامین بھی شریک اشاعت ہوتے تھے۔ علمی، دینی، تعلیمی، تاریخی اور دیگر اجتماعی مسائل پر تحقیقی مقالات بھی ہوا کرتے تھے۔ خالص ادبی مضامین و منظومات کا بھی ایک مستقل سرہ ہوتا تھا اور "سیر الحوادث"، "اخبار و آثار"، اور "نظرات" وغیرہ عنوانات کے تحت ہند، بیرون ہند، خصوصاً عالم اسلام کے واقعات حاضرہ اور ان پر تبصرہ بھی چھپا کرتا تھا جو بالعموم مولانا مرحوم کے قلم سے ہی ہوا کرتا تھا۔ جس سے ان کی عربی انشاء کی قوت و ندرت اور زبان کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے اشارات کے علاوہ مولانا مسعود عالم صاحب کے مستقل مقالات اور ان کی مطبوعہ غیر مطبوعہ اور مکمل و نامکمل تصانیف کے منتخب ابواب بھی "الضیاء" میں نکلا کرتے تھے۔

"الضیاء" کے چار سالہ مواد کا یہاں کوئی تفصیلی تعارف تو ممکن نہیں ہے اور نہ ہی یہ مقصود ہے، البتہ صرف چند ایک ایسے مضامین کا یہاں ذکر کئے دیتا ہوں جو خاص طور پر میرے لئے جاذب توجہ ثابت ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ہلکا مضمون جو میں نے بہت دلچسپی سے پڑھا ہے وہ شیخ الہلالی کا مضمون المناظرۃ الطریفۃ فی الصدق والکذب ہے جو مجلد اوّل کے متعدد شماروں میں پھیلا ہوا ہے۔ ہلالی صاحب کی زبان ایسی شیریں اور سلیس ہے جسے سہل ممتنع کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یعنی آدمی اسے پڑھے تو ایسی اچھی اور آسان معلوم ہو کہ ویسا ہی لکھنے کو جی چاہے۔ لیکن لکھنے کی کوشش کی جائے تو لکھنے والا عاجز رہ جائے۔ ہلالی صاحب نے اس میں بتایا ہے کہ یہاں لسان القرآن کے نشوونما

تو پانے کے نمایاں وجہ یہ ہیں کہ اصل تو اساتذہ کو زبان سے صحیح معنوں میں خود بھی مس نہیں ہے اور انکی اکثریت اس پر قادر نہیں ہے کہ عربی
کو ایک زندہ زبان کی حیثیت میں پڑھ پڑھا سکے۔ پھر یہاں مدارس میں ذریعہ تعلیم اردو یا انگریزی ہے حالانکہ ابتدائی چالیں ' پڑھنے پڑھانے کا
سارا تعلیمی ماحول خالص عربی ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ کتب نصاب اور دینیات کی مقدار بھی بہت زیادہ ہوتی ہے اور تعلیم میں تدریج و
ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ ہر مدرسے میں مقامات حریری، حماسہ اور دیوان متنبی جیسی کتابیں پڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ
یہ کتابیں دیار عربیہ کے عام مدارس میں بھی نہیں پڑھائی جاتیں۔ ان کتابوں کے فحش اور غیر اخلاقی حصص کے پڑھنے پڑھانے پر ہلالی صاحب
نے بڑی سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان مقامات کو جب ایک شریف آدمی تنہائی میں بھی پڑھنے بیٹھتا ہے تب بھی تہذیب و اخلاق
اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لیتی ہے۔ قرآن کی درس و تدریس مدارس عربیہ خصوصاً دینی مدارس میں کیسے جائز قرار دی جا سکتی ہے انہوں نے ندوہ
میں اپنا معمول بیان کیا ہے کہ وہ ایسے مقامات پڑھائے بغیر گزر جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاگردوں نے پوچھا کہ اگر امتحان میں یہی مقامات آ گئے تو
ہم کیا کریں گے۔ جواب میں کہنے لگے کہ اگر ان سے متعلق سوالات کے جوابات آتے بھی ہوں تو نہ لکھنا۔ بلکہ یہ لکھ دینا کہ ہمیں استاد نے پڑھانے سے
انکار کر دیا تھا۔ اور یہ ہدایت بھی کی تھی کہ ان کا کوئی جواب نہ لکھنا۔ اس مضمون کے آخر میں ہلالی صاحب نے لکھا ہے کہ بہت سے معلمین خود عربی
سیکھنے کے محتاج ہیں اور عربی کے نقص اور ضعف کی وجہ سے انہیں کتاب اللہ سے بھی مناسبت نہیں ہے۔ اسی ضمن میں انہوں نے مولانا حمید الدین
فراہی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی عربیت اور قرآن فہمی کا اعتراف کیا ہے۔

مولانا سید سلیمان صاحب مرحوم کے متعدد تاریخی اور تحقیقی مضامین الضیاء میں مسلسل نکلتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض سید صاحب نے لکھے ہیں اور
بعض کو آپ کے تلامذہ نے اردو سے ترجمہ کیا ہے۔ دوسری جلد کے شروع کے پرچوں میں حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کی کتاب الوراثۃ فی الاسلام پر
مولانا علی الزینبی کی ایک عمدہ تنقید شائع ہوئی ہے۔ جو اس قابل ہے کہ اسے اردو کا جامہ پہنایا جائے۔

مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم کے اپنے مضامین میں سے (تاثیر الاسلام فی الشعر العربی) بہت بلند پایہ علمی مضمون ہے جو بالاقساط
چھپتا رہا ہے اس کے علاوہ ان کے متعدد مضامین ہیں۔ مقالات اور واقعات عالم پر تبصروں کے علاوہ بعض کتب جدیدہ پر مولانا مرحوم کی تنقیدات
بھی قابل مطالعہ ہیں مثلاً آخری مجلد کے چوتھے اور پانچویں نمبر میں مصر کے معروف مصنف محمد حسین ہیکل کی کتاب "حیاۃ محمد" پر ایک مفصل تنقید شائع
ہوئی ہے جس میں مصنف کی لکھی لغزشوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

عالم اسلام کے مشاہیر زعماء، علماء اور ادباء سے "الضیاء" اور اس کے مدیر کے نہایت گہرے ذاتی مراسم و روابط قائم تھے۔ چنانچہ الضیاء
میں جا بجا امیر شکیب ارسلان، سید رشید رضا رحمہما اللہ اور دوسرے اہل قلم اور صحافیوں کے مراسلات ملتے ہیں۔ جن میں علاوہ دیگر امور کے،
ادارۂ الضیاء کی علمی کاوشوں اور بالخصوص اس مجلے کی شستہ زبان کی دل کھول کر داد دی گئی ہے اور اپنے یہاں کے ادیبوں کی زبان اور انداز بیان
کے فساد پر ماتم کر کے انہیں شرم دلائی ہے اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو یہاں چند اقتباسات اس سلسلے کے درج کر دیئے جاتے۔

بہر کیف الضیاء کو اگرچہ اپنے ہاں قدر شناسوں کی قلت کے باعث عمر کی صرف چار بہاریں ہی دیکھنا نصیب ہو سکیں، لیکن الضیاء اور مدیر الضیاء
کے بارے میں عالم عرب کی قدر دانی کا یہ ثبوت کیا کم ہے کہ جب مدیر الضیاء کا جنازہ نکلا ہے تو دول عربیہ کے سفراء اشکبار آنکھوں کے ساتھ اسے
کندھا دے رہے تھے اور انہی ایام میں الضیاء کے مجلدات ایک سفیر کے زیر مطالعہ تھے۔

آخر میں جو الفاظ مولانا ابوالحسن علی صاحب نے مدیر الضیاء کے بارے میں استعمال کئے تھے میں انہی کو مستعار لیتے ہوئے الضیاء پر منطبق
کر کے رخصت ہوتا ہوں کہ

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

عربی کا ایک ہندوستانی انشاپرداز

عبداللہ عباس ندوی
ادیب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

غیر عربی داں حلقوں میں یہ بات حیرت سے سنی جائے گی کہ یہاں (ہند و پاک میں) صحیح عربیت کا ذوق مفقود ہے اور ان سیکڑوں دینی مدارس کے جود جو عربی مدرسے کہلاتے ہیں یہاں عربی زبان اپنی صحیح شکل میں کبھی اور کہیں نہیں جاتی اور خال خال ہی ایسے افراد ہوئے ہیں، جو زبان و ادب صحیح ذوق رکھنے والے کہے جا سکتے ہیں، انہیں خال خال افراد میں مولانا مسعود عالم ندوی بھی تھے جو عربی ادب پر فنی مہارت رکھتے تھے۔ اس زبان کے مزاج شناس ادیب اور صاحب اسلوب انشاء پرداز تھے، البتہ ان کے ادبی مقام کو سمجھنے کے لئے ہمیں ایک ناگزیر تمہید سے گزرنا پڑے گا، اس ملک میں عربیت کے تاریخی پس منظر کو دیکھنا ہوگا، ورنہ اردو میں ان کی عربی انشاپردازی کی خصوصیت واضح نہ ہو سکے گی، حسن اتفاق سے ن النفحات[1] کے مقدمے میں مولانا ہی کے قلم کی چند سطریں ملتی ہیں جو ایک ملک میں عربیت کے تاریخی پس منظر کو واضح کرتی ہیں،

(ہمارا ملک (برصغیر ہند و پاک) ان خوش نصیب ملکوں میں ہے جہاں عرب تاجروں اور مجاہدوں کے قدم آ چکے ہیں اگرچہ وہ زیادہ ن قیام نہیں کر سکے اور آخر کار ان کی آمد و رفت کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا، اسی لئے عربی زبان یہاں وہ فروغ نہیں حاصل کر سکی جس کے مستحق تھے، ہاں چند شاعر عربی کے ضرور پیدا ہو گئے جن کی پختہ کلامی اور عربی ذوق کی صحت سے انکار نہیں، لیکن یہ حال سندھ کا ہے جہاں ان کی آمد و رفت رہی تھی، سندھ کے علاوہ ملک کے دوسرے حصے جہاں عرب مجاہدین آئے ہی نہیں بلکہ مغلوں، ترکوں اور افغانیوں کی فوجیں آتی رہی ہیں، وہاں قرآن کریم کی زبان جس کس مپرسی میں رہی اور جس وجہ اس کی مٹی پلید ہوئی اور جس قدر فارسیت کا غلبہ رہا اس کا ذکر فضول ہے، رہے وہ حضرات جو زمانے کی ناسازگاریوں کے باوجود عربیت کو سینوں سے لگائے رہے اور اس کے درس و تدریس میں مشغول رہے، انہوں نے اگر کبھی عربی میں کچھ لکھا لکھایا تو ان کی تحریریں حافظ ابراہیم (مصر کے ایک قادر الکلام اور مقبول عام شاعر) کے ان دو شعروں کا مصداق تھیں ؎

سرت لوثۃ الاعجام فیہا کانما   لعاب الأفاعی فی مسیل فرات

فجاءت کثوب ضم سبعین رقعۃ   مشکلۃ الالوان مختلفات

عربی زبان میں ان عجمیوں کی ژولیدہ بیانی اس طرح سرایت کر گئی جیسے نہر فرات کے بہاؤ میں اژدہوں کے زہر پھیل جائیں نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تحریریں

---

[1] مولانا مسعود عالم ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گہرے دوست اور عربیت میں ان کے ہم مذاق ساتھی مولانا عبدالرحمان الکاشغری الندوی استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ کا عربی دیوان جس پر مولانا مسعود عالم ندوی نے ایک جامع اور پُرمغز مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

جیسے کپڑوں کی طرح ہو گئیں جن میں لاتعداد رنگ برنگ کے پیوند لگے ہوں)

چند ماہرین فن کو چھوڑ کر جنہوں نے زبان و ادب کو صحیح طریقے پر حاصل کیا کسی کو بھی اس عموم سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا (صحیح طریقہ اختیار کرنے والے، وہ لوگ ہیں جنہوں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور زبان و ادب میں کامل دستگاہ حاصل کی، ان لوگوں میں عربیت کا پایہ بلاشبہ بہت بلند ہے۔ جیسے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور سید مرتضیٰ زبیدی، یا ان کی طرح اگر کسی اور نے یہ کمال حاصل کیا ہو۔ الاعرات ۱۰۰۹)

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور سید مرتضیٰ زبیدی یا ان جیسے مستثنیٰ افراد کو چھوڑ کر ہمیں جو عربی تحریروں کے نمونے ملتے ہیں ان کی تحلیل ہم اس طرح کر سکتے ہیں:-

قافیہ کا شدت سے التزام اور قوافی ہی کی رعایت سے نہ صرف الفاظ بلکہ بے فائدہ جملوں کا اضافہ، غریب اور مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کو لانے کی کوشش، منطق کی درسی کتابوں کا اسلوب بیان اور وہی طرز استدلال، عام جملوں کی ترکیبوں میں بھی فقہ، منطق کی درسیات کی اتباع، پھر ہر موضوع کے لئے ایک ہی انداز نگارش، ان عربی تحریروں کا حال ہے جو ادبی نمونے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں، ان کے علاوہ جو دوسرے فنون پر تصنیفات اور حاشیوں کی زبان ہے ان کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سخت قسم کی عربی نما فارسی ہے۔

طوالت کے خوف سے ہم یہاں پر ان اسباب کو حذف کرتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے یہاں خاص نوعیت کی عربیت نے رواج پایا، جو عربوں کے لئے بھی نامانوس اور اجنبی ہے، البتہ اس قدر اشارہ ضروری ہے کہ یہاں مروج نصاب اور طرز تعلیم کا لازمہ یہی تھا، اور جب کہ حریری کے خاص طرز کو خود عرب ممالک نے بھی دور انحطاط کا نمونہ سمجھا اور ابن خلدون ہی کے طرز کو صحیح عربیت کا نمونہ سمجھ کر اختیار کیا اس وقت زبان و ادب میں اسلامی دور (پہلی اور دوسری صدی) کے ادب کو معیار قرار دیا گیا اور زبان کو خالص قرآن و حدیث کی زبان کے مطابق کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس کے نتیجہ میں متعدد صاحب اسلوب ادیب پیدا ہوئے جن کی ادبی تحریریں کسی طرح دوسری صدی کے مصنفین اور ادبار سے معیار میں کم نہیں ہیں۔ چنانچہ مصطفیٰ صادق الرافعی اور امیر شکیب ارسلان، مفتی محمد عبدہ، رشید رضا، اور دوسرے نئے صاحب طرز ادبار ہی قدیم عربیت کے دلدادہ اور اس کے مقلد ہیں لیکن ہمارے یہاں جو طرز رائج تھا اس پر کئی پشتیں گزر چکی تھیں اور امتداد زمانہ سے اس طرز خاص کو بھی ایک گونہ "تقدس" کا درجہ حاصل ہو گیا[۱]، اور مصر و شام کی عربیت کے لئے "نئی عربی" کی اصطلاح چل پڑی، اور ظاہر ہے لفظ "نئی" کے اندر ہمارے روائتی مدارس کے لئے کتنی وحشت ناک کیفیت پوشیدہ ہے۔ اس لئے یہ امید کب کی جا سکتی تھی کہ وہ ان ادبی قدروں کو قبول کر سکیں گے۔ قبول کرنا تو درکنار قابل اعتنار بھی گردانئے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ برصغیر کی سرزمین صحیح عربیت کے لئے ناموزوں تھی۔ بلکہ ہر دور میں ایک دو ایسے صاحب کمال ضرور رہے جن کی ادبی تحقیق کا لوہا خود عرب ممالک کے ادبار نے مانا ہے جیسا کہ ان دنوں۔ علامہ عبد العزیز المیمنی، مولانا محمد ناظم ندوی (شیخ الجامعۃ العباسیہ بہاولپور) اور مولانا عبد الرحمان الکاشغری زبان و ادب میں حجت کا درجہ رکھتے ہیں خصوصاً میمن صاحب تو مرحوم احمد تیمور پاشا کے بعد عالم عربی میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ لیکن باوجود

---

[۱] اس کی واضح مثال جب کہ ہمارے مدارس عربیہ میں ایک اخلاقی لحاظ سے پست ترین اور زبان کے لحاظ سے عامیانہ درجے کی کتاب نفحۃ الیمن داخل نصاب ہے، اس کے مقابلے میں ایک ہندوستان کے مقبول عالم دین کا منتخب مجموعہ جس میں قرآن کریم اور احادیث نبوی، خطبات صحابہ کے معیاری نمونے ہیں باوجود اعتراف کے کوئی یہ ہمت نہ کر سکا کہ نفحۃ الیمن کی جگہ پر اس طرز کے دوسرے مجموعہ کو نصاب میں داخل کریں۔

اس لئے ان حضرات نے انشا پردازی کو اپنا میدان نہیں بنایا، اور نثر میں تھوڑا بہت جو لکھا وہ فنی اور متکلف نثر کا نمونہ ہے، اس میں روانی برجستگی اور سلاست نہیں ہے جب کہ میمن صاحب کی مقبول تحقیقی کتاب (رابعا لعلاء وما الیہ) کے آخر میں جہاں علمائے ادب وبیان نے خراج تحسین پیش کیا ہے وہاں متعدد تقریظ نگاروں نے اسی تکلف اور عدم سلاست کی شکایت بھی کی ہے:

مولانا مسعود عالم ندوی انہیں معدودے چند خوش نصیب افراد میں تھے جنہوں نے زبان کو صحیح طریقہ پر حاصل کیا، ان کے فطری ذوق اور وہبی صلاحیتوں نے ان کے فن کو جلادی، قدیم ماخذ کے گہرے مطالعہ اور جدید لٹریچر سے براہِ راست استفادہ نے ایک مناسب اور معتدل طرز پر ان کی ادبیت کو ڈھال دیا، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی سرپرستی اور عربی کے ماہر فن ادیب شیخ تقی الدین الہلالی کے تلمذ سے ان میں امتیازی شان پیدا ہوگئی جس نے ان کو تمام ہندوستانی طرز کے ادبا کی صف سے نکال کر خالص عرب نثرار ادبا کی صف میں ان کی جگہ ———— اور ممتاز جگہ پیدا کردی۔

مولانا مسعود عالم ندوی نحو و بلاغت میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے قدیم ماخذ ادبیہ میں کوئی ایسا ماخذ نہیں ہے جس سے مولانا نے براہِ راست استفادہ نہ کیا ہو۔ قرآن کریم سے خاص شغف تھا۔ اور قرآن کے بعد احادیث اور صحابہ کی زبان ہی کو وہ معیار سمجھتے تھے، چنانچہ ان کی تحریروں میں برجستگی وسلاست و روانی کے ساتھ ساتھ قدیم محاورات اور قرآنی ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں۔ مولانا کا خاص کمال یہ ہے کہ عصرِ اوّل کے اسلوب و محاورات میں جدید خیالات اور جدید فکر کو بڑے حسن کے ساتھ جمع کردیتے تھے ہمالانکہ یہ طبعی اور مسلم امر ہے کہ جن لوگوں کو نحوی قواعد کے باب میں غلو ہوتا ہے ان کی تحریریں تکلف سے پاک نہیں ہوتی ہیں لیکن مولانا مسعود عالمؒ صاحب اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

مولانا نے دیارِ عرب کا سفر تو آخر عمر میں کیا جب کہ ان کی صلاحیتیں پختہ ہوچکی تھیں اور استفادہ انہیں بلکہ افادہ مقصود تھا۔ اور عرب کے علماء ان سے ایک مورخ، عالم دین اور ادیب وانشاپرداز کی حیثیت سے ملے، لیکن عرب ممالک سے ان کا تعلق تقریباً بیس سال تک رہا، مشاہیر علماء اور انشاپردازوں سے خط و کتابت، تبادلۂ خیالات کرتے رہے اور وہاں کے ممتاز پرچوں میں شروع ہی سے مضامین لکھتے رہے۔ اور وہاں اس حد تک متعارف تھے کہ ان کی شخصیت علمی حلقوں میں اجنبی نہیں تھی۔

جب انہوں نے ندوہ سے 'الضیاء' نکالنا شروع کیا ہے اس وقت ان کے شباب کا زمانہ تھا الضیا نے عالم اسلامی کے متعدد اصحابِ قلم سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ مجمع العلمی دمشق جو عربی ممالک میں ایک ممتاز ترین اکاڈمی ہے اس نے بھی دل کھول کر داد دی۔ تمام ادبی رسالوں نے حیرت ومسرت کے ساتھ اس رسالہ کا استقبال کیا، حیرت اس بات پر کہ ہندوستان سے عربی زبان کا پرچہ نکلے اور اس کی زبان اس درجہ معیاری ہو کہ عرب ممالک کے پرچوں سے پیچھے نہ رہے یہ واقعی عجیب بات بھی تھی چنانچہ المجمع العربی دمشق کے آرگن نے ایک طویل تقریظ وتبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

.... ليس العجب ان تنهض العربية في تونس والجزائر ومراكش وانما العجب ان يستطع ضيدها وتخفق لواءها في بلاد العجم ...... كنهوضها اليوم في بلاد الهند بواسطة الغيور من اساتذتها فقد انشأ هؤلاء الاساتذة مجلة علمية ادبية تعليمية اجتماعية،

ولقد كان الانشاء فيها هي لغة مصر بما عهدناه . فصاحتها فاص...

ثلاث المجلة الاستاذ (مسعود عالم الندوی) الضیاء شوال [illegible]

اس زمانہ میں بغداد (عراق) سے ایک رسالہ لغۃ العرب نامی ایک عیسائی ادیب الاب انستاس ماری کرملی کی ادارت میں نکلتا تھا مدیر نے مولانا کو اس طرح مخاطب کیا ہے۔

بغداد فی - ۲۰ر ۱۱ر ۱۹۳۲ء —— سیدی الجلیل

اهنیکم بالعلامة وان کنتم فی حداثة السن ولیست العبرة بالسن انما العبرة بالعلم. رأیی فی مجلتکم انها ترسم نظرة واسعة فی الآداب العربیة وصوات تفیحوا فی مساعیکم ویوخذ علیها شیئان ان لا تتعرض للادیان وقد تعرضت فی کلامها علی کتاب "شعراء النصرانیة" والثانی أن یکون طبعها بالحروف لا بالحجر، فهذا الطبع متعب النظر وتصعب قرأته .... الاب انستاس الکرملی۔

عراق وشام کے دو مقتدر ذمہ داروں کی رائے بطور نمونہ پیش کی گئی اس کے علاوہ مصر، الجزائر، تونس، مراکش سے کس قدر تحسین و تقریظ ہوتی رہی اس کے لئے اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ (ماخوذ۔ الضیاء شوال ۱۳۵۱ھ)

عالم عربی سے براہ راست واقفیت رکھنے والے اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہندوستان میں صرف ایک ہی پرچہ تھا۔ جس نے ہر حلقہ سے داد حاصل کی، اور اس کامیابی کا تمام تر سہرا مولانا مسعود عالم صاحب کے سر ہے۔

مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم تاریخ اسلامی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اور تاریخ کی زبان عربیت کے لحاظ سے بہت ہی اہم اور قابل اعتناء سمجھی گئی ہے، سیکڑوں ایسے محاورات اور روزمرہ کی مثالیں ہیں جو صرف تاریخ ہی کی کتابوں میں ملتی ہیں خالص ادبی کتابوں میں ان کا استقصار نہیں کیا گیا ہے۔ اس لئے مولانا کی تحریروں میں تاریخی تلمیحات بھی ملتی ہیں اور ان کا موضوع عموماً تاریخ ہی رہا ہے۔ خالص ادبی نقطۂ نظر سے ان کی مفصل تحریر صرف ایک ہی ملتی ہے یعنی "تاثیر الاسلام فی الشعر الجاہلی" جو دراصل ایک طرح (Thesis) کے طور پر انہوں نے لکھا تھا۔ اور الضیاء میں بالاقساط شائع ہوتا رہا اس کے علاوہ ان کی مفصل کتاب "غربة الاسلام فی الهند" جو تمام تر تاریخی جائزہ ہے اگرچہ افسوس کہ وہ چھپنے کے باوجود ان کے ایک عرب دوست الاستاذ محب الدین الخطیب کی نامعلوم کوتاہی کی وجہ سے سامنے نہ آسکی، اس کے علاوہ ان کی ایک خالص ادبی تحریر ہمیں "الزہرات" (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) کے مقدمے میں ملتی ہے ورنہ ان کی اکثر تحریریں تاریخی یا اجتماعی ہیں ان کی عربی تحریر کا نمونہ ہم اس مقدمے سے پیش کرتے ہیں چونکہ طول طویل اقتباسات اردو کے مضمون میں قارئین پر بار ہوں گے اس لئے چند سطروں پر اکتفا کریں گے لیکن یقین ہے کہ اصحاب ذوق کے اندازہ کے لئے یہ سطریں کافی ہوں گی۔

هذه حال اللغة العربیة، وهؤلاء شعراؤها فی مهد العروبة والارض التی بها نبتت ازدهرت فیها فی الاقطار التی استعربت وتعربت فنطقت بلغة العرب وتدینت بدیانتهم، حتی اصبحت بلدانا عربیة کالحیرة او اکثر منها لکن لغة العرب ما کانت تنحصر فی منطقة جغرافیة ضیقة، فانها ما کادت تشرق شمس الاسلام حتی اخترقت دائرتها الاقلیمیة وتبعت القرآن المجید وقضت اشعة وهجه، حیثما ذهب بهم حملة دینه، نبیه (ص)، وتسربت الی الفرس والمسلمین بالله فی کل صقع توجدت من قلبهم تربة صالحة فتع علیها غیثها فانبتت من کل زوج بهیج۔

یہ سطریں راقم السطور کی نظر میں مولانا مسعود عالم صاحب کے اسلوب خاص کا نمونہ ہیں جن میں ترکیبوں کی چستی، بندش کی عمل آوری، [illegible]

الاستاذ کا عربی ادب
منظر اور پس منظر

محمد کاظم سباق

۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا۔ عرب ممالک میں گزشتہ ایک صدی سے عربی زبان و ادب نے جو حیرت انگیز ترقی کی تھی، اس کے اثرات ہندوستان کے بعض حلقوں تک ایک عرصہ ہوا پہنچ چکے تھے، حالی، شبلی اور عبدالحمید فراہی نہ صرف یہ کہ عربی لغت و ادب کے مسائل پر تنقیدی نظر رکھتے تھے بلکہ مصر و شام کی جانی پہچانی زبان میں پوری قدرت کے ساتھ اظہار خیال کر لیتے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء اپنے شباب پر تھا، یوں تو ہندوستان کے ہر دینی مدرسہ میں عربی زبان کی تعلیم کا انتظام موجود تھا، لیکن جو چیز ندوہ کو ان سب سے ممتاز کرتی تھی وہ یہ کہ اس میں دور انحطاط کی زبان نہیں بلکہ انیسویں اور بیسویں صدی کی زندہ اور رائج الوقت عربی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی، ندوہ کے اساتذہ میں جہاں سید علی الزینبی، عبدالحلیم صدیقی اور عبدالرحمن کاشغری جیسے عربی کے پختہ کار عالم اور ادیب بر سر فہرست نظر آتے تھے وہاں اس کی سرپرستی سید سلیمان ندوی جیسے عربی زبان کے باذوق عالم اور نقاد کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا کتب خانہ قدیم عربی کتابوں کے علاوہ عصر جدید کی بے شمار علمی و ادبی عربی تصانیف سے مزین تھا اور وقت کے تمام قابل ذکر عربی اخبارات و رسائل اس کے دارالمطالعہ میں آتے تھے۔ ——— اسی زمانہ میں ندوہ کے سربراہ سید سلیمان کو صوبہ بہار کے قریہ اوگانواں کے ایک نوجوان کا، جو کسی عربی مدرسہ سے نیا نیا فارغ ہوا تھا، ایک خط عربی زبان میں موصول ہوا، جس کی املا کمزور، عبارت بے جوڑ اور زبان ناقص تھی لیکن لکھنے والے کا شوق ... اس کے ایک ایک لفظ سے پھوٹا پڑتا تھا۔ اس خط میں اس نوجوان نے عربی زبان و ادب کے ساتھ اپنے انتہائی شوق و شغف کا اظہار کرتے ہوئے بیان کیا کہ اسے اگرچہ ایک عربی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے کی سعادت نصیب ہو گئی ہے، لیکن عربی ادب و انشاء کی تکمیل کی خواہش ابھی تک دل میں باقی ہے اور اس غرض کے لئے وہ چاہتا ہے کہ بلاد عرب کی کسی درسگاہ کا رخ کرے، اسے بتایا جائے کہ طلب علم کی جو پیاس سے لگی ہوئی ہے، اس کو فرو کرنے کے لئے مصر و شام کا کون سا دانش کدہ زیادہ موزوں ہوگا۔ مکتوب الیہ کی نگاہ جوہر شناس تھی، تاڑ گئی کہ صاحب مکتوب کوئی معمولی اور عام نوجوان نہیں، ایک باصلاحیت اور ہونہار طالب علم ہے، کیوں نہ اس معدن خام کو ندوہ کی تجربہ گاہ میں کندن بنایا جائے، چنانچہ سید صاحب نے اپنے جواب میں جہاں اسے مصر کی مشہور یونیورسٹیوں کے حالات و کوائف سے آگاہ کیا، وہاں یہ ذکر بھی کر دیا کہ میرا مشورہ آپ کو یہ ہے کہ باہر جانے سے پہلے ندوہ میں کچھ سال گزار لیں، اس پر عربی زبان کا یہ شیدائی شوق کے پروں سے اڑ کر لکھنؤ آیا اور ندوہ کے آخری سال میں داخل ہو گیا۔ یہاں اسے ندوہ کے کتب خانے اور دارالمطالعہ میں عربی کتابوں اور رسالوں کا وہ گنج بے بہا میسر آیا کہ اس نے عربی زبان و ادب کی خوب خوب پیاس بجھائی اور دارالعلوم کے اساتذہ اور آخری کلاسوں کے طلبہ کی صحبت میں وہ ماحول میسر آیا کہ جس کے ہوتے ہوئے وہ مصر کا سفر کرنے سے ایک حد تک بے نیاز ہو گیا۔ چنانچہ اس نے آخری سال کا امتحان پاس کر لینے پر بس نہ کی، بلکہ مزید دو سال عربی ادب کی تکمیل میں بسر کئے اور اس کے اختتام پر عربی زبان میں ایک اطروحہ (Thesis) بعنوان "تاثیر الاسلام فی الشعر العربی" (عربی شاعری پر اسلام کے اثرات) لکھ کر ادب کی سند حاصل کی۔ اس زمانے میں ندوۃ العلماء میں عالم عرب کے مشہور نحوی اور ادیب ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مغربی، استاد ادب کی حیثیت

ہ آسشنا اہل ہوئے۔ ندوہ جو زندہ اور رائج الوقت عربی زبان کی نشر و اشاعت میں پہلے ہی ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتا تھا، نحو و ادب کے امام کے آجانے سے اس کے اندر ایک عظیم الشان انقلاب آگیا۔ ہمارے اس ... نے اس مجمعۂ علم و ادب کی مسلسل صحبت و ہمنشینی سے بیش بیش فائدہ اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے عربی انشاء و نگارش میں وہ قابلیت بہم پہنچالی کہ دو سال بعد جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ایک ماہوار عربی رسالہ نکالنے کی تجویز سامنے آئی تو اس کی ادارت کے لئے سب کی نگہ انتخاب قریۂ اودگانواں کے اسی لائق فرزند پر پڑی، اور اس نے چار سال اس عربی رسالہ کو کمال حسن اور چابکدستی سے چلایا اور ۱۹۳۵ء کے اواخر میں جب وہ ندوہ سے فارغ ہو کر باہر کی دنیا میں نکلا تو بزم گہ علم و ادب ... وقت ایک پرجوش اور اولوالعزم عالم دین، اور عربی زبان کے ایک پختہ کار اور مشاق انشاء پرداز سے متعارف ہوئی ————
ن کا نام تھا مسعود عالم الندوی اودگانوی !!

اس فاضل ندوہ کے فن کے جوہر تو رسالہ "الضیاء" کے صفحات پر ہی آشکارا ہو گئے تھے، جسے دیکھ کر فصحائے عرب عش عش کر اٹھے، یہاں تک عربی کے بہت بلند پایہ اہل قلم ابن ناصر الدین، جو محقق اور لغوی ہونے کی وجہ سے اپنی سخت گیر تنقید اور نکتہ چینی میں "مشہور زمانہ" تھے، اس رسالہ کو ... کر یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ:-

> عربوں کے لئے مقام غیرت ہے کہ اُن کے اکثر و بیشتر رسالوں سے اس عجمی ملک کے رسالہ کی زبان بہتر و برتر ہوتی ہے۔ رب کعبہ کی قسم! یہ کیسے تعجب کا مقام ہے کہ کتاب الٰہی کی زبان اپنے وطن سے زیادہ ایک عجمی ملک میں پُرشوکت اور باوقار ہو!"

... کے بعد جب اس نے اپنے اس ہنر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عربی رسالوں میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تو ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۶ء ... عالم عرب کو ہندوستان کے سیاسی اور ثقافتی حالات سے روشناس کرانے میں وہ عظیم الشان کام سرانجام دیا کہ جس سے بڑی بڑی سفارتیں ... برآ نہیں ہو سکتیں۔ مصر کا مشہور علمی اور اسلامی ہفت روزہ "الفتح" ان کی جولانئ فکر کا خاص میدان تھا، اس کے علاوہ اس کے نتائج افکار "العرب ... سلمین" "التمدن الاسلامی" (شام) وغیرہ میں بھی شائع ہوتے رہے، اسلامی تاریخ اس کا خاص موضوع تھا، اور سیاسیات میں اسے حد درجہ دلچسپی تھی ... تح وغیرہ میں اس نوجوان ادیب کے مضمون زیادہ تر انہی دو موضوعوں پر ہوتے تھے۔ ۱۹۴۲ء کے بعد اس فاضل رو زنگار نے تحریک اسلامی کے ... بہ عربی کی سرپرستی کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لیا، اور اپنی مسلسل بیماری اور ضعف و ناتوانی کے باوجود ترجمہ و تعریب کے سے سخت اور صبر آزما ... م کو اس خوبی اور جانفشانی کے ساتھ نبھایا کہ عرب کے زباندانوں کو ایک بار پھر اس نابغۂ ادب کے فن کی داد دینی پڑی۔ مصر حاضر میں عربی دنیا کے ... ب سے بڑے عربی انشاء پرداز علامہ محمد البشیر الابراہیمی نے اپنے ایک مضمون میں دارالعروبہ کے عربی میں ترجمہ شدہ رسالوں کی بابت لکھا کہ:-

> "میں نے ان رسالوں کے اندر الفاظ و معانی میں ایسی مناسبت اور ہم آہنگی پائی ہے کہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کئے گئے ہیں۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ موضوع بھی اسلامی ہیں اور دونوں زبانیں بھی اسلامی اور مؤلف اور مترجم دونوں ایک ہی فکر (فکر قرآن) کے پروردہ ہیں، اس لئے اس ترجمہ میں روح نے اپنی کارفرمائی دکھائی ہے، ہمارے دوست مسعود ـــ اللہ کا لطف ان کے شامل حال ہو۔
> برصغیر ہندوپاکستان میں اُن دو میں سے ایک ہیں جو عربی نگارش میں عربوں کے ہم پلہ ہیں۔"

... ابھی اس کا یہ کام جاری تھا اور اسی کی ترقی و توسیع کی خاطر یہ مجاہد عالم عرب کی دوسری مرتبہ سیاحت کرنے کے لئے پر تول رہا تھا کہ ... کا پیغام آگیا۔

استاذ مسعود الندوی عربی ادبا و اہل قلم کے کس سلسلہ کے پیرو تھے؟ ان کا خاص اسلوب کیونکر پیدا ہوا؟ اور اس اسلوب کی خصوصیات کیا تھیں؟ ــــ اس پر کلام کرنے سے پہلے کچھ باتیں مقدمات کے طور پر کہہ دینی ضروری ہیں :-

اہل ہند عربی زبان سے اول اول اس وقت آشنا ہوئے جب عرب تاجروں نے جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں آمد و رفت شروع کی۔ ان کے میل جول سے اہل مدراس و مالابار کے نہ صرف اخلاق و عادات ہی متاثر ہوئے بلکہ ان کی زبان نے بھی ان نو واردوں کی زبان کا اچھا خاصا اثر قبول کیا اس کے بعد جب پہلی صدی کے اواخر میں سندھ پر عرب مسلمانوں نے حملہ کیا اور ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا تو شمال مغربی ہند کے اس مختصر علاقہ میں بھی عربی زبان کا دخل ہوا - اور وہاں کی زبانیں اس سے متاثر ہوئیں، لیکن عرب فاتحوں کے جلد واپس لوٹ جانے کے باعث یہ اثر زیادہ دیر رس نہ ثابت ہوا اور یہاں وہ حالت قائم نہ ہو سکی کہ عرب مجاہد افریقہ اور یورپ میں جہاں جہاں بھی گئے اور آباد ہوئے وہاں کی زبان ہی بدل گئی اور پورے ملک میں عربی ہی عوام و خواص کی زبان ہو گئی، یہاں صرف انہی علاقوں نے عربی زبان کا اثر قبول کیا جن کو عرب سے کسی طور سابقہ پیش آیا اور وہ بھی اس حد تک کہ ان زبانوں میں عربی کے متعدد الفاظ داخل ہو گئے اور یہ عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں۔ سندھی اور ملیالم بولیاں میں دوسری علاقائی زبانوں کی نسبت اسی وجہ سے عربی الفاظ کی کثرت ہے: اور سندھی کا ایک ہی رسم الخط ہے جو خالص عربی نسخ کا ہے، لیکن ملیالم ہندی اور عربی دونوں رسم الخطوں میں لکھی جاتی ہے۔

ہندوستان میں عربوں کے اس مختصر قیام اور یہاں کی زبانوں پر عربی زبان کی اس کم اثری کا نتیجہ تھا کہ دوسری صدی ہجری کے آغاز سے لے کر تیرھویں صدی ہجری کے اواخر تک اس ملک میں سوائے چند ایک نفوس کے عربی کا کوئی قابل ذکر ادیب اور انشاء پرداز پیدا نہ ہو سکا۔ اور ان معدودے چند نفوس میں بھی اکثریت ان کی تھی جو یا تو ہندوستان سے ترک سکونت کر کے عرب میں جا بسے اور وہیں ان کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا۔ یا پھر انہوں نے اپنی زندگی کا معتدبہ حصہ دیار عرب میں گزارا، عربی کی ضخیم مستند لغت تاج العروس کے مصنف مرتضیٰ زبیدی بلگرامی اگرچہ ہندی الاصل تھے۔ لیکن یہاں سے ہجرت کر کے عرب میں چلے گئے اور قاہرہ میں ان کا انتقال ہوا، عربی لغت کی ایک دوسری کتاب العباب الزاخر کے مصنف حسین بن محمد صغانی (متوفی ۶۵۰ھ) عرب ملکوں میں بار بار آئے اور گئے، اسی طرح شیخ علی متقی برہانپوری (م ۹۷۵ھ)، شیخ محمد طاہر پٹنی (م ۹۰۶ھ) اور امام شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) سب کو ممالک عربیہ میں کچھ عرصہ بسر کرنے کا موقع ملا، اور وہیں سے انہوں نے عربی ادب و انشاء میں اپنا مقام پیدا کیا۔

لیکن آٹھویں صدی ہجری سے لے کر بارھویں صدی ہجری تک کا زمانہ عربی علوم و آداب کے اعتبار سے خود عربی ممالک میں بھی زیادہ روشن نہ تھا۔ پورے عالم عرب پر ظلمت اور جمود کا دور دورہ تھا۔ یہاں زوال کے پیچھے پیچھے زبان و ادب کا انحطاط بھی چلا آیا تھا اور جس سرزمین نے ایک ڈیڑھ صدی کے عرصہ میں جاحظ، ابو العباس المبرد، ابن العمید، صاحب بن عباد، خوارزمی، بدیع الزمان ہمدانی، ابو الفرج اصفہانی اور ابن قتیبہ جیسے نادرۂ روزگار ادبا، نقاد اور مصنفین پیدا کئے تھے۔ اُس میں اس پانچ سو سالہ کے طویل عرصہ میں سوائے ابن خلدون اور چند ایک دوسرے نفوس کے اور کوئی قابل ذکر نثر نگار نظر نہیں آتا۔

یہ جمود اس وقت ٹوٹا جب تیرھویں صدی کے آغاز میں یورپ نے اپنے حملوں سے عربی ممالک خصوصاً مصر و شام کو جھنجھوڑا، عرب جو اس وقت تک ترکوں کے پشتینی خادموں کی حیثیت سے خواب غفلت میں محو تھے، یکایک بیدار ہو گئے تو دیکھا کہ وہی یورپ جس کو انہوں نے آٹھ سو برس قبل علم و حریت کی روشنی عطا کی تھی اب جدید علوم و فنون سے مسلح ہو کر سامنے کھڑا للکار رہا ہے؛ مصر کو اس زمانے میں [illegible] سربراہ مل گیا، جس نے اس زبوں حالت اور قومی مذلت کے سامنے مایوس ہو کر ہتھیار ڈال دینے کے بجائے دانش و حکمت سے کام لے کر مصری قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، اس نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا کہ یورپ کی اس عظیم الشان قوت کا سرچشمہ وہ علوم و فنون ہیں جن میں [illegible]

[illegible]

کے حصول کے لئے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے مغربی ممالک خصوصاً فرانس اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں بھیجے۔ عرب ممالک میں جدید علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں خود مغربی طاقتوں کے تغلب و تسلط اور اختلاط و اختلاف نے بڑا کام کیا۔ نپولین بونا پارٹ نے جب اٹھارویں صدی عیسوی کے اخیر میں مصر پر حملہ کیا تو اس کے ساتھ جنگجو فوج ہی نہیں آئی بلکہ اس کے جلو میں اہل علم و ہنر کا ایک طائفہ آیا جس نے آتے ہی یہاں نئی تعلیم اور نئی تہذیب کا بیج بو دیا۔ مدرسے قائم ہو گئے، رسالے شائع ہونے لگے، ایک علمی اکاڈیمی کی بنیاد ڈال دی گئی، رصدگاہیں اور تجربہ گاہیں قائم کی گئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک پریس لگایا گیا جس میں وہاں اور عربی ادب کی نایاب کتابیں طبع ہونی شروع ہو گئیں۔ مصر کے بعد اس بیداری میں شام اور لبنان کا نمبر آیا۔ شام میں پہلے ہی پروٹسٹنٹ اور کیتھولک عیسائی مبلغین کا بڑا اثر و نفوذ تھا اور اتفاق یہ کہ انہوں نے اپنے مشن کی تبلیغ و اشاعت کے لئے عربی زبان ہی کو ذریعہ بنایا، مدرسے اور تعلیم گاہیں قائم کیں، یورپی علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں کئے، اخبار اور رسالے نکالے، نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان و ادب کے جسم بے جان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے وہ عروج و ترقی حاصل کی کہ اموی اور عباسی دور کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ عرب ممالک میں عربی زبان اور اس کے آداب و فنون کی نشأۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ اس صدی میں زبان و ادب کی تجدید شروع ہوئی اور بیسویں صدی کے ثلث اوّل تک پہنچتے پہنچتے نقطۂ کمال کو جا پہنچی، اسی سو سال کے اس طویل عرصہ میں عربی کے بے شمار ادباء، انشا پرداز، مصنفین، صحافی، شاعر اور نقاد پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنی علمی اور فکری کاوشوں سے عربی کے علم و ادب میں بہت بیش قیمت اضافے کئے، اور ان میں سے بعض نے اپنے فن کو ایسے بلند مقام پر پہنچا دیا کہ ایک طرف وہ بلندیٔ فکر، دقتِ نظر، وسعتِ علم اور نزاکت بیان میں یورپ کے بڑے بڑے اہل فکر اور ارباب علم و ادب کے مد مقابل ٹھہرے اور دوسری طرف بلاغت ادا، قوت بیان اور نفوذ کلام میں اموی اور عباسی زمانے کے اہل کمال کے مقام کو جا پہنچے، بلکہ کچھ تو ان سے بھی آگے نکل گئے۔ یہ اہل ہنر تعداد میں بہت زیادہ تھے اور ان سب کے ناموں کے استقصار کا یہ موقع نہیں، لیکن ان میں سے ایک سلسلۃ الذہب کا ذکر کرنا ضروری ہے، ہماری مراد اس سلسلہ سے ہے جس کے سرحلقہ عالم اسلام کے مشہور فلسفی رہنما اور اتحاد المسلمین کے سب سے پہلے داعی: جمال الدین افغانی تھے، جنہوں نے اپنی بلندیٔ فکر، قوت عزم اور شجاعت نفس سے دلوں میں نئے خیالات، نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کر دیا اور اپنی پُر اثر شخصیت سے عالم عرب کو بیدار کرنے میں وہ کام کیا جو بڑی بڑی جماعتیں اور ادارے نہ کر سکتے، وہ صرف ایک مصلح اور معلم ہی نہ تھے بلکہ افغانی الاصل ہونے کے باوجود عربی زبان کے اعلیٰ انشا پرداز تھے، مصر میں آٹھ سال رہنے کے بعد جب انہیں وہاں سے نکالا گیا تو پیرس میں انہوں نے اپنے جانشین اور شاگرد خاص مفتی محمد عبدہ کے ساتھ مل کر ایک عربی رسالہ العروۃ الوثقیٰ جاری کیا، جو اپنے زورِ بیان اور قوت انشاء میں ضرب المثل تھا۔

ان کے جانشین مصر کے مشہور عالم، مصلح، ادیب اور انشا پرداز مفتی محمد عبدہ تھے۔ جنہوں نے نہ صرف علمی اور تعلیمی حلقوں میں اپنی دور رس فکر اور جاندار فکر سے ایک انقلاب پیدا کیا بلکہ عربی زبان کی اصلاح و ترقی میں بھی ایک مجددانہ کارنامہ انجام دیا۔ اور علمی اور اصلاحی مضامین کی ادائیگی کے لئے ایسے منطقی اسلوب کا نمونہ پیش کیا اور وہ ستھری اور نکھری ہوئی زبان پیدا کر کے دکھائی کہ ان کے بعد آنے والوں کو اس راستہ سے ہٹنا دشوار ہو گیا۔ اردو ادب و انشاء میں جو مقام اور جو موقف مولانا شبلی کا تھا، عربی زبان و ادب میں وہی مقام مفتی محمد عبدہ کا تھا، اور جس طرح شبلی کے مقالات آج بھی انشاء اور مقالہ نگاری میں ایک اعلیٰ نمونہ کا کام دیتے ہیں۔ اسی طرح عربی میں آج جو شخص خالص اسلامی موضوع پر اچھی زبان میں کوئی چیز لکھنا چاہے تو اسے تفسیر المنار کے اجزا اور رسالۃ التوحید وغیرہ کے مطالعہ سے کافی مدد ملتی ہے ــــ پھر مفتی محمد عبدہ کے شاگردوں اور جانشینوں کا سلسلہ چلا، اور جن لوگوں نے ان کی صحبت و مجالست سے فائدہ اٹھایا ان کی تعداد تو خدا ہی جانتا

ہے، لیکن جن اصحاب نے ان سے خاص طور پر اکتساب فیض کیا اور ان کی علمی اور ادبی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیا وہ تین تھے، اول مصر کے مشہور عالم، مفسر اور ادیب سید رشید رضا، دوم شام کے نامور سیاسی لیڈر اور مجاہد وطن نجاہد اور اپنے وقت کے سب سے بڑے عربی نثر نگار امیر شکیب ارسلان اور سوم شام کے مستند لغوی اور عربی کے بے مثال مقالہ نویس عبدالقادر المغربی۔

عالم عرب کی مذکورہ بالا علمی اور ادبی شخصیتوں کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ یہی وہ سلسلۃ الذہب تھا جس کے نہ صرف علمی و فکری اثرات ہندوستان تک پہنچے بلکہ اس ملک میں عربی زبان کے نشر و احیاء کا جہاں جہاں بھی غلغلہ بلند ہوا، وہاں اسی حلقہ کے طریقہ و اسلوب بیان نے نمونہ کا کام دیا۔ اور اس کی کچھ وجوہات یہ تھیں کہ اس حلقہ کے سرخیل جمال الدین افغانی کی شخصیت آفاقی تھی اور ان کا مشن عالمگیر تھا۔ انھوں نے جب وحدت اسلامیہ کی دعوت پیش کی تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ پورے عالم اسلام میں اس کا آوازہ نہ گونجتا اور وہ مصر یا ترکی میں محصور ہو کے رہ جاتی۔ اس لئے جہاں جہاں "العروۃ الوثقیٰ" پہنچا وہاں افغانی اور محمد عبدہ کا اسلوب نگارش بھی پہنچا۔ پھر اس حلقہ کے بیشتر افراد صرف ادیب اور شاعر ہی نہ تھے اور نہ محض صحافی تھے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عالم دین اور واقف شریعت بھی تھے، آج ہندوستان میں کتنے ہی اہل علم ایسے ہوں گے جو سید رشید رضا کو صرف ایک مفسر قرآن اور مفتی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان اور عرب کے علمی اور ثقافتی حلقوں میں جب باہمی روابط پیدا ہوئے اور کتب و رسائل کا تبادلہ ہونے لگا تو عربی ادباء اور اہل قلم کے اسی حلقہ کے نتائج افکار ہندوستان میں زیادہ پھلے پھولے اور انہی کی تحریریں اس ملک میں زیادہ رائج اور مقبول ہوئیں ——— یہی وجہ ہے کہ یہاں متقدمین میں مولانا شبلی، مولانا عبدالحمید فراہی اور عبدالحی لکھنوی وغیرہ، اور متاخرین میں سید سلیمان ندوی، اور ندوۃ العلماء کے دوسرے اساتذہ اور اصحاب قلم پر عربی ادب و انشاء کے اسی افغانی سکول کا پرتو پڑا۔

اس افغانی سکول کے طریقہ و اسلوب کی خصوصیات پر تفصیلی گفتگو کا تو یہ موقع نہیں مختصراً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس میں تین چیزیں سب سے نمایاں نظر آتی ہیں:۔ ایک صحت زبان اور فصاحت کلام، اس مدرسۂ علم و ادب کے ایک ایک فرد کی زبان اس قابل ہے کہ اسے عربی محاورہ کی صحت کے لئے بطور سند کے پیش کیا جا سکے۔ جزوی مسامحتیں اور معمولی فروگزاشتیں کس سے سرزد نہیں ہوتیں اور کوئی بشر ان سے کہاں بچ سکتا ہے لیکن ان سے قطع نظر جو محاورہ یا ترکیب سید رشید رضا، امیر شکیب ارسلان یا عبدالقادر مغربی کے قلم سے نکلا ہے وہ آج زبان میں اتھارٹی کا کام دیتا ہے دوسرے استرسال (سلاست اور روانی) اور وضاحت کلام، محمد عبدہ اگرچہ موقع و محل کی مناسبت سے کبھی کبھی مسجع اور قافیہ بند عبارت بھی لکھ لیتے تھے اور خوب لکھتے تھے، لیکن ان کا عام اسلوب سلیس اور رواں تھا، پھر امیر شکیب ارسلان تو استرسال کے بادشاہ تسلیم کئے گئے، وہ بھی اگرچہ کبھی کبھار اپنے مقدموں اور دیباچوں میں بڑی چابکدستی سے سجع بندی کرتے تھے، لیکن ان کے عام کلام میں آبشاروں کی سی روانی اور موج دریا کا سا بہاؤ ہوتا تھا۔ اور اس فن میں عربی زبان کی پوری تاریخ میں شاید ہی کوئی ان کا مد مقابل ہو۔ اور ان سب کے کلام میں جو چیز مشترک نظر آتی ہے وہ سادگی اور وضاحت ہے، ان کی بڑی بڑی تصنیفوں سے لے کر چھوٹے چھوٹے مقالوں تک کہیں عبارت میں کوئی ٹیڑھ، ترکیب میں کوئی پیچیدگی اور معانی میں کوئی ابہام و تعقید نظر نہیں آتی۔ تیسرے وہ اسلامیت اور وہ جذب و خلوص جو ان سب کے کلام میں روح کی طرح جاری و ساری ہوتا تھا۔ اور یہ وہ صفت ہے جو اس حلقہ سے باہر لکھنے والوں میں بہت ہی کم نظر آتی تھی۔

ادب و انشاء کے افغانی سکول کی یہ تمام خصوصیات ندوۃ العلماء کے اس علمی و ادبی ماحول پر پوری طرح چھائی ہوئی تھیں جس میں استاد مسعود عالم ندوی نے عربی زبان و ادب کی تکمیل کی۔ یہیں سے ان کا عربی اسلوب تیار ہوا، اور اپنے اساتذہ اور پیش روؤں کی طرح انھوں نے بھی یہ خصوصیات اپنے اندر جذب کر لیں اور عربی انشاء میں وہ قدرت اور سلیقہ بہم پہنچا لیا کہ [illegible] تک جب کہ ندوہ میں آئے ہوئے انہیں دو ہی سال ہوئے تھے، وہ الزہراء جیسے عربی کے بلند پایہ ماہوار رسالوں میں اپنے مضامین چھپوانے لگے ——— لیکن جس چیز نے ان کے فن اور ہنر کو زیادہ نکھارا اور ان کے اسلوب کو مزید جلا بخشی

اور اس میں فصاحت و بلاغت کا وہ جوہر پیدا کیا جس نے انہیں عرب کے زبان آور صف کی صف اول میں لا کھڑا کیا، وہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کا فیضِ صحبت تھا، ڈاکٹر ہلالی اگرچہ اس حلقہ میں نہیں آتے جس کا ذکر اوپر ہوا لیکن اس حلقہ کی زبان اور اسلوب بیان کی تمام صفات نہ صرف ان کی انشاء و تحریر میں بدرجۂ اتم موجود تھیں بلکہ ان کی عام گفتگو اور کلام کا انداز بھی وہی تھا۔ ان کی روزمرہ کی بول چال زبان کے اعتبار سے سند تھی اور ان کے طرز انشاء میں وہی سلاست، سہولت اور روانی تھی چنانچہ ڈاکٹر ہلالی کی تین سال کی صحبت و معاشرت نے بہت جلد استاذ مسعود الندوی کی عربی انشاء کا ایک خاص طرز پیدا کر دیا اور اس میں وہ انفرادیت اور خصوصیت پیدا کر دی جو کم اہل قلم میں نظر آتی ہے۔

استاذ مسعود الندوی نے عربی زبان میں اپنی زندگی میں جو کچھ لکھا، اُسے تین ادوار پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور (۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک) وہ تھا جس میں انہوں نے چار سال عربی رسالہ "الضیاء" ایڈٹ کیا۔ اس عرصہ میں ان کا اوڑھنا بچھونا عربی ہوتا تھا، عربی ہی پڑھتے اور عربی ہی میں لکھتے تھے۔ خود کہتے تھے کہ ان چار سالوں میں میں نے اردو کی کوئی کتاب اور کوئی رسالہ اٹھا کے نہ دیکھا اور اگر میری اپنی زبان نہ ہوتی تو اس کا دامن شاید ہاتھ سے چھوٹ ہی جاتا۔ "الضیاء" کے ابتدائی سالوں میں ڈاکٹر تقی الدین ہلالی ندوہ میں موجود رہے، اس اثناء میں ایڈیٹر "الضیاء" کا دستور یہ ہوتا تھا کہ نہ صرف اپنے مضامین اور شذرات، بلکہ رسالہ کے پورے مندرجات شائع ہونے سے قبل ڈاکٹر صاحب کو پڑھ کر سناتے اور وہ ان کی اصلاح کرتے تھے، لکھنے والے چونکہ سب عجمی نژاد ہوتے تھے اس لئے اصلاح کا یہ کام خاصا لمبا ہوتا تھا۔ آخری دو سالوں میں ڈاکٹر ہلالی ہندوستان سے باہر چلے گئے، اور اصلاح کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ لیکن استاذ مسعود کہتے تھے کہ ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ رسالہ کے پہلے دو سالوں میں باوجود اصلاح ہو جانے کے نحو و لغت کے سُقم رسالے میں رہ ہی جاتے، اور بعد کے دو سالوں میں جب کہ کوئی اصلاح نہیں ہوتی تھی، رسالہ میں زبان کے اسقام بہت کم بلکہ بمنزلۂ صفر رہ گئے۔ استاذ مسعود "الضیاء" میں "سیر الحوادث، نظرات، عالم الادب" کے مستقل عنوان خود لکھتے تھے اور اس کے علاوہ ان کا ایک آدھ مضمون تقریباً ہر رسالہ میں شامل ہوتا تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ "الضیاء" کے تمام مقالہ نگاروں میں خود ایڈیٹر "الضیاء" کی زبان ہی سب سے اعلیٰ اور ممتاز ہوتی تھی۔ استاذ مسعود نے ڈاکٹر ہلالی کی سرپرستی میں رسالہ "الضیاء" میں جو کام کیا اس سے ان کے کلام میں بے حد پختگی آ گئی، اور ان کی عربی نگارش کا ایک خاص نہج پیدا ہو گیا۔ دوسرا دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک کا ہے، جس کا بیشتر حصہ انہوں نے پٹنہ کی اورینٹل لائبریری میں کیٹلاگر کی حیثیت سے گزارا۔ اس اثناء میں ان کے پاس عربی رسائل و جرائد برابر آتے تھے اور انہیں بھی لکھنے پڑھنے کی بہت فرصت میسر ہوتی تھی، اس لئے ان میں متصلاً مضامین لکھتے تھے، غالباً اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ عرصہ قبل انہوں نے مصر کے مشہور صحافی اور اہل قلم محب الدین الخطیب کی خواہش پر ہندوستان کی دو تاریخیں عربی میں لکھیں، ایک "غابر مسلمی الهند وحاضرهم" (ہندوستانی مسلمانوں کا ماضی اور حال) جو ہندوستان کی عام سیاسی اور ثقافتی تاریخ تھی اور ابھی تک شائع نہیں ہو سکی، دوسرے ہندوستان میں دعوت اسلامی کی خاص تاریخ جس کا نام پہلے "غربة الاسلام فی الهند" رکھا گیا لیکن بعد میں اسے "تاریخ الدعوة الاسلامية فی الهند" کر دیا گیا اور اس کا ایک خلاصہ ایک عرصہ ادھر "نظرة اجمالية فی تاریخ الدعوة الاسلامية فی الهند وباکستان" کے نام سے مصر سے شائع ہوا ــــــ تیسرا دور ۱۹۴۴ء کے بعد سے لے کر ان کے آخری زمانہ تک کا ہے، جس میں انہوں نے تصنیف و تالیف اور مقالہ نگاری کم کر دی، اور جماعت اسلامی کے اردو لٹریچر کے ترجمہ و اشاعت کے کاموں میں ہمہ تن مشغول ہو گئے، اس زمانے میں ان کے قلم سے نصف درجن کے قریب رسالے اور پمفلٹ ترجمہ ہو کر شائع ہوئے اور اس سے تقریباً دگنے رسالوں اور کتابوں کے ترجموں کی انہوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اصلاح تہذیب کی اور انہیں زیور طباعت سے آراستہ ہونے کے قابل بنایا، اس کے ساتھ ساتھ مصر کے عربی رسالوں: المسلمون، الدعوة، منبر الشرق اور الرسالة وغیرہ میں انہوں نے کچھ مضامین لکھے ــــــ ان کی تصنیف و تالیف کے ان تینوں زمانوں میں ان کا اسلوب نگارش اپنی تمام خصوصیات اور امتیازی صفات کے ساتھ برقرار رہا، اور اس میں صرف اتنا تغیر ہوا کہ شروع زمانہ میں جہاں [illegible]

تھا وہاں سن و سال میں ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں متانت، لطافت اور سہولت کا پہلو غالب آتا گیا، اور ان کے آخری زمانوں کے مضامین بہت سنجیدہ، نہایت شستہ اور بے حد سلیس ہو گئے۔

استاذ مسعود الندوی کے اسلوب نگارش کی چند نمایاں صفات تھیں جن کا مصدر و منبع اتفاق اور عہد جدید کے اسی سلسلۂ ادباء کا طرز انشاء اور اس کی وہ مجملہ خصوصیات تھیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ لیکن یہاں ان پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

ان کے اسلوب کی پہلی اور سب سے نمایاں صفت تھی۔ زبان کی صحت، محاورات کا صحیح استعمال، فصیح الفاظ کا انتخاب اور بلیغ تراکیب سے عبارت کی آرائش، زبان و محاورہ کے معاملہ میں وہ تقویٰ کے اس اعلیٰ مقام پر فائز تھے جہاں ایک مشتبہ اور مشکوک چیز کا استعمال بھی حرام سمجھا جاتا ہے۔ جس لفظ یا ترکیب میں ذرا بھی شک ہوتا اسے استعمال نہیں کرتے تھے، اور اس کی بجائے ایسا لفظ یا ترکیب لے آتے جس کی فصاحت کا یقین ہو۔ ایک دفعہ اپنے ایک شاگرد سے کہنے لگے کہ اگر زباندانی میں کوئی مقام حاصل کرنا ہے تو یہ اصول بنا لو کہ جس لفظ و ترکیب کی صحت کا یقین کامل حاصل نہ ہو اس میں ہمیشہ شک کرو اور بغیر اس کی تحقیق کئے اسے کبھی استعمال نہ کرو۔ حد یہ تھی کہ جب اپنے تلامذہ کے مضمونوں اور ترجموں کی اصلاح بھی کرنے بیٹھتے تو سب سے پہلے قاموس، اساس البلاغۃ، المصباح المنیر اور مختار الصحاح وغیرہ عربی لغت کی یہ سب کتابیں میز پر رکھوا دیتے، اور اصلاح کرتے وقت جس لفظ میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا، پاس بیٹھے ہوئے شاگرد سے کہتے کہ لغت میں دیکھو اور پڑھو، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں زبان و محاورہ کی غلطیاں بہت ہی کم ہوتی تھیں اور اسی کو دیکھ کر عرب کے فصحاء اور اہل زبان تعجب کرتے تھے اور انہیں اس پر خراج تحسین ادا کرتے تھے، اگرچہ اس ملک ہندوستان اور خود ندوہ میں ان کے علاوہ اور بھی پختہ کار صاحب قلم موجود تھے اور ہیں لیکن مولانا محمد ناظم صاحب ندوی (پرنسپل جامعہ عباسیہ، بہاولپور) کی روایت ہے کہ ابوالحسن محمد البشیر الابراہیمی سے جب اس بارے میں ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ مسعود الندوی اصحهم لغة (مسعود الندوی کی زبان ان سب سے صحیح ہوتی ہے)۔ زبان و محاورہ کی صحت کے بارے میں ان کا یہ اہتمام صرف عربی کی حد تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ ان کے جاننے والوں کو معلوم ہے کہ وہ اردو اور انگریزی تک میں اس غیر معمولی اہتمام کے پابند تھے، انگریزی اخبار اسٹیٹسمین وہ اس لئے پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے کہ زبان کے اعتبار سے وہ اس کا معیار ملک کے دوسرے انگریزی اخباروں سے بہت اونچا سمجھتے تھے۔ اردو کے عام اور کثیر الاستعمال مفردات تک میں ان کی تحقیق و تدقیق کی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ کہنے لگے، میں نے مولانا مودودی کے کسی مضمون میں اس قسم کی ترکیب دیکھی کہ "اس چیز کو فلاں امر سے کافی نقصان پہنچا" یہاں لفظ "کافی" کا استعمال "بہت" کے معنوں میں کچھ کھٹکنے لگا۔ مولانا مودودی سے ملاقات ہوئی تو ان سے ذکر کیا کہ اس جملہ میں "کافی" کا استعمال کیوں کر فصیح ہے، انہوں نے فرمایا کہ دہلی کی زبان میں یہ لفظ "بہت" کے معنی میں عام استعمال ہوتا ہے میں نے کہا: میں یوں نہیں مانوں گا، اندر جا کر والدۂ محترمہ سے دریافت کیجئے، ہم ان کی زبان کو سند تسلیم کرتے ہیں۔ اگر وہ اسے صحیح کہہ دیں تو پھر ٹھیک ہے، چنانچہ مولانا اندر گئے، استفسار کیا اور واپس آ کے بتایا کہ وہ بھی اسے صحیح بتاتی ہیں، تب میں نے یقین کیا۔ ایک موقع پر کہنے لگے کہ پنجابی زبان کا لفظ "چوکس" اب اس کثرت سے عام ہو گیا ہے کہ اردو کے اہل قلم بھی اسے استعمال کرنے لگے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر کہنے لگے کہ پنجابی زبان کا لفظ "چوکس" اب اس کثرت سے اردو کے کلام میں استعمال ہونے لگا ہے کہ میں نے فلاں صاحب کو لکھ دیا ہے کہ بھئی! لاکھ بیچو چلاؤ، یہ "چوکس" تو اب اردو میں گھسا ہی چاہتا ہے! اسی صحبت میں کہا کہ فلاں صاحب عاصم میاں کو خط لکھتے ہیں تو "بتلائیے! کیا حال ہے؟" خدا جانے یہ "بتلائیے" کیا بلا ہے؟ —— ایک دوسری صحبت میں کہا کہ ماہر القادری کا صاحب کا وجود بہت غنیمت ہے جو "فاران" میں لٹھ لئے بیٹھے ہیں۔ ایک بار دریافت کیا گیا کہ زبان و محاورہ کی جن غلطیوں کی وہ نشاندہی کرتے ہیں۔ ان سے کیونکر بچا جائے اور اس غرض کے لئے کس کتاب کا مطالعہ مفید رہے گا، تو فرمایا کہ ایسی کوئی کتاب تو اردو میں موجود نہیں جیسی عربی میں لغۃ الجرائد اور تذکرۃ الکاتب وغیرہ ہیں۔ اس کا علاج بس یہ ہے کہ آپ ایک عرصہ اردو کے صرف مستند اہل قلم کی تحریروں کا مطالعہ کریں اور اس دوران میں اردو کی کوئی دوسری کتاب یا رسالہ نہ پڑھیں۔ ان مستند نثر نگاروں کی فہرست پوچھی گئی تو مثال کے طور پر چند نام بتائے: علامہ شبلی، سید سلیمان

ندوی، عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالاعلیٰ، ڈاکٹر عبدالحق، ماہرالقادری۔ وغیرہ

کوئی شک نہیں کہ اردو زبان و ادب میں خود ان کا مقام بھی بلند تھا۔ وہ اگر عربی میں لکھنے پڑھنے کو اپنا مستقل مشغلہ نہ بناتے تو انہوں نے جس نہج پر اردو انشاء پردازی کی ابتدا کی تھی (جس کا ایک نمونہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے مضمون "دوست کی یاد میں" میں اُن کے ایک خط سے پایا جاسکتا ہے) تو آج وہ خود اردو کے ایک بڑے صاحبِ قلم ہوتے اور مذکورہ بالا اصحاب کی صف میں پائے جاتے — پھر بھی اردو میں جو تالیف و تصنیف کرتے اس میں زبان کی صحت کا حتی الوسع خیال رکھتے، ان کی کتاب "دیارِ عرب میں" کے مقدمہ میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے اردو کے اس روزنامچہ کی اشاعت سے پہلے بھی انہوں نے اس کی زبان و محاورہ کے باب میں مشورہ لے لینا ضروری خیال کیا۔ یہ کیفیت ان کی اردو زبان کے معاملے میں تحقیق و احتیاط کی تھی جو ایک تو ان کی اپنی زبان تھی دوسرے اس کو انہوں نے اپنے علمی مشاغل میں ثانوی زبان کا درجہ دے رکھا تھا۔ اسی پر قیاس کر لیجئے کہ عربی کے معاملے میں ان کی تحقیق و تدقیق اور حزم و احتیاط کا کیا عالم ہوگا۔ عربی زبان میں ان کی نگاہ تحقیق و تنقید اتنی دور تک پہنچتی تھی کہ شیخ احمد سکندری اور محمد کرد علی جیسے چوٹی کے اہلِ علم بھی ان کا ہدفِ تنقید بننے سے نہ بچ سکے "لغات جدیدۃ" کے شروع میں استاذ مسعود الندوی کا تحقیقی مضمون ہر صاحبِ علم نے پڑھا ہوگا۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زبان اور بلاغت کا کیسا اعلیٰ اور نازک ذوق رکھتے تھے اور اس معاملے میں ان کی نظر کس قدر باریک بین تھی۔

دوسری صفت ان کے عربی طرزِ نگارش کی یہ تھی کہ اس میں سلاست اور روانی سادگی اور پرکاری اور وضاحت اور صفائی ہوتی تھی۔ امیر شکیب ارسلان ان کے محبوب ادیب تھے، اور ان کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو استاذ مسعود نے نہ پڑھی ہو اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر کے طرزِ انشاء کا گہرا اثر ان کی تحریر پر پڑا۔ لیکن یہ اثر ایک حد تک تھا۔ کلام میں روانی اور تیز رفتاری کی جو کیفیت امیر شکیب کے کلام میں تھی۔ وہ مسعود الندوی کے کلام میں نہ پیدا ہوئی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ استاذ مسعود الندوی سلسلۂ شبلی و سلیمان ندوی کے جانشین تھے، اور ایجاز و اختصار اس سلسلہ کی اردو تحریروں کا طرۂ امتیاز تھا۔ علامہ شبلی کے قلم سے ایک جملہ بلکہ ایک لفظ زائد از ضرورت نہیں ٹپکتا تھا۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی کی تحریر میں بھی بلا کا اختصار ہوتا تھا۔ "مکاتیب سلیمان" میں ان کی ایجاز نگاری کے جوہر خصوصیت کے ساتھ دید کے قابل ہیں۔ اسی طرح استاذ مسعود بھی اردو میں جو کچھ لکھتے وہ "ما قلّ و دلّ" کا نمونہ ہوتا تھا۔ اور اس فن کا بہترین نمونہ انہوں نے اپنے کتابچہ "عربوں کی قومی تحریک" میں پیش کیا ہے جس میں انہوں نے دریا کو کوزہ میں بند کر کے رکھ دیا ہے اور ایک ایک پیرا اس شان کا لکھا ہے کہ تاریخ عرب کا پورا ایک باب اس میں سما گیا ہے۔

ایجاز و اختصار کے اسی اصول کی طرف رہبری کرتے ہوئے راقم الحروف کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"مرادفات کا آپ نے کثرت سے استعمال کیا ہے تین تین چار تک آپ مترادف جملے لیتے آئے ہیں، میں نے اس میں کمی کر دی ہے، بعض لوگ اسے پسند کرتے ہیں لیکن جو طریقہ ماثوراً مولانا شبلی سے ہم تک پہنچا ہے وہ اس کے برخلاف ہے، مولانا شبلی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ تحریر میں جتنے ایسے جملے نظر آئیں جن کے نکالنے سے مطلب خبط نہ ہو انہیں حذف کر دو، پختہ مشق لکھنے والوں کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ مختصر اور جامع لکھتے ہیں ......"

طبیعت میں مختصر نویسی اور ایجاز نگاری کے اسی میلان کی وجہ سے ان کے استرسال میں وہ برق رفتاری تو نہ پیدا ہوئی جو اُن کے محبوب انشاء پرداز کے کلام کا خاصا تھی، لیکن اس کے کلام کی باقی تمام خصوصیات کو انہوں نے اپنی تحریر میں بڑی خوبی کے ساتھ جذب کیا۔ فصیح و بلیغ استعارات اور تشبیہوں کا جگہ جگہ استعمال، خالص عربی محاورہ اور روزمرہ کی پابندی، شستہ اور شگفتہ الفاظ کا انتخاب، عبارتوں اور ترکیبوں کی فنی تراش خراش علاوہ قرآن کریم کی آیات اور عربی ضرب الامثال سے کلام کی حسن کاری — یہ سب خصوصیات ان کے کلام میں باتیں تمام و کمال موجود

سیں کہ عجمی اور عربی کا فرق کہیں محسوس نہیں ہوتا تھا۔

ایک تیسری خصوصیت ان کے کلام میں تکرار کی تھی، اس تکرار سے ہماری مراد چند خاص الفاظ اور چند مخصوص جملوں کا بار بار استعمال کرنا ہے، یہ ایک طبعی امر ہے اور کم و بیش ہر صاحب طرز ادیب کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہر پختہ ادیب اور صاحب قلم کا ایک خاص اسلوب ہوتا ہے، الفاظ کا ایک خاص ذخیرہ ہوتا ہے فکر و تخیل کا ایک خاص نہج ہوتا ہے جن کی مدد سے وہ کسی موضوع پر خیال آرائی کرتا ہے۔ اور اس کے کلام میں لازماً چند الفاظ اور چند جملے ایسے ملتے ہیں جو اس کے قلم سے بار بار غیر ارادی طور پر نکل جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے مولانا شبلی کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے، انہیں معلوم ہے کہ ان کی تحریر میں کچھ الفاظ اور کچھ فقرے ایسے ملتے ہیں جن کا وہ بار بار اعادہ کرتے ہیں۔ اور انہی سے ان کے کلام میں ایک خاص حسن اور پرکاری پیدا ہوتی ہے مثلاً غمزہ ناز، سرمایۂ افتخار، شباب و مستی، رنگ، داستان، تم جانتے ہو، تم نے دیکھ لیا، تم غور کرو، قوم کی بد مذاقی کا یہ عالم ہے، قوم کی بد مذاقی اب اس حد تک پہنچ گئی ہے وغیرہ، وغیرہ۔ استاذ مسعود الندوی بھی چونکہ اپنی ایک منفرد طرز کے مالک تھے اس لئے ان کے کلام میں بعض خاص الفاظ اور جملوں کا تکرار اس کثرت سے ملتا ہے کہ اہل نظر کے لئے ان کے کلام کا پہچاننا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ "هٰذا و" - عربی میں نئی بات شروع کرتے ہوئے "هٰذا" کا لفظ کہتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بات تو ختم ہوئی، اب دوسری بات یہ ہے کہ .... اس کا استعمال وہ کثرت سے کرتے تھے، ان کا شاید ہی کوئی مضمون یا کوئی طویل مکتوب ایسا ہوگا جس میں یہ لفظ نہ آیا ہو، مثالیں:۔ هذا، وأحسبني قد اديت الامانة۔

هذا، ولولا الحديث ذو شجون......

هذا، وان ملك الحبشة لا يعامل سكانها المسلمين عدلاً ورحمةً ......

هذا، والفضل كله لمحررها الشاب النشيط الذي

هذا وبعث صلة" ......

۲۔ "ايّما" (کیسا ہی!) عربی زبان میں یہ لفظ عموماً تعجب و تحسین کے موقع پر بولتے ہیں، استاذ مسعود کی تحریروں میں یہ لفظ بھی جگہ جگہ ملتا ہے، مثلاً:۔ احتفلت الفرس منذ أشهر بالفردوسي ايّما احتفال (ایرانیوں نے فردوسی کی کیا ہی یادگار منائی ہے)

وجال اخوانا من معين اللغة ايّما ارتواء

۳۔ "قل لي بربك" (واللہ بتائیے!) عربی میں تعجب و تاکید کے مقام پر کہتے ہیں، استاذ مسعود نے یہ جملہ بھی اپنی عبارتوں میں کافی استعمال کیا ہے: فقل لي بالله ماذا يكون جوابه؟ ......

فقل لي بربك ايها القارئ، كيف السبيل إلى التخلص من هذا البلاء......

وقل لي بالله ماذا يكون مصير الطالب المسكين الذي لا يعرف شيئاً

۴۔ بذل الجهد المستطاع (حتی الوسع کوشش کی):۔ استاذ کے کلام میں اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں!

هذا ونحن باذلون الجهد المستطاع أن لا تتعطل المجلة ولا ينقطع حبل حياتها...... ("الضیاء" ۳۳ء)

هذا ونحن باذلون الجهد المستطاع أن تظهر مجلتنا "الهلال" بأسرع ما يمكن ...... (راقم کے نام ایک خط میں ۴۸ء میں)

۵۔ مُثقل كاهله بأعباء العمل (اس کے کاندھوں پر کام کا بڑا بوجھ ہے):۔ "الضیاء" کے آخری عدد کے آخری صفحہ پر لکھتے ہیں:۔ نقصد بهذا الاعتذار من المجلة وكاتبها المثقل كاهله بأعباء التاريخ وصاحب المطبعة (ہم یہ پرچہ اس حالت میں نکال رہے ہیں کہ رسالہ، مطبع اور کاتب کے قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے)۔ عراق سے ۴۹ء میں راقم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: هذا والأخ محمد عاصم

مُشتغلاً كاهله بأعباء من الاشغال المتعددة

۵۔ كان بودّنا (ہماری خواہش تھی کہ ”الضیاء“ ہی کے متعلق رسالے میں لکھتے ہیں)، وكان بودّنا أن نطبع المجلّة بالمصروف (ہماری خواہش تھی کہ رسالہ ٹائپ میں طبع کریں)

وكذلك بودّنا أن يعرف صديقنا الأديب الألمعي الأستاذ محمد ناظم شيئاً من مجهوداته ......

۶۔ ایک زمانے میں وہ اپنی ہر کتاب اور ہر مضمون یا تحریر کے نیچے لکھتے تھے وكتبه على عجلٍ وتزاحم اشغال (یہ خط یا مضمون بہت جلدی اور مصروفیت میں لکھا گیا ہے) اور ایک خط میں تو انتہا کر دی، عراق سے راقم کے نام ایک عربی خط کے آخر میں لکھا، وكتبه على عجلٍ وتلاحم اشغالٍ وشغل بال، فالرجاء أن لا تبالي بما فيه من الهفوات (یہ خط میں نے بہت جلدی، مصروفیت اور کام کی زیادتی کے دوران میں لکھا ہے، اگر کوئی فروگزاشت ہو گئی ہو تو پروا نہ کرنا)

یہ تو ان کے اپنے الفاظ اور کلمات تھے جو وہ تکیۂ کلام کے طور پر لاتے تھے، ان کے علاوہ قرآن کریم کی چند آیات ایسی تھیں جنہیں وہ موقع موقع سے استعمال کر کے اپنے کلام میں خاص حسن و رونق پیدا کرتے تھے۔ مثلاً

۱۔ وإن تعجب فعجب قولهم (بڑے تعجب کی بات تو اُس کا یہ قول ہے ......) استاذ مسعود کو جب بھی اپنے کلام میں اسے استعمال کرنے کا موقع ملتا، ضرور استعمال کرتے، مثلاً: وإن تعجب فعجب افتتان كثيرٍ من ناشئة العرب بشعر (تاغور) (حیرت تو اس پر ہے کہ عربی نوجوان ٹیگور کی شاعری پر سر دھنتے ہیں لیکن ... .)

۲۔ أعاد وأبدأ أفي ذكره (اس کا بار بار ذکر کیا)، لعمري من شأنها أن يعاد ويُبدأ في ذكرها ۔ [الضیاء]

۳۔ أتى على بنيانه من القواعد (اس چیز کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا) : أتى فيه على القاديانية من القواعد۔ [”]

۴۔ تبدّلت الأرض غير الأرض (ارض و سما ہی بدل گئے) أقام استاذنا الجليل ثلاث سنين في دار العلوم فتبدّلت الأرض غير الأرض وتغيّر الجو. ...
(ڈاکٹر ہلالی ندوہ میں تین سال رہے، اور ندوہ کے ارض و سما ہی بدل گئے .....)

۵۔ لحاجةٍ في نفس يعقوب (اپنی ذاتی اغراض کی خاطر): قرآن کریم کا یہ جملہ ان کی تحریروں میں زیادہ تو نہیں استعمال ہوا، لیکن ہم نے یہ نگینہ صرف انہی کے کلام میں جڑا ہوا پایا۔ ولمّا قامت حركة الخلافة في الهند بعد الحرب، استولوا على الهيئة الوطنية لحاجةٍ في نفس يعقوب

یہ محض چند مثالیں تھیں، اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم ان کے کلام سے وہ تمام الفاظ اور جملے نکال کر پیش کر دیتے، جو ان کی خاص VOCABULARY (الضیاء) کا کام دیتے تھے۔ ابن الرومی کا ایک شعر ہے: ما أنسَ لا أنسَ خبّاً فأمورث بِهِ (میں اس نانبائی کو کبھی نہ بھولوں گا جس کے پاس سے میرا گزر ہوا) یہ ترکیب انہیں بہت پسند تھی، اور جب بھی موقع ملتا اسے استعمال کرتے، الضیاء کے ایک مضمون میں لکھا، وما أنس لا أنس ما دبّجته يراعته في حوادث كشمير (امیر شکیب ارسلان نے حوادث کشمیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کو تو کوئی بھول ہی نہیں سکتا)، اور یہی ترکیب جہاں تک ہمیں یاد ہے انہوں نے اپنے کتابچہ ؛ نظرةٌ اجمالية في تاريخ الدعوة الاسلامية میں اس کثرت سے استعمال کی ہے کہ وجدان کو کھٹکنے لگتی ہے۔ علاوہ ازیں استاذ مسعود اپنے آخری زمانے میں اپنے عربی مضمونوں میں ایک جملہ مکرر استعمال کرنے لگے تھے اور وہ یہ تھا، متوخياً الايجاز حسب ما استطعتُ جہاں بھی یہ کہنا ہوتا کہ میں یہ بات حتی الوسیع اختصار سے کہوں گا۔ وہاں یہی ایک ہی جملہ اُٹھا کے رکھ دیتے اور یہ کبھی کبھی اچھا نہیں لگتا تھا ــــ لیکن اپنے اپنے ذوق کا معاملہ تھا، اور اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اپنے ناقص ذوق کی بناء پر کہا گیا، اور ایک طالب علم اور مبتدی کا ذوق ہی کیا؟ ــــ خلاصۂ کلام یہ کہ ان کے کلام میں چند خاص لفظوں اور ترکیبوں کی ”تکرار“ ضرور ہوا کرتی تھی، اور اس سے جہاں ان کے کلام میں دلآویزی اور حسن پیدا ہوتا تھا، وہاں یہ تکرار ان کی تحریروں میں ایک خصوصیت اور امتیازی صفت پیدا کر دیتی تھی

آخر میں اس امر کا ذکر کر دینا نامناسب نہیں کہ دنیا کی ہر زبان کی طرح عربی زبان میں بھی اہلِ ادب کے دو طبقے رہے ہیں: ایک کلاسیکی ادیبوں کا طبقہ اور دوسرا متجدد ادباء کا۔ آج سے ربع صدی پہلے تک اول الذکر طبقہ کا پلڑا بھاری تھا۔ سید رشید رضا، امیر شکیب ارسلان، الشیخ ناصر الدین، مصطفیٰ صادق الرافعی، صادق عنبر، کرد علی، شیخ احمد سکندری اور اسعاف النشاشیبی وغیرہ جو سب کے سب اول الذکر طبقہ کے نمائندے تھے، کا وہ رعب و دبدبہ ہوتا تھا کہ علمی اور ادبی مسائل میں کسی "ترقی پسند" کو ان کے سامنے سر اٹھانے کی مجال نہ ہوتی تھی۔ ہر چند کہ عربی ادب میں متجددین اور آزاد خیال ادیبوں کا ایک گروہ پیدا ہو چکا تھا اور روز آئے دن کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے رہتے تھے، لیکن ان میں سے جب بھی کسی نے ان اساطین ادب کے ساتھ ٹکر لی، ہمیشہ منہ کی کھائی۔ ادباء کے اس فرقۂ ضالہ کے لیڈر طٰہٰ حسین نے کچھ عرصہ ہوا ایک کتاب "فی الادب الجاہلی" لکھ کر یہ انکشاف فرمایا کہ جاہلی شاعری کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ امرؤ القیس، نابغہ اور عنترہ سب خیالی نام ہیں۔ اور ان سے جو شاعری منسوب ہے وہ اموی دور کی ہے۔ اس بحث کے ضمن میں یہ بات بھی کہہ دی گئی کہ قرآن نے قوم لوط، عاد اور ثمود کے جو قصے بیان کیے ہیں، یہ افسانوی تخلیق ہیں، جن کا مقصد وعظ و نصیحت کرنا اور عبرت دلانا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سو فیصدی صحیح ہوں۔ اس پر مصطفیٰ صادق الرافعی نے پھر کر ایسے معرکے کے مضامین لکھے اور اس فکر باطل کا ایسا تار و پود بکھیرا کہ طٰہٰ حسین کو جان کی خیر منانی پڑی ـــــ لیکن قرآنی اور کلاسیکی ادب کے یہ سب علمبردار ایک ایک کر کے اٹھتے گئے اور آج اس طبقہ کے باقیات الصالحات میں معدودے چند نفوس ہی باقی رہ گئے ہیں، مثلاً مصر میں احمد حسن الزیات، محب الدین الخطیب، الجزائر میں محمد البشیر الابراہیمی، شام میں عبدالقادر المغربی۔ عراق میں: تقی الدین الہلالی وغیرہ۔ اس کے برعکس تجدد پسند اور مغرب زدہ ادباء اور نثر نگاروں کا وہ طبقہ جس کے سربراہ طٰہٰ حسین، احمد امین، زکی مبارک، عباس محمود العقاد، عبدالرحمان بدوی، محمود تیمور وغیرہ تھے اور ہیں، روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے اور آج یہ عالم ہے کہ عربی کے رسالوں، جریدوں یا کتابوں کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، پچانوے فی صدی لٹریچر انگریزی یا فرنچ کا ترجمہ معلوم ہوگا، اور اس میں قرونِ اولیٰ کی زبان کی سی حلاوت، دلکشی اور سحر آفرینی نہیں ملے گی۔ ڈاکٹر ہلالی ہی کا قول ہے کہ آج پوری کی پوری عرب قوم مترجم بن کر رہ گئی ہے۔ ہمارے استاذ مسعود الندوی رحمہ اللہ اسی کلاسیکی طبقۂ ادباء کے رکنِ رکین تھے اور سرزمین ہند و پاک میں اس کے ایک سرگرم اور پرجوش نمائندہ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی وفات سے اس طبقہ کو جو پہلے ہی قلتِ رجال کا شکار تھا عظیم الشان نقصان پہنچا ہے اور اس پر اہلِ دل کا دل جتنا کڑھے کم ہے۔

بقیہ: نیا انقلاب ص ۲۶

صدی کے ابتدائی تیس سال بعد یعنی ۱۳۵۰ھ اور اس کے بعد دو خطروں کے درمیان گھر گئے تھے۔ ان کے دونوں طرف دہکتی ہوئی آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایک طرف متحدہ قومیت اور ہندوستانی وطنیت کا خطرناک تصور تھا۔ اور دوسری طرف مسلم قومیت کا ضرر رساں طرزِ فکر۔ بعضوں نے پہلے خطرہ کو ترجیح دی اور اس کے چرکے کھائے۔ بعضوں نے دوسرے خطرے کو قبول کیا۔ اور ایسے لوگوں کی اکثریت تھی جو اس آگ میں کود گئے۔ اسلامی تعلیمات پر نظر رکھنے والا ہر صاحب فہم و بصیرت سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں نظریات میں اسلام اور اس ملک میں اسلامی تحریک کے مستقبل کے لیے کیسے شدید خطرات پنہاں تھے۔ پچھلے صفحات میں ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

تصانیف

اسعد گیلانی

ایک بچھڑے ہوئے رفیق کی یاد جب کبھی آتی ہے تڑپا جاتی ہے۔ زندگی کی روزانہ مصروفیات میں کسی کا نام سرسری طور پر دل و دماغ میں گونج جانا علیحدہ چیز ہے لیکن جب وہ نام جذبات کو متاثر کرتا ہوا دل میں گہرے تیر کی طرح پیوست ہو کر رہ جائے اور ذہن کے اور دل کے جذبات کو تمام تر اپنے لئے وقف کرلے تو وہ ایک دوسری نوعیت کی یاد ہوتی ہے۔ ایسے ہی جذبات تھے جن سے متاثر ہو کر مولانا حسرت موہانی نے کہا تھا کہ ؎

نہیں آتی جو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی ۔۔۔ مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

کسی کی ایسی یاد جب آتی ہے تو آدمی کا دل گویا چھلکتا ہوا آبلہ ہو جاتا ہے اور اس کے احساسات دکھتے ہوئے پھوڑے کی طرح ہوتے ہیں جو شدت تنفس سے بھی ٹیس محسوس کرتے ہیں

مولانا مسعود عالم ندوی کی یاد بھی ایسی ہی ایک چیز ہے۔ آدمی روزانہ بیسیوں اموات کی خبر سنتا ہے لیکن اس کے لئے وہ سب "خبریں" ہوتی ہیں۔ بے اثر اور بے گداز۔ لیکن جب کبھی اس کے قریب ترین حلقہ میں کوئی شخص اسے چھوڑ کر جاتا ہے تو اس کی ساری ہستی اس دھکے کو اپنی ہستی پر اثر انداز محسوس کرتی ہے۔ کچھ دن پہلے تک مولانا ہمارے درمیان علم و تحقیق کے موتی بکھیرتے نظر آتے تھے۔ کسی کے وہم میں بھی نہ تھا کہ علم کا یہ چشمہ صافی اچانک تھم جائے گا لیکن آج میں ان کی تصانیف کا تذکرہ کر رہا ہوں اس لئے کہ اب ان تصانیف میں اضافے کے سارے امکانات ختم ہو چکے۔ اب ان کتابوں میں نہ کوئی اضافہ ہوگا۔ نہ کمی ہوگی نہ اغلاط نامے لگے گا اور نہ تبدیلی ہوگی۔ یہ کتب ہمارے اور ہماری نسلوں کے درمیان مولانا کے فکری وجود کی ہمیشہ پرتو نمائندگی کرتی رہیں گی۔

لیکن ان کے فکری وجود کے تعارف سے متصل میں ان کی ہستی کے اس سراپا اخلاص وجود کی بھی کچھ جھلک دکھانا چاہتا ہوں، جو ہمارے درمیان برسوں رہا اور جسے ہم مولانا مسعود عالم ندویؒ کے نام سے جانتے تھے۔

مولانا کی صحبت اٹھانے کا اگرچہ مجھے بہت کم موقع ملا لیکن جس قدر بھی میں نے انہیں دیکھا میں نے ان میں بڑی کشش محسوس کی۔ ان کی ہر ملاقات ان کے بارے میں شخی ہمدری و رشتی طبع کی باتوں کی ہمیشہ تردید کیا کرتی۔ وہ بڑے ملنسار اور متواضع طبیعت کے مالک تھے۔

پہلی بار میں ان کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب دارالعروبہ جالندھر (مشرقی پنجاب) میں تھا۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ ان کا نام میں نے بعض جرائد میں دیکھا تھا اور ان کے تحقیقی انداز تحریر سے متاثر سے زیادہ مرعوب تھا۔ چند گھڑی کی نشست میں میں نے اندازہ کیا کہ مولانا ذرا ہکلا کر لیکن بہت تیز رفتاری سے گفتگو کرتے تھے۔ گفتگو اکثر علمی موضوعات پر کرتے اور خصوصاً عالم عرب سے ان کی واقفیت بڑی وسیع تھی۔ صحت کمزور تھی اور دمہ کا عارضہ لاحق تھا۔ اس وقت ادب کی اونچی دیوار میرے اور ان کے درمیان حائل رہی۔

دوسری بار تب ملاقات ہوئی جب ۱۹۴۹ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ میں شرکت کے لئے وہ کراچی تشریف لائے۔ ان کا ارادہ ممالک عرب کے دورے کا بھی تھا۔ چنانچہ روانگی سے قبل کی تیاریاں پاسپورٹ اور دوسرے لوازمات کے سلسلے میں انہیں کراچی میں اندازاً ۱½ ماہ ٹھہرنا پڑا۔ اس دوران میں مولانا سے بارہا ملاقات ہوئی۔ جہانِ نو کے دفتر میں بھی مولانا تشریف لائے اور ہمیں کام کرتے ہوئے دیکھا۔

جہانِ نو حکومت کی پیہم نوازشات اور سرمائے کی قلت کی وجہ سے صرف عزیمت کے بل پر ہی نکل رہا تھا جسے مولانا نے اکثر محسوس کیا چنانچہ اکثر حوصلہ افزائی فرماتے۔ ان کے مشورے بہت دل بڑھانے والے اور ان کی رائے بہت صائب ہوتی اس لئے کہ اخباری دنیا کا انہیں ذاتی تجربہ حاصل تھا۔

ساڑھے سات ماہ کے دورے کے بعد جب واپس تشریف لائے تو حکیم نصیرالدین صاحب ندوی کے ہاں نظامی دواخانہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں ملاقات کے لئے جانے ہی والا تھا کہ ان کا پیغام پہنچا۔ حاضر ہوا تو ان کی صحت کو پہلے سے بہت بہتر دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے اور بٹھایا۔ اپنے سفر کی باتیں بہت دیر تک بیان فرماتے رہے۔ رخصت ہونے کے لئے اٹھا تو میرے ساتھ باہر تشریف لائے اور دواخانہ کی بیرونی گیلری میں پڑی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور مجھے بھی بٹھا لیا۔

فرمایا "ہم باہمی رفیق اور ایک منزل کے مسافر ہیں اس لئے ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں"۔

عرض کیا "فرمایئے"

کہنے لگے "میرے پاس چند ایک مقامی رفقاء نے آپ کی تحریر کی شدت کی شکایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تحریر میں درشتی اور تیزی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ جس سے مخاطب پر اثر نہیں ہو سکتا جو تبلیغ کے لئے ضروری ہے"۔

میں نے عرض کیا "یہ تو آپ خود ہی دیکھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ پھر تحریر میں بھی ہر شخص کا ذاتی ذوق اور انداز بیان ہوتا ہے۔ اندازِ بیان تو کوئی بدلنے سے رہا۔ البتہ میں حق بات کو بہت زور سے کہنے کا قائل ہوں اور اسے دعوت کا وقار سمجھتا ہوں"۔

فرمانے لگے "میں نے بھی ان حضرات سے یہی کہہ دیا تھا اور یہ بھی کہ میں نے ان کی ایسی کوئی تحریر اب تک دیکھی نہیں۔ کئی ماہ بعد واپس آیا ہوں۔ دیکھ کر ہی رائے قائم کر سکوں گا۔ پھر میں نے ان رفقاء کو تنبیہہ کی کہ جن حالات اور جس جذبے کے تحت یہ لوگ اخبار نکال رہے ہیں آپ کو چاہیئے کہ ان کی ہمت افزائی کریں۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں۔ ان کی بے سروسامانی میں ہاتھ بٹائیں۔ ان کے ساتھ چٹائی پر جا کر بیٹھیں اور کام میں تعاون کریں۔ اسی صورت میں آپ ان کو بہتر طور پر سمجھا اور رکھا سکیں گے"۔

میں نے عرض کیا "میں تو چاہتا ہوں کہ صاحب فہم اور اہل علم رفقاء ہماری رہنمائی کریں۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو ہم تو جیسا کیسا کام بھی ہوگا کئے جائیں گے"۔

فرمانے لگے "آپ اپنا کام کئے جایئے۔ بس حکمتِ تبلیغ پیش نظر رہے۔ باقی رہی حق بات تو اسے چھپانا تو شیطان کا کام ہے حق بات کہنے والے کی آواز میں ہمیشہ زور ہوتا ہے اس لئے کہ حق خود ایک طاقت ہے"۔

پھر فرمانے لگے "بہت دن ہوئے میں نے آپ کا ایک مضمون "اللہ تعالیٰ" الحسنات میں دیکھا تھا جو مجھے بہت پسند آیا تھا اس سے میں نے آپ کی ادبی صلاحیت اور زورِ بیان کا اندازہ لگایا تھا"۔

میں خاموش رہا تو تھوڑی دیر رک کر پھر بولے۔

"مناسب ہو کہ آپ جہانِ نو کے چند تازہ پرچے مجھے دے دیں تاکہ میں انہیں دیکھ لوں۔ ویسے بھی کئی ماہ کی غیر حاضری کی وجہ سے جماعت کے

اخبارات سے بالکل بے تعلق ہوگیا ہوں۔ کوثر گاہے گاہے ملتا رہا ہے۔ "جہانِ نو" دیکھنے کو جی چاہتا رہا۔ اسے جاری کرانے کا بھی بار بار خیال آیا۔ اور سوچا کہ آپ کو خط لکھوں لیکن سفر کی حالت میں نہ ہو سکا۔

مجھے دل ہی دل میں بڑی ندامت ہوئی کہ میں نے ان کے نام اس سفر کے دوران میں اخبار کیوں جاری نہ رکھا۔ یہ صرف تساہل کی وجہ سے ہوا تھا اور کچھ ان کے بار بار بدلنے والے پتوں کی وجہ سے۔

اس کے بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے پھر فرمانے لگے۔

"دیکھئے تحریر میں جس قدر نرمی اور تواضع ہو اسی قدر مخاطب توجہ سے سنتا ہے۔"

میں نے عرض کیا "مولانا یہ تو درست ہے لیکن نرمی کی زیادتی سے جھجک اور تذبذب ٹپکنے لگتا ہے اور بات کا وزن کم ہو جاتا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ مرکز میں بعض حضرات پر مشتمل ایک بورڈ ہو جو ایک طرف تو تحریروں کے لئے کچھ تنقیدی پیمانے اور حدود مرتب کر دے اور دوسری طرف ایسی تحریروں پر احتساب رکھے جو تحریک کے عمومی مزاج کے منافی ہوں۔ اگر ایسا کوئی اہتمام ہو سکے تو میں اپنے ذوق کے ادیبوں کی نمائندگی کے لئے نعیم صدیقی صاحب کا نام تجویز کرتا ہوں۔"

فرمانے لگے "میں جانتا ہوں کہ وہ آپ لوگوں کے سرخیل ہیں۔ ضرورت ہوئی تو میں ان سے بھی گفتگو کروں گا۔"

اس کے بعد جب میں ان کی خدمت میں جاتا رہا اور جب کبھی انہیں کوئی چیز کھٹکتی یا خصوصاً پسند آتی تو وہ بذریعہ خطوط مفید مشورے بھی دیتے اور ہمت افزائی بھی کرتے۔

پروفیسر حسن الاعظمی صاحب کی کسی ابتدائی عربی کتاب پر جہانِ نو میں تبصرہ شائع ہوا تو مولانا نے مجھے لکھا کہ وہ تبصرہ صحیح نہیں تھا اس لئے کہ وہ کتاب اتنی اہمیت کی مستحق نہ تھی جس قدر اسے دی گئی تھی۔

میں نے ایک افسانہ "اسلم مرگیا ہے" چراغِ راہ میں لکھا۔ اس پر مولانا نے مجھے خط میں لکھا کہ ایسا افسانہ دل آزار تھا جس سے کسی کے واپس تحریک کی طرف پلٹنے کی امید کم ہو سکتی تھی اور کٹ جانے کا امکان زیادہ تھا۔ مجھے مولانا کی رائے سے اتفاق نہ تھا۔ چنانچہ میں نے ایک مفصل خط ان کی خدمت میں لکھا۔ جس میں تحریر تھا کہ میرے نزدیک اقامت دین کی جدوجہد کی راہ مسلمان کی زندگی کی آخری راہ ہے۔ اس پر آکر واپس جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جو پورے شعور کے ساتھ آئے اور پھر پلٹ کر جائے۔ وہ اپنے جرم کی نوعیت کے لحاظ سے کسی بھی رقت کا مستحق نہیں اور میں نے یہ افسانہ لکھ کر آمد و رفت کے اس راستے پر کڑا پہرے دار کھڑا کر دیا ہے۔ تاکہ آنیوالوں کو معلوم رہے کہ جانے کا راستہ مسدود ہے۔ اگر تحریک میں آمد و رفت کا راستہ بار بار کے لئے کھلا ہے تو پھر تحریک کا خدا حافظ ہے۔ مولانا نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا مجھے یقین تھا کہ مولانا کم از کم میری نیت کی طرف سے پورے مطمئن ہو گئے تھے۔

پھر ایک بار وہ کراچی تشریف لائے اور چند دن رہ کر واپس تشریف لے جا رہے تھے کہ اچانک کراچی ریلوے اسٹیشن پر ملاقات ہو گئی۔ عاصم صاحب کو دوسرے ڈبے میں بھیج کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ چنانچہ میں کراچی سے ملیر تک اسی گاڑی میں گیا۔ باتیں ہوتی رہیں وہ جنرل نجیب کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ اس سے کچھ امید نہیں ہو سکتی۔ لوگ خواہ مخواہ اس کے بارے میں حسن ظن میں مبتلا ہیں۔ مصر کی سیاسیات پر مولانا نے سیر حاصل گفتگو کی جو تھوڑے ہی دنوں بعد حرف بحرف پوری اتری۔ میں مولانا کی صحت کو بار بار دیکھتا رہا اور ایک بار تو میں نے بے قابو ہو کر ان کی کلائی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بخدا اتنی پتلی کلائی میں نے کسی کی نہ دیکھی تھی۔ نہایت نحیف جثہ۔ بنڈی پہنے ہوتے۔

سر پر مفلر لپٹا ہوا تھا۔ میں ان کی مجاہدانہ اسپرٹ پر حیران تھا۔ وہ اتنی کمزور صحت کے ساتھ بھی کام کا پورا پورا حوصلہ رکھتے تھے۔ پھر ایک عزیز کے ساتھ ہنستے بولتے باتیں کرتے چلے گئے۔ میرا آنے پر میں اتر گیا اور ان کی صحت کی طرف سے ایک بوجھ دل میں لے کر آیا۔ چنانچہ گھر جا کر ان کی صحت کی تشویشناک کمزوری کا ذکر کیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔

دوسری بار وہ شوریٰ کے موقعہ پر تشریف لائے۔ میں روز سوچتا رہا کہ آج جا کر ملتا ہوں۔ ایک صبح دفتر سے سیدھا ان کی قیام گاہ پر جانے کا پروگرام بنا کر تیار ہو رہا تھا جب ان کی وفات کی خبر ملی۔ میں ان کی قیام گاہ پر گیا لیکن یہ تب ہوا جب پنجرہ خالی پڑا تھا اور طائر عالم قدس کی طرف پرواز کر گیا تھا۔

اب ان کی یادگار صرف ان کی کتابیں ہیں۔ جو ہمارے درمیان رہ گئی ہیں یا ان کی وہ پُرخلوص باتیں جو اس وقت تک میرے کانوں میں گونجتی رہیں گی۔ جب تک قوت احساس باقی ہے۔ درج ذیل سطور میں انہیں کتابوں پر ایک سرسری نظر ڈال رہا ہوں

- ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک
- محمد بن عبدالوہاب (ایک بدنام مصلح)
- اشتراکیت اور اسلام
- دیارِ عرب میں
- مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر
- مکاتیب سلیمانیؒ
- الترجمۃ العربیہ حصہ اول و دوم (محمد عاصم صاحب کے ساتھ مل کر مرتب کیں)
- ہندوستان میں دعوتِ اسلامی کی تاریخ (جو زیرِ طبع ہے)

ان کے علاوہ مولانا نے جماعت اسلامی کے لٹریچر کی بہت سی کتب بھی عربی میں منتقل کیں۔ اور چند عربی کتب خود لکھیں۔

یہاں پہلے ان کے ان کاموں (WORKS) کا تذکرہ کرنا ہے جو کتابی شکل میں اردو میں ہمارے سامنے ہیں۔

مولانا کا علمی مذاق خالص مؤرخانہ تھا۔ جو ان کی کتب پر ایک نظر ڈالتے ہی فوراً سامنے آجاتا ہے۔ وہ خود بھی اپنے بارے میں تحریر فرماتے ہیں،

"خاکسار تاریخ کا طالب علم ہے"

(دیباچہ دیارِ عرب)

چنانچہ ہر جگہ ان کا مورخانہ اندازِ بیان، اندازِ فکر اور اندازِ تحقیق ان کی کتابوں کی سطر سطر میں نمایاں ہے۔ وہ واقعات کو بلا حوالہ اور حقائق کو [illegible] کے بیان نہیں کرتے۔ اس معاملے میں ان کا ذوقِ تحقیق و تفتیش بہت بڑھا ہوا ہے۔ اس کے باوجود ان کی تحریر میں وہ خشکی [illegible] جو [illegible] لکھنے والوں کے اِں پائی جاتی ہے۔

[illegible] کے دو دو تین تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس لئے کہ جس محنت و کاوش سے انہوں نے [illegible] محنت کے ساتھ بہت بہتر ہے۔

"ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" مولانا کی وہ کتاب ہے۔ جو انہوں نے انتہائی تحقیق وتفتیش کے بعد مرتب کی۔ اور اس کے لئے انہیں ۲۴ عربی، اردو، اور انگریزی کی کتب کا مطالعہ کرنا پڑا اور وہ سلسلۂ تحقیق اس قدر دراز ہوا کہ اسی دوران میں "محمد بن عبدالوہاب" مرتب ہو گئی۔ اس کتاب کا موضوع سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا شہدائے بالاکوٹ کے بعد کا دور ہے اور ظاہر ہے کہ تحریک کے اس حصے کے متعلق لکھنا جوئے شیر لانے سے متعلق ہو جانا جوکھوں کا کام ہے۔

چنانچہ مولانا مسعود عالم خود لکھتے ہیں کہ:

"اس ہے عمل کا دائرہ عمل نسبتاً الجھا ہوا اور پُرخطر بھی تھا۔ حکومت وقت کے خوف سے معاصر اور آزاد باخبر حلقوں نے کوئی یادداشت محفوظ نہیں رکھی اور تو اور صادق پور میں بھی کوئی معقول تحریری رسالہ موجود نہیں۔ سننے اور دیکھنے والے آنکھیں بند کر چکے اور ایک آدھ واقف کار نظر بھی آئے تو پہلی سختیوں کا رعب دل پر اب تک بیٹھا ہوا ہے عظیم آباد، پٹنہ میں سات سال مسلسل قیام اور ایک مشہور اور قیمتی کتب خانے (خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ) کی تمام آسانیوں کے باوجود مواد فراہم اور تلاش کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور سات آٹھ سال کی مسلسل جدوجہد کے باوجود بعض گم شدہ کڑیوں کا سراغ اب تک نہیں مل سکا" (دیباچہ تحریک اسلامی)

اس کتاب کی ابتدا میں ہی مولانا نے ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک جس کے داعی سید احمد شہید بریلوی تھے اور نجد میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کے فرق کو نمایاں کیا ہے۔ یہ کتاب آٹھ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے اور ہر باب تحقیق وتفتیش کا بہترین مرقع ہے۔ مجاہدین کا مقصد اور مشن۔ سید صاحبؒ کی شہادت۔ خلفاء۔ تبلیغ، مقدمات، ابتلاء وآزمائش کے مراحل۔ ہندوستان کے اندر اس تحریک کا نظام عمل۔ ان کی مطلات، استقامت اور سزائیں۔ اور کامیابی اور ناکامی کے اسباب سب پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب نے ولیم، ڈبلیو، ہنٹر کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا بھی پوری طرح علمی انداز میں محاکمہ اور ازالہ کیا ہے اور تحریک کے متعلق مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بدگمانیوں کے بادل کو بھی پوری طرح چھانٹ دیا ہے۔

اس کے اب تک دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں، لیکن دونوں اغلاط اور طباعتی حسن کے فقدان کا شکار ہیں۔ ضرورت ہے کہ کوئی صاحب ذوق پبلشر اسے زیادہ اچھے انداز میں شائع کرے۔

"محمد بن عبدالوہاب" کا موضوع بھی علمی، تاریخی اور تحقیقی ہے۔ اور اس کتاب کو حقیقت میں "پہلی تحریک اسلامی" کی ضمنی تخلیق کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اسی کتاب کے مواد کی فراہمی کے دوران میں مولانا کو اس تحریک نجد کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی۔ اور پھر اس میں اس قدر دلچسپی محسوس کی کہ اس مواد کو علیحدہ تالیف کی صورت میں مرتب کر دیا۔ اس کتاب میں مولانا نے اس مظلوم لیکن بدنام مصلح محمد بن عبدالوہاب کی پوری سیرت اور دعوت پر تحقیقی روشنی ڈال کر تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ جو وہابی کے نام سے پھیلائی جاتی رہی ہیں۔ اس کتاب کے لئے مولانا نے ۵۰ کتب کا تحقیقی مطالعہ کیا اور ان میں سے اس کتاب کا مواد جمع کیا لیکن پھر بھی ذوق تحقیق کا یہ عالم ہے کہ خود لکھتے ہیں:

"کتابوں کی کمی کے باعث مسودہ مکمل کرنے کی نوبت نہ پہنچی۔ اور جب کچھ لکھا تو کچھ اور کتابیں سامنے آنے پر کافی اصلاح وترمیم کی ضرورت پڑی۔ پھر بھی انتہائی تلاش اور جستجو کے باوجود بعض ضروری اور اہم کتابیں نہ مل سکیں" (دیباچہ محمد بن عبدالوہاب)

اس کتاب کے تین ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ تحقیق و تفتیش کا یہ ایک ایسا عمدہ مجموعہ ہے کہ اس موضوع پر اتنی مبسوط کتاب اردو زبان میں میری نظر سے نہیں گزری۔ اسے مولانا نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں شیخ کے ذاتی حالات۔ تعلیم۔ نشوونما۔ دعوت وفات کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ دوسرے میں اس تحریک کے سیاسی جدوجہد کے پہلو سے بحث کی ہے۔ صلح و جنگ، فتح و معاہدہ اور سیاسی اثرات، تیسرے باب میں شیخ ؒ کی تصانیف اور علمی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں شیخ کی عمومی دعوت اور مسلک سے بحث کی ہے اور پانچویں میں تحریک سے متعلق غلط فہمیوں کا علمی محاسبہ کرکے ان کی تردید کی ہے۔

" اشتراکیت اور اسلام " مولانا کے عمومی اختیار کردہ موضوع " تاریخ " سے کچھ ہٹی ہوئی تالیف ہے۔ لیکن اس کتاب کو دیکھ کر بھی محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کے ذوق و تحقیق نے یہاں بھی پورا پورا حصہ ادا کیا ہے۔ یہ کتاب دراصل مولانا کے مختلف مقالات کا مربوط مجموعہ ہے۔ جسے بعد میں ایک معنوی ربط میں پرو دیا گیا ہے لیکن فہرست مضامین پر نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ البتہ اسلامی پہلو کچھ تشنہ معلوم ہوتا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے مولانا نے خود بھی محسوس کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

" اشتراکیوں نے بھی جہاں تک ان کے افکار و نظریات کے پیش کرنے کا تعلق ہے کسی تحریف یا غلطی کی نشاندہی نہیں کی۔ البتہ اسلامی پہلو کی تشنگی کا احساس رہا اور بعض اہل نظر نے اس طرف توجہ بھی دلائی "

(دیباچہ اشتراکیت اور اسلام)

یہ کتاب اشتراکی نظام فکر و عمل اور فلسفہ سے تفصیلی بحث کرتی ہے۔ " اشتراکیت اور اس کا پس منظر " معاشی اشتراکیت اور اس کے علمبردار، " مراحل " اشتمالیت یا مارکسی اشتراکیت " طبقاتی تصادم " " تاریخ کی مادی تعبیر اور لادینیت " " مارکسی اشتراکیت کی تاریخ " " مذہب اور اشتراکیت " " اسلام اور اشتمالیت " " اشتراکیت کا اپنے اصولوں سے انحراف " اور پھر آخر میں " اسلام کا معاشی نظام "۔ یہ کتاب موضوعات کے لحاظ سے پندرہ ابواب میں بٹی ہوئی ہے۔ ان میں سے چودہ باب کتاب کے موضوع سے بحث کرتے ہیں اور آخری باب ان کتب کی فہرست پر مشتمل ہے جن سے مولانا نے کتاب کی تالیف میں استفادہ کیا ہے۔ یہ اردو، انگریزی، عربی کی کل ۱۰۴ کتب ہیں۔ یہ کتاب اسناد اور حوالے کے لحاظ سے اتنی ٹھوس اور خصوصاً اس کا اشتراکی پہلو اتنا عمدہ ہے کہ ایک جتنی معلومات اس ۴۰۰ صفحات کی کتاب سے حاصل کر لیتا ہے اتنا اسے بڑی بڑی ضخیم جلدیں پڑھنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ضخیم اور بے شمار علمی کتب کا بہترین خلاصہ ہے جو اپنے نتائج فکر کے ساتھ منسلک کرکے پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے جو ابتدائی مطالعہ کرنے والے قاریوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی۔

مولانا کی ایک ابتدائی کتاب " مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر " بھی ہے۔

یہ کتاب انہوں نے مولانا سندھی کی کتاب " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک " کے بعض غیر معتدل خیالات کی تردید اور تصحیح میں لکھی تھی جس کا دیباچہ مولانا سلیمان ندوی مرحوم ؒ نے تحریر فرمایا تھا۔ اپنی کتاب میں مولانا سندھی نے شاہ ولی اللہ ؒ کی علمی تحریک کو اکبر کے دین الٰہی کی علمبردار اور اس کے کارنامے کو تکمیل تک پہنچانے والی قرار دیا ہے۔ اس طرح سید احمد شہید ؒ کی تحریک اور ان کے رفقاء کے حالات کے بارے میں بھی بڑی زیادتی سے کام لیا گیا تھا اور خصوصاً اہل صادق پور کے حالات اور ان کی کمزوریوں کا بڑا مبالغہ آمیز ذکر تھا۔ اس پر مولانا مسعود عالم نے تنقیدی تبصرہ کیا اور ایک ایک نقطہ کی علمی لحاظ سے تردید کی۔ یہ کتاب اب بالکل نایاب سی ہو گئی ہے اگر اسے دوبارہ شائع کر دیا جائے تو ہمارے علمی تنقیدی ذخیرے کا وہ ایک عمدہ حصہ ہے۔

"الترجمۃ العربیہ" حصہ اول و دوئم مولانا مسعود عالم اور ان کے شاگرد رشید محمد عاصم صاحب کی مشترکہ تالیف ہے۔ مولانا کو عربی زبان پر جتنا عبور تھا۔ اور ان کا ذوق جتنا بلند تھا، وہ ہمارے علمی حلقوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کے پیش نظر یہ مسئلہ بھی تھا کہ ہمارے نوجوانوں میں عربی دانی کا ذوق پیدا ہو۔ اسی ذوق کا تقاضا وہ تقاجب انھوں نے اپنے استاد کرم مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ مل کر "لغات جدیدہ" مرتب کی تھی۔ اس ذوق کا یہ دوسرا اور نہایت ترقی یافتہ مظاہرہ ہے جو ان دو کتب کی صورت میں سامنے آیا جن طرح یا کہ بھی ان کتب سے استفادے کا موقعہ ملا ہے وہ ان کتب کی افادیت کے پوری طرح قائل ہیں۔

ان کی ایک اور کتاب "ہندوستان میں دعوت اسلامی کی تاریخ" کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔

ان کی ایک دوسری عربی کتاب "حاضر مسلمی الہند و غابر ہم" ہے جو مصر کے اخبار "الفتح" میں مسلسل شائع ہوتی رہی تھی اور اس اخبار کے ایڈیٹر اسے کتابی شکل میں چھاپنے کا پروگرام رکھتے تھے لیکن وہ اب تک شائع نہ ہو سکی۔ اسکی اشاعت کا مولانا کو بہت انتظار تھا۔ چنانچہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں۔

"ایڈیٹر کی بے پایاں عنایات کے باعث کتاب اب تک نہ شائع ہو سکی۔ گزشتہ سال ۱۳۶۳ھ میں پھر جلد از جلد اشاعت کا وعدہ ہوا مگر اب تک یہ وعدہ بھی عملی قالب اختیار نہ کر سکا۔" (نوٹ مکاتیب سلیمانؒ صفحہ ۱۸۸)

"مکاتیب سلیمان" مولانا کی آخری کتاب ہے جو طبع ہوئی اور وہ بھی ان کی وفات کے بعد یہ کتاب ان کی تمام تالیفات میں کتابت و طباعت اور گٹ اپ میں سب سے بہتر ہے۔ مولانا کو عمر بھر اپنے پبلشروں سے کتابوں کی خرابی کتابت و طباعت کا شکوہ رہا۔ ان کی کتب میں اغلاط نامہ ایک لازمی جزو بن کر رہ گیا تھا لیکن افسوس کہ اگر ایک کتاب معیاری طباعت و کتابت کے ساتھ آئی بھی تو وہ ان کی موت کے بعد۔ جب ان کی آنکھ اس کی طرف سے بند ہو چکی۔

یہ کتاب مولانا مرحوم کے استاد محترم سید سلیمان ندویؒ کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ کسی بزرگ کے خطوط کو جمع کرنا اور پھر جمع کر کے اشاعت کے لئے دے دینا تو کوئی ایسا کام نہیں ہے جس وجہ سے اسے کارنامہ قرار دیا جا سکے لیکن مولانا مسعود عالم نے ترتیب مکاتیب میں بھی اپنے مخصوص علمی ذوق کا پورا پورا مظاہرہ کیا ہے اور اسے واقعی کارنامہ بنا دیا ہے۔ یہ مجموعہ ۲۵ سال کے مکاتیب کا ذخیرہ ہے جسے ایک مرتبہ صدی کے حوادث زمانہ میں سے گزرتے ہوئے اپنے ساتھ سنبھالے رکھنا بجائے خود ایک کارنامہ ہے اور یہ کارنامہ اس وقت مزید عجیب ہو جاتا ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے عرصے میں صرف ایک مکتوب ضائع ہوا۔ اس کے سوا ایک ایک خط محفوظ رکھا گیا۔ یہ مراسلت فروری ۱۹۲۸ء میں شروع ہوئی اور اگست ۱۹۵۳ء میں ختم ہوئی۔

اس کتاب میں بیشتر خطوط علمی طرز کے ہیں۔ کہیں "الضیاء" کا ذکر ہے جو مولانا مسعود عالم کا عربی ماہنامہ تھا جو چار سال تک لکھنؤ سے نکلتا رہا۔ اس کی مصروفیتیں اور مشورے۔ کہیں ندوہ کی سیاسیات اور معاملات کی باتیں اور کہیں اشاعت و طباعت کے تذکرے۔ چند مکاتیب جن کا تعلق تصوف اور علم سلوک کے مسائل سے ہے بہت ہی خوب ہیں اور سید صاحب مرحوم کی ستھری فکر کا بہترین نمونہ ہیں۔

مولانا مسعود عالم نے ان مکاتیب کی تاریخ وار ترتیب میں بھی بڑی محنت دکھائی ہے۔ لیکن اصل چیز وہ انڈکس ہے[1] جو اس کتاب کے آخر میں لگا ہوا ہے۔ اشخاص، کتب، علمی مدارس اور دوسرے اہم مقامات کا اس ۲۹۴ صفحات کی کتاب میں جہاں جہاں اور جتنی جتنی بار ذکر آیا ہے اسے صفحہ وار اس انڈکس میں درج کر دیا گیا ہے۔ یہ اتنی محنت اور جگر کاوی کا کام ہے جسے مولانا مسعود عالم جیسا تحقیقی ذہن رکھنے والا مصنف ہی انجام دے سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا مرحوم کی مد عربی کتب اور بھی ہیں جو میری نظر سے نہیں گزریں۔ صرف ان کے نام نظر سے گزرے ہیں۔

---

[1] یہ انڈکس مولانا مسعود عالم ندوی کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید محمد عاصم صاحب نے تیار کیا تھا۔ (ادارہ)

"تاریخ الدعوت الاسلامیہ"

"نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوت الاسلامیہ"

ہو سکتا ہے کہ یہ ایک ہی کتاب کے دو نام ہوں جو ترمیم و اضافے کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ رکھ دیئے گئے ہوں۔

ان کا ایک مضمون "محاسن جہاد" کے نام سے کتابچہ کی شکل میں بھی شائع ہوا تھا لیکن اس وقت وہ بالکل نایاب ہے۔

ان کی کتابوں میں ایک اہم کتاب جس کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ وہ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے "دیار عرب میں" ہے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جس کے آئینے میں "مولانا مسعود عالم ندوی" اپنے پورے سراپا کے ساتھ نظر آجاتے ہیں۔ ان کی دوسری کتابیں وہ ایک مورخ ہیں جو اگرچہ تحریک اسلامی کا ایک مفکر ہے اور مقصد کو کسی حال نظر انداز نہیں کرتا لیکن فکر و تحقیق و تفتیش کا دبیز پردہ شخصیت کو بہت دور پیچھے چھپائے رہتا ہے اس کتاب میں مولانا مسعود عالم ندوی خود نظر آتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے میں نے ان کو دیکھا۔ جیسے وہ باتیں کرتے تھے۔ جیسے وہ دعوت پیش کرتے تھے جیسے ان کا لہجہ تھا۔ جیسی ان کی فکر تھی۔ جیسا ان کا انداز تھا۔ ہو بہو وہی ۔۔ بالکل خود مولانا مسعود عالم ندوی ـــــ جو ان کی سیرت، کردار، شخصیت، سراپا اور بہت قریب سے دیکھنا چاہے وہ ان کی کتاب "دیار عرب میں" غور و فکر سے پڑھے۔ اسے نظر آجائے گا کہ ایک روح مضطرب ہے جو اپنے دوش پر ایک بیمار جسم کو لادے اللہ کے دین کی راہ میں صحراؤں میں، وادیوں میں، بیابانوں اور آبادیوں میں ایک ہی دھن اور ایک ہی فکر میں سرگرداں ہے وہ کراچی میں بیٹھے ہیں یا حجاز میں پہنچ گئے ہیں۔ وہ کویت اور بغداد و ریاض جاتے ہیں۔ وہ شیخ احمد آبادی۔ علامہ ہلالی، طہٰ فیاض اور محمد محمود صواف سے گفتگو کرتے ہیں۔ ہر جگہ وہ مجسم دعوت اور مجسم درد و سوز بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پھر وہ شخصیت جو راہ تحقیق کی گرد میں بالکل چھپی ہوئی تھی جب اللہ کی راہ میں سفر کرتی ہوئی اللہ کے رسولؐ کے دیار میں پہنچتی ہے تو تحقیق و تفتیش کی یہ خارزار خشکی اچانک آنسوؤں سے تر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ میں نے بیسیوں تذکرے پڑھے ہیں اور لوگوں نے درد و سوز سے دیار حرم کا ذکر کیا ہے لیکن یہاں جو عالم ہے وہ بالکل دوسرا ہے۔

"آج دیار حرم کی طرف قافلے کی روانگی ہے۔ دل شوق اور جذبات شکر سے لبریز ہے۔ بیمار کیا بساط۔ تمام ظاہری اور مادی وسائل سے محروم لیکن مالک حقیقی کا فضل ہے کہ راستے کی تمام مشکلیں آسان ہوتی جا رہی ہیں اور انتہائی سکون و آرام کے ساتھ کشاں کشاں منزل مقصود کی طرف چلے جا رہے ہیں۔"

"مدت کی سوئی ہوئی تمنائیں جاگ رہی ہیں۔ یا الٰہی۔ وہ کیا ساعت ہوگی جب تیرے گھر کے سامنے کھڑے ہوں گے اور وہ کیا آن ہوگی جب ہمیں طواف کی سعادت حاصل ہوگی۔ یہ مشت خاک اور دیار حرم کی آبلہ پائی ـــ یہ اللہ کا فضل ہے جو کچھ ہے اس کا ہے جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے۔"

"طائف کی سڑکوں اور بازاروں سے گزر رہے۔ لاریاں اور ٹرک بھر بھر کر حاجی کو لے جا رہے تھے نگاہیں شہر کی عمارتوں پر تھیں لیکن دل جذبات شوق سے معمور۔ ایک ایک پتھر اور ایک ایک اینٹ کو شوق اور تجسس کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ وہی طائف ہے جس نے حضور انورؐ کی دعوت ٹھکرا دی تھی۔ کیا یہ وہی پہاڑیاں اور دشوار گزار گھاٹیاں ہیں جہاں حضرتؐ کے قدم لہو لہان ہو گئے تھے۔ موٹر بڑی تیزی سے پہاڑی سلسلوں اور پیچیدہ گھاٹیوں سے ہو کر جا رہی تھی اور گنگناتا بار بار دل میں کہتا یہ راستہ تو موٹر سے روندنے کے قابل نہیں۔ ہم اپنے کو [illegible]

تو پھر کیوں سب سے بڑے داعی حق کے نقش قدم پہچاننے کی ہمت نہیں کرتے ـــــ یہی راستہ تھا یہی گھاٹیاں ہوں گی یہی زمین یہی تھی۔ پہاڑیاں یہی تھیں۔ اب بھی وہی زمین ہے پہاڑیاں بھی وہی ہیں لیکن پاکباز پیغمبرؐ کے نقش قدم پر چلنے والے راہ حق کے سودائی کہاں ہیں ـــــ ؟"

اس کے بعد مدینۃ النبیؐ کا ذکر ہے۔ جس کے لئے کروڑوں روحیں بے تاب ہیں۔ وہاں پہنچنے کی سعادت جب مولانا کو حاصل ہوتی ہے تو ان کی کیفیت قابل رشک ہے۔

"ابھی تین چار گھنٹے کی مسافت باقی ہے لیکن دل ابھی سے لرزنے لگا ہے۔ مدتیں گزریں۔ زمانہ بیت گیا۔ مدینہ کی حاضری کا شوق دل میں چٹکیاں لیتا رہا۔ بارہا فرط شوق میں پڑھتا رہا ـــ

صبا تو جائے یہ کہیو مرے سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

وہ ساعت کیا ہوگی جب یہ گنہگار روضۂ حضرت عالیؐ میں سلام کرے گا۔ جب کبھی یہ خیال آتا آنکھیں پُرنم ہو جاتیں ـــــ !"

یہ وہ سماں ہے جو مولانا تحریر کے ذریعے اپنے ہر قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں اور جس سے ہر قاری اس حضور اقدسؐ میں پہنچنے کے تصور کی تھرتھری اپنے دل میں پاتا اور اپنی آنکھوں کو نم آلود محسوس کرتا ہے۔

پھر لکھا ہے:۔

"جانے ان راستوں سے حضور انورؐ کا کیسے گزر ہوا ہو۔ موٹر نہ ہوتی تو گرد راہ سے پوچھتا۔ شاید نقش پا کے کھوئے ہوئے اثرات کا سراغ لگتا۔ مدینہ کی پاک بستی قریب ہوتی جا رہی ہے اور خاکسار کی خاکی کے خلیوں سے چور۔ گھبرایا ہوا۔ گھگھیاتا اور درود پڑھتا چلا جا رہا ہے۔ جی چاہا یہاں سے پیدل چلیں۔ عرصے سے تمنا تھی کہ مدینے میں پاپیادہ داخل ہوں۔ امام مالکؒ مدینہ منورہ میں سواری استعمال نہیں کرتے تھے کہتے "جہاں رسول اللہؐ کی قبر ہے اس زمین کو کسی جانور کی ٹاپوں سے روندنا حرام سمجھتا ہوں"۔ (دیار عرب میں)

یہ اس سوز و گداز کی جھلک ہے جو مولانا مسعود عالم کے جسم و روح میں تھا۔ وہ یہی اس کتاب میں تحریک اسلامی کے ان کارکنوں کو نظر آتے ہیں جو اپنی ہر گھڑی اللہ کے دین کو پھیلانے اور اس کے حبیب کا پیغام پہنچانے اور اس کے لئے زمین ہموار کرنے میں صرف کرتا ہے۔ اس کتاب میں نظر آتا ہے کہ بیماری، کمزوری اور ضعف ان کے لئے ادائے فرض کے جذبہ کے سامنے ہیچ تھے۔ وہ دین حق کی سربلندی کے لئے زندہ رہے اور ان کو موت بھی اس حالت میں ملی کہ وہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے گھر سے نکلے ہوئے عین حالت سفر میں تھے۔ اس کتاب میں تحریک اسلامی کے کارکنوں کو کارکردگی اور عزیمت کا ایک معیاری نمونہ مل سکتا ہے۔

اشتد ادا الظلام یؤذن دائماً بانبثاق الفجر (اسعاف ؟)

ترجمہ: سخت اندھیرا صبح کے طلوع ہونے کی خبر دینے والا ہوتا ہے۔

محاسنِ سجادؒ

مرتبہ۔ مسعود عالم ندوی
صفحات۔ ۱۷۲
قیمت۔ ایک روپیہ

۱۷ نومبر ۱۹۴۰ء کو مولانا محمد سجاد صاحب کا پھلواری (ضلع پٹنہ) میں انتقال ہوا۔ مولانا مسعود عالم صاحب کو ان سے انتہائی محبت و عقیدت تھی۔ جنوری ۱۹۴۱ء میں ماہنامہ "الاصلاح" (پٹنہ) کا "سجاد نمبر" شائع کرنے کی کوشش کی گئی مگر حالات اس طرح کے تھے کہ شائع نہ ہو سکا۔
اپریل ۱۹۴۱ء میں "محاسن سجاد" کے نام سے یہ کتاب مرتب کی۔ اس میں سب سے پہلے "پیش لفظ" ہے۔ جو مولانا عبدالماجد دریابادی کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے اپنے قلم سے "تقریب" کے عنوان سے اس مجموعہ کے شائع کرنے کا مقصد اور مناسبت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے "ذاتی حالات" کے تحت مولانا حافظ عبدالحکیم صاحب (مہتمم مدرسہ انوار العلوم) مولوی ذکریا صاحب۔ مولانا محمود منظر حسین صاحب بہاری اور بعض دوسرے حضرات کے مضامین ہیں۔ "محاسن" کے تحت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم، ڈاکٹر سید محمود صاحب، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے مضامین ہیں۔ ایک مضمون "یادیں" کے عنوان سے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کے اپنے قلم سے بھی ہے۔ اس کے "خدمات" کے تحت چند دوسرے حضرات کے مضامین ہیں۔ آخر میں "نقصانِ عظیم" کے عنوان سے سید فروغ صاحب قادری کی ایک نظم بھی ہے۔

کتاب کے اکثر مضامین پر جہاں ضرورت محسوس کی مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنی طرف سے حاشیہ میں نوٹ بھی دئیے ہیں۔ اس کتاب سے مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم کی اس محبت و عقیدت کا پتہ چلتا ہے، جو انہیں مولانا محمد سجاد مرحوم سے تھی۔

اس مجموعہ کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ اس میں مولانا سجاد مرحوم کے متعلق مولانا راغب احسن صاحب (سیکرٹری کلکتہ مسلم لیگ) کا ایک اختلافی مضمون بھی شامل ہے۔ اس کے متعلق مولانا نے لکھا ہے "راغب احسن صاحب کا مضمون شاید بہتوں کے لئے تکلیف دہ ہو، پھر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ اس کی اشاعت ناگزیر ہو گئی۔ راقم کے اصرار اور مسلسل و متواتر یاد دہانی پر مکرم راغب احسن صاحب نے یہ مقالہ عنایت فرمایا، اور پھر جب ان سے لہجہ نرم کرنے اور کچھ ترمیم و تبدیلی کی درخواست کی گئی تو وہ راضی نہ ہوئے۔ مجبوراً میں ایک مفصل نوٹ آغاز میں دے دیا گیا ——— طباعت سے پہلے بعض دوستوں کی نظروں سے گزری، تو وہ اس نوٹ پر بھی مطمئن نہ ہوئے۔ آخر ان کے اصرار سے برادرم جناب شمس ہاشمی کا جوابی مضمون بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اور اس طرح اس "کتاب المناقب" میں "باب المہمل" کا مستقل اضافہ ہو گیا، جس کا مجھے انتہائی رنج ہے۔"

❦

تنقید نگاری

آباد شاہ پوری

کسی شے کے کھرے کھوٹے کو پرکھنے اور حسن و قبح کو جانچنے کی صلاحیت و قوت کا نام نقد و تجزیہ ہے۔ جس طرح ایک جوہری اس قوت کی مدد سے اصلی اور مصنوعی جواہرات کو پہچان لیتا ہے اور ایک صیرفی زرِ خالص و کم عیار میں تمیز کر لیتا ہے۔ اسی طرح افکار و نظریات کا جوہری اور حیاتِ انسانی کا صیرفی ــــــ ناقد ، اس صلاحیت کی مدد سے افکار و نظریات کے حسن و قبح اور زندگی کے کھرے کھوٹے کو الگ کر دکھاتا ہے۔ پہلا کام گو تجربہ و ممارست چاہتا ہے لیکن مشکل نہیں ہے۔ دنیا میں ہزاروں جوہری اور لاکھوں صیرفی ایسے ملیں گے جو زر و جواہر پر نظر ڈالتے ہی پکار اٹھیں گے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے برعکس زندگی اور اس کے منبع سے پھوٹنے والے فکری و عملی مظاہر کا نقد و جائزہ کوئی آسان کام نہیں۔ زندگی کا سمندر بڑا وسیع اور عمیق ہے۔ اس کی غواصی اور اس کے مظاہر کا بے لاگ تجزیہ محض تجربہ و مادست کے بل بوتے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے راست فکر ، وسیع علم ، گہری نظر ، بے لاگ بصیرت ، بے خوف فطرت ، بے لوث دیانت اور انصاف پسند ضمیر کی ضرورت ہے۔ یہ وہ زادِ راہ ہے جس کے بغیر اس راہ کا مسافر چند قدم بھی نہیں چل سکتا۔

یہاں ایک ناقد کا بے جان جواہرات اور بے حس سیم و زر سے پالا نہیں پڑتا بلکہ اس کا ہدف ایک ذی حیات معاشرہ ، یا اس کا کوئی طبقہ اور اس کے افراد ہوتے ہیں چونکہ ناقد خود اس معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے اس لئے اسے اپنے فرض کی دیانت دارانہ ادائیگی سے باز رکھنے کے لئے سیکڑوں مرئی و غیر مرئی اور محسوس و غیر محسوس عوامل نمودار ہو جاتے ہیں۔ فہم و بصیرت کی کجی اور علم و نظر کی کوتاہی اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے خود اس معاشرے کی محبت اس کا قلم روک لیتی ہے۔ کبھی گروہی اور طبقاتی مفادات اس کی بے لاگ قوت تنقید کو سلب کر لیتے ہیں۔ شخصی اغراض اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہیں ، کبھی کسی گروہ ، طبقے یا فرد کا خوف اس کو اظہارِ حق سے روک دیتا ہے۔ کبھی وقت کی مصلحت آڑے آجاتی ہے کبھی بزرگوں کا ادب اور ان کی شفقت زبانِ قلم کو گنگ کر دیتی ہے اور کبھی دوستوں کی محبت اور ان کے تعلقات زنجیرِ پائے خامہ بن جاتے ہیں۔

الغرض یہ وہ وادئی پرخار ہے جس کے بہت کم مسافر اپنے دامن کو اس کے کانٹوں سے بچا کر نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ آج ہر "بوالہوس" "حسن پرست" ہونے کا مدعی ہے لیکن صحیح معنوں میں "اہل نظر" خال ہی خال ملتے ہیں۔ تنقید نگاری کے ان [illegible] والوں کی بھیڑ یہاں کمی نہیں ہے لیکن وہ لوگ جنہیں اس کٹھن وادی سے کامیاب نکلنے والوں کی صف میں شمار کیا جا سکتا ہے معدودے چند ہی ہوں گے۔

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم انہی چند معدودے چند افراد میں سے ایک تھے۔ ان کے اندر وہ ساری صفات قابلِ رشک حد تک موجود تھیں جو کسی شخص کو ایک بلند پایہ ، مصنف اور بے لاگ تنقید نگار بناتی ہیں اور جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ محض ایک دعویٰ نہیں ہے بلکہ جو علمی سرمایہ وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں ، اس کا ایک ایک ورق اس حقیقت کی شہادت دے سکتا ہے۔

اس شہادت کو پیش کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ایک بنیادی بات ذہن نشین کر لی جائے جس طرح تنقید نگاری کا یہ اصول غلط بلکہ مضحکہ خیز ہے کہ کسی متعین اور مخصوص معیار کی بجائے زندگی اور اس کے عملی مظاہر یا فن کار کی تخلیقات کا نقد و تجزیہ ماحول ، وقت یا فن کار کے جذبات و احساسات کے اصول پر کیا جانا چاہیے ، بعینہٖ ایک با اصول تنقید نگار کے فن کا جائزہ لینے کا یہ طریقہ غلط ہے کہ جس اصول کو اس

نے اپنے فن کی کسوٹی بنایا ہے۔ اسے نظر انداز کر دیا جائے تو ایک شخص اس کسوٹی سے اختلاف کر سکے تنقید نگار کے پرکھنے والے فن سرمایہ کے معیار حد کا فیصلہ دے سکتا ہے۔ لیکن اسے یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کسوٹی کو نظر انداز کر کے تنقید نگار کے فن کے متعلق کوئی رائے قائم کرے اس لئے کہ جب تنقید نگار اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے وقت ہر حالت اور ہر مرحلہ میں ایک متعین کسوٹی سامنے رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسوٹی جن اصولوں سے ترتیب دی گئی ہے وہ اصول تنقید نگار کے فکر و ذہن اور جذبات و احساسات میں رچ بس گئے ہیں اب اگر وہ کسی چیز پر نقد و تبصرہ کرتا ہے یا کسی واقعہ پر اپنے تاثرات و جذبات کا اظہار کرتا ہے تو اس کے ذہن و فکر اور جذبات و احساسات کے پیچھے وہ اصل وہ اصول کارفرما ہوتے ہیں جو اس کے رہنمائے فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اصولوں کو نظر انداز کر کے کوئی درست اور اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہی اصول تو اس کے فن کی روح ہوتے ہیں، اور روح کو اگر جسم سے نکال دیا جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے اور اس "با[illegible] [illegible] کو اظہار کیا معنی رکھتا ہے؟

مولانا مرحوم ایک فاضل مترجم اور ادیب ہونے کے علاوہ عالم باعمل بھی تھے۔ کتاب و سنت سے انہیں عشق کی حد تک لگاؤ تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ لگاؤ عشق بن کر ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا۔ ان کی فکر و نظر، کردار و عمل، تحریر و ادب، تحقیق و تجسس اور محبت و نفرت پوری زندگی کا محور یہی دو چیزیں تھیں ——— یعنی کتاب اور سنت۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے جو سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ سب کتاب و سنت سے اسی عشق اور کتاب و سنت کے علمبرداروں کی مدافعت کے جذبے ہی کا مرہون منت ہے۔ "محمد بن عبد الوہاب" اور "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" تاریخ و سیر میں مولانا کی دو بلند پایہ تحقیقی تصانیف ہیں ـــ ان کی "[illegible] تصنیف" خود مولانا کی زبانی سنیئے۔

> "۱۹۳۹ء میں ندوۃ العلماء کے دو طالب علموں نے یہ ارادہ کیا کہ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کی چلائی ہوئی تحریک تجدید و امامت کی مکمل تاریخ مرتب کی جائے۔ ایک نے حضرت سید صاحب کی سیرت اپنے ذمہ لی اور دوسرے نے بالاکوٹ کے شہداء سے اپنا سفر شروع کرنے کا ارادہ کیا۔
>
> دونوں نے اپنا اپنا کام شروع کیا۔ ان میں جو صاحب ہمت و صاحب دل اور صاحب ہمت تھا اس نے سیرت سید احمد شہید مرتب کر لی (۱۹۳۹ء) . . . .
>
> دوسرے (راقم) نے بھی اپنا کام شروع کیا . . . . . . دوران بحث و تحقیق میں نجد کی وہابی تحریک (جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے) کا ذکر بار بار نظر سے گزرا اور ایسی غلط بیانیوں اور افتراپردازیوں سے دوچار ہوا کہ یارائے ضبط نہ رہا . . . . . اور اس بے اختیاری میں راقم نے زیر ترتیب کتاب کے دو حصے کر دیئے، شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نجدی کی سیرت و دعوت سے متعلق یہ حصے، اس موجودہ کتاب کی پہلی جلد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری جلد ہندوستان کی تحریک تجدید امامت کی مکمل تاریخ پر مشتمل ہوگی . . . ."
>
> (محمد بن عبد الوہاب ـــ تقریب)

یعنی مولانا نجد و ہندوستان کے حامیان دین متین اور فدایان کتاب و سنت پر اپنوں اور بیگانوں کی افتراپردازیوں کو برداشت نہ کر سکے اور قلم کی تلوار سے کر ان کی مدافعت کی۔ جیسا کہ آگے ہی "شان تصنیف" "مولانا ندوی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر"

مولانا مسعود عالم مرحوم جب طویل جلا وطنی کے بعد ہندوستان واپس لوٹے تو اپنے ساتھ " منتشر افکار " اور " جدید نظریات " بھی لائے۔ ان " جدید افکار و نظریات " کی زد ایک طرف شاہ ولی اللہ رحمہ، سید احمد شہید رحمہ، مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اور ان کی جماعت کے ایثار و قربانی اور ان کے عقیدتی سرفروش جانشینوں پر پڑتی تھی۔ دوسری طرف ان سے پوری اسلامی تاریخ بلکہ خود کتاب و سنت کے احکام کا چہرہ بھی مسخ ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسا عظیم فتنہ تھا کہ اگر اسے ہوا مل جاتی تو شاید عہدِ اکبری کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ایسی حالت میں مولانا جیسا کتاب و سنت کا عاشق اور مجاہدین حق کا محب کیونکر خاموش رہ سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے قلم اٹھایا اور ان " جدید افکار و نظریات " کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔

" اشتراکیت اور اسلام " کی شانِ تصنیف بھی یہی ہے۔ ایک (مرحوم) احراری لیڈر نے لاہور کے ایک سہ روزہ اخبار میں مضامین کا سلسلہ شائع کیا۔ جس میں اسلام اور اشتراکیت کو ایک دکھایا گیا تھا۔ مولانا نے ان کی تردید میں ایک مضمون تحریر کیا۔ اسی مضمون کو بعد میں پھیلا کر کتاب کی شکل دے دی گئی۔

قصہ مختصر یہ کہ مولانا کی تمام تصنیفات کا محرک خود کتاب و سنت یا اس کے علمبرداروں سے والہانہ عشق و محبت رہا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ مولانا کے نزدیک افکار و نظریات کو جانچنے اور زندگی کے کھرے کھوٹے کو پرکھنے کی کسوٹی کتاب و سنت ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہ کسوٹی ان کے فن کی بنیاد ہے اور ان کے تنقید و تبصرہ میں اس کی کارفرمائی کو نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ امر واقعہ ہے کہ ان کی تنقید نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے۔ وہ مسلمان معاشرے کی اجتماعی، اخلاقی، دینی اور سیاسی زندگی کا جائزہ اسی ایک نقطۂ نظر سے لیتے ہیں اور پھر اخلاص کے ساتھ جو کچھ پاتے ہیں بے لاگ انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہم یہاں چند پر اکتفا کرتے ہیں۔ " دیارِ عرب میں " مجاز کے سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

" ریاض اور کویت کی دنیا بھی ماں کی طرح ہماں بھی بدوؤں کے لشکر کے روٹی کے ٹکڑوں کی تلاش میں ہر طرف ہاتھ پھیلائے نظر آتے ہیں۔ اللہ! اللہ! جن کے آباؤ اجداد نے " اونٹ کا دودھ " پیتے پیتے ایک لق و دق صحرا کی سرحد سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی۔ آج وہ پھر اسی جہالت اور فقر و بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ عربوں نے اللہ کے دین کو چھوڑا تو اللہ کی نعمتوں نے بھی ان سے منہ موڑ لیا۔ " (صفحہ ۲۶)

" تصوف " کو ہمارے ہاں دین میں جو اہم مقام دے دیا گیا ہے، اس سے کون ناواقف ہے۔ حالانکہ اس کا بڑا حصہ بدعات اور خرافات پر مشتمل ہے اور کتاب و سنت میں اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ مولانا اس کے شدید دشمن تھے اور جب بھی ذکر چھڑتا تھا اس سے پوری بیزاری کے ساتھ اظہارِ برأت کرتے تھے۔ " دیارِ عرب " کے ابتدائی صفحات میں لکھتے ہیں۔

" سوئے نجد کا یہ سلسلہ جاری ہے اور غالباً بصرہ تک جاری رہے گا۔ ہمارے بزرگ اس محاسبہ نفس کو تصوف کی شاخ بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ تم بھی عملاً تصوف کے قائل ہو۔ عاجز عرض کرتا ہے۔ " یہ تو آپ کے اختیار میں ہے ؛ ہر اچھے فعل کو تصوف کا نام دے دیں اور پھر کہیں تم تصوف کے قائل ہو۔ " ہم تو اس دجل و فریب سے برأت کرتے ہیں جو آج عام طور پر تصوف کے پردے میں رونما ہوتا ہے۔ ہم ان بدعات کے منکر ہیں جو تصوف کی راہ سے دین خالص میں داخل ہو گئی ہیں باقی " احسان " اور " تعلق باللہ " کا کون کافر منکر ہوگا ؟ (صفحہ ۱۶)

نجد کے علماء نے لونڈیوں سے تمتع کے جواز کا فتویٰ دے رکھا ہے۔ چنانچہ سلطان نجد اور شہزادے چار بیویوں کے علاوہ لونڈیوں سے بھی تمتع کرتے ہیں۔" یہ کتاب وسنت کے صریح خلاف ہے۔ مولانا نجد گئے تو نجد کے مشہور عالم شیخ محمد بن ابراہیم آل الشیخ سے اس مسئلہ پر گفتگو سے باز نہ رہ سکے۔ "دیارِ عرب" میں لکھتے ہیں:-

> "دار الضیافت میں ایک مدنی نوجوان نے بڑی صفائی کے ساتھ کہا تھا۔ انما الامر اصم السیٔ اُمنت - (ابھی یہ فتویٰ تو حضرت زید کی کرامات سے ہے) میں شیخ سے اس کی تصدیق چاہتا تھا۔ یہی خوف تھا کہیں وہ برا نہ مانیں مگر راقم نے جی میں کہا "حق میں خوف وخطر کا سوال کیا معنی رکھتا ہے؟" آخر گفتگو ہوئی۔ راقم نے اپنے ناقص علم اور حقیر معلومات کی حد تک اسلام میں "تسری" کی حیثیت بیان کی، ہمارے فہم میں یہ اسیران جنگ تک محدود ہے اور جنگ کے نازک حالات کا ایک عملی اور انسانی حل ہے۔ لیکن اس کو عام کر دینا اور بیع وشرا کو جائز اور صحیح قرار دینا اور پھر ان پر "تسری" کا حکم جاری کرنا روح اسلام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ شیخ نے صفائی کے ساتھ امرائے نجد کے عمل کی تائید کی" (صفحہ ۲۲)

مولانا کی تنقید نگاری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی عالمانہ فہم وبصیرت اور موثر عالمانہ نگاہ الفاظ کا جگر چیرتی ہوئی حقیقت کی تہ کو پہنچ جاتی ہے اور وہ زیر نقد واقعہ یا مسئلہ کا تجزیہ مختصر الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں کہ کوئی الجھن اور ابہام رہنے نہیں پاتا اور حقیقت حال منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

اس خصوصیت کی مثالیں "محمد بن عبد الوہاب"، "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" اور "مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار وخیالات پر ایک نظر" میں بکثرت ملتی ہیں۔ خصوصاً موخر الذکر کتاب میں تو یہ خصوصیت پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ "اقتباسات در اقتباسات" دینے سے مضمون کے بہت زیادہ طویل ہو جانے کا خدشہ ہے۔ ورنہ ہم اس خصوصیت کی مثالیں بھی پیش کرتے۔

ایک خصوصیت یہ ہے کہ مولانا حالات ومسائل کا نقد وتجزیہ پوری ناقدانہ دیانت اور بے خوفی کے ساتھ کرتے تھے اور اپنی رائے کا اظہار کسی لاگ لپیٹ اور مداہنت کے بغیر کر دیتے تھے۔ "مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار وخیالات پر ایک نظر" کی "شانِ تصنیف" کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ مولانا سندھی دیوبند کے اساطین میں سے تھے۔ "تحزب" اور "تشانہ گیری" نے طبقہ علماء میں جو تنگ دلی اور بے حوصلگی پیدا کر دی ہے، اس کے پیش نظر ان پر نقد کرنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف تھا۔ مولانا اگرچہ مولانا سندھی کے افکار وخیالات پر تنقید محض احقاق حق اور غلط فہمیوں کے ازالے کی خاطر کر رہے تھے لیکن اہل دیوبند اسے "مدرسہ" کے اختلاف پر محمول کر سکتے تھے، تاہم مولانا نے نتائج سے بے نیاز ہو کر قلم اٹھایا اور حق یہ ہے کہ تنقید وتبصرہ کا حق ادا کر دیا۔ "قلم اٹھانا" بجائے خود ایک بڑی جسارت تھی، مستزاد یہ کہ مولانا کی تنقید کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔ مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ فرمائیے:-

> مولانا سندھی اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک مجموعی مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ہندوؤں کو اسلام سے وحشت نہ رہے اور مسلمان خوشی خوشی ہندوستانی قومیت کا جزو بن سکیں
> (صفحہ ۱۳۴)

"خلق قرآن" کا فتنہ اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ اس فتنہ کا مقابلہ اصحاب عزیمت واستقامت خصوصاً امام احمد بن حنبلؒ نے جس پامردی سے کیا۔ وہ بھی اس تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ لیکن مولانا سندھی کے نزدیک یہ حق وباطل کی کشمکش نہ تھی بلکہ عربوں اور

نجد کے علماء نے لونڈیوں سے تمتع کے جواز کا فتویٰ دے رکھا ہے۔ چنانچہ سلطان نجد امراء شہزادے چار بیویوں کے علاوہ لونڈیوں سے بھی تمتع کرتے ہیں۔ " یہ کتاب وسنت کے صریح خلاف ہے۔ مولانا نجد گئے تو نجد کے مشہور عالم شیخ محمد بن ابراہیم آل الشیخ سے اس مسئلے پر گفتگو سے باز نہ رہ سکے۔ " دیار عرب " میں لکھتے ہیں :۔

" دار الضیافہ میں ایک مدنی نوجوان نے بڑی صفائی کے ساتھ کہا تھا۔ انما الاعمال بالنیات ([illegible]) (ابھی یہ فتویٰ تو حضرت زید کی کلمات سے ہے) میں شیخ سے اس کی تصدیق چاہتا تھا۔ یہی خوف تھا کہیں وہ بُرا نہ مانیں مگر اِتم نے بھی میں کہا " حق میں خوف وخطر کا سوال کیا معنی رکھتا ہے " آخر گفتگو ہوئی۔ عاجز نے اپنے ناقص علم اور حقیر معلومات کی حد تک اسلام میں " تسری " کی حیثیت بیان کی۔ ہمارے فہم میں یہ اسیران جنگ تک محدود ہے اور جنگ کے نازک حالات کا ایک عملی و انسانی حل ہے۔ لیکن اس کو عام کر دینا اور بہر بیع وشرا اکو جائز اور صحیح قرار دینا اور پھر اس پر " تسری " کا حکم جاری کرنا روح اسلام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ شیخ نے صفائی کے ساتھ امرائے نجد کے عمل کی تائید کی " (صفحہ ۲۲۰)

مولانا کی تنقید نگاری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی عالمانہ فہم وبصیرت اور سوز خانہ انکا الفاظ کا جگر چیرتی ہوئی حقیقت کی تہ کو پہنچ جاتی ہے اور وہ زیر نقد واقعہ یا مسئلہ کا تجزیہ مختصر الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں کہ کوئی الجھن اور ابہام رہنے نہیں پاتا اور حقیقت حال منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے

اس خصوصیت کی مثالیں " محمد بن عبد الوہاب " " ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک " اور " مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار وخیالات پر ایک نظر " میں بکثرت ملتی ہیں۔ خصوصاً موخر الذکر کتاب میں تو یہ خصوصیت پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ " اقتباسات در اقتباسات " دینے سے مضمون کے بہت زیادہ طویل ہو جانے کا ڈر ہے۔ ورنہ ہم اس خصوصیت کی مثالیں بھی پیش کرتے۔

ایک خصوصیت یہ ہے کہ مولانا حالات ومسائل کا نقد وتجزیہ پوری ناقدانہ دیانت اور بے خوفی کے ساتھ کرتے تھے اور اپنی رائے کا اظہار کسی لاگ لپیٹ اور مداہنت کے بغیر کر دیتے تھے۔ " مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار وخیالات پر ایک نظر " کی " شان تصنیف " کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ مولانا سندھی دیوبند کے اساطین میں سے تھے۔ " تحزب " اور [illegible] گیری نے طبقہ علماء میں جو تنگ دلی اور بے حوصلگی پیدا کر دی ہے [illegible] تھا۔ مولانا اگرچہ مولانا سندھی کے افکار وخیالات پر تنقید محض احقاق حق اور غلط فہمیوں کے ازالے کی خاطر کر رہے تھے لیکن اہل دیوبند اسے " مدرسہ " کے اختلاف پر محمول کر سکتے تھے، تاہم مولانا نے نتائج سے بے نیاز ہو کر قلم اٹھایا اور حق یہ ہے کہ تنقید وتبصرہ کا حق ادا کر دیا۔ " قلم اٹھانا " بجائے خود ایک بڑی جسارت تھی، اس پر طرہ یہ کہ مولانا کی تنقید کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔ مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ فرمائیے :۔

مولانا سندھی اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجون مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ہندوؤں کو اسلام سے وحشت نہ رہے اور مسلمان خوشی خوشی ہندوستانی قومیت کا جزو بن سکیں

(صفحہ ۱۴۳)

" خلق قرآن " کا فتنہ اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ اس فتنہ کا مقابلہ اصحاب عزیمت واستقامت خصوصاً امام احمد بن حنبلؒ نے جس پامردی سے کیا۔ وہ بھی اس تاریخ کا ایک زریں باب ہے لیکن مولانا سندھی کے نزدیک یہ حق وباطل کی کشمکش نہ تھی بلکہ عربوں اور

عجمیوں کا قومی تمانہ تھا۔ عرب جن کے ہاتھ سے (مامون کے زمانے میں) سیادت کے سب ذرائع چھن چکے تھے۔ عربی کو اس لئے الہٰی زبان منوانے پر مصر تھے۔ کہ عجمیوں پر کسی نہ کسی صورت اپنا تفوق قائم رکھ سکیں۔ مولانا مسعود عالم اس نظریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اب تک اشتراکیوں کی یہ خصوصیت مشہور تھی کہ وہ دنیا کی تاریخ کی تعبیر معاشی عوامل کے ذریعہ کیا کرتے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ وہ اس خبط میں منفرد نہیں، ہمارے بعض ارباب فکر کا بھی یہ کمال ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ کی تشریح و تعبیر "قومی نقطہ نظر" سے کر لیتے ہیں" (ص ۱۴۶)

پھر اس نظریہ کا تجزیہ اور اصل حقیقت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

اسجا تا ہے کہ ان ائمہ صدق و صفا کے ایمان و اخلاص پر اس سے زیادہ بدنما بہتان نہیں اٹھایا جا سکتا۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (ص ۱۴۹)

مولانا اس خصوص میں —— بے خوف تنقید اور بے باکانہ اظہار رائے —— میں بڑا بلند مقام رکھتے ہیں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رح ہوں —— یا ان کے اپنے مشفق و مربی استاذ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر تقی الدین ہلالی۔ رفیق راہِ حق مولانا مودودی ہوں یا عزیز ترین دوست علی میاں (مولانا ابو الحسن علی ندوی)، ان کی جس رائے سے اختلاف رکھتے ہیں، اس کو برملا بیان کرنے اور اس پر تنقید سے نہیں چوکتے۔ اس راہ میں عقیدت و ارادت حائل ہوتی ہے نہ ادب و شفقت اور نہ رفاقت و محبت۔

شاہ ولی اللہ رح جو ہندوستان کے ظلمت کدے میں ہدایت کا چراغ تھے۔ جن کے علم اور عزم و ہمت نے امت مسلمہ میں دین کی تازہ روح پھونک دی۔ ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر مولانا ایک پُرجوش عقیدت مند کی مانند کرتے ہیں لیکن ایک مسئلہ ایسا بھی ہے جس پر انہیں شاہ صاحب علیہ الرحمتہ کے ساتھ اتفاق نہیں ہے اور وہ اپنے اس اختلاف کو مطلق نہیں چھپاتے اور پوری صاف گوئی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم ان ولی اللہ کو تو مانتے ہیں۔ جو محدث اور مجدد ہیں لیکن ان ولی اللہ رح کو نہیں مانتے جو صوفی ہیں۔

سید سلیمان ندوی رح مولانا مرحوم کے استاذ تھے۔ سید صاحب کی مولانا پر جو خاص شفقت تھی اور مولانا اپنے استاذ مشفق سے جس طرح محبت رکھتے تھے اور ان کا ادب و احترام کرتے تھے اس کا اندازہ "مکاتیب سلیمان" سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر فی الحقیقت استاذ اور شاگرد دونوں پر رشک آتا ہے۔ بایں ہمہ مولانا مرحوم کو سید صاحب علیہ الرحمتہ سے اختلاف رائے کرنے میں کوئی باک نہ ہوتا تھا "مکاتیب سلیمان" کی "تقریب" میں اپنے اور سید صاحب رح کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"لیکن متفرقات دین کے باب میں میری روش الگ تھی۔ تصوف و سلوک و تزکیہ کے بارے میں عاجز نے مطالعہ کے بعد اور اس انشراح صدر کے ساتھ ایک مسلک اختیار کیا ہے۔ اپنی طبیعت و مزاج کے لحاظ سے صرف امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) کی نکھری ہوئی توحید دل کو لگتی ہے اور تو اور ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کے ہاں بھی اس باب میں کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت سید صاحب کی صحبتوں اور مکاتیب سے استفادہ کے باوجود راقم اپنے مسلک پر قائم رہا۔"

"دیار عرب میں" ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

عصر کے بعد بادشاہ کی آمد تھی .... عاصم صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور بولے "چلیں۔ بادشاہ طواف کرے گا"! میں نے کہا۔ "میاں جاؤ اور ان کی زیارت کرو۔"

راقم اس تماشہ بینی سے باز آیا۔ یوں طبیعت بھی پژمردہ ہے" عاصم بولے۔ "آپ کے سید صاحب بھی حرم میں ہیں اور دیکھ رہے ہیں؟" میں نے کہا۔ "راقم نے کب کسی کی تقلید کی ہے؟ سید صاحب قبلہ کا ادب و احترام اپنی جگہ پر، لیکن ابن سعود کا جلوس اور فوج اور پولیس کے جلو میں اس کا طواف دیکھنے حرم جاؤں ـــ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" (صفحہ ۹۵-۹۴)

ڈاکٹر تقی الدین ہلالی بھی مولانا کے استاد تھے اور مولانا ان کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے لیکن یہ ادب و احترام بھی حق رائے کے اظہار اور تنقید میں مانع نہ ہو پاتا تھا۔ "دیارِ عرب میں" ایک مقام پر ہلالی صاحب کی علمی و دینی صلاحیتیں بیان کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا بھی کھلے دل سے اظہار کر دیتے ہیں۔

"مگر دعوت و تبلیغ میں اہل حدیث حضرات کی طرح فروع سے آگے نہیں بڑھتے۔"

(صفحہ ۱۱۱)

مولانا مرحوم کے مولانا مودودی کے ساتھ جو تعلقات تھے، ان پر تبصرہ کی حاجت نہیں۔ لیکن تنقید و اظہار رائے کا حق یہاں بھی انہوں نے اپنے لئے محفوظ رکھا تھا۔ "دیارِ عرب میں" "نظام حیات کی تصحیح" کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"آج تقریباً ایک خطبہ کی تصحیح ہوئی، سیاسی نظام میں ذمیوں کے حقوق پر استاذ مرحوم نے سخت اختلاف کیا۔ "ذمیوں کو تبلیغ بلکہ اسلام پر تنقید کی اجازت ہوگی"۔ اسے انہوں نے سخت گمراہ کن قرار دیا۔ تبلیغ کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ مگر تنقید کی اجازت البتہ قابل اعتراض اور تعلیمات اسلام کے خلاف ہے۔ راقم نے مولانا مودودی سے اس کے متعلق عرض کیا تھا۔ مگر انہوں نے کچھ ایسی توجیہہ کی جس سے راقم کو اطمینان نہ ہوا۔ اب ہلالی صاحب کے اعتراض کے بعد پھر اور کھٹک رہی ہے۔ بہرحال شائع کرنے سے قبل مصنف سے پھر گفتگو کر لی جائے گی اور حکومت کی پابندیوں نے اس کا موقع نہ دیا تو یہ ایک نوٹ کے ساتھ جوں کی توں شائع کر دی جائے گی۔" (صفحہ ۶۵-۶۴)

مولانا مرحوم اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے درمیان جو گہری دوستی اور برادرانہ محبت تھی۔ اس کو اس مضمون کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مولانا ندوی نے اپنے [illegible] کی وفات پر [illegible] لکھا ہے۔ لیکن یہ گہری محبت بھی مولانا کو صاف گوئی اور بے باکانہ تنقید سے روک نہ سکی تھی۔ ان کے ایک پمفلٹ اُرِیدُ اَن اَتَحَدَّثَ اِلَی الاِخوان (میں اخوان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زیر نظر پمفلٹ میں مصنف نے الاخوان المسلمون والوں سے باتیں کی ہیں۔ یہ باتیں اچھی، معقول اور دل نشین انداز میں کی گئی ہیں۔ مگر توقع کے خلاف تذبذب فکر یہاں اور نمایاں ہے۔ مصر میں اقامت دین کے علمبرداروں کو فاضل مصنف یہ سمجھانا چاہتے ہیں "کہ حکومت اور نظام حکومت کے قیام کا مطالبہ اسلام میں مطلوب و مقصود نہیں۔ حکومت اللہ کی طرف سے انعام ہے یہ طلب نہیں کی جاتی"۔ کہنا بھی چاہتے ہیں مگر کہتے ہوئے ڈرتے بھی ہیں اور اسی لئے ان کے بیان میں تضاد بھی نمایاں ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ "حکومت طلب

نہیں کی جاتی۔ یہ نتیجہ کے طور پر خود بخود ظہور میں آتی ہے، جیسے ایک درخت اپنے وقت پر پھل دینا شروع
کر دیتا ہے۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں — " لیکن دعوت کے کسی مرحلے میں — دعوت کے پھیل جانے
اور دل و دماغ میں جاگزیں ہونے کے بعد — اگر یہ کام حکومت کے بغیر ناممکن ہو تو ہم دعوت اور دین کی
خاطر اس کے لئے جدوجہد کریں گے جیسے وضو کے لئے پانی کے حصول کی جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن اسی ذہنیت
اور اسی کردار اور پاکیزگی اخلاق کے ساتھ .... الخ" (ترجمان القرآن جلد ۱۷)

تنقید آگے بھی چلتی ہے اور اس میں مولانا نے " کردار و اخلاق کی پاکیزگی " کا " تجزیہ " کیا ہے۔ اس تنقید پر عزیز دوست نے ایک خط میں بڑا
شکوہ کیا۔ خط کا جواب پرجوش محبت سے دیا گیا مگر " شکوہ " کے جواب میں بڑی صفائی سے کہہ دیا —

" اما بعد۔ آخر ماجرا کیا ہے ؟ تنقید و تحسین میں آخر برا ماننے کی بات کیا ہے۔ جہاں تک فکر و
رائے کا تعلق ہے۔ دوستوں کے درمیان اختلاف قابل برداشت ہونا چاہیئے " (دوست کی یاد میں)

اقتباسات بہت طویل ہو گئے لیکن مولانا کی بے خوف تنقید نگاری اور بے باکانہ اظہار رائے کی خصوصیت کو اجاگر کرنے کے لئے ایسا
ناگزیر تھا۔ بسا اوقات ایک تنقید نگار کا قلم اپنے فرض کی دیانتدارانہ ادائیگی کی راہ میں حائل ہونے والی ساری مشکلات اور رکاوٹوں کو پھلانگ جاتا
ہے۔ لیکن کسی شخصیت کی عقیدت، کسی بزرگ کی شفقت، کسی رفیق کے تعلق یا کسی دوست کی محبت کی زنجیریں اس کو جکڑ کر رکھ دیتی ہیں۔
بہت کم ناقد ایسے ہوتے ہیں جو ان زنجیروں کو توڑتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں۔ پھر ان کی عظمت میں کسے کلام ہو سکتا ہے ؟

مولانا کی تنقید نگاری کی ایک خصوصیت ان کا وسیع علم اور قائل کر دینے والی قوت ہے۔ ان کی اس خصوصیت کا مطالعہ ان کی علمی و
تاریخی تصنیفات میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ کسی تاریخی یا علمی مسئلے پر کبھی سطحی یا تشنہ تنقید نہیں کرتے بلکہ جب بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کا نہایت
گہرا اور سیر حاصل تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے پیش کردہ خیالات کے حق میں اپنے وسیع علم کی مدد سے دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں حتیٰ کہ قاری
زیر بحث مسئلے کی خامیوں اور مولانا کی تنقیدی موقف کی مضبوطی کا دو اور دو چار کی طرح قائل ہو جاتا ہے۔

ایک اور خصوصیت ان کی بے لوث دیانت اور انصاف پسندی ہے۔ وہ کسی مسئلے پر اظہار رائے کرتے وقت خاص احتیاط کرتے
ہیں کہ کوئی خلاف واقعہ بات قلم سے نہ نکل جائے۔ مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی سے حتی الامکان احتراز کرتے ہیں۔ ان کی علمی تحریروں میں جو " خشکی "
پائی جاتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ عبارت میں رنگینی اور شگفتگی پیدا کرنے کے لئے کسی نہ کسی حد تک مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی سے
کام لینا پڑتا ہے اور مولانا اس کو پسند نہیں کرتے۔ ورنہ مولانا کی عام تحریر میں بڑا حسن اور دلفریبی ہوتی ہے۔ " دیار مغرب میں " جو ایک
علمی کتاب کے بجائے سفرنامہ ہے۔ مولانا نے جو پیاری اور شگفتہ زبان استعمال کی ہے، وہ اس حقیقت کی گواہ ہے۔

" دیار مغرب " کے مطالعے سے ایک حقیقت اور آشکارا ہوتی ہے وہ یہ کہ مولانا واقعات و حالات کا ان کی گہرائی میں اترے بغیر بھی سیر حاصل
تجزیہ کر لینے کی زبردست قوت رکھتے تھے۔ یہ طریق تجزیہ انہوں نے " دیار مغرب میں " اختیار کیا ہے چونکہ یہ ایک سفرنامہ تھا اور سفرنامے
کے لئے علمی تجزیہ کا طریقہ غیر موزوں ہوتا ہے اس لئے لامحالہ " سطحی طریقہ " اختیار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن مولانا کی خوبی یہ ہے کہ وہ سطحی انداز میں بھی وہی
باتیں کر جاتے ہیں جو ایک ناقد علمی تجزیہ کے بعد کہتا ہے۔ دیکھئے عراق کی دینی حالت کا تجزیہ کس انداز میں کیا ہے۔

شام کو قادری صاحب کی طرف نکل گیا۔ وہاں پاکستانی حضرات آتے رہتے ہیں اور قادری صاحب
کی خفیہ تبلیغ کا شکار ہوتے ہیں۔ عراق میں تو قادیانی تبلیغ کارگر نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ تو اصل مذہب
ہی سے برگشتہ ہیں۔ ایک نئی ہندوستانی نبوت پر وہ کب ایمان لانے لگے ؟ یہاں دہریت و الحاد نہیں

صرف بے عملی اور غفلت ہے مغرب کی نقالی نے انہیں عیش و عشرت کا دلدادہ بنا دیا ہے۔ علمی معیار معمولی ہے۔ دماغی حالت بھی زیادہ بلند نہیں (ص۱۱۸)

عراق کی اجتماعی نفسیات پر تنقید کا انداز ملاحظہ ہو۔

"آجکل اقتصادی ابتری کا عام شکوہ ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اخبار نے موٹروں کی کثرت کا بھی رونا رویا ہے۔ عراق کی ساری دولت اور پیداوار انہی نمائشی چیزوں میں ضائع ہوتی ہے۔ اہل قلم روتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک فیشن ہو گیا ہے۔ جس طرح مقرروں، خطیبوں اور شاعروں کو فلسطین کا موضوع ہاتھ آ گیا ہے۔ جسے دیکھو فلسطین کو رو رہا ہے اور غریب فلسطین تو سردست عرب اور مسلمانوں کے ہاتھ سے جا چکا۔ (ص۱۳۷)

ایک اور اجتماعی خرابی کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"ایک طرف بغداد کی سرمستی اور طمطراق اور دوسری طرف آس پاس کی دیہاتی آبادیوں کی خستہ حالت دیکھ کر دولت کی اس غیر اسلامی تقسیم پر غصہ آتا ہے۔ ایک طرف شہر میں موٹر سے نیچے کوئی سواری نہیں دکھائی دیتی۔ دوسری طرف ہمارے ہاں کے غریب پناہ گزینوں کی طرح آبادی کا بڑا حصہ خستہ حال جھونپڑیوں میں دن گزارنے پر مجبور ہے۔ یہی وہ تکلیف دہ ماحول ہے جہاں اشتراکیت پروان چڑھتی ہے۔ اشتراکیت کا مقابلہ صرف الفاظ اور تشدد آمیز قانون سے نہیں ہو سکتا۔ ملک کے اقتصادی نظام اور اس کی سازگاری کے لئے پورے نظام زندگی میں ایک صالح انقلاب کے بغیر اشتراکیت کا قلع قمع نہیں ہو سکتا۔ مگر افسوس بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہے۔ ورنہ لوگ زیادہ سے زیادہ ایک زوردار مقالہ لکھ دینا کافی خیال کرتے ہیں:۔ (ص۱۵۶-۱۵۵)

"دیار عرب میں" اس "طریق تجزیہ" کی کامیاب مثالیں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ مولانا کی تنقید نگاری کے یہ صرف چند پہلو ہیں ان کے فن کا مکمل جائزہ گنجائش اور وقت چاہتا ہے اور بدقسمتی سے یہی دونوں قلم کی عنان روک رہی ہیں۔

بدت لك فرصة للتعيش حرا
فحاذر أن تكون لها مضيعا
ومالك بعد هذا اليوم يوم
فإن لم تستطع لن تستطيعا

ترجمہ: تمہیں آزادانہ زندگی بسر کرنے کا ایک موقع ملا ہے۔ خبردار! اسے ہرگز ضائع نہ کرنا۔ یوں سمجھو کہ تمہارا یہ دن کام کرنے کے لئے آخری دن ہے۔ اگر تم نے یہ کام آج نہ کیا، تو پھر کبھی نہ کر سکو گے

(ماخوذ از ذاتی ڈائری مولانا مسعود عالم ندوی)

منظومات

- عروج قادری
- ضیا محمد ضیا
- ابو البیان حماد
- طٰہٰ یسین
- سید عبد العلی

خطوط

بخدمت......

- سید ابو الحسن علی ندوی
- محمد عبد اللطیف صاحب
- محمد نصر اللہ خاں صاحب گجرات
- محمد عاصم

دوست کی یاد

عروج قادری

یہ کس نے مرے قلب میں ہل چل سی مچا دی — یہ کس نے مجھے آج کراچی سے پکارا
یہ کس کا حسین چہرا مری آنکھوں میں آیا — پھر کیوں ہے مرے سامنے جاں سوز نظارا

میں مل نہ سکا گرچہ یہاں پھر کبھی تجھ سے — تو یاد تو آتا ہی رہا روز بھی شب بھی
گریاں مرا یہ دل ہی نہیں بلکہ ہیں گریاں — تقویٰ بھی طہارت بھی شرافت بھی ادب بھی

اب تیری ملاقات قیامت پہ ہے موقوف — فردائے قیامت تو مگر دور بہت ہے
کہتے ہیں کہ انساں ہے مختارِ جہاں میں — حق یہ ہے کہ انسان تو مجبور بہت ہے

برہم کبھی ہوتا تو ہنستے تھے تجھے دوست — سختی تری محبوب تھی، غصّہ ترا پیارا
اِک شان سے بھرپور ترے قہر کا تیور — اک کیف سے معمور ترے مہر کا دھارا

تاریخ ہو، تبلیغ ہو یا خط کی عبارت — تھی شدتِ احساس سے مملو تری تحریر
اِک شاخِ گُل افشاں ادب تیرا قلم تھا — پیغام بر عہدِ سعادت تری تقریر

اِک جہدِ مسلسل سے عبارت تری ہستی — اے مردِ مجاہد تجھے اللہ جزا دے
اے دوست تری یاد بھی ہے حوصلہ افزا — اللہ تجھے اپنی عنایت سے نوازے

مزارِ اُستاد پر

چند آنسو

طٰہٰ یٰسین

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار"

آہ اب وہ بلبلِ رنگین نوا خاموش ہے!
جس کے نغموں سے تھا یہ سارا گلستاں نغمہ زار
بزم مے بے کیف ہے وہ شور ہا و ہو نہیں،
اُٹھ گیا وہ رونقِ محفل وہ رندِ بادہ خوار
شمعِ روشن بجھ گئی یا مہرِ تاباں چھپ گیا
اک اُداسی سی ہے محفل پر جہاں تیرہ و تار

موت کی آغوش میں شاید اسے آیا قرار
زندگی بھر جو تڑپتا ہی رہا سیماب وار

ہاں ہمیں سکھلا گیا آدابِ رسمِ عاشقی
جان دے دی اپنے مقصد کے لئے پروانہ وار
"یک نفس جان نزار او تپید اندر عرب"
زندگی کیا تھی ادائے فرض کی آئینہ دار
زندگی بھر موت سے آنکھیں ملاتا ہی رہا
وہ نحیف و ناتواں سچ مچ تھا اک کوہِ وقار
عزم محکم ہمت عالی، نگاہِ دلنواز
جانِ پرسوز و دلِ درد آشنا و بے قرار
وہ عجم کے لالہ زاروں سے اٹھا رومی صفت
تھا مگر اس خم میں صہبائے حجازی کا خمار

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے"

مسعود عالم ندوی

ضیاء محمد

آج کیوں تھمتا نہیں ہے آنسوؤں کا آبشار
درد رہ رہ کر جگر میں اُٹھ رہا ہے کس لئے
لحظہ لحظہ بڑھ رہی ہیں کیوں مری بے تابیاں
چاک ہے کیوں دستِ وحشت سے گریبانِ شکیب
کیوں تڑپتا ہے مثالِ ماہیٔ بے آب دل
کس نے رکھ دی ہے مری گردن پہ غم کی تیغِ تیز
ہائے یہ مسعود کی فرقت کا داغِ سینہ سوز
آہ وہ چہرہ نظر سے آج پنہاں ہو گیا
آج وہ بیدار دل کنجِ لحد میں سو گیا
مومنِ پاکیزہ سیرت، مسلمِ نیکو سرشت
غیرتِ دیں سے اُٹھا تھا جس کی ہستی کا خمیر

کیوں نکلتے ہیں مرے سینے سے آہوں کے شرار
نالہ کیوں میری زباں پر آ رہا ہے بار بار
چھوٹتا جاتا ہے کیوں ہاتھوں سے دامانِ قرار
صبر کا دامن ہے کیوں جوشِ جنوں سے تار تار
جانِ مضطر کس لئے ہے دردمند و سوگوار
تیر کس نے کر دیا ہے اک مرے پہلو سے پار
ہائے اس کی ناگہاں رحلت کا زخمِ جاں شکار
جس کے خد و خال سے تھا نورِ باطن آشکار
جاگ اُٹھی قسمتِ خوابیدۂ خاکِ مزار
زاہدِ پرہیزگار و عابدِ شب زندہ دار
نشۂ حق کا ملا تھا جس کی آنکھوں کو خمار

چل بسا دینِ خدا کا عاشقِ شوریدہ سر
آج اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر رخصت ہوا
چھپ گیا زیرِ زمیں فکر و نظر کا آفتاب
وہ قلندر جس کو اپنی سادگی پر ناز تھا
جو بدی کی قوتوں سے عمر بھر لڑتا رہا،
اب کہاں سے آئے گا وہ دردمند و معمورِ دل
پھر کہاں ایسا عظیم الشاں مؤرخ آئے گا.
جس کا اسلوبِ نگارش معجزہ سے کم نہ تھا
شاہدِ معنی کے رُخ سے کون اُلٹے گا نقاب
اب کہاں دیکھیں گے ہم حُسنِ بلاغت کا کمال
اُس کے مدفن پر ہوں ہر دم بارشیں انوار کی

پیروِ سنت فدائے اُسوۂ خیر البشرؐ
کاروانِ اہلِ ایماں کا پرانا ہم سفر
خاک میں پنہاں ہوا گنجینۂ علم و ہنر
خندہ زن تھا جو غرورِ جبّہ و دستار پر
شیطنت کے سامنے ہر دم رہا سینہ سپر
اب کہاں سے آئے گی اُس کی وہ چشمِ حق نگر
قول جس کا مستند تھا رائے جس کی معتبر
جس کی ہر تحریر میں ہوتا تھا جادو کا اثر،
اب کہاں آئے گا ایسا ناقدِ صاحب نظر
چل دیا بزمِ ادب سے وہ ادیبِ نامور
اُس کی تربت پر خدا کی رحمتیں شام و سحر

مسعود عالم رحمۃ اللہ علیہ

ابوالبیان حمّاد

وہ عالم کا مسعود، مسعود عالم — وہ مردِ مجاہد وہ عبدِ مکرم
سنی دینِ مظلوم کی آہ جس دم — بہ صد شوق اس نے کیا خیر مقدم
شکیب ارسلانِ گلستانِ عجم کا — وہ عصرِ رواں کا براہیم ادہم
ہو خاشاکِ باطل تو اک شعلۂ حق — ہو عدل و صداقت تو ژالہ و شبنم
کہیں زخم دیکھے جو انسانیت کے — تو بے تاب ہو کر چلا لے کے مرہم
دیارِ عرب کی جو خاک اس نے چھانی — تو بس اس لئے دینِ حق ہو مکرم
وہ غوطہ زنِ بحرِ افکارِ قرآں — معارف سے واقف، حقائق کا محرم
جری اور بے باک اظہارِ حق میں — نہ رکھی کوئی بات بھی دیں کی مبہم
تنِ زار میں وہ دھڑکتا ہوا دل — جسے کوئی غم ہے تو اسلام کا غم
یہی فکر تھی رشکِ فردوس بن جائے — وہ دنیا جو ہے مثلِ قعرِ جہنم
وہ کیا محفلِ دہر سے اُٹھ گیا اب — ہوئی بزمِ تحقیق و تنقید برہم
جیا حق کی خاطر مرا حق کی خاطر — نہ کیوں خوش ہو پھر مالکِ عرشِ اعظم
جو مسعود عالمؒ رہا زندگی میں — ہے وہ آخرت میں بھی مسعود عالمؒ

وہ حمّاد جب زندۂ جاوداں ہے
تو پھر کس لئے اُس کا غم اس کا ماتم!

قطعۂ تاریخ

انتقالِ پُرملال مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

حکیم سید عبدالعلی بخاری آسیونی

جہاں دین مولانا مسعودِ عالم — دِر احباب ہر دل عزیز و مکرّم
ادیبِ یگانہ، شہیرِ زمانہ — وضع دار و باخلق نیک و معظم
مَعَ اِخْتِلَافٍ فِیْ بِبَعْضِ الْعَقَائِدِ — نہ گہ فرق آورد در ربط باہم
بہ ضیق النفس مبتلا بود دائم — مگر ہمّتِ عالیش بیں کہ تاہم
بایں ضعفِ اعضا و امراض پیہم — برائے سفر کرد قصدِ مصمّم
بہ دنیائے اسلام دورہ نماید — خیالاتِ خود را رساند بہ عالم
ولیکن سفر دیگرے پیش آمد — کہ آں لابدی شد ز تقدیرِ مُبرم
اجل بغتۃً در رسید و ببردش — سوِ ملکِ جاوید و محبوبِ اعظم
کہ وقتِ اجل چوں بیاید یقیناً — نماند کسے پس از آں بیش و نے کم
خبر دفعۃً شد کہ آں نیک و اکرم — ازیں دارِ فانی رواں گشت یکدم
یقیں واں نکردم یقیں گو بظاہر — مگر اندرونم بسوزید ازیں غم
بہ صبرِ جمیل ایں دعا یاد کردم — ز ربّ السمٰوات با چشمِ پُرنم
بہ فردوسِ اعلیٰ بہ درجاتِ عالی — رساند ز فضلش خداوندِ عالم
عزیزی میاں عاصمم گفت پیہم — کہ تاریخِ رحلش ہمی بر نگارم
علیؔ ہاتفِ غیب گفتا بگوشم — سنِ ہجری و عیسوی ہر دو باہم
ز دنیائے فانی عزیز و معظم — بہ دارِ نعیم رفت مسعودِ عالم
ھ ۱۳ ۷۳ — ھ ۱۳ ۷۳
بنازید ازیں فضل مسعودِ عالم — بجشید ہر گہ خداوندِ عالم
ء ۱۹ ۵۴ — ء ۱۹ ۵۴

خطوط

ہورواخورد بلتھرا روڈ (بلیا)

محب مخلص

۴ رمضان المبارک ۵۹ھ

سلام ورحمت

آپ کا محبت نامہ پنجشنبہ کو ملا جب کہ میں سفر کے لئے پابہ رکاب تھا، یہاں جمعہ کو پہنچا، حسب دستور سفر کی تھکان سے طبیعت بدمزہ ہو گئی اور جواب میں تاخیر ہوئی۔

لکھنؤ آدمی تو کس امید پر؟ جب گھر بیابان ہو رہا ہو تو پھر گھر جا کر کیا ہو؟ اس وقت دارالعلوم میں کون ہوگا؟ گونڈہ پہنچ کر لکھنؤ نہ جانا، صدمہ تو ضرور ہوگا، رائے بریلی تو راستہ سے الگ ہے۔ اس لئے سر دست سوال ہی نہیں اٹھتا، انشاء اللہ کسی اور فرصت میں۔

میرا مضمون اور مقتدانہ، ایک ہی کمی۔ آپ جانتے ہیں کہ تحقیق اور ریسرچ کے لئے میں نہیں پیدا ہوا تھا، پڑھ دُگی کو کیا کروں؟ اللہ کوئی سامان کردے، تو اس "ریسرچ" اور مخلوطات میں آنکھیں پھوڑنے سے باز آجاؤں، الفرقان کے لئے آپ کی خواہش اور حکم پر میں نے جو کچھ کر دیا ہے، وہ میرے اصل رجحان اور خیالات کا آئینہ ہے۔ الندوہ کے لئے یہ "ریسرچ" کتاب خانہ کے قیام کا احسان ہیں، حکم ہو تو ایسی تحقیق روزانہ کر سکتا ہوں، "آپ نیاز مندوں" کی "درخواست" اس لئے منظور نہیں ہوگی کہ آپ اپنی "نیاز مندی" کی بنا پر "الفرقان" کے لئے سخت بیگاری لے چکے تھے، دوسری درخواست کی تعمیل بھی اسی "نیاز مندانہ حدود" کے اندر ہونا چاہئے تھی۔ اگر میں جانتا کہ میرے پرانے "نیاز مندوں" کو بھی قسم کے "ریسرچ" میں مزا آنے لگا ہے، تو کب کا مضمون حاضر ہو چکا ہوتا! اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے "نیاز مندانہ" رنگ کا مضمون مختصر نہیں ہو سکتا، اور الندوہ میں لمبے مضمونوں کی گنجائش نہیں، بہرکیف کوشش کروں گا کہ ایک تحریر اپنے ذوق کی بھی حاضر کروں۔ لیکن اگر "ذوق" اور "نیاز مندی" کی تکمیل میں دقت ہوئی، تو کوئی "شذرہ" حاضر کردوں گا۔

ہاں ایک بات رہ جاتی ہے "اصاغر و اکابر"۔ آپ سے کچھ تکلف نہیں

- -

- - - - - - - - - - اس گروہ میں سمجھدار صرف دو آدمی ہیں، "مفتی اعظم" اور "محمد سجاد" سو یہ لوگ بھی "قارئین الندوہ" کی کوئی علمی رہنمائی نہیں کر سکتے۔ مولانا سجاد اس جماعت کے گاندھی و جناح ہیں، جتنا میں ان سے واقف ہوں، شاید ہی کوئی واقف ہو، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مطالعہ کتب کے باب میں وہ "الندوہ" کے قارئین الندوہ، طالبین ندوہ کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتے اور یہ محمد سجاد وہ شخص ہے جس کی وسعت نظر، اصابت رائے وغیرہ وغیرہ پر علماء کی جماعت ایمان رکھتی ہے۔ ہمارے حفظ الرحمٰن اور سعید احمد سے اچھے صاحب نظر ہمارے عبدالسلام اور علی ہیں یہ میری ذاتی رائے ہے، جو روز بروز پختہ ہوتی جاتی ہے۔ "تحفہ ہائے گفتنی" لکھ کر بھیج دیجئے۔ ملاقات تو سر دست نہیں ہو رہی ہے۔ میں یہاں ۱۳ اکتوبر تک ہوں، ۱۰ اکتوبر کی صبح کو پٹنہ پہنچوں گا۔

الفتح کا وہ نمبر چھپنے پر بھیج دوں گا۔ آپ پڑھ کر خوش ہوں گے۔ "اصاغر و اکابر" کا سلسلہ ناقص اور ناکمل ہو گیا بہت لمبی بحث ہے۔ بہرحال آپ کی رائے مجھ سے اچھی اور پختہ ہو گی میں نے ضابطہ کا پروٹسٹ کر دیا ہے۔ ممکن ہے، اصاغر و اکابر کے بارے میں، میں سلجھا کر نہ لکھ سکا ہوں، بہرحال اپنے کو اس سوال کے جواب کا اہل نہیں پاتا، یہ صاف بات ہے گستاخی معاف! والسلام

زوجین کا سلام زوجین کو۔

آپ کا مسعود

سنٹرل جیل۔ راولپنڈی
۲۹، رمضان ۱۳۷۲ھ

عزیز مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ عرصہ ہوا ملا تھا۔ مگر جواب کا موقع نہ مل سکا۔ ہفتہ میں صرف دو خط کی اجازت ہے۔ اس لئے تمام دوستوں اور عزیزوں کو وقت پر جواب دینا بہت مشکل ہے، امید کہ آپ میری مجبوریوں کے پیش نظر خیال نہیں کریں گے۔

اور حالات اچھے ہیں۔ صحت میری بہت غنیمت ہے۔ روزے باہر بھی نہیں رکھ سکتا تھا، یہاں رکھنے کا اور بھی امکان نہیں تھا۔ تراویح پوری بیس رکعتیں وہ ختم پڑھیں۔ اور حدیث کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس اتفاقی موقع سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی ناشکری ہوگی۔ مطالعہ کی رفتار اچھی ہے۔ جانے کب تک یہاں رہنا ہے۔ بہرحال دو چار مہینوں میں بھی خاصہ پڑھ لوں گا۔ اور انشاء اللہ یہ مطالعہ ہمارے کام میں بہت مد ہوگا۔ اب تک میں نے حدیث کا باضابطہ اور مسلسل مطالعہ بہت کم کیا ہے۔ باہر اتنی فرصت کہاں ملتی ہے؟

اور بھی اس تنہائی سے فائدے پہنچ رہے ہیں۔ بہت سی عادتیں چھوٹ رہی ہیں۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ میں روزانہ اسٹو پر چائے بناتا ہوں، برتن دھوتا ہوں بلکہ مانجھتا ہوں۔ بار بار لوٹوں میں پانی لاتا ہوں۔ جو کام آپ سے نہیں ہوتے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخوبی پورے ہو جاتے ہیں۔ گجرات کے اسیروں میں دو چار نوجوان واقف اور مشفق نکلے۔ انھوں نے نہانے کے لئے پانی گرم کرنے اور تیل مالش میں بڑی مدد کی اور کر رہے ہیں۔ غالباً آج کل وہ لوگ رہا ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ پھر کوئی نظم کر دے گا۔

کل سے رہائیاں ہو رہی ہیں۔ مگر خیال ہے کہ ہم لوگ ابھی کچھ دنوں اور مہمان رہیں گے، بہرحال "بادہ" تو قدح خوار کا ظرف دیکھ کر ہی دیتے ہیں۔ الحمدللہ کہ اپنی بیماری اور کمزوری جسم و جان کے باوجود دل بالکل مطمئن اور قانع ہے۔ مومن ابتلا کو دعوت نہیں دیتا، مگر جب آ جائے۔ تو اللہ تعالیٰ سے استقامت کی دعا مانگتا ہے۔ ہمارا بھی یہی حال ہے، الحمدللہ ہم یہاں کچھ شوق سے نہیں آئے۔ مگر جب ہمارے کرم فرما ہمیں لے آئے ہیں، تو توکلاً علی اللہ ہم خوش اور مطمئن ہیں۔ اور ہر طرح خیریت ہے۔ غازی صاحب[1] اچھے ہیں۔ تمام دوستوں اور رفیقوں خاص کر ہمارے عزیز شان کو بہت بہت سلام۔ آپ میرے خط کا انتظار کئے بغیر لکھتے رہیں۔ والسلام

عاجز۔ مسعود عالم ندوی ۱۲/۶/۵۳

اورینٹل پبلک لائبریری
بانکی پور، پٹنہ

مسعود نواز

سلام شوق

نباہ کا شبہ اور مسعود بے نوا سے! اللہ جھوٹ نہ بلوائے یہ گنہگار "نباہ" اور تعلقات کی استواری میں خام ثابت نہیں ہوگا۔ دارالعلوم کے زمانۂ قیام میں برادران یوسف اور گندی وطنی سیاست کے علمبرداروں کے باعث ممکن ہے۔ مجھ سے کبھی بد اخلاقی یا بے عنوانی ہو گئی ہو، ورنہ اس ہیچ میرز کا دامن کم از کم آداب "نفاق و ریا" کی آلودگیوں سے پاک ہے۔ والعلم عند اللہ، وھو اصدق الشاھدین۔

شبلی صاحب کو نہ لکھا، اچھا کیا، وہ شعبان ہی میں انکار کر چکے تھے صرف میرے اصرار کے باعث انھوں نے حامی بھری تھی، حیدرآبادی بھائی کے وعدوں پر جی رہے ہیں۔ اللہ مبارک کرے، اور ہر رنگ میں کامیاب اور بامراد بنائے۔ "حافظا وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس"۔

---

[1] حافظ مولانا عبدالواحد صاحب (رکن جماعت اسلامی گوجرانوالہ)

۔۔۔ صاحب بہت مسرور ہوں گے، یہاں بعض جگہوں کے لئے درخواست دے گئے ہیں۔ میں نے انہیں ازخود اطلاع کردی تھی کہ میرے چلے آنے کے بعد ان کا تقرر لازمی ہے، باہر کا آدمی لائق کم معاوضہ نہیں آسکتا، اس لئے ۔۔۔ کے سوا کوئی ہماری جماعت میں نہیں، جسے آپ لے سکیں، اچھے اچھے علماء اور حاملین اعلام کی عبارت خوانی تک قابل مضحکہ ہے، نام کیا لوں؟ آج کل بھی ایسی مثالیں سامنے ہیں پھر زعم ہمہ دانی پر اور ہنسی آتی ہے۔

میرے لئے راحت اور سکون کے اسباب ضرور فراہم ہیں، اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، ندوہ کی ناپاک اور خسیس ترین عداوتوں سے دوچار رہنے کے بعد، خوبصورت الماریوں اور بے زبان سنہری جلدوں کی صحبت بس غیر مترقبہ معلوم ہوتی ہے، ندوہ کی محبت یہاں آنے سے کم نہیں ہوئی بلکہ اور بڑھ گئی، آؤں گا، دوچار روز رہوں گا، اور ان دنوں میں، کسی درجہ میں پڑھاؤں گا بھی، لیکن ملازم ہو کر صرف مجبوری اور پریشانی کی حالت میں آسکوں گا۔ ایک رونا ضرور ہے وہ ندوہ کی تباہی کا، اللہ نے مجھے داروغہ مطلق تو بنایا نہیں، اس خیال سے خاموش ہوں، خاموش رہتا ہوں۔ بہرحال چار ماہ کی رخصت تو منظور ہو ہی چکی ہے، اسی اثناء میں کوئی فیصلہ کرلوں گا، اغلب یہ ہے کہ مستعفی ہوجاؤں گا، یوں مستقبل کا حال اللہ کو معلوم ہے، ممکن ہے، مرضی مولیٰ میرے گناہوں کی پاداش میں دوچار ماہ کی سزا اور دے دے؛ علی میاں، جس ماحول میں نفس انسانی اور اغراض کی پرستش ہوتی ہو، وہاں ایک خوددار سکون سے نہیں رہ سکتا، داستان طویل ہے، پھر کبھی، میں ندوہ کی رام کہانی سننے کا مشتاق ہوں، بلکہ دل ادھر ہی لگا رہتا ہے ابھی میری ڈاک لائبریری ہی کے پتے سے آتی ہے اس لئے کارڈ میں کوئی قابل اخفا بات لکھنا ہو تو عربی میں لکھئے ورنہ لفافہ۔

تفصیل سے سننے کا منتظر۔

مسعود بے نوا

کراچی

جمعہ [۴ مارچ ۴۹ء]

برادرم! سلام مسنون۔

توقع ہے کہ اب تم بخیر و عافیت واپس آگئے ہوگے۔ میرا سفر تو اچھی طرح کٹا۔ مگر یہاں کی آب و ہوا آجکل بہت خراب ہے وہ دمبر کی بات نہیں تمہیدی کام تو غالباً آسانی سے اور جلد ہوجائے گا۔ ہفتہ عشرہ میں پتہ چلے گا ۱۵ رسے شوری ہے اور شاید ۲۰، ۲۱ تک جانے اسی میں فیصلہ ہوگا۔ اگر فیصلہ فوری طور پر "عدم سفر" کے حق میں ہوا تب تو ۔۔۔ سے کر فوراً واپس آجاؤں گا۔ البتہ اگر سفر کے حق میں ہوا جیسا کہ رجحان ہے، تو پھر اب تک کچھ طے نہیں کرسکا ہوں۔ افضل صاحب کا ایک مہینہ یہاں انتظار کروں یا بہاولپور یا پنڈی ہی چلا آؤں ہر شکل میں کچھ نہ کچھ پریشانی ہے۔ یہاں سب سے بڑی تکلیف آب و ہوا کی ہے۔ بہرحال آئندہ جمعہ تک پھر لکھوں گا۔

تم اپنی مفصل روداد لکھو۔ خاص کر یہ بتاؤ کہ کیا کیا لاسکے ہو۔ تاکہ سفر کی صورت میں جو کمی ہو اس کے پورا کرنے کی کوشش کی جائے پوری فہرست مع حساب کے بھیج دو تو اچھا ہو۔ دمشق سے جواب آگیا ہے جواب کل ابوالخیر عزنسوی کی معرفت بھیج رہا ہوں وہ کل جارہے ہیں اب تم عام طور پر جواب لکھ کر ہفتہ وار ڈاک پر بھیج دیا کرو۔ پیر کا دن مقرر کرلو میں جمعہ کے دن لکھا کروں گا۔

امید ہے دلہن سلمہا اچھی ہوں گی۔ بچی بھی اچھی ہوگی انشاء اللہ۔ اسے "بڑے اباجان" کی دعا بھیج دینا۔

چتوں اور مسودات کا چارٹ کاظم صاحب کے پاس رہ گیا ہے، بھیجنے کے لئے لکھا ہے۔ والسلام

ماجد
مسعود عالم ندوی

سردی

موسم کی تبدیلی آپ کی صحت کے لئے ایک آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کے لئے جاڑے کی آمد بحالیٔ صحت کا پیغام لاتی ہے۔ لیکن جو لوگ صحت کے اصولوں سے غفلت برتیں اُن کے لئے یہی صحت بخش موسم جو افزائش خون کا زمانہ ہے افزائش بلغم کا بہانہ بن جاتا ہے اور طرح طرح کے عوارض میں مُبتلا رکھتا ہے۔ نزلہ، زکام اور کھانسی اس موسم کی عام بیماریاں ہیں جو رفتہ رفتہ اعضائے تنفس کی خرابی، ضعفِ دماغ اور ضعفِ اعصاب کا سبب بن جاتی ہیں یا اس سے بھی زیادہ شدید صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

یہ موسم آپ زیادہ تر مکان کے اندر ہی بسر کرتے ہیں۔ لہٰذا مکان، صحن اور اُس کے گرد و نواح کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ تنگ و تاریک گوشوں سے چیزیں ہٹالیں تاکہ مچھروں کو پناہ نہ مل سکے۔ سردی سے گھبرا کر صبح کی سیر اور غسل ترک نہ کریں اور جہاں تک ہوسکے گرم کپڑے پہنیں۔ غذا گرمیوں کے مقابلے میں شیریں، مقوی اور مرغن کھا سکتے ہیں۔ سوتے وقت کھڑکیاں اور روشندان کھلے رکھیے اور منہ ڈھک کر ہرگز نہ سوئیے۔

اسکے علاوہ ہمدرد کی **سُعالین** اور **صدوری** کا استعمال رکھئے یہ آپ کو اس موسم کی عام تکالیف سے محفوظ رکھے گا۔

ہمدرد کا نصب العین انسانوں کی صحیح طریق زندگی کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔

ہمدرد (پاکستان)

کراچی ڈھاکہ لاہور

ادب میں اسلامی قدروں کا علمبردار

اپریل سنہ ۱۹۵۵ء

ماہنامہ چراغِ راہ کراچی

بہ ادارت: نعیم صدیقی
۳۔ شاہ جمال لاہور

★

شمارہ: ۴ — جلد: ۸

مندرجات

قیمت فی پرچہ: ۸ آنے
سالانہ چندہ: ۵ روپے

دفتر ماہنامہ چراغ راہ۔ کراچی نمبر ۱

سوچ بچار

کبھی سوچا بھی کیجئے

ادارہ

مشہور کہاوت تھی کہ انگریز اور ہندو کسی اقدام اور اسکیم کے بارے میں برسوں پہلے سے سوچنے لگتے ہیں، سکھوں کی قوم کرتی پہلے ہے سوچتی بعد میں ہے، اور مسلمان وقت کے وقت سوچتا ہے۔ لیکن آج ملک جس صورت حالات سے گزر رہا ہے اس کو پیدا کرنے والے اقدامات پر وقت کے وقت بھی نہیں سوچا گیا، لیکن ان کے جو نتائج سامنے آ رہے ہیں ان پر کاش کہ اب بعد از وقت ہی کچھ سوچ لیا جائے

پہلی بات ـــــ یہ سوچئے کہ دستوریہ اور اس کے ارکان کے ہاتھوں کتنے ہی مفاسد کیوں نہ پیدا ہوئے ہوں، کیا اس کے فعال ہونے کی صورت میں یہ دستوری اور قانونی اور انتظامی انتشار بھی پیدا ہو سکتا تھا جس سے آج ہم دوچار ہیں۔ پے در پے عدالتی فیصلے سامنے آ رہے ہیں کہ حکومت کے فلاں فلاں اقدامات غیر آئینی تھے اور فلاں فلاں امور میں دستوری حدود سے تجاوز کیا گیا ہے چھوٹی قدروں کے پرخچے اڑ گئے ہیں اور آمریت ہمارے دروازوں پر دستک دے رہی ہے۔ بین الاقوامی حلقوں میں پاکستان آج کس درجہ رسوا ہو رہا ہے۔

دوسری بات ـــــ یہ سوچئے کہ اگر دستوریہ کو کام کرنے دیا گیا ہوتا تو دسمبر ۵۴ء میں بنا بنایا دستور نافذ ہو جاتا، ملک کے اسلامی ری پبلک ہونے کا دستوری اعلان ہو چکا ہوتا اور آج نئے انتخابات ہو رہے ہوتے اور زیادہ سے زیادہ ۵۵ء کے وسط تک عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے اپنی حکومت خود چلا رہے ہوتے۔ بخلاف اس کے موجودہ صورت میں سب کچھ غیر معلوم مدت کے لئے معلق ہو گیا ہے اور اگر بڑے اخلاص سے بھی ہمارے سربراہ کار تیز رفتاری سے کام کریں اور واقعی ایک صحیح نمائندہ دستوریہ پیدا بھی کر دیں تو دستور سازی کی زلف کے سر ہونے تک ایک مدت درکار ہے ـــــ ذرا سوچئے کہ دونوں میں سے ملک کا بھلا کس صورت میں ہے؟

تیسری بات ـــ یہ سوچئے کہ مارچ ۵۴ء میں دستوریہ توڑنے کا پہلا مطالبہ اٹھا اور اس کی نمائندہ حیثیت کو بعض عناصر نے چیلنج کیا۔ اس مطالبہ اور چیلنج کو دستوریہ کے ارکان وزارت، مسلم لیگ اور تمام ذمہ دار حکمرانوں نے بھی، نیز پریس نے بھی تخریبی قرار دیا۔ سوال یہ ہے کہ مارچ سے ۲۴ اکتوبر تک دستوریہ کے اندر وہ نئے کیڑے کونسے اور کس تاریخ کو پڑ گئے تھے کہ جس کے بعد اس کا وجود ناقابل برداشت ہو گیا؟

چوتھی بات ـــــ یہ سوچئے کہ ۲۴ اکتوبر کے فرمان سے چند روز قبل نون صاحب دستوریہ کے توڑے جانے کی قیاس آرائیوں کی تردید فرماتے ہیں۔ کراچی میں تمام پارٹیوں کا ایک مشترک جلسۂ عام ہوتا ہے جس میں مسلم لیگ بھی شامل تھی اور اس میں زوردار طریق سے "دستوریہ توڑ دو" کے نعرے کی تردید کی جاتی ہے اور مطالبہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ دستوریہ جلد از جلد دستور کو نافذ کر دے۔ لاہور میں جماعت اسلامی کے زیر اہتمام اکتوبر ہی میں ایک بڑا جلسۂ عام ہوتا ہے جس میں دستوریہ کو توڑنے کے مطالبے کی حقیقت عوام پر واضح کی جاتی ہے اور تقاضا کیا جاتا ہے کہ دستوریہ حسب وعدہ اپنا دستور پاس کر کے نافذ کر دے، اس پر کوئی صدائے اختلاف تک نہیں اٹھتی

محمد علی وزیر اعظم امریکہ سے واپس آتے ہیں تو ہوائی اڈے پر ہزاروں افراد کا ہجوم اس مطالبے کے ساتھ ان کا استقبال کرتا ہے کہ دستور جلد نافذ کیا جائے۔ ملک بھر میں اکتوبر میں پانچ جلسے بھی ایسے نہیں ہوئے اور دو چار ریزولیوشن بھی عوام کی طرف سے سامنے نہیں آئے کہ دستور کو توڑ دیا جائے بلکہ اس کے برعکس ہر طرف سے ایسے جلسوں کی روداد یں سامنے آتی ہیں جن میں دستور نافذ کرنے کا مطالبہ دستور سے کیا گیا۔ تو سوال یہ ہے کہ وہ رائے عامہ کون سی تھی، کہاں پیدا ہوئی، کس تاریخ کو اس نے جنم لیا جس کا احترام فرماتے ہوئے جناب گورنر جنرل بالقابہ نے اپنا فرمان نافذ فرما دیا؟

پانچویں بات — یہ سوچئے کہ اس معطل شدہ دستور کے بالمقابل کیا یہ صورت اپنے اندر زیادہ شان نمائندگی و جمہوریت رکھتی ہے کہ موجودہ غیر جمہوری طرز پر مامور شدہ وزراء گورنر جنرل کے مشورے سے ایک دستور کمرے میں بیٹھ کر لکھیں (اور اعلان کیا جا رہا ہے کہ وہ لکھا لکھایا موجود ہے) اور پھر اس پر موجودہ اسمبلیوں سے منتخب شدہ نئے نمائندہ پر مشتمل ایک "صحیح نمائندہ دستوریہ" سے دستخط کرائیں اور اس ڈھانچائی طریق پر ملک کا نامۂ تقدیر اس کے گلے میں زبردستی لٹکا دیا جائے؟

چھٹی بات — یہ سوچئے کہ موجودہ اسمبلیوں سے نمائندے لے کر ایک نمائندہ دستوریہ کس طرح بنائی جا سکتی ہے جب کہ خود ان اسمبلیوں کے بارے میں "نمائندہ دستور" بنانے والے اکابر نے غیر نمائندہ ہونے کے فتوے لکھے ہیں۔ سہروردی صاحب کے مختلف بیانات پنجاب اور سرحد اسمبلیوں کے خلاف موجود ہیں۔ بہاولپور کی اسمبلی کو خود گورنر جنرل نے برطرف فرما کر اس کی حیثیت واضح کر دی ہے۔ سندھ اسمبلی کے بارے میں جو آراء ظاہر کی جا چکی ہیں ان کا ریکارڈ اخبارات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مشرقی بنگال میں متحدہ محاذ کو جو سرٹیفکیٹ اکابر کی طرف سے دیئے گئے ہیں اور جن کی بنا پر ۹۲ ء لگائی گئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اب ان اسمبلیوں کی جو ہر نمائندگی نچوڑ کر جو نئی دستوریہ بنائی جائے گی وہ کس حد تک نمائندہ ہوگی اور اس کا دستور کتنا جمہوری ہوگا؟

ساتویں بات — یہ سوچئے کہ موجودہ دستوریہ کا بنایا ہوا دستور اگر کچھ ناقابل برداشت خرابیاں رکھتا بھی تھا تو ان کے ساتھ اس کے اندر دفعہ ۲۵۴ کے تحت پارلیمنٹ کو مجرد سادہ اکثریت کے ذریعے ترمیم کا اختیار بھی تو دیا جا رہا تھا، پس ہر خرابی بآسانی دور کی جا سکتی تھی۔ موجودہ دستوریہ کی کوتاہیوں کو دور کرنے کے لئے جب خود پارلیمنٹ بھی کافی ہو سکتی تھی تو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس دستوریہ کو ختم کر کے اور اس کے بنے بنائے کو غارت کر کے نئی دستوریہ بلانے پر سوچا جاتا اور ملک کو مزید طویل عرصے کے لئے مجبوری حالت میں رکھا جاتا۔

آٹھویں بات — یہ سوچئے کہ دستوریہ اچھی تھی یا بری، اس کا مرتب کردہ مسودۂ دستور کیسا تھا، وہ کیا چیز ہے جسے ہم سمجھ پانے والے تھے، لیکن اب فرمانِ اکتوبر نے ہمیں اس سے محروم کر کے ہماری قسمت کو معلق کر دیا ہے؟ آگے بڑھنے سے پہلے ایک بار اس مسودے کو سیاسی حوادث کے ملبے کے نیچے سے نکال کر دیکھ تو لیجئے کہ اس میں خوبیاں کیا ہیں اور کمزوریاں کیا ہیں۔ دستوریہ کے خلاف مولویوں کا غبار نکالنے والوں نے کبھی آپ کو یہ بھی بتایا کہ اس کے مسودہ میں کون سی واضح خرابی موجود ہے جس سے نجات پانے کے لئے سارے جھگڑے اٹھائے جا رہے ہیں؟ دستوریہ بری سہی، لیکن اگر دستوریہ نہ ہو تو اصل مطلوب تو دستور ہے۔ گائے کیسی ہی بدشکل ہو، اگر وہ دودھ اچھا دے رہی ہے تو گائے کو پوچھتا کون ہے، دودھ دوہئے اور گائے کو ہانک دیجئے!

تنقید کے تخریبی تصورات اور تعمیری نظریے

محمد عثمان رمز۔ بی اے

کہا جاتا ہے تنقید کو بحیثیت فن پیش کرنے کا سہرا ارسطو کے سر ہے۔ مگر تنقید میں سائنٹیفک اسپرٹ نشاۃ ثانیہ کے بعد پیدا ہوئی۔ اس سلسلہ کے بڑے بڑے نقادوں نے زندگی کو زیادہ سے زیادہ قریب تر ہو کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اور پھر اپنے مشاہدہ و تجربہ کو منظم اور مربوط ڈھنگ پیش کیا۔ مزید برآں مادہ پرست اسکول فن سائنٹیفک اسپرٹ کی توضیح اس طرح بھی کرتا ہے کہ انسان نشاۃ ثانیہ کے بعد خرافاتی اور مذہبی ۔۔ کو شکست دیتا چلا آ رہا ہے۔ اور روز بروز مادی قدریں اپناتا جا رہا ہے۔ یہاں آمنا اور صدقنا کہنے سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ ہم سائنٹیفک اسپرٹ کے مطلب کو واضح طور پر متعین کریں۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی حقیقت مشاہدہ اور تجربہ کو مربوط طریقہ سے پیش کیا جائے تو گنجائش کلام نہیں رہتی۔

مگر ادب اور تنقید میں لفظ سائنٹیفک اسپرٹ اس معنی میں مستعمل نہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ناقد ادب کسی نہ کسی نظریۂ زندگی کا ماننے والا ہے۔ اس کے پاس انفرادی و اجتماعی زندگی کا کوئی نہ کوئی تصور رہتا ہے اور اسی تصور کے مطابق وہ ادب کی قدریں متعین کرتا ہے۔ اور اسی زندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ افراد و قوم کے سرمایۂ ادب پر تنقید و تبصرہ کرتا ہے۔ مثلاً نیٹشے ہی کو لیجئے اس کی تنقید میں BLOOD BEAST جگہ جگہ متحرک نظر آتا ہے۔ یونانی ادب پر جب وہ قلم اٹھاتا ہے تو اسی اسپرٹ کے ساتھ۔ یا پھر مزید وضاحت کے لئے فرائڈین اسکول کو لیجئے فرائڈ خود ماہر نفسیات جب بھی ادب پر تنقید کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ادیب نے مسائل زندگی کی تفسیر اور ترجمانی کس حد تک جنسیات کی روشنی میں کی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے علاج کے لئے ادیب اور ادب نے کس حد تک جنس کو پیش کیا ہے۔

ایسی نام نہاد سائنٹیفک اسپرٹ ہمارے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ اس اعتراض کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس ناقد کو زندگی کی جو بھی قدر یا قدریں اچھی لگتی ہیں وہ انہیں کے متعلق زندگی کی تفسیر و ترجمانی شروع کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر فرائڈ ہی کو لیجئے اس کے نزدیک جنسیات کی اتنی بڑی بنیادی اہمیت ہے کہ وہ زندگی کے تمدنی، ثقافتی، عمرانی اور تہذیبی مسائل کا حل اسی کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اسی طرح عمرانیات کا ماہر اٹھتا ہے اور وہ زندگی کو اسی کے ہر دگرد گھمانا شروع کر دیتا ہے۔ اور یونہی ایک معاشیات کا ماہر اٹھتا ہے اور وہ زندگی کو ۔۔ ۔۔ بنا دیتا ہے۔

اس کا واضح اور صریح نتیجہ یہ دیکھا جا رہا ہے کہ آج وحدت زندگی پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ اس کا لازمی اثر دنیا کے ہر ادب پر پڑا بطور خاص تنقید پر۔ جس طرح زندگی میں وحدت نہیں رہی اسی طرح ادب اور تنقید میں وحدت کا فقدان نظر آتا ہے۔ اس نمایاں نقصان کے باوجود ایک ناقد کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے ادعایت (DOGMA) اور تضاد کو ختم کر دیا ہے اور تنقید کے فن کو سائنٹیفک بنایا ہے۔ ۔۔ سائنٹیفک اسپرٹ کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کو خانوں خانوں میں منقسم کر کے اس کا حل تلاش کیا جائے تو پھر ہمیں کوئی تعجب نہ چاہیئے کہ ارسطو ہی کے سر ادبیت کا سہرا بندھتا ہے۔ اس لئے کہ وہی وہ پہلا مفکر ہے جس نے پہلا ادعائیہ فلسفہ ۔۔ SCIENCES

[illegible] گیا۔ لہٰذا ان کی باقاعدہ فکری بنیادیں رکھیں۔ بعض نے دنیا کے عظیم چھوٹے بڑے نقاد متاثر ہوتے رہے۔ مثال کے طور پر "شعریات" ہی کو لیجئے اس میں ارسطو نے اصول ادب کے تنقید مرتب کرتے وقت جو استقرائی طریقہ اختیار کیا وہ موجودہ سائنٹفک طریقہ استقراء کی بلوغ ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ سائنٹفک اسپرٹ ہمارے ہی دور کی چیز ہے صحیح نہیں۔ بلکہ یہ چیز ہر اس دور کی خصوصیت میں داخل ہوگی جہاں اختلال و انتشار رونما ہو رہا ہوگا یا ہو چکا ہوگا۔ سقراط اور افلاطون کے بعد جب یونانی معاشرہ میں ایک فکری اور سیاسی بحران رونما ہونا شروع ہوا تو سکندریت نے جنم لیا۔ اسی طرح آج انتہائی جزئیت پسندی ایک خوفناک رفتار کے ساتھ تخریب کی طرف چلی جا رہی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم سرمایۂ تنقید کا جائزہ لیں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ سائنٹفک اسپرٹ کے بارے میں دو چار جملے اور تحریر کروں۔ اس کے گن گانے والے، اگر دیکھا جائے، تو مشاہدہ اور تجربہ پر اپنا تمام زور صرف کر دیتے ہیں اور دوسرے مکاتب فکر کی کاوشوں کو وہمی، تخیلی اور روحانی کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم مشاہدہ اور تجربہ کو محض لفظی معاوضہ میں رد نہ کریں بلکہ اس کی وسعتوں کی حد تک اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اگر ہم غور کریں تو ہماری قوت مشاہدہ ہی ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کی حیثیت اس کائنات میں ایک چھوٹی اکائی کی ہے۔ اور اس کا رشتہ دو گونہ ہے۔ ایک تو اس کی زندگی کا وہ رخ ہے جہاں وہ کائنات کی تمام دوسری اشیاء اور کی طرح اصول فطرت کا پابند ہے[1]۔ اور اس کا مجبور کردہ بھی۔ اور ایک وہ رخ ہے جہاں وہ تمام دوسری مخلوقات سے الگ اپنی ایک آزاد حیثیت رکھتا ہے[2]۔ اس کی یہ آزاد حیثیت اس کے وجود کو ایک اخلاقی وجود بنا دیتی ہے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنا خدا وہ خود ہے یا کوئی ایسی خالق طاقت ہے جو اس سے زندگی کے نظم و ضبط کا مطالبہ کرتی ہے تاکہ اس کی زندگی کے دونوں رخوں میں توازن برقرار رہ سکے۔ بالفاظ دیگر انسان کے سامنے بنیادی مسئلہ زندگی کے طور پر یہ مسئلہ نہیں کہ کون ظالم ہے کون مظلوم؟ کون مالک ہے کون مزدور؟ کون غریب ہے کون سرمایہ دار؟ بلکہ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنی خود اختیاری کو اختیارات دینے والے کی مرضی کے مطابق استعمال کرے یا اس سے صرف نظر کر کے خود ساختہ بنیاد اپنائے۔ اگر واقعی اس سے کسی کو اتفاق ہے کہ انسان کی حیثیت اخلاقی وجود کی ہے تو پھر اس سے انکار نہیں کہ ادب اور تنقید اس اخلاقی بنیاد سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔ ان میں وہی رشتہ ہے جو تانے اور بانے میں ہوتا ہے۔ اب اس جملہ معترضہ کے بعد آیئے ذرا تنقیدی سرمایہ کا مختصر جائزہ لیں۔

اردو ادب کی تاریخ پیدائش تو متنازعہ فیہ ہو سکتی ہے مگر نقد ادب کے بارے میں تمام نقاد اس پر متفق ہیں کہ اردو ادب میں باقاعدہ تنقید ۱۸۹۳ء کے بعد حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" سے شروع ہوتی ہے۔ یہ اگرچہ تعجب خیز ہے کہ ادب تو پیدا ہو جائے گا اور تنقید صدیوں کے بعد جنم لے۔ اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ تنقید سے پہلے (مراد اک طویل عرصہ پہلے) جو ادب پیدا ہوتا ہے وہ اس کی تابع ہے۔

---

[1] مثلاً اس کے دوران خون کا نظم ایک خاص پلان کے تحت عمل کر رہا ہے۔ یا یہ کہ انسان اس عالم محسوسات میں چیزوں کا احساس ایک خاص قانون کے تحت کرتا ہے وغیرہ۔

[2] انسان ایک آزاد حیثیت ان معنوں میں رکھتا ہے کہ وہ دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں ایک ایسی قوت رکھتا ہے جو ان میں نہیں۔ یہ قوت عقل و شعور ہے۔ جو شعوری طور پر علم و عمل کا جامہ پہنتی ہے۔ اسے چاہے تو انسان حق کے لئے استعمال کرے اور چاہے تو اس سے باطل کی خدمت انجام دے۔

مشین کلچر کی آمد سے کبھی کسوٹی کے اور پرکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو قوم صدیوں تک اعلیٰ ادب پیدا کرتی چلی آتی ہے تنقید سے بیگانہ رہتی ہے تو وہ اپنی اصلاحی صلاحیتیں کھو چکی ہوتی ہے جو نہ تو ٹریکٹر کی آمد سے پیدا ہوتی ہے اور نہ کہ ایٹم بم اور مائنڈ ریڈنگ سے نمایاں ہوتی ہے۔ بلکہ ان کا تعلق اخلاقی قوتوں سے ہوتا ہے۔ اور یہ اخلاقی قوتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ اخلاقی قوتیں جن کا سرچشمہ تو فطرت ہیں ـــ اس کا تعلق انسان کے طبعی شعبۂ زندگی سے ہے۔ اور دوسری وہ جن کا منبع خود انسان کا اخلاقی وجود ہوتا ہے ـــ اس کا تعلق انسان کے اخلاقی شعبۂ زندگی سے بحث کرتا ہے۔

لہٰذا ناقدین ادب کا یہ کہنا کہ اردو ادب میں تنقید ـــ سائنٹیفک تنقید ـــ مشین اور ٹریکٹر کی آمد سے شروع ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک قطعی صحیح نہیں۔ یونانی ادب کو لیجئے ان میں کئی ایک چوٹی کے نقاد پیدا ہوئے۔ جن میں لانگی نس ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں یوجیہ کا خیال ہے کہ :

> "لانگی نس کے سوا کسی قدیم یونانی نقاد نے، یہاں تک کہ ارسطو نے بھی اس واقعہ کو
> ملحوظ نہیں رکھا تھا کہ ادب کی اعلیٰ اور پر عظمت تصانیف کی پیدائش کا سب سے بڑا ذریعہ اس
> زمانہ کے اخلاقی اور معاشرتی رواج ہوتے ہیں"۔

اس کو مشین اور ٹریکٹر سے کوئی واسطہ نہیں۔ مگر ہو سکتا ہے کہ عصر حاضر کے سائنٹفک نقاد یہ کہنے سے گریز نہ کریں کہ یونانی ادب یا لانگی نس کو زندگی سے کیا واسطہ رہا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ موجودہ سائنٹیفک اسپرٹ اپنے اصل کے اعتبار سے یونانی ہی ہے۔ اس لئے فرق اسپرٹ کا نہیں بلکہ تصور زندگی کا ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ ہندوستان میں فن تنقید مشین اور ٹریکٹر کی آمد کے بعد وجود میں آیا صحیح نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اردو داں ادیب و انشاء پرداز جو خانقاہی تصوف اور شاہی زنانے محلوں سے باہر نکلے اور عوام سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا تب انہیں احساس ہوا کہ وہ کہاں اور کس مقام پر تھے۔ انہوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ ان پراگندہ ذہنوں کی فتح میں ان کی باصلاحیت ہونے اور اخلاقی اصولوں کا بھی ہاتھ ہے۔ اردو ادیبوں اور مفکرین میں سرسید تھا اس کو سب سے پہلے محسوس کیا اور انہوں نے اسی جذبۂ تاثر کی تحت رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ مگر چونکہ ہندوستانی کے دماغ ایک عرصہ دراز معطل اور جمود کے شکار چلے آ رہے تھے اس لئے ان کے اندر اختراع کی بجائے نقالی کا جذبہ پروان چڑھنے لگا۔ سرسید بھی اس سے بچ نہ سکے۔ مغربیت ـــ مغربی لادینیت کے اخلاقی اقدار ـــ کو انہوں نے شعوری اور لاشعوری طور پر ادب و فکر میں سمونا شروع کر دیا جس کے نتیجہ کا اثر آج کی نسلوں کو بھی ہے۔

ان کے بعد حالی نے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامہ کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور اس کے نتیجہ میں اردو ادب کو ایک نئی شاہراہ پر لے کر چلنے ان کے سامنے مولانا شبلی اور سرسید دونوں ہی کی شخصیتیں تھیں۔ اور وہ مولانا کے فکر مذہب اور سرسید کے فلسفہ نیچرلزم کے بیچ بیچ چلنا چاہتے تھے مگر ابھی وہ دن اردو ادب کے نہیں آئے تھے جب کہ اس میں فلسفہ و تحریک کا کوئی کامیاب امتزاج مل سکے۔

ادیبوں اور نقادوں میں نئی نئی قدروں کی تلاش شروع ہو چکی تھی۔ بیشتر کی نظریں مغرب کی طرف اٹھ رہی تھیں اس لئے کہ اخلاقی، سیاسی اور فکری اعتبار سے وہی غالب تھا۔ خاص طور پر برطانوی، فرانسیسی اور جرمن فکر و فلسفہ، ورڈسورتھ، ایڈیسن، پوپ اور جانسن کی طرف مرعوبیت سے دیکھتے۔ مگر روس کا جھنڈا بھی پروان پا رہا تھا۔ پھر یہ کہ انگریزی سامراجیت کے مظالم جب اور بڑھے تو ہندوستانیوں نے سنجیدگی سے بدھ اور دھرم قطری روحانی طرز اور روس کے بالزاک، ترجنیف، گورکی اور ٹالسٹائی ملک کی طرف بھی دیکھنا شروع کیا۔ اقبال اسی دور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے خود فلسفۂ

تھی۔ کوشش سے پیرانِ پیر بننے کی کوشش کی۔ محمد علی ایک ذہین اور طباع فلسفی پائی تھی اس لئے اپنے کو کسی میں ضم نہیں کیا۔ بلکہ اپنی ایک علیحدہ تحلیلِ فکر نکالی۔ میرے خیال میں اردو ادب میں اقبال نے پورے ایک دور کا اضافہ کیا۔ اردو ادب اب تک جس سے محروم تھا — یعنی فلسفہ[1] — وہ اقبال نے عطا کیا۔ مگر "شانِ رزاقی" کو چیلنج دینے والا اقبال عقرآن صد بابِ پہلوئی پر ہی قانع ہو کر رہ گیا۔ ورنہ اس کا فلسفہ آج کسی تحریک کی آغوش میں پروان چڑھتا اور اس کی شخصیت جو دور بہ دور بدلتی رہی اپنے اندر یک رنگی کی حامل ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال نے اردو ادب اور شاعری میں بہت ہی اضافہ کیا۔ مگر نہ تو ابھی ہندوستان ہی آزاد ہوا تھا اور نہ ہی وہ مذہبی غلامی کے جوئے کو اتار پھینک سکا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد مارکسیت کے ہاتھوں برطانوی اقتدار کو ایک شدید دھچکا لگا۔ اس لئے کہ مارکسیت نے جنگِ عظیم کی پیدا کردہ انتشاری صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ بالشویک انقلاب کے بعد مارکسی تصورات اشتراکی تحریک کے سہارے چل نکلے۔ اور ان تصورات کا اثر دور نزدیک سب پھیلنا شروع ہوا کچھ فرانسیسی ادیبوں نے بھی اُس کے تصورات کو اپنا لیا۔ رومان رولاں ان میں نمایاں اور ممتاز ہے۔

ہندوستان میں نئی پود نے جب اشتراکی تصورات کا مطالعہ کیا تو اس میں انہیں اک "پیغمبرانہ صداقت" نظر آئی۔ اس لئے کہ انگریزی سامراجیت کے مظالم، جامد مذہب کی لوٹ کھسوٹ اور سرمایہ داروں کے تشدد اس کے لئے کافی تھے۔ وہ ان سب کے مخالف ہو گئے۔ مذہب کی مخالفت نے (جو عقل سے زیادہ جذباتی ہے) اخلاقی قدروں سے بھی بے نیاز کر دیا۔ ان کے پاس لے دے کر مارکسی اقدارِ حیات — مادی اقدارِ حیات، رہ گئی تھیں۔ ان قدروں پر ادب اور تنقید کی بنیاد رکھنے کی اوّلیت اختر رائے پوری کو ہے۔ ان کی کتاب "ادب اور انقلاب" اشتراکی تصورِ تنقید کی پہلی کتاب ہے۔ اردو ادب میں یہ دور ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے۔ یہیں سے اردو ادب میں ادبیت، فلسفہ اور تحریک کا امتزاج ملتا ہے۔ اور یہیں سے ادب برائے زندگی کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔ اور تنقید میں سائنٹیفک اسپرٹ کا دعویٰ شروع ہوتا ہے۔ ہمیں یہاں پر نہ تو "ادب برائے زندگی" پر بحث کرنی ہے اور نہ ہی اب سائنٹفک اسپرٹ پر کچھ کہنا ہے۔ بلکہ جو چیز مجھے آپ کے سامنے پیش کرنی ہے وہ اشتراکی تصورِ تنقید ہے۔

اشتراکی تصورِ تنقید کے بارے میں ہمارے نزدیک یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اشتراکیین اشتراکی ادیبوں کے علاوہ اور کسی کو نہیں سراہتے۔ ہمارے لئے یہ ایک فروعی بات ہے۔ البتہ میں رہنما اشتراکیین اور اشتراکی تصورِ تنقید میں اگر بہت گمبھیر نہیں تو پھر بھی خاصا تضاد محسوس کرتا ہوں مثلاً گورکی ایک موقع پر لینن کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس نے بیتھوون کا گایا ہوا ایک نغمہ سننے کے بعد کہا "یہ نغمہ مافوق البشر ہے۔ میں اسے بار بار سننا پسند کرتا ہوں۔ لیکن میں موسیقی کے لئے اکثر و بیشتر وقت نہیں نکال سکتا۔" یا ٹالسٹائی ایک جگہ کہتا ہے کہ "کوئی فنِ ادب کی توثیق و تردید میں ہمیشہ مارکسی اصول کو نہیں برت سکتا۔ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ فن کو خاص فن کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔" مجھے تضاد بیان کا احساس اس وقت اور بھی ہوتا ہے جب کہ ہمیں اشتراکی ادیب و ناقد مل جل کر یہ بتلاتے ہیں کہ "لینن نے "ادب پر بحث کرتے ہوئے نظریۂ عکس (THEORY OF REFLEXION) کو رواج دیا"۔ ایک اشتراکی نقاد لکھتا ہے "کسی زمانہ میں شعر آسمان سے نازل ہوتے تھے اور شاعر ملہم کہلاتا تھا۔ لیکن آج ایسا

---

[1] یہاں فلسفہ سے میری مراد وہ زندگی آمیز فکری قوت ہے جو انسانی زندگیوں کو گرمایا کرتی ہے۔ یہ چیز اردو ادب کے ماقبلِ اقبال کے دور میں مجھے نہیں ملتی۔ ورنہ یوں تو جامد فلسفے کب اور کہاں نہیں رہے۔

تنقید ادب دیگر فنون کی طرح ایک فن ہے ۔ مگر اس کے اوجہ ہیئتوں کا نقد اور تین الجھتے ہے ۔
یہ توجملہ معترضہ کے طور پر ایک بات آ گئی تھی اب سنئے ممتاز حسین صاحب اپنے ایک مقالہ ۔۔۔ تنقید کا مارکسی نظریہ ۔۔۔ میں تحریر کرتے ہیں

> "دنیا کا ہر ادیب یا شاعر کائنات اور حیات کے متعلق ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے یہی نظریہ زندگی کے تجربات سمجھنے میں مدد پہنچاتا ہے ۔ گو کہ واقعات اور تجربات بھی زندگی کو متاثر کرتے رہتے ہیں مگر اس سلسلہ عمل کے ابتدائی نقطہ کی دریافت میں شدید اختلاف ہے ۔ یعنی اسکول اس کو زندگی سے مقدم سمجھتا ہے ۔ برخلاف اس کے مارکسی فلسفہ مادے کو خیال سے مقدم تصور کرتا ہے اور اسے متحرک اور تغیر پسند بتاتا ہے ۔ انسانی زندگی اسی متحرک اور تغیر پسند مادے کی ایک انفعالی صورت ہے "

تقدیم و تاخیر مادہ و خیال (روح) کا جھگڑا صدیوں پرانا ہو چکا ہے ۔ جس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ انسانی عقل اس کا کوئی سائنٹیفک جواب دینے سے عاجز رہی ہے ۔ اس مسئلہ کی اہمیت اس پہلو سے نہیں کہ کون پہلے اور کون بعد ، بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ ان دونوں میں توازن اور توافق کا سامان کونسا نظریۂ زندگی پیش کرتا ہے ۔ ہمارے علم کی حد تک یہ کام صرف اسلام انجام دیتا ہے ۔ اور اسلامی ادب زندگی کی قدروں کو انہیں اچھی طرح سمو سکتا ہے ۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ تمام اشتراکیین فلسفۂ تغیر کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں ۔ اور پھر نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ " انسانی فطرت ذرائع پیداوار کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے " ۔ اس کا انطباق اشتراکی ادیب اور ناقد کچھ اسی طرح کرتے ہیں ۔ کہ جاگیردارانہ نظام میں عورت بالکل ہی پابہ زنجیر تھی ، وہ کسی پنجرہ میں بند کردہ پنچھی کی طرح تھی ۔ جب صورت حال یہ تھی تو اردو ادب کے شعراء معشوق کے حرم کی دیواریں پھلانگتے ، نہ پھلانگ سکتے تو در کے سامنے بستر لگاتے ، اس سے بھی مایوس ہوتے تو چلمن پر نظریں جما دیتے ۔ مگر ! جوں ہی معاشی اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہو گئیں عورت کی فطرت بدلتی گئی ۔ اور جنسی آزادی کی راہ ہموار ہوتی گئی ۔ یہاں تک کہ اردو ادب کی رومانیت اور تصوراتی محبت کی جگہ جنسی ۔ حقیقی ۔۔۔۔ عشق نے لے لی ۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی فطرت واقعی ذرائع پیداوار کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے ؟ ہم سمجھتے ہیں ۔ نہیں ۔ مثلاً غلامی کے دور سے لے کر آج تک بلکہ ماقبل تاریخ سے لے کر آج تک ذرائع پیداوار نے سینکڑوں کروٹیں لیں مگر ظلم کو ناپسند کرنے کا جذبہ ۔۔۔ جو کہ انسانی فطرت ہے ۔۔۔ کیا بدل گیا ؟ کیا آج کوئی خود ظلم کو پسند کرنے لگی ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ فطرت کوئی اضافی چیز نہیں بلکہ اس کا تعلق براہ راست قوانین فطرت سے ہے جو خود کبھی نہیں بدلتے ۔

تبدیلی فطرت کے علاوہ ایک اشتراکی ناقد جس چیز پر زور دیتا ہے وہ شعورِ انسانی کے ارتقاء کی مادی تفسیر ہے ۔ اسے سلیم احمد نے " ادب کی بنیادی قدریں " میں فلسفۂ تغیر اور تبدیلی فطرت کے لازمی نتیجہ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس سے تو کسی کو اختلاف نہیں کہ ذہن انسانی ارتقاء کرتا رہا ہے ۔ اختلاف جس سے کیا جا سکتا ہے وہ تصور ارتقاء ہے ۔ ہماری سمجھ میں مادی مفکرین کی یہ بنیادی غلطی ہے کہ سلسلۂ ارتقاء میں (وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ) اشیاء کی فطرت بدل جاتی ہے ۔ حالانکہ وہ اپنی جگہ پر دائم ہوتی ہے ۔ یہ بات اس وقت اور عجیب سی معلوم ہوتی ہے ۔ جب کہ یہ کہا جاتا ہے کہ انسانی زندگی کے ارتقاء میں سب سے زیادہ عامل ذریعہ پیداوار رہا ہے ۔ اس لئے کہ ایک جاندار قوت کو ایک غیر جاندار عامل کنٹرول کر رہا ہوتا ہے ؟

[illegible]

[illegible] (۱) اور قرآن [illegible] ہم [illegible]

[illegible] ایک کا [illegible] آرہا ہے [illegible] ہماری [illegible] تنقید و ادب [illegible] ہو جاتی ہے کہ [illegible] ان میں کوئی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً تورات، زبور، انجیل اور قرآن سب اپنی روح کے اعتبار سے ایک ہیں مگر معاشرت، تمدن، تہذیب اور انفرادی و اجتماعی نفسیات کی تبدیلیوں کے باعث ان کتابوں کی ہیئت ترکیبی میں گوناگوں پہلو ملتے ہیں۔

اب سوال اس کا رہ جاتا ہے کہ اسلامی نظریۂ تنقید و ادب کے وہ کون سے اصول ہیں جو قوانین فطرت کی طرح غیر متبدل ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو مجھے عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی نوعیت وجود کے اعتبار سے ایک اعلیٰ فعّال قوت سے ہم رشتہ ہے۔ اور اس رشتہ کی نوعیت بنیادی طور پر اخلاقی ہے۔ اس کے بارے میں ہم اگر کسی قسم کی قیاس آرائی سے کام لینا چاہیں تو نہیں لے سکتے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فی الحقیقت کیا ہے مگر اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتا دیا ہے دراصل اسی پر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا انحصار ہے۔

اس کی مثال یوں لیجئے کہ اس اعلیٰ فعّال قوت نے اپنے بارے ہمیں یہ بتایا کہ وہ نظم کائنات سے پوری طرح باخبر ہے اور کائنات کی ہر شے کا اسے علم ہے نیز یہ کہ وہ انسان کے اقوال و اعمال سے بھی باخبر ہے جن کے محاسبہ کا ایک دن بھی مقرر ہے۔ اب اس گنجینہ اصول کو (جس میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں) اسلامی ادب اور نظریۂ تنقید ایک اہم بنیاد کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ اسلامی نظریۂ تنقید کی کسوٹیوں میں یہ ایک کسوٹی ہوگی جو کہ ہمارے مختلف پیچیدہ گتھیوں کو سلجھائے گی۔ بالخصوص اس جنسی الجھاوے کو جو موجودہ تہذیب نے بطور حق وراثت دیا ہے۔ اس لئے کہ مسئلۂ جنس کا تعلق خواہ کتنا ہی کچھ لاشعور سے ہو مگر ہر جنسی جرم مجرم شعور انسانی کی شہہ پر ہوتا ہے جس میں ماحول بھی معاونت کرتا ہے۔ اس لئے اصطلاح کی سبیل محض شعور اور شعور کا تجربہ اور دار التجربہ میں مخلوط تعلیم کا پڑھ لینا نہیں بلکہ فی الحقیقت اس مذکورہ بنیاد کی روشنی میں ایک نظریاتی اور ذہنی انقلاب پیدا کر دینا ہے (خواہ وہ فرد ہو یا کوئی سوسائٹی — علاج دونوں کا یہی ہے) اسلامی نظریۂ تنقید اپنے پچھلے اور موجودہ سرمایۂ ادب کو اسی اصول کی روشنی میں دیکھے گا۔ اور اگر یہ بات قیمہ کے طور پر نکلی کہ:

"ہائے ان بیچاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار"

تو مرود کہی جائے گی اور مثبت طور پر اس قدر زندگی کو پیش کیا جائے گا جو افراد و قوم میں مسابقتی اسپرٹ پیدا کرتی ہے۔

دوسری بات جو مجھے لکھنی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ہمیشہ سے یک رنگ رہا اس کی فطرت غیر متبدل ہے اور اپنی اندرونی ملاوٹ سے بلند ہو کر ایک وحدت رکھتی ہے۔ وحدت فطرت اور اس کی دوسری خصوصیات کسی ایک فرد یا چند افراد یا کسی ایک قوم کے افراد کا سرمایہ نہیں بلکہ یہ ایک نقد مشترک ہے جو ہر NORMAL انسان کے حصہ میں آئی ہے۔ اس لحاظ سے تمام کے تمام انسان ایک برادری — عظیم برادری کی چھوٹی چھوٹی اکائیاں — ہیں۔ ان میں جغرافیائی دیوار کبھی حائل نہیں ہو سکتی۔ مگر بدقسمتی سے جس ادب نے جغرافیائی دیواریں اٹھائی ہیں اور انسانوں کے درمیان خلیجیں اور کھائیاں کھودی ہیں — جیسے نازی ادب — یا موجودہ مغربی لادینی ادب — ان پر اسلامی نظریۂ تنقید استخفاف کی نظر [illegible]

[illegible] مسابقتی اسپرٹ سے میری مراد یہ ہے کہ انسان اور سوسائٹی میں ایک ایسا ذہنی انقلاب پیدا کیا جائے جس سے ہر فرد اور سوسائٹی خود اپنا محاسبہ کرے اور یہ کہتے ہوئے کہ تمام کی تمام زندگی ایک امتحان ہے جس کا نتیجہ زندگی ختم ہونے کے بعد [illegible] جس نتیجہ اور جس نتیجے کے اعلان میں حق کی طرف سے کوئی رعایت نہ برتی جائے گی۔

"پرانی عمارت"

زکی زاکانی

پرانی عمارت گرا چاہتی ہے
گرا چاہتی ہے پرانی عمارت
نہ آئے گی آندھی نہ اُٹھے گا طوفاں
نہ برسیں گے بادل نہ چمکے گی بجلی!
نہ آئے گا جھٹکا کوئی زلزلے کا!
اچانک سُنا جائے گا اک دھماکہ
دہل جائے گا جس سے دل زندگی کا
زمیں کانپ اُٹھے گی جس کے اثر سے
فلک جس سے لرزہ براندام ہوگا
گھڑی آن پہنچی قیامت کی سر پر
اچانک زمیں ایک بدلے گی کروٹ
بس اک ثانیے ایک ہی ثانیے میں
اچانک گرے گی پرانی عمارت
نکل جاؤ لوگو! نکل جاؤ لوگو!
اِدھر بھاگ جاؤ اُدھر بھاگ جاؤ
پرانی عمارت یہ انسانیت کی
گرا چاہتی ہے گرا چاہتی ہے
گرا چاہتی ہے پرانی عمارت
پرانی عمارت گرا چاہتی ہے

یہ اکھڑی ہوئی چھت
شکستہ شہتیریں
[illegible] میں چھپی ہوئی سی
[illegible]

یہ شہتیریاں کرم خوردہ پرانی!
جنہیں گھیر رکھا ہے چمگادڑوں نے
یہ سبزہ سا اُگتا ہوا چار جانب
ہیں جس میں چھپی کھڑکیاں ٹوٹی پھوٹی
شکستہ در و بام بر سینہ چھت
یہ بنیادیں اکھڑی ہوئی شور خوردہ
ہزاروں برس جن میں مرتا رہا ہے
غلاظت سے بھرپور گاڑھا سا پانی
کہاں تک کھڑی رہ سکیں گی زمیں پر
اچانک زمیں ایک بدلے گی کروٹ
اچانک اکھڑ کر گریں گی کچھ اینٹیں
پھر اک دم سُنا جائے گا اک دھماکہ
نکل جاؤ لوگو! نکل جاؤ لوگو!
مبادا کوئی دب کے رہ جائے نیچے
اِدھر بھاگ جاؤ اُدھر بھاگ جاؤ
پرانی عمارت یہ انسانیت کی
گرا چاہتی ہے گرا چاہتی ہے
گرا چاہتی ہے پرانی عمارت
پرانی عمارت گرا چاہتی ہے

ہوا کا بس آئے گا اک تیز جھونکا
لرز کر زمیں پر گرے گا پلستر
پلستر کہ جس نے ہزاروں برس تک
[illegible]

یہ [illegible] زدہ پیلا چہرہ
چھپائے ہوئے ہے جو لاشوں کا چہرہ
گھٹا ہوا سا لرزتا ہوا سا
بس اب آ رہے گا زمیں پر اچانک
[illegible]
[illegible] انسانیت کی
پرانی عمارت کے تاریک گوشے
جہاں مچھروں، کھٹملوں، پسوؤں نے
حکومت بنا رکھی ہے اپنی اپنی
بس اب خاک میں دب کے رہ جائیں گے سب
یہ شہتیریاں جن کے دامن میں چھپ کر
بہت چین پایا ہے چمگادڑوں نے
اکڑ کر گریں گی زمیں پر اچانک
یہ کیڑے کوڑے، یہ مچھر، یہ کھٹمل
یہ چوہے
یہ چمگادڑیں
اور یہ پسّو
یہ بچے بھڑوں کے یہ سانپ اور بچھو
اچانک ہی نابود ہو جائیں گے سب!
نہیں کوئی طاقت بچا سکتی ان کو
نشانے ہے اب موت کے شش پہلو کے
ہے چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا
گھڑی آن پہنچی قیامت کی سر پہ
کوئی رو رہا ہے کوئی چیختا ہے
بہت ہو رہی ہے دہائی دہائی!
مگر [illegible] ہیں
[illegible]
[illegible] تعمیر اس کے

بہت دیر سے منتظر تھے جو اس کے
کہ گرتی ہے کب یہ پرانی عمارت
وہی اب کھڑے دُور سے کہہ رہے ہیں
نکل جاؤ لوگو! نکل جاؤ لوگو
یہاں سے بھاگ جاؤ [illegible]
پرانی عمارت یہ اب [illegible]
گرا چاہتی ہے گرا چاہتی ہے
گرا چاہتی ہے پرانی عمارت
پرانی عمارت گرا چاہتی ہے

اُٹھائی گئی تھی عمارت یہ جس دم
بہت اس کے نقشے بنائے گئے تھے
زمیں کہہ رہی ہے کہ معمار اس کے
بہشت بریں سے منگائے گئے تھے
بہاروں سے رنگینیاں وام لے کر
در و بام اس کے سجائے گئے تھے
ڈبو کر قلم رنگِ انسانیت میں
کئی بیل بوٹے بنائے گئے تھے
اسے ظلمتوں سے بچانے کی خاطر
دیئے مہر و مہ کے جلائے گئے تھے
مکمل ہوئی تھی عمارت یہ جس دم
ترانے مسرت کے گائے گئے تھے
شراب آدمیت کی بانٹی گئی تھی
محبت کے ساغر لنڈھائے گئے تھے
بکھیرے گئے تھے ستاروں کے موتی
خزانے فلک پر لٹائے گئے تھے
تماشا [illegible] تھا جو جشن زندگی کا
بہت پھول اس پر چڑھائے گئے تھے

اصولِ آدمیت کے طور رکھ گیا
اہم فیصلے کچھ سنائے گئے تھے
مگر آہ!
ابھی کچھ سنے تھے اب تک
[illegible]
دیکھا کسی نے حسنِ زندگی کو
نہ پایا کسی نے ابھی رازِ ہستی
بس اپنی تمناؤں کی کج روی سے
ہر اک شے کو زیر و زبر کر دیا ہے
مٹا کر بہاروں کی تابانیوں کو
ستاروں کو داغِ جگر کر دیا ہے
پلا کر ہر اک چیز کو جامِ مستی
ہر آواز سے بے خبر کر دیا ہے
ہر اک حسن میں بھر دیا رنگِ آتش
ہر اک درد کو دردِ سر کر دیا ہے

ہیں ڈالے عمارت میں انسانیت کی
ہزاروں بہم خود پرستی نے رخنے
شگاف اس میں ڈالے ہیں بدکاریوں نے

یہ درزیں یہ خم دے رہے ہیں گواہی
کہاں تک کھڑی رہ سکیں گی زمیں پر
یہ بنیادیں اکھڑی ہوئی شور خوردہ
ہزاروں برس جن میں مرتا رہا ہے
غلاظت سے بھرپور ناپاک پانی
یہ ادھڑی ہوئی چھت

شکستہ منڈیریں
یہ دراڑیں کائی میں لپٹی ہوئی سی
کہاں تک کھڑی رہ سکیں گی زمیں پر
اچانک [illegible]
بس اک ثانیے ایک ہی لمحے میں
اچانک گرے گی پرانی عمارت
اور اک پھوٹ نکلے گا
چشمہ لہو کا

لہو!

ہاں لہو!

جو ہزاروں برس سے
پیا جا رہا تھا بہانے بہانے

اور اب!
جب گرے گی یہ کہنہ عمارت
تو ہر اینٹ اس کی
اگل دے گی سارا
لہو جو ہزاروں برس تک پیا ہے
نکل جاؤ لوگو نکل جاؤ لوگو
ادھر بھاگ جاؤ ادھر بھاگ جاؤ
مبادا کوئی دب کے رہ جائے نیچے
پرانی عمارت یہ انسانیت کی
گرا چاہتی ہے گرا چاہتی ہے
گرا چاہتی ہے پرانی عمارت
پرانی عمارت گرا چاہتی ہے

آسمانی ادب

(قرآن کے ادبی جمال کا انعکاس)

نئی نسلوں کی اٹھان کے لیے اسلامی خاکہ

اور ہم نے لقمان کو یہ سوجھ بوجھ (کی تعلیم) دی تھی کہ اللہ کا حق مان! —— اور جو کوئی (اپنی زندگی میں) اللہ کا حق مانتا ہے تو وہ بس (اپنی ہی) جان کی بھلائی کے لئے مانتا ہے۔ اور جو کوئی (اللہ کے حق سے) انکار کرتا ہے تو (ایسے لوگوں سے) اللہ بے نیاز ہے اور وہ (کسی کے ماننے بغیر) اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔

اور (ذرا تصور میں لاؤ وہ موقع) جب لقمان نے اپنے بیٹے کو فہمائش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اے میرے بیٹے اللہ کے ساتھ (اس کی ذات، صفات، حقوق اور اختیارات میں) کسی اور کو حصہ دار نہ ٹھہرائیو! —— بالیقین شرک بڑی بھاری بے انصافی ہے!"

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے بارے میں وصیت کی —— اس کی ماں اسے تھکن پر تھکن اٹھا کر پیٹ میں رکھتی ہے اور پھر دو برس میں جا کر اس کی دودھ چھڑائی ہوتی ہے۔ —— وصیت یہ کہ میرا حق مان اور (میرے حق کے بعد) اپنے والدین کا حق مان! آخرکار لوٹ کر آنا تو میری ہی بارگاہ میں ہوگا!

لیکن اگر وہ اس بات پر تجھ سے کشمکش کریں کہ میرے ساتھ کسی (ایسی طاقت) کو شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تجھے کوئی (مستند) علم حاصل نہیں ہے تو ایسی صورت میں ان کی اطاعت مت کر اور (دنیوی امور میں) بھلے اسلوب سے ان کے ساتھ میل جول رکھ۔ اور (اپنی زندگی بنانے کے لئے) اُن کے پیچھے چل جو میری طرف رجوع کریں۔ پھر تم سب کو میری ہی طرف پلٹنا ہے اور میں (محاسبہ کرکے) تم کو تمہارے کئے کرائے سے آگاہ کر دوں گا!

ہاں تو، لقمان نے کہا :-

"اے میرے بیٹے! اگر کوئی چیز رائی کے دانے کی صورت میں ہو، اور چاہے وہ کسی پتھر کے اندر ہو، یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو، اللہ اس کو لا حاضر کرے گا۔ یقیناً اللہ رازداں ہے، خبردار ہے!"

"اے میرے بیٹے! نماز قائم کر اور (لوگوں کو) نیکی کی دعوت دے اور برائی سے روک! اور (اس کام میں) جو صورت حالات بھی پیش آ جائے اس کو ہمت سے برداشت کر! —— بیشک (بیٹا) یہ ہیں ہمت کے کام!"

"اور لوگوں کے سامنے (گھمنڈ سے) اپنے گال نہ پھلا اور زمین میں اکڑ کی چال نہ چل! بالیقین اللہ تعالیٰ متکبروں گھمنڈیوں کو پسند نہیں کرتا۔"

اور اپنی (زندگی کی) چال میں اعتدال پیدا کر اور اپنی آواز دھیمی رکھ —— یقیناً ناپسندیدہ ترین آواز گدھے کی آواز ہے۔"

(سورۂ لقمان)

نمائندۂ حق نے فرمایا

(جوکا ہر قول وفعل حجت ہے)

○ یہ ابو یعلیٰ معقل بن یسارؓ کا بیان ہے :-

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ: "کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ ایک رعیت کی سربراہ کاری سونپے اور وہ جس دن مرے تو ایسی حالت میں مرے کہ وہ اپنی رعیت سے خیانت کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کو حرام نہ کر دے۔"

ایک دوسری روایت میں آخری الفاظ یوں ہیں :- "کہ وہ خیر خواہی سے اس کی حفاظت نہ کر رہا ہو تو وہ جنت کی بو بھی نہ سونگھے گا!"

ایک اور روایت میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :-

"کوئی حکمران جو مسلمانوں کے معاملات کا سربراہ کار بنایا گیا ہو اور پھر وہ ان کی خدمت انجام دینے کے لئے سرگرمی نہ دکھائے اور ان کی خیر خواہی نہ کرے وہ ان مسلمانوں کے ساتھ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا!"

○ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے :-

میں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے سنا کہ: "اے اللہ! جو کوئی میری اُمت کا کسی معاملے میں سربراہ کار بنے اور پھر وہ اُن پر سختی کرے تو تو بھی اُس کے ساتھ سختی کر! اور جو کوئی میری امت کا کسی معاملے سربراہ کار بنے اور وہ اُن سے نرمی برتے تو تُو بھی اُس سے نرمی برت!"

○ یہ ابو مریم الازدی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، آپ نے حضرت معاویہؓ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ :-

میں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے سنا کہ "اللہ تعالیٰ جس شخص کو مسلمانوں کے کسی معاملے میں سربراہ کاری دے اور پھر وہ ان کی حاجات، ان کی ضروریات اور ان کی ناداری سے اپنی آنکھیں بند رکھے تو اللہ تعالیٰ بھی قیامت کے دن ایسے شخص کی احتیاج اور ضرورت اور بے چارگی سے بے نیازی برتے گا!"

استنباط :- ★ مسلمانوں کے حکمرانوں کے لئے یہ روا نہیں کہ رعیت کے ساتھ خیانت کا معاملہ کریں، یعنی اپنے حقوق و اختیارات شریعت کی حدود اور دستور و قانون کی پابندیوں کو توڑ کر کوئی ناجائز فائدہ اٹھائیں یا کسی شخص یا ادارے کی حق تلفی کریں یا پوری ملت پر وبال ڈالیں۔

★ مسلمانوں کے حکمرانوں، وزرا، ایم۔ایل۔اے صاحبان اور لیڈروں پر شرعاً واجب ہے کہ وہ ان کے مفاد کی خدمت میں سرگرمی دکھائیں، ان کی خیر خواہی کریں، اُن پر سختی نہ کریں بلکہ ان سے نرمی برتیں اور ان کی حاجات، ضروریات اور بے چارگیوں کو معلوم کر کے ان کا ازالہ کریں۔

★ قوم کی خیر خواہی اور اس کے مفاد کی خدمت میں اور اس کے عوام کی حاجات و ضروریات کو پورا کرنے میں جو حکمران خیانت یا غفلت سے کام لیتا ہے وہ قیامت کے روز خدا اور رسولؐ کا مجرم قرار پا کر جنت کے قریب پھٹکنے سے محروم کر دیا جائے گا۔

کیا یہ تعلیم قرآن سے کوئی تضاد رکھتی ہے ؟

کیا ان ارشادات کی قدر و قیمت وقتی تھی اور اب یہ انسانیت کو روشنی نہیں دے سکتے ؟

کیا ایسی حکمت کے ان جواہر ریزوں کو مٹی میں ملا دینا چاہیئے ؟

یہ تصویریں، ہیں تیری —

اقبال احمد

[ذیل میں ایک حساس نوجوان کے احساسات درج کئے
جاتے ہیں جو اپنے الفاظ میں نہ جانے کتنوں کی ذہنی
تصویر پیش کر رہا ہے۔]

تقریباً چار سال سے میں اپنے وطن سے دور ہوں —۔ گو یہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وطنیت کا قائل تو نہیں لیکن دل سے مجبور ہوں —۔ اور ایک باشعور انسان کی یہی کامیابی سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے دل سے، اپنی فطرت کے تقاضوں سے اور اپنے احساسات کی نزاکت و لطافت سے مجبور ہو۔ وہ انسان ہی کیا جس کی آنکھیں رنج و غم کے اظہار سے عاری ہوں جس کے لب بہاروں میں بھی ساکت ہوں۔ جس کی زبان کسی کی خاطر ہل بھی نہ سکے —— اور اب میں ایسے ہی انسانوں میں ہوں جو صرف یہ جانتے ہیں کہ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کو آنا ہے۔ اور اسی روز و شب کی کش مکش میں زندگی کو دنیا کی آلودگیوں سے پاک ہونا ہے اور میں ——

—— /// ——

میں کراچی میں رہتا ہوں جہاں کے بادل ہمیشہ پیاسے رہتے ہیں۔ جہاں کلیوں پر بھنورے کبھی نہیں منڈلاتے اور جہاں کوئل کبھی نہیں کوکتی۔ — اور سچ پوچھئے تو ضرورت بھی کیا ہے ان خرافات کی۔ یہاں خیر سے پیٹ بھی بھر جاتے ہیں اور جسم بھی بہ اعتبار مراتب ڈھکے ہوتے ہیں —— میرا حلقہ سفید پوشوں کا ہے۔ جنہیں اپنی سفید پوشی پر بڑا ناز ہے.... اور جن کے خون میں بھی کسی قدر سفیدی کی آمیزش موجود ہے۔

—— /// ——

اور اسی لئے مجھے وطن چھوٹنے کا احساس تو ہے پر غم نہیں اور اگر غم بھی ہے تو اس کا اظہار کسی طور سے نہیں ہوتا —— کراچی کے بادلوں کی طرح آنسو بھی خشک ہو چکے ہیں —— شاید کل کسی کی موت ہو تو آنسو کے دو قطروں سے بھی خراج عقیدت نہ پیش کر سکوں ——۔ یہاں ہوا بہت تیز چلتی ہے۔ بڑی بھیانک سی آواز کے ساتھ —— لیکن وہ آندھی نہیں ہوتی۔ اور اگر ہوتی بھی ہے تو کسی کا دل تک نہیں ہلتا ——

—— /// ——

یہاں کی آبادی روز افزوں ترقی پذیر ہے اور اسی تناسب سے اموات میں بھی اضافہ ہے —— روزانہ آبادی کا

(باقی ص ۲۱)

پاکستان کے عظیم ترین قیدی سے ایک ملاقات

سید صدیق الحسن گیلانی

"یہاں فقط سر شاہین کے واسطے ہے کلاہ"

پورے چالیس روز انتظار کرانے کے بعد آخر ربانی صاحب نے ہمیں اجازت دے دی اور ہمارا چھوٹا سا قافلہ چناب ایکسپریس سے روانہ ہو گیا۔ جسم گاڑی میں، دل ملتان میں، آنکھیں رسائل و اخبارات پر اور ذہن جیل کے اندرونی نقشے کی منظر کشی کر رہا تھا۔ محمود صاحب چپکے چپکے ایک رسالہ پڑھ رہے تھے۔ عبدالغنی صاحب نے ذرا بلند آواز سے پڑھنے کا مطالبہ کیا اور پھر احتجاج۔ مجھے بھی اس مطالبے کی تائید کرنا پڑی۔ ایک تو مطالبہ جائز تھا اور دوسرے حکمرانوں کی طرح میرا بھی صرف 'کان' پھڑا رہا تھا۔ یہ نہ سمجھئے کہ خدانخواستہ میں بھی حکمرانوں کی طرح کہیں آنکھیں لگائے بیٹھا تھا۔ ہرگز نہیں، نہ میرے تصور میں کوئی امریکہ کا یانکی تھا، نہ برطانیہ کا ٹامی اور نہ ہی روس کا ریچھ نہ کوئی کمال و جمال میری آنکھوں کو خیرہ کئے ہوئے تھے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ میں نے اپنی عینک سوٹ کیس کے اندر رکھ دی تھی اور رات کے وقت اسے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ اور اس بدگمانی میں بھی مبتلا نہ ہو جائیے کہ میں نے کان بالکل حکمرانوں کی طرح وا کر دئے تھے کہ "محکمۂ کمالاتِ خاص" جتنی اور جیسی میل بھرنا چاہے بھرتا رہے۔ یہ باتیں تو صرف حکمرانوں کو زیب دیتی ہیں اور وہ بھی صرف انہیں جو واقعی الف لیلہ کا ذوق اور مزاجِ ملوکانہ رکھتے ہوں۔ محمود صاحب کو آخر ہتھیار ڈال دینا پڑے اور مولوی فتح محمد صاحب نے ہفت روزہ اقدام سے حاجی لق لق کا مضمون سنانا شروع کیا۔ ظالم نے صحافیوں کا نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ بس میں تو حاجی لق لق کا قائل ہو گیا۔ صحافت کا ابن الوقت دریائے صحافت میں جس طرح اپنی گندگاہ میں بلتا ہوا کسی نواب کی ہوکٹ پر ڈیلیٹا بنا کر بے ضمیری کے بحرِ ظلمات میں غرق ہو جاتا ہے اس کی اس سے بہتر تصویر کھینچنا مشکل ہے۔ ایکسپریس ٹرین اپنی پوری رفتار کے ساتھ اندھیری رات میں جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشن تاریکی میں ذرا ذرا سی روشنی لئے دستوری سفارشات کے مجوزوں کی طرح اڑتے جا رہے تھے عبدالغنی صاحب سو چکے تھے، مولوی فتح محمد صاحب اونگھ رہے تھے اور محمود صاحب ابھی تک پڑھے جا رہے تھے کہ صبح ہو گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم نے کفایت شعاری کے ساتھ چائے پی اور چائے کی بے لطفی کو زائل کرنے کے لئے تازہ اخبارات پڑھنے شروع کر دئے۔ سرگودھا، لائل پور، خانیوال آئے اور گئے، تین بجے گاڑی ملتان کے پلیٹ فارم پر تھی اور ہم آرزوؤں کا ایک سمندر آنکھوں میں جذب کئے اپنا سامان اتار رہے تھے۔ تانگے میں بیٹھ کر حسین آگاہی پہنچ گئے۔ ۲۹ رجنوری بروز ہفتہ صبح صبح ہم ڈسٹرکٹ جیل کی طرف اس "آزاد زندانی" کو ملنے کے لئے روانہ ہو گئے جس نے جیل میں بیٹھ کر اپیل سے انکار کر کے پوری انسانیت کو درسِ آزادی دیا اور قانون کے وقار کو چار چاند لگا دئے۔ در زنداں بند تھا، ربانی صاحب پھاٹک کی چھوٹی سی آنکھ سے جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے، دوسرے رفیق جیل کو غور سے دیکھ رہے تھے خصوصاً وہ حضرات جنہیں ابھی اس تربیت گاہ سے واسطہ نہیں پڑا، میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ذرا سے وقفے میں خیالات کا ایک طوفان اٹھا اور دل و دماغ پر چھا گیا۔ اللہ کی زمین اللہ کے بندوں پر کتنی تنگ کر دی گئی ہے، شیاطین نت نئے ڈرامے تیار کرتے ہیں، اللہ کے بندوں کو پھانستے ہیں اور پھر کسی ڈرامے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ یا اللہ! اس تیری دنیا میں تیرا نام لینا سب سے مشکل کام ہے ــــ آخر کیوں؟ ... اتنے میں پھاٹک کھلا اور رفقاء اندر داخل ہونا شروع ہو گئے۔ میں فوراً اٹھا اور تیزی سے پھاٹک پر پہنچ کر رفقاء کو اندر لے گیا۔ جیلر صاحب کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ درمیان میں میز اور کرسی اور ساتھ ہی صوفہ۔ ہم بنچوں پر بیٹھ گئے۔ راولپنڈی کے مقابلے میں

ملتان میں سردی بہت کم تھی۔ موسم خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گرمی محسوس ہونے لگی۔ میں نے دیکھا میری پشت پر ایک انگیٹھی جل رہی تھی۔ گرمی بہت زیادہ ہو گئی۔ میں نے کہا کیا یہ جہنم میرے پیچھے ہی رہے گا؟ اور میرا کسی رفیق نے جواب دیا۔ جی ہاں اور جنت سامنے ..... السلام علیکم ..... آواز آئی ..... مولانا مودودی دروازے میں سے داخل ہو رہے تھے۔ وہی میٹھی میٹھی آواز، وہی نورانی چہرہ، وہی ہلکا سا تبسم، وہی جلال، وہی جمال ——— طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو ...... جس کی اذان نے سترِ کلیم و خلیل فاش کر دیا۔ سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ ایک ایک سے مصافحہ کیا ..... میں آخر میں تھا ..... اچھا آپ! فرمایا اور پھر معانقہ ہوا۔ میں بالکل قریب بنچ کے کونے پر بیٹھ گیا ——— مولانا! آپ کی صحت اب کیسی ہے؟ میں نے عرض کیا۔ فرمانے لگے۔ بھائی! یہ چھوٹی موٹی بیماریاں تو ساتھ ہی چلتی رہتی ہیں۔ بس ایک جگہ ہے جہاں یہ کچھ نہیں ہو گا ..... جنت ..... اگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پہنچ گئے تو ...... میرے ساتھ ہی مولوی فتح محمد صاحب ہمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے، عبدالغنی صاحب بالکل پاس کھڑے دوسروں کو بیٹھنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ محمود صاحب جنہیں مولانا کو دیکھنے کا پہلی دفعہ موقع ملا تھا بالکل سامنے کھڑے موقع سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اب لوگوں نے مختلف مسائل پوچھنا شروع کئے۔ زکوٰۃ کے مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی، پھر دو چار ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں، میں نے عرض کیا۔ راولپنڈی کے گارڈن کالج کے ایک عیسائی پروفیسر صاحب نے جو آجکل امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے گئے ہیں، ہمارا لٹریچر منگوایا ہے۔ انہیں ایم۔ اے کا تھیسس (THESIS) تیار کرنا ہے جس کا یونیورسٹی نے موضوع مقرر کیا ہے "مودودی اور اس نے اسلام کو کس انداز سے پیش کیا ہے" (MAUDOODI & HIS EXPOSITION OF ISLAM) فرمانے لگے۔ مغربی ممالک میں لوگوں نے تحقیق کا ذوق پیدا کر لیا ہے۔ صرف سنی سنائی باتوں پر ہی انحصار نہیں کر لیتے، اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو صرف سنی سنائی باتوں پر انحصار کر لیا جاتا ہے۔ بلکہ بڑے بڑے اہم معاملات کے متعلق رائے قائم کر کے فیصلے بھی کر لئے جاتے ہیں۔

ہماری کیفیت اس مسافر کی سی تھی جو لق و دق صحرا میں بادِ سموم کے تھپیڑے کھاتا ہوا ایک چشمۂ صافی کے کنارے سائے میں بیٹھ کر اپنی پیاس بجھا رہا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس چشمۂ صافی پر آدم خور قابض ہیں، ہم بھول چکے تھے کہ یہ جیل ہے اور بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے کہ ہمیں ایک پیغام نے جھنجھوڑ دیا، وقت ختم ہو چکا تھا۔ باہر ڈیوڑھی میں آ کر ہم کھڑے ہو گئے، اندرونی پھاٹک کھلا اور دورِ حاضرہ کا عظیم مفکر جس نے ملتِ اسلامیہ کو ہزار معبودوں سے نجات حاصل کرنے کا راہِ مستقیم دکھا کر صحیح آزادی کا درس دیا۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہہ کر زنداں کے دروازے کو عبور کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ پھاٹک کی کریہہ آواز بلند ہوئی۔ اندر کوئی قیدی چوکیدار پہرہ دے رہا تھا ——— نہیں وہ کراہ رہا تھا۔ پھاٹک کی آواز نے اسے بھی زخمی کر دیا تھا۔ میرے دل پر شدید چوٹ پڑی۔ پھاٹک کی درازوں میں سے دور تک جھانکتا رہا۔ مولانا ..... مولانا مودودی تیز تیز قدم اٹھاتے جا رہے تھے، ایک منٹ کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گئے مڑ کر دیکھا تو رفقاء باہر نکل رہے تھے۔ باہر آیا، رفقاء تانگے کے پاس کھڑے تھے، میں بھاری بھاری قدموں سے سیدھا سڑک پر چل دیا۔ میرے ساتھی بھی ساتھ ہی چلنے لگے۔ ڈسٹرکٹ جیل پر میں نے ایک بھرپور نظر ڈالی اور عالمِ تخیل میں دیکھا امام ابن تیمیہؒ، امام ابو حنیفہؒ اور مجدد الف ثانیؒ کی روحیں جیل پر سایہ کئے ہوئے تھیں۔ میرے اندر کلمۂ حق کہنے کا وہی ولولہ پھر پیدا ہوا جو اکثر مسلمانوں کے دلوں میں تاریخِ اسلام پڑھتے ہوئے کروٹیں لیا کرتا ہے ——— سانحۂ کربلا کی روداد پڑھتے ہوئے میں نے یہ آرزو کی تھی کہ اے کاش میں امام کے ساتھیوں میں ہوتا! اگر میں جہانگیر کے عہد میں ہوتا تو اسے بھرے دربار میں غرور و تکبر کی کرسی سے اٹھا کر اسے بتاتا کہ تو مجدد الف ثانیؒ کو قلعۂ گوالیار میں بند نہیں کر رہا بلکہ ملوکیت کو کفن پہنا رہا ہے۔ ملوکیت اپنے حامی کو داغدار کر کے ہمیشہ کی نیند سو گئی ہے۔

اب جمہوریت کا دور ہے میری اپنی قوم حکمران ہے۔

میری وہ عظیم قوم جس نے صدیاں اس انتظار میں گذار دیں کہ اسے اعلائے کلمۃ الحق کا موقع نصیب ہو۔
میری وہ مقدس قوم جس نے اس عزم صمیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ایک خطۂ زمین کی التجا کی تھی کہ اسے شہادتِ حق کا فریضہ ادا کرنا تھا۔
میری وہ عزیز قوم جس نے خلافتِ راشدہ کے نمونے پر نئی ریاست کی تعمیر کا اعلان کیا تھا اور قرار دادِ مقاصد کے ذریعہ یہ عہد کیا تھا کہ یہاں مسلمانوں کو لازماً اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنتِ رسول ؐ میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں۔

میں نے عہد کیا کہ میں اپنی عظیم، مقدس اور عزیز قوم کو صاف صاف واشگاف الفاظ میں کہوں گا کہ اے میری قوم:
تو ملوکیت کی گھناؤنی تاریخ کو نہ دہرا۔
تو اس شخص کے درپئے آزار نہ ہو جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں تیری دلی آرزوؤں اور امنگوں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے لئے اپنے خونِ جگر سے تیل مہیا کر رہا ہے۔
تو اس محسن کشی سے باز آ اور اپنے "اکابرین" سے پوچھ کہ جب خدا کے حضور تمہیں ان ظالم قوموں کی صف میں کھڑا کیا جائے گا جو داعیانِ حق کو پھانسی اور جیل سے نوازتی رہیں تو تیرے پاس کیا جواب ہوگا؟

بقیہ۔ یہ تصویریں ہیں تیری صفحہ ۱۸

ایک چھوٹا سا حصہ یہاں کی مشینی زندگی سے اکتا کر گوشہ تنہائی کو منتقل ہو جاتا ہے —— اور سچ پوچھئے تو یہ مرنے والے بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ یہاں تو مرنا بھی اپنے بس کا نہیں —— کاش کہ میرے لئے بھی کسی گوشہ خاموش میں ایک قبر کھدی ہوتی اور میں بھی اس میں چین کی نیند سو سکتا —— لیکن —— زندگی کی چارہ سازی تو حادثات سے ہوتی ہے۔ اور میرے بازو شل ہو چکے ہیں —— اور اک ایک تھکے ہوئے ملاح کی طرح چپو کو پھینک کر کشتی میں سو رہا ہے اور کشتی آہستہ آہستہ طوفان کی سمت بڑھتی جا رہی ہے۔

یہاں کے لوگ فطرت کے بعض بعض تقاضوں سے بھی عاری ہو چکے ہیں۔ بڑے سے بڑے صدمے پر بھی رو نہیں سکتے اور اگر کبھی روئے بھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رونے کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ البتہ ہنستے بہت ہیں اور کبھی کبھی تو اتنے زور سے قہقہے لگاتے ہیں کہ خوشی کانپ اٹھتی ہے اور وقت لرز کر رہ جاتا ہے بس —— "محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی" ——

موجِ وحباب[1]

تابش الوری [illegible]

بات صرف اتنی تھی تم سے پیار تھا ہم کو — یہ معاملے لیکن گیر و دار تک پہنچے
ذوق یہ ہمارا تھا آ بسے جو زنداں میں — بحث وہ تمہارا تھا، اقتدار تک پہنچے
کتنے دیر اور کعبے راستوں میں حائل تھے — ہم بڑی کشاکش سے کوچۂ یار تک پہنچے
میرے قافلے نے جو آسماں پہ چھوڑے تھے — آج چاند تارے بھی اس غبار تک پہنچے
نامراد آنکھوں سے خون ٹپک پڑا دل کا — ہم خزاں سے گھبرا کر کس بہار تک پہنچے
رو نہ اے دلِ ناداں! ورنہ سوچ کیا ہوگا — گریہ نالہ ہائے شوخ بامِ یار تک پہنچے

حسن احسانی

پھر ہوئی تازہ رسمِ زلیخا — حسن پہ تہمت! توبہ، توبہ!
حکمِ زباں بندی ہے نافذ — سارا عالم گونگا، بہرا!

منظر خورجوی

گوارا ہاں مجھے ہو جائے گی پھر سرزا سہلے — ذرا تکلیف کیجئے اور سن لیجئے بیاں میرا
پسینہ کی طرح میں نے بہایا خونِ دل پھر بھی — خدا معلوم دشمن ہو گیا کیوں باغباں میرا
مرے دل سے تو پوچھے کوئی لذت آزمائش کی — قیامت تک ہوا کرتا الٰہی امتحاں میرا

ابوالوفا حجازی

جس کو دیکھو ہے وہی شوخ ادائی کا قتیل — گل اگر چاک گریباں ہے، تو نرگس ہے علیل
قافلہ والو! عجب شانِ گراں خوابی ہے — لوریاں دیتی ہے شاید تمہیں آوازِ رحیل

ابنِ محمود

خبر کیا تھی، وطن کی سرزمیں یوں تنگ بھی ہوگی — بڑی حسرت لئے ہم ہر در و دیوار سے گزرے
وہ جن کے نام کی عظمت پہ جاں دینا سعادت تھا — وہ بس جرمِ محبت پر سرِ دار سے گزرے

شبنم سبحانی

ختم تھی ہم پہ رونقِ گلشن — ہم اٹھے، خیمۂ بہار اٹھا!
ہم کو رسوا کیا زمانے نے — اے وفا! تیرا اعتبار اٹھا!
جانے کس رندِ تشنہ لب کے لئے — آج پیمانہ بار بار اٹھا!
ساقیا! تیری بے رخی کے طفیل — جو اٹھا آج، سوگوار اٹھا!

---

[1] نظموں خصوصاً غزلوں کی پیداوار ہمارے حلقے میں زیادہ ہے، بہت سی چیزیں موصول ہوتی ہیں اور جگہ پا سکنے کے انتظار میں پڑی رہتی ہیں۔ اس سے شعراء کو شکایت پیدا ہوتی ہے [illegible] اشاعت مناسب [illegible] کی وجہ سے شعری موضوعات [illegible] نہ ہو سکی۔ [illegible] ناگزیر تھا کہ اشعار کو زیادہ جگہ دی جائے۔ بعض قارئین کو شاید یہ ناپسند ہو لیکن ہمیں قارئین سے [illegible] یہ جملہ اس [illegible] ہوتی ہے۔ (ادارہ)

مبین مظفر حسین اختر

ہوئی حاصل اسی کو ہر مسرت صبح تاباں کی — خوشی کے ساتھ کاٹی تھی شب غم جس نے ہجراں کی
ہمارے گریۂ پیہم کا ہو کچھ تو اثر پیدا — الٰہی! لاج تیرے ہاتھ ہے اب چشم گریاں کی
بیان حق حضور اہل باطل شرط اول ہے — نہ ہو اتنی اگر ہمت تو کمزوری ہے ایماں کی

محسن ظفر

گزرنا ہے رہ خار و خطر سے — مگر مشکوک ہیں ہم راہ بر سے
فضا کے دوش پر ہے زلف عنبر — یہ ابرے تمناؤں پہ برسے
ہوئے تخ بستہ ساکن دل کے دھارے — گزرنا چاہتا ہوں آگ پر سے
بھٹکنے کا ارادہ ہو تو چلئے — جنوں نا آشنا ہے رہ گزر سے
لگا ہوں کا سہارا دو تو سنبھلوں — گرا جاتا ہوں دنیا کی نظر سے
فلک کی گردش نا مہرباں بھی — بہت مانوس ہے محسن ظفر سے

راشد النجیری ارشد

دلوں کے داغ جلاؤ ابھی اندھیرا ہے — خرد کو شمع دکھاؤ، ابھی اندھیرا ہے
ستم ہے قافلہ سالار ہو گئے رو پوش — ستارو! راہ دکھاؤ! ابھی اندھیرا ہے
یوں مسیحا تو کم نہ تھے لیکن — ایک بھی درد آشنا نہ ملا
جانے کیا بات تھی گلستاں میں — پھول کوئی کھلا ہوا نہ ملا
میں نے ہر آستاں سے منہ موڑا — جب کہیں تیرا آستانہ ملا

مضطر مجاز پوری

یہ خلوص یاد کی اللہ رے پاکیزگی، — نام جب آتا ہے ان کا، آنکھ کرتی ہے وضو
ڈوب جائیں گے ستارے، شمع بھی بجھ جائے، — آ خیال یار آ، پڑھ لیں نماز آرزو

سرور بیوھاری

یا مجھے برق سر طور بنایا ہوتا — یا سراپا مرا بے نور بنایا ہوتا
یا تو احساس جمیعت ہی نہ ہوتا مجھ میں — یا نہ اتنا مجھے مجبور بنایا ہوتا
ذوق ایذا طلبی تشنہ رہا جاتا ہے — زخم دل کو مرے ناسور بنایا ہوتا
بخشنے والے بقدر طلب اسرار مجھے — کار گلوں کو مری مشکور بنایا ہوتا

ناہید چغتائی

مدت سے ہے نو بہار مژگاں — آؤ منائیں جشن چراغاں
جیسے ہوئے ہیں آپ گریزاں — مونس غم ہے گردش دوراں
صحن چمن میں یہ کون آیا! — ہر غنچہ ہے آج غزل خواں
ڈوب رہا ہے مہر منور — تم ہی سنوارو زلف پریشاں
دور میں آیا ساغر گلگوں — آج کہاں ہے گردش دوراں
مست ہوا کے جھونکے آئے — لاؤ کہاں ہے ساز بہاراں

مسعود جالوی:

اے مسیحا! یہ تیرے نام کا جادو کیا ہے — کہ تڑپ جاتی ہے بجلی مرے ارمانوں میں
شمع کے گرد ہے اک ڈھیر سا بال و پر کا، — لیکن آشفتہ سری ہے وہی پروانوں میں
جبرِ دنیا کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی — تیرے عارض کی شفق ہے مرے افسانوں میں

صیاد رضوان بریلوی:

زلفِ گیتی سنوارنے اٹھے — اک نئی زندگی کے دیوانے
پھر نبرد آزما ہیں ظلمت سے — اک نئی روشنی کے پروانے
اشک جو آ گئے تھے پلکوں پر — اب تبسم ہیں ڈھلنے والے ہیں
خامشی ساز بننے والی ہے — لب پہ نغمے مچلنے والے ہیں
چمک اے انجمِ فطرت! تیرگیٔ عصرِ حاضر میں — کبھی شعلہ نفس ہو کر! کبھی آتش بجاں ہو کر
گزر جا اس جہانِ خیر و شر کی تنگ راہوں سے — کبھی آہِ رسا ہو کر! کبھی برقِ تپاں ہو کر
خبر کیا تھی تصور گلستاں کا کرتے ہی رضوانؔ — لپٹ جائیں گی دامن سے بہاریں بجلیاں ہو کر

حسرت بدایونی:

چمن میں غیر بن کر آ رہا ہوں ہائے یہ دن ہے! — یہ سارے پھول میرے تھے، یہ سارا گلستاں میرا

کمال سالار پوری:

تمام عالمِ ہستی ہے وادیٔ سینا — نصیب دیدۂ بینا نہیں تو کچھ بھی نہیں
ترے دماغ، ترے دل میں تیری رگ رگ میں — کسی کے عشق کا سودا نہیں تو کچھ بھی نہیں

مختار ستاری:

میرے لئے حسیں مری وحشت کے زاویے — ہر اک قدم ہے راہ گزاروں کی آبرو
یہ خار دیکھتے رہے پتوں کی اوٹ سے — لٹتی رہی چمن میں بہاروں کی آبرو

منظر کلیمی:

خود اٹھا لے سامنے سے اس کے مینائے شراب — صرف ساقی کی زبانی مہربانی پر نہ جا!
ان کے سینوں میں ہے کچھ اور ہے زباں پہ اور کچھ — واعظانِ شہر کی آتش بیانی پر نہ جا!
نگاہِ آرزو میں بسنے والے! — ابھی کچھ اور بھی دل کے قریں ہو
حقیقت عشق کی میں بھی سناؤں — اگر میرے فسانے پر یقیں ہو

اظہر:

روش باغباں کی رہی جابرانہ — قفس تھا ہمارے لئے آشیانہ
خدا ہی رکھے آبروئے حمیت — بڑی پُر شکن ہے جبینِ زمانہ
سہے وار بھی ہم نہ گھبرائے اظہرؔ — ازل سے طبیعت ملی باغیانہ

ضمیر

وکٹر ہیوگو کے تخیل پر مبنی

عین الدین علوی (ایم اے علیگ)

ایک ایکٹ کا ڈراما

وکٹر ہیوگو سے اس تمثیل کا پلاٹ مستعار لینے کی دو وجہیں ہوئیں۔ LES MISERABLE (لا میزرے رابل) کے ابتدائی ابواب میں بیان کئے ہوئے اس واقعے کو کئی لحاظ سے میں بے مثل سمجھتا ہوں۔ مجھے اس صورت حال (SITUATION) میں حقیقت اور ڈرامائیت کے اس قدر عناصر و امکانات نظر آتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں یہ اثر، یہ درد، دنیا کے ادب میں مشکل سے کہیں اور ملے گا۔ یہاں ہیوگو اس بلندی پر ہے جہاں آرٹ ایک مقصد کی گرمی سے فروزاں ہو کر معراج کو پہنچ جاتا ہے۔!

دوسرا سبب یہ تھا کہ ایک معروف کہانی جب اسٹیج پر پیش کی جاتی ہے تو اس کے مقبول ہونے اور عوام کے دلوں میں نفوذ کر جانے میں دشواری نہیں ہوتی۔ کسی "خیال" کے ابلاغ کا یہ بڑا کامیاب "وسیلہ" ہے۔

ایک غلط فہمی جس کے پیدا ہونے کا امکان ہے دور کر دینی ضروری ہے ــــ وہ یہ کہ ضمیر صرف ترمیم و اضافہ نہیں ہے بلکہ ایک تخلیق ہے جس میں صرف قصے کا خاکہ مستعار لیا گیا ہے۔ ہیوگو کا سہارا لے کر عمارت خود میں نے کھڑی کی ہے۔ ایسی عمارت جو ارد گرد کی فضا میں زیب دے سکے۔

میں نے اس ڈرامے میں واقعے کے صرف سب سے زیادہ شدید اور عظیم الشان رُخ کو نشو و نما کا موقع دیا ہے ــــ یعنی مجرم اور "بشپ" کی مڈبھیڑ۔ یہی اس کہانی کا سب سے زیادہ ہیجان خیز اور کشمکش سے لبریز حصہ ہے۔ اسے ہیوگو نے فقط تین چار صفحات میں (وہ بھی اس طرح کہ بشپ کی بوڑھی بہن اس رات کے واقعے کو اپنی سہیلی کے نام خط میں لکھتی ہے) بیان کیا ہے۔ اس مقام پر فطرۃً پڑھنے والے کے دل میں بشپ اور مجرم کا پورا مکالمہ معلوم کرنے کی خواہش ہوتی ہے لیکن یہ مطالبہ تشنہ ہی رہ جاتا ہے! گویا ہیوگو نے ایک معرکہ آرا SITUATION تو دے دی ہے لیکن اس میں رنگ بھرنا۔ اسٹیج کے لئے اس میں زندگی کا خون دوڑانا ڈراما نگاروں کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ میں نے اسی صبر آزما کام کی کوشش کی ہے۔ مجھے دعویٰ نہیں کہ میں اسی طرح کامیاب رہا ہوں جس طرح ہونا چاہئے۔ تاہم اسے اسٹیج پر پیش کرنے کے بعد مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ یہ ناکامیاب بھی نہیں ہے! اس نے مجھے یہ بھی یقین دلایا کہ اسٹیج اور اسکرین کے موجودہ ٹھیکہ داروں کا پھیلایا ہوا یہ عام خیال سراسر غلط اور گمراہ کن ہے کہ پبلک ادنیٰ درجے کے رقص، عامیانہ مزاح و تمسخر، حسن و عشق کے چند بوسیدہ مناظر کے سوا اسٹیج اور اسکرین پر کسی اور چیز کی روادار نہیں۔ اس مایوس کن خیال کا پرچار صرف اپنی ذہنی تہی مائیگی چھپانے اور اپنے ادنیٰ درجے کے "لٹریچر" کو بازار میں چلانے کے گھناؤنے مقصد کے لئے کیا گیا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ اگرچہ عوام کے ذہن کی عادتیں اس قدر بگڑ چکی ہیں۔ پھر بھی "حقائق" ان کے ذہنوں پر صحت مند اور [illegible] نقوش چھوڑ رہی

جاتے ہیں!۔۔۔ اور یہ معمولی بات نہیں۔

ایک بات قابلِ ذکر ہے۔ ہیوگو نے مجرم کی اصلاح کا کارنامہ ایک بشپ کے وسیلے سے انجام دیا ہے جو خود غیر معمولی اخلاقی صفات اور کردار کا مجموعہ ہے چنانچہ پڑھنے والے کے ذہن پر خواہ مخواہ یہ خیال مرتسم ہوجاتا ہے کہ اصلاح و تزکیہ کا کام ایک "دنیادی" انسان کے بس کا نہیں بلکہ فقط ایک "مذہبی گروہ" کے لئے مخصوص ہے۔ ہم اور آپ اس فریضے سے آزاد ہیں۔ اور ہمیں یہ مشکل کام انہیں ماہرینِ خصوصی (SPECIALISTS) کے لئے چھوڑ دینا چاہیے۔ وہی "دین" اور "دنیا" کا سطحی تضاد!

میں نے اپنے ڈرامے میں یہ بنیادی قسم کی ترمیم کردی ہے کہ بشپ، مرشد یا مولوی (مختصر یہ کہ پیشہ ور "مذہبی فرد") کو چھوڑ کر ایک پروفیسر کو اپنا ہیرو بنایا ہے۔ اور یہ دکھایا ہے کہ کوئی بھی مسلمان، اگر وہ اسلام پر عامل ہے، زندگیوں کو بدل ڈالنے والی طاقت رکھتا ہے[1]۔ اور یہ کہ صحیح قسم کی تبلیغ ہر مسلمان کی عملی زندگی کا سب سے گراں قدر حصہ ہے۔

بیگم جلال۔ پروفیسر کا چھوٹا بھائی۔ ملازم (شریف) یہ سب کردار بھی میرے اپنے ہیں۔ اسی طرح جیل کے سپاہی بھی۔ تیسرے اور چوتھے منظر میں جو عمل (ACTION) پیش کیا گیا ہے اس میں میں نے ہیوگو سے انحراف نہیں کیا ہے۔ مکالمے سب میرے اپنے ہیں۔۔۔ دو تین جملوں کو چھوڑ کر، جن کی اپیل اتنی شدید تھی کہ میں ان کو ہیوگو سے مانگے بغیر نہ رہ سکا۔

پہلا منظر

(جیل کے اندر۔ ضمیر، ایک پرانا قیدی، ایک ٹانگ پھیلائے اور دوسری سکوڑے ہوئے بیٹھا ہے۔ چہرے پر دہشت۔ اور اس قسم کی خشونت اور بےرحمی جو عموماً ایسے اشخاص میں پیدا ہوجاتی ہے جن کو سوسائٹی نے مجرم قرار دے کر اپنے حلقے سے باہر کر دیا ہو۔ اس وقت وہ تنہا ہے اور اپنے آپ سے باتیں کررہا ہے۔)

رہائی! آج میری رہائی کا دن ہے (ایک طنزیہ قہقہہ لگاتا ہے) جو تھوڑی بہت عمر رہ گئی ہے وہ بھی یہیں گزر جاتی تو کیا حرج تھا! مجھے اب یہاں کون سا دکھ تھا؟ جیل کی دیواریں پرانی آشنا ہیں! یہ آہنی سلاخیں میری ہمدم ہیں۔ یہ ہتھکڑیاں، یہ زنجیریں میرے دیرینہ دوست! بڑی ۔۔۔ چھوٹیں گی یہ!

(زیر لب ہنستے ہوئے) میری رہائی دنیا والوں کے ضمیر کی رہائی ہے۔ (مسکراتا ہے) ہمیشہ ۔۔۔ (یکایک سنجیدہ ہو کر۔ درشت اور خونخوار انداز میں) دنیا نے ۔۔۔ ان چوروں نے جو اپنے آپ کو انسان کہتے ہیں میرے ساتھ کیا کیا ہے؟۔۔۔ کیا ایک ڈبل روٹی کا ٹکڑا اتنا بڑا گناہ تھا؟ وہ ٹکڑا آج تک خبیث روح کی طرح میری گردن پر سوار ہے اور میری زندگی کا لہو چوسے چلا جا رہا ہے۔۔۔ وہ لاشیں پڑی ہیں (ذرا سیدھے ہو کر بیٹھ کر) وہ میری انسانیت کی لاش!۔ اور وہ میری محبت کی!!۔۔۔ ضمیر کا جنازہ!۔۔۔ اور۔ اور وہ امانتوں کا!! (سسکی بھرتا ہے)۔۔۔ جاؤ! مُردار ہو تم سب!! گھبراؤ مت۔ گدھ اور چیلیں تمہیں بھی کے حلق کے نیچے اتار لیں گی!۔۔۔ نیکی، خدا، مذہب، شرافت ڈھکوسلے، مکاروں کی مکاریاں!۔۔۔ بدمعاش، کمینے، شیطان! مار ڈالا تم نے میری بہن کو! اس کی عصمت کو۔ اس کے بچے قاتل ہو تم سب! دیکھو کتنی لاشیں پڑی ہیں تمہاری گراں بہا!

---

[1] لیکن اب حضرت عیسیٰ نہیں فرمائیں گے کہ آپ کلیہ کرنا رحمدلانہ خیالی ہے اور ایسے جیتے جاگتے کردار کا موجودہ معاشروں میں ہاتھ آنا بالکل خلاف توقع ہے۔ اچلو کے سوا، اور یہ پہلو سے یہ تمثیلچہ کامیاب ہے۔ (ادارہ)

کے ساتھ) انتقام! انتقام!! میرا سینہ پھر پھٹنے لگا۔ اس مرے ہوئے دل میں بار بار کیوں شعلہ بھڑک اٹھتا ہے؟ —— اور دھڑکنے والے دل! تھم! سوچ! سمجھ! میں پاگل نہیں ہوں! —— ہاں اور دنیا! تو میری دشمن ہے، اور میں تیرا! ہم دونوں ایک دوسرے کو ڈسنے کے لئے ہیں۔ تو مجھے ڈس چکی خوب! اب ذرا مجھے ڈسنے دے! — میں نے سوچ لیا، سمجھ لیا۔ میں زندہ رہوں گا۔ فقط اس لئے کہ تجھے اپنے انتقام کے شعلوں سے پھونک دوں —— ضمیر! آج سے تیری زندگی کا مقصد یہی ہے —— نوعِ انسانی کو تباہ کر — جتنا بھی ہو سکے — جہاں بھی!! ——

(تین سپاہی داخل ہوتے ہیں، گفتگو کرتے ہوئے)

پہلا سپاہی: مبارک ہو ضمیر خاں! آج رہائی کا دن آ ہی گیا! (بنچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ باقی دونوں بھی بیٹھتے ہیں)۔

ضمیر: ہوں!

دوسرا سپاہی: ضمیر خاں آدمی تھوڑی ہے جنات ہے۔ چار دفعہ تو زنجیر تڑا کر بھاگ چکا ہے۔ اور ہر بار تین تین سال کی اور چڑھ گئی!

تیسرا سپاہی: ہے وفادار! —— ہر پھر کر آ ہی جاتا ہے سسرال میں!

(دوسرا ہنستا ہے)

پہلا سپاہی: مگر دوست، یاد بہت آؤ گے۔ جیل کے پھاٹک اور گنبد کی طرح تم بھی جیل کا ایک چلتا پھرتا ٹکڑا بن گئے تھے۔ (ضمیر خاں کے ساتھ ایک سانس لیتا ہے کھانے کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے۔

ضمیر آہستہ آہستہ اٹھ کر پیالہ ہاتھ میں لئے چل دیتا ہے]

تیسرا سپاہی: "رسی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا"! اب بھی دل لگی کا برا مانتے ہیں قبلہ! [ایک بوڑھا سپاہی داخل ہوتا ہے]

بوڑھا سپاہی: کون برا مانتا ہے؟ ——

تیسرا: (جلدی سے) آپ نہیں! اس ضمیرے کا ذکر ہو رہا تھا —— آئیے بیٹھئے!

بوڑھا: (بیٹھتے ہوئے) بھائیو یہ ایک عجیب کیس ہے (CASE) ہے۔ —— تمہیں نہیں معلوم۔ میں تو اسے اس وقت سے دیکھ رہا ہوں جب آج سے اُنیس سال پہلے جیل کی سلاخوں نے پہلی بار اس کا منہ دیکھا تھا — اور یہ بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ میں بھی اُن لوگوں میں تھا جنہوں نے اس کے ہاتھوں میں پہلی بار ہتھکڑی ڈالی —— !

پہلا: کیوں بابا، تم اسے عجیب کیوں کہتے ہو؟

بوڑھا: جب اُس کا جرم سنو گے تو عجیب ہی کہو گے!

دوسرا: (اشتیاق سے) سناؤ ——

بوڑھا: اس کی ایک بہن تھی۔ بیوہ —— تلے اوپر کے سات ننھے ننھے بچوں کی ماں۔ یہ بچپن ہی میں ماں باپ کی گود سے محروم ہو چکا تھا۔ اسی بہن نے اس کو پال پوس کر بڑا کیا۔ پھر اس کا آدمی فوت ہو گیا۔ اور اب بہن اور سات بھانجوں کا بوجھ اس پر آن پڑا۔ یہ بیچارا لکڑیاں کاٹ کاٹ کر تانبے کے پیسوں میں تبدیل کرتا اور اپنا پیٹ کاٹ کر بھانجوں کا پیٹ بھرتا —— اس رات بلا کی سردی تھی۔ پالا پڑ رہا تھا۔ اسے لکڑیاں نہ مل سکیں۔ بھیڑیئے بھی غاروں میں پناہ لے رہے تھے لیکن یہ بدنصیب گلیوں میں مارا مارا پھر رہا تھا —— سارے دن بچے بھوک سے تڑپے تھے۔ اس نے تنگ آ کر میتا نان بائی کی دکان کی کھڑکی توڑ کر ایک ڈبل روٹی چرالی۔

دوسرا سپاہی: — ڈبل روٹی!

بوڑھا: ہاں فقط ڈبل روٹی! ابھی سنتے جاؤ! اُسی وقت میتا آ پہنچا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں، ٹوٹے ہوئے شیشے نے اس کا ہاتھ بھی زخمی کر دیا۔ اور ڈبل روٹی بھی دکان پر ہی رکھی رہ گئی۔

پہلا سپاہی: گناہ بے لذت!

بوڑھا: —— یہ خون کا فوارہ چھوڑتا ہوا گلیوں میں بھاگا لیکن میتا نے

اس جلتی ہوئی جان کو شکست دے ہی دی۔ پکڑ لیا۔ یہ بہن اور بھانجوں سے جا کر اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ میں تم سے غافل نہیں تھا!

اور انصاف کے دیوتا نے تین سال کے لئے ان کے درمیان آہنی سلاخوں کی دیوار کھڑی کر دی!

پہلا سپاہی: بے چارہ!

بوڑھا: ——— وہ تین سال جس طرح اس نے گزارے ہیں انہیں دیکھ کر مجھ جیسے سنگ دل پولیس والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ اس محکمے کا . . . . . یہ زنجیروں سے بندھا ہوا مشقتیں کرتا۔ چکی پیستا۔ بڑے بڑے پتھر پیٹھ پر ڈھوتا۔ اس کی کمر شام تک دوہری ہو جاتی۔ لیکن اپنے خیال میں محو رہتا۔ بڑبڑاتا رہتا: "کاش میں روٹی تو گھر پہنچا دیتا۔ اتنی مہلت بھی نہ دی۔ ٹکڑا تو رکھ دیتا بچوں کے آگے۔ ایک نظر دیکھ لیتا۔ تمہارا کیا بگڑ جاتا؟ میری بہن! بھوکی ہوگی بچے! روٹی! روٹی"!——— اور وہ کام کرتے کرتے رک جاتا۔ نظریں کہیں دور جم جاتیں۔ گارڈ کے کوڑے برسنا شروع ہوتے اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں مشین کی طرح حرکت کرنے لگتے ——— اس نے کبھی احتجاج نہیں کیا۔ سزاؤں پر چیخ پکار نہیں مچائی۔ خاموشی سے ایک پتھر کے بت کی طرح جلاد کے کوڑے کھاتا اور آسمان کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتا کہ دیکھنے والا تھرا اٹھے!

پہلا: واقعی عجیب ہے اس کی کہانی۔

دوسرا: لیکن اب وہ کچھ اور بن چکا ہے۔

تیسرا: اس وقت شاید اس سے زیادہ خطرناک قیدی سارے جیل میں نہیں!

پہلا: ایک ڈبل روٹی کے ٹکڑے کے لئے جسے وہ پا بھی نہ سکا انیس سال تک جیل کی دیواروں سے سر پھوڑنا پڑے ——— پھر ایسا شخص خطرناک نہیں تو کیا پیغمبر ہوگا؟ - - - - میاں ان لوہے کی سلاخوں کی خاصیت ہی یہی ہے!

دوسرا: ہم لوگوں کو دیکھو۔ ہم پر تو صرف سایہ پڑا ہے۔ اور ہم جو کچھ ہیں جو کچھ کرتے ہیں وہ دنیا جانتی ہے۔

بوڑھا: میں تو یہ کہنے کو تیار ہوں کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں، جتنا کچھ بھی ظلم ہوتا ہے وہ کم ہے اس ظلم سے جو عدالتوں کے سائے میں، اور پولیس کی نگرانی میں، انصاف کی خوب صورت آڑ لے کر کیا جاتا ہے!———

تیسرا: بڑے میاں! آپ کو تو کسی مسجد میں اذان دینی چاہیے تھی۔ یا کسی خانقاہ پر پیر فقیر بن کر بیٹھنا تھا۔ ورنہ اسکول میں بچے پڑھاتے۔ آپ ہمارے محکمے کی طرف کیوں راستہ بھول گئے؟ یہاں تو ہم جیسوں کا کام ہے جو اپنے ضمیر کے گھوڑوں کو کانٹوں دار لگام دے کر اپنی مٹھی میں لے لیتے ہیں!

دوسرا: ورنہ یہ منہ زور گھوڑا ہم سب کو گدھا بنا دے اور ڈنڈے کھلوائے!

بوڑھا: یہی ہوتا ہے دنیا میں دوستو! میں راستہ بھول کر نہیں، اپنی مرضی سے آیا تھا پولیس میں۔

دوسرا: کیا اس وقت "اوپر کی آمدنی" کا شوق تھا؟———

پہلا: یا اس وقت ظلم کرنے سے نہیں گھبراتے تھے؟———

تیسرا: یا کسی سے بدلہ لینا تھا؟———

دوسرا: یا ضمیر کا گھوڑا قابو میں تھا؟———

بوڑھا: (سب کے سوالوں کا ایک ساتھ جواب دیتے ہوئے) نہیں! نہیں! نہیں! نہ رشوت کے لئے۔ نہ ظلم کے لئے۔ نہ کسی سے بدلہ لینا تھا! ——— میں ایک بڑے مقصد سے آیا تھا!

دوسرا: وہ کیا؟

بوڑھا: ——— کہ جب میں اور میرا ضمیر نہیں بدل سکتے تو میں پولیس کو کیوں نہ بدل ڈالوں! (سب ہنستے ہیں)

دوسرا: "مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں!"

بوڑھا: ہاں ٹھیک ہے! ہنسو، ہنسنے ہی کا مقام ہے۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکا۔ جہاں کہیں میں انہیں ان کی غلطیوں سے آگاہ کرتا، میری کٹ حجتی، میری ہٹ دھرمی، میری "حکم عدولی" پر افسر

اور نا خسروی نہیں چھوٹے موٹے مسائل بھی مخالفت کا ایک محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ۔ میں دل کے ارمان دل ہی میں لئے رہ جاتا ——— ان باتوں کا نتیجہ آج تم دیکھ رہے ہو مجھے بھی ایک طرح مجرموں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا تھا ——— آخر کار میری وہ ادنی قوت جسے لوگ معاملہ فہمی اور عقل مندی کہتے ہیں جاگ اٹھی ——— اسے جاگنا پڑا اور میں نے ایک ادھ مرے انسان کی طرح خاموشی کا مذہب اختیار کر لیا !

تیسرا : لیکن پھر بھی آپ رہے سپاہی ! ترقی نہیں کی۔

بوڑھا : کیا میں تم سب سے زیادہ، جیلر صاحب سے زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوں ؟

تیسرا : میں تو کہتا ہوں۔ کہ پھر بھی آپ نے ترقی نہیں کی !

بوڑھا : ہاں ! اور مجھے فخر ہے کہ میں نے ترقی نہیں کی !

دوسرا : خوب ! کیوں ؟

بوڑھا : کیوں کہ یہی زندہ ثبوت ہے کہ مجھ میں کچھ کرنے کا حوصلہ تھا !

پہلا : بڑے میاں، بات آپ ہی کی حق ہے !

دوسرا : بھئی بڑے میاں سے نپٹنا آسان نہیں۔ پھر پولیس کے ہیں ! (سب ہنستے ہیں) لاؤ شکور بیڑی پلاؤ (باہر سے کسی کے پکارنے کی آواز : "گارڈ نمبر ۳۵ ۔ ۳۶ !" پہلا بیڑی نکال کر دوسرے کو دے چکا ہے اور وہ ماچس جیب سے نکال چکا ہے۔ لیکن جلاتا نہیں آواز سن کر دونوں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

پہلا (شکور) : لو بھئی چلو کارِ خیر کے لئے ! (اٹھ کر چلنے لگتے ہیں۔ ——— پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

پروفیسر جلال الدین کا مکان ۔ رات کا وقت ۔ مردانہ نشست کا کمرہ آتشدان میں آگ جل رہی ہے چاروں طرف سیاں ۔ دو آرام کرسیوں میں سے ایک پر بیگم جلال دراز ہیں اور ایک رسالہ دیکھ رہی ہیں ——— وسط میں ایک بڑی چوکور میز رکھی ہے جس پر موم بتی کی روشنی ہے۔ گوشے میں ایک طرف ایک الماری کتابوں سے بھری رکھی ہے۔ دیواروں پر چند گروپ آویزاں ہیں اور سامنے ایک طرف ایک بڑے سائز کی تصویر ولیم مارس کی اور اس سے تھوڑے فاصلے پر علامہ اقبال کی وہ تصویر جس میں وہ ہاتھ پر ٹھوڑی رکھے آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ ٹنگی ہوئی ہے میز پر ایک گلدستہ رکھا ہے اور مولانا روم کی مثنوی ——— سامنے داہنی طرف باہر سے داخل ہونے کے لئے دروازہ ہے۔ جس سے پروفیسر جلال الدین داخل ہوتے ہیں، فاختئی رنگ کی شیروانی اور ڈھیلا پاجامہ پہنے ۔ عمر تقریباً چالیس سال ۔ مختصر ڈاڑھی جس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ آنکھوں پر باریک کمانی کا چشمہ ۔ سر پر سیاہ ٹوپی ۔ پاؤں میں پنجابی جوتے ۔ ہاتھ میں ایک موٹی واکنگ اسٹک] ۔

بیگم : (کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے) کہاں گئے تھے آپ ایسی سردی میں ؟ ——— کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ کھانا ٹھنڈا پالا ہو گیا ۔ (کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

پروفیسر : (نرمی سے) نتھو کے یہاں !

بیگم : (تعجب سے) نتھو ، سائیس ! کیوں ؟ (مایوس مڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

پروفیسر : بیچارہ بیمار ہے ۔ شام کو مجھے اس کے بچے نے بتایا ۔ (بیٹھتا ہے)

بیگم : یہ نگوڑے چین سے نہیں بیٹھنے دیتے دم بھر کے لئے ! اگر بیمار ہی تھا تو آپ کو اطلاع دینا کیا ضرور تھا ، ڈاکٹر کے پاس جاتا ۔ ویدوں حکیموں کا دروازہ کھٹکھٹاتا ۔

پروفیسر : غریب کے پاس پیسہ کہاں ڈاکٹر حکیم کے لئے !

بیگم : تو آپ سے پیسے مانگتا تھا ، آپ نے پیسے ہی دے دیئے ہوتے !

پروفیسر : مگر میرے پاس بھی نہ تھے ——— میرے پاس جو چیز پیسوں سے زیادہ قیمتی تھی وہ دے آیا ۔

بیگم : (کچھ گھبرا کر) کیا چیز ؟

پروفیسر : ہمدردی !

بیگم: (مطمئن ہو کر) نجانتے ہیں نہ یہ سب، کہ میاں سیدھے سادے اللہ والے شہر ہے۔ ذرا کسی کا رونگٹا دُکھے اور کوئی بلائے تو کالج چھوڑ کے چلے آئیں گے۔ آپ کی کمزوری سے خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں یہ لوگ!

پروفیسر: وہ چیز جسے میں اپنی تنہا مضبوطی سمجھتا ہوں، تم اس کو کمزوری کہتی ہو؟ [پروفیسر کا چھوٹا بھائی کمال جو میڈیکل کالج میں پڑھ رہا ہے پینٹ اور قمیض پہنے داخل ہوتا ہے۔ قد او سط درجہ کا ہے۔]

کمال: بھائی جان۔ میں کچھ کتنا چھوٹا منہ بڑی بات سمجھتا ہوں۔ لیکن اتنا کہنے کی جرأت کروں گا کہ آپ اپنی شان اور مرتبے کا خیال تو رکھا کیجئے! آپ ایک بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔

پروفیسر: شان اور مرتبہ! یہ دونوں چھوٹے اور کھوٹے آدمیوں کے غلاف ہیں جنہیں وہ اپنے مٹی کے بنے ہوئے جسموں کو بارش کی بوچھاڑوں سے بچانے کے لئے برساتی کی طرح اوڑھے رہتے ہیں!

بیگم:۔ ہمارے جسم مٹی کے نہیں ہیں؟ (یہ کہتے ہوئے وہ اُون اور سلائیاں اٹھا کر سویٹر بننا شروع کر دیتی ہے)

پروفیسر: ہیں! لیکن مذہب کی بھٹی میں تپ کر پکے ہو چکے ہیں۔ انہیں دنیاوی آلام و مصائب کی موسلا دھار بارشیں بھی نہیں گلا سکتیں! ——— مجھے ننھو کی بیمار پُرسی اور تھوڑی دیر کی تیمارداری سے اس وقت وہ طمانیت، وہ سکون اور وہ عرفان حاصل ہوتا ہے جو عبادت سے حاصل ہوتا ہے! سمجھنے کی کوشش کرو! کمال یہی عبادت ہے!

بیگم: روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ کے بعد پانچویں عبادت کہاں سے آگئی؟

کمال: (نہایت خفیف طنز کے لہجے میں) میں تو آج تک اس قسم کے "اقوالِ زریں" کو فریم کر کے دیوار کی زینت بڑھانے۔ اور نوٹ بک کے صفحے بھرنے کا ایک ذریعہ سمجھتا رہا ہوں!

پروفیسر:۔ یہ ہماری محرومی ہے! کاش ہم حقیقتوں کو اقوالِ زریں کا خطاب دے کر انہیں طاقوں پر سجانا چھوڑ دیں۔ انہیں اپنے دل کے گھر میں سجانا سیکھیں! کاش ......

کمال:۔ (بے صبری کے ساتھ بیچ میں بولتے ہوئے) دل کے گھر میں گھر کی فکروں سے ایک انچ جگہ بھی خالی رہ گئی ہو ———

پروفیسر: کمال، دل کوئی گھروندا نہیں۔ لامکاں اور لازماں ہے! خدا کی بنائی ہوئی پہیلی یہی ہے کہ دل مٹی کے ایک چھوٹے سے جسم میں بند ہے۔ لیکن اتنا بڑا ہے کہ اس میں ساری کائنات سما سکتی ہے ——— وہ ایک سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ ایک فضا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ ایک آسمان ہے جس کا کوئی دائرہ نہیں!

[بیگم جلال اس دوران میں ایک جماہی لے کر اون اور سلائیاں آدھے بنے ہوئے سویٹر کے ساتھ لپیٹ کر رکھ دیتی ہیں اور بولتی ہیں]

بیگم: اب آپ کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہوتی جا رہی ہیں ——— چلئے کھانا کھا لیجئے نا!

پروفیسر: (نرمی سے) میں ذرا ٹھہر کر کھاؤں گا۔ بھوک نہیں!

کمال: خدا ہم لوگوں کو توفیق دے کہ ہم بھی اس دل کو دیکھ سکیں۔ اب تک تو میں دل کو گوشت کا چار انچ کا ٹکڑا ہی سمجھ سکا ہوں۔ فزیالوجی نے مجھے اتنا ہی بتایا ہے!

پروفیسر: میاں کمال آگے بڑھ جاؤ اس فزیالوجی سے! آسمانی فزیالوجی کیا کہتی ہے، یہ بھی دیکھو! (اپنے خیال میں محو ہوتے ہوئے) جب تم فارغ التعلیم ہو کر ایک ڈاکٹر بن جاؤ گے ——— جب تمہیں خلقِ خدا کی خدمت میں لطف آنے لگے گا اس وقت تم سمجھ جاؤ گے کہ دل کیا ہے! ابھی تم فزیالوجی کے شاگرد ہو۔ اُس وقت فزیالوجی تمہاری شاگرد ہو گی!

کمال: (پہلو بدل کر) لیکن بھائی جان! آپ خود ہی تو کہا کرتے ہیں کہ اپنے گھر اور کنبے کی خبر گیری پہلی عبادت ہے۔ جسے دوسرے لفظوں میں "اول خویش بعدہٗ درویش" بھی کہا جاتا ہے!

بیگم: (متوجہ ہو کر) اور کیا!

پروفیسر: اپنا کنبہ! کیا ننھو میرا بھائی نہیں ہے؟ ——— اپنی نظر کو وسیع کرو

کیا سارے انسان ایک کنبے کے افراد نہیں؟

کمال: بھائی جان! (کسی قدر پُر ملال لہجے میں) دوسروں سے سلوک کرتے وقت آپ کبھی کبھی یہ بھی سوچ لیا کیجئے کہ آپ کا ایک چھوٹا حقیقی بھائی ہے جسے کالج کی فیس کے علاوہ بھی پیسے کی ضرورت پڑ سکتی ہے!

پروفیسر: (ہنستے ہوئے) کمال میاں! میں نے کبھی تم کو خالی ہاتھ واپس کیا ہے۔ سوائے اس وقت کے جب میرا ہاتھ خود خالی تھا؟ —
اگر تم نے خود مجھ سے اپنی ضرورت کے اظہار میں شرم و حیا سے کام لیا تو تم کو ویسا نہ چاہیے تھا! —

کمال: جی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ہاتھ خالی ہی کیوں ہو — آپ خدا کے فضل سے ڈیڑھ ہزار روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اور چار افراد کا مختصر گھرانہ ہے — —

بیگم: (کمال کے اس برمحل فقرے پر خوش ہو کر) اور کیا بھیا! —

پروفیسر: پھر وہیں آگئے نا! مجھے اس ناچیز عبادت سے بھی باز رکھنا چاہتے ہو جس کا اللہ نے مجھے موقع دیا ہے —!

کمال: (ذرا جرأت اکٹھی کر کے) بھائی جان، کیا آپ کو یقین ہے کہ انور، نسیم، عبدالستار، اور حشمت علی وغیرہ جن کی فیسیں آپ ہر ماہ اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں، وہ سب اتنے ہی مسکین ہیں جتنے کہ نظر آتے ہیں؟ — کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ اپنے والدین کے بھیجے ہوئے جیب خرچ کو سینما اور تھیئٹر کے کا ذخیر میں صرف کرتے ہیں؟ — کیا آپ کو یقین ہے کہ جو لوگ رو رو کر آپ سے اپنے لئے مکانوں کا کرایہ مانگ کر لے جاتے ہیں وہ اپنی مختصر پونجیوں کو جوئے میں نہیں ہارتے؟ — جو لوگ آپ کی سخاوت سے علاج کرا کے شفا پاتے ہیں وہ اچھے ہونے کے بعد چوری اور اٹھائی گیری کے آبائی پیشوں میں پھر جی جان سے مشغول نہیں ہو جاتے؟ — کیا آپ کو ......

پروفیسر: (بے دلی سے، بات کاٹتے ہوئے) سمجھتا ہوں، تم کیا لینا چاہتے ہو۔ یہ وہ آخری دلیل ہے جو تمہارے خیال میں مجھے متزلزل کر دے گی۔ جس کے آگے مجھے ہتھیار ڈال ہی دینے پڑیں گے — لیکن سنو کمال! سلوک کرتے وقت مسلمان یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے سلوک کا کوئی مفید نتیجہ بھی نکلے گا! — اس کی بے لوث نگاہیں صرف اتنا دیکھنا کافی سمجھتی ہیں کہ یہاں دکھ ہے، آنسو ہیں، افلاس ہے۔ اور اس کی ہمدردی کی آغوش وا ہو جاتی ہے۔ جس طرح رتوندے کے مریض کے لئے رات کے اندھیرے میں ہر چیز نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اسی طرح ہماری اندھی ہمدردی جہاں بھی غموں اور مصیبتوں کے اندھیرے سے دوچار ہوتی ہے تو باقی سب کچھ اس کی نظروں سے چھپ جاتا ہے! وہ "دینا" دینا نہیں جو نتیجے یا معاوضے کی اُمید میں ہو! وہ تو فقط "لینا" ہے!

بیگم: قرآن شریف مع ترجمہ اور بہشتی زیور میں نے بھی پڑھا ہے۔ یتیموں بیواؤں اور مسکینوں کی مدد کا ہر جگہ حکم ہے۔ مگر یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ لوگو! چور، ڈاکوؤں اور جواریوں کی امداد کرو۔ ان کے لئے آنسو بہاؤ! —

[اتنے میں ملازم (شریف) گھبرایا ہوا، ہاتھ میں تھیلا لئے داخل ہوتا ہے۔ یہ پرانے کوٹ اور سلوار میں ملبوس ہے۔ سر پر پگڑی باندھے ہے۔ ادھیڑ عمر، بڑی مونچھیں، خشخشی ڈاڑھی]

شریف: (ہانپتے ہوئے) سرکار! میں بازار سے ترکاری لینے گیا تھا.....
[بیگم اور کمال اس کے داخلے پر چونکتے ہیں، مگر اس کے لٹے جملے پر ہنس دیتے ہیں]

پروفیسر: ہاں کہو! خیر تو ہے، یہ گھبراہٹ کیوں؟

شریف: وہاں جس دکان پر بھی گیا، بس ایک ہی چرچا سنا!

کمال: (ترشی سے) صاف صاف کہو۔ اختصار کیوں کراتے ہو —

شریف: بچے بچے کی زبان پر یہی قصہ تھا کہ آج ایک بڑا خطرناک آدمی شہر میں آ پہنچا ہے!

بیگم: (پریشان ہوکر) یا اللہ خیر!

شریف: اُنیس سال کی جیل کاٹ کر نکلا ہے۔ چھٹا ہوا بدمعاش! بڑا موذی ہے۔ بڑا ظالم! رحم تو ہے ہی نہیں کمبخت کے دل میں۔۔۔ سب شہر میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ سب سہمے ہوئے ہیں۔ لوگوں نے سرِ شام ہی سے گھروں کی کنڈیاں بند کرنی شروع کر دی ہیں۔ اور بچوں کو اندر بٹھا لیا ہے! ۔۔۔۔ میں بھاگا بھاگ خبر دینے آیا ہوں! ۔۔۔۔

بیگم: سنئے سُنئے!

پروفیسر: اچھا! واقعی وہ اتنا خطرناک ہے؟ (اپنے خیال میں محو ہو کر) قیدی! مجرم! مجرم کو سب دیکھ لیتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کون سی سڑک تھی جس نے اسے جرم کی منزل تک پہنچایا!! ۔۔۔

بیگم: یا اللہ، تیرا ہی آسرا ہے! شریف! جاؤ، تینوں پورب والے کمروں اور غسل خانے کے کواڑ اچھی طرح بند کر دو ۔۔۔

شریف: (کچھ او رکہنے کی کوشش کرتے ہوئے) سرکار......

بیگم: (اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے۔ پروفیسر جلال سے مخاطب ہو کر) اور میں کہتی ہوں، یہ آپ کے دیوان خانے کا دروازہ بھی آخر کبھی بند ہوگا یا نہیں؟ ۔۔۔

شریف: (زور سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے) جی بی بی جی! بس میں یہی کہنے جا رہا تھا۔ (ترغیب کی کوشش کرتے ہوئے) سرکار، ایسے ایسے موقع روز تھوڑی ہی آتے ہیں۔ بس آج آج کی بات ہے۔ آج تو اسے بند کر ہی دیجئے! ۔۔۔

بیگم: یہ کہاں بند کرانے والے! یا اللہ تیری پناہ! میرے تو خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ رات بھر کواڑ کھلے پڑے رہتے ہیں۔ ذرا کوئی انگلی سے چھو دے اور چوپٹ کھل جائیں۔ پھر یہ مصیبت کہ اگر کوئی اللہ مارا آدھی رات کو بھی دستک دے تو "آجاؤ" کے سوا یہ دوسرا جواب نہیں جانتے (یہ "آجاؤ" ایسا تکیۂ غلاف۔ ز یہ تکیۂ کلام۔ ہو گیا ہے کہ کمبخت سوتے میں بھی منہ سے یہی نکلتا ہے کہ "آجاؤ"۔

شریف: ہاں سرکار۔ ویسے تو اللہ نگہبان ہے۔ اس کی حفظ امان میں۔ لیکن آدمی کو اپنی سی تو حفاظت کر لینی چاہئے۔ توکل کرے مگر اونٹ کو بھی باندھ دے! اور یہ بزات پولیس والے! ان سے تو کوئی امید ہے نہیں۔ یہ تو دوست ہوتے ہیں ویسے ٹھگوں کے! اگر خدانا خواستہ کی پناہ، کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو ۔۔۔ سرکار حکم دیں، میں ابھی خیر الدین لوہار کو اس کے مکان سے بلا لاؤں؟ ایک منٹ میں چٹخنی فٹ کر دے گا۔

بیگم: ہاں ہاں! ٹھیک ہے! تم .....

پروفیسر: (بات کاٹ کر) یہ دروازہ جو بیس سال سے کھلا ہوا ہے ۔۔۔ اس کو آج میں کس طرح بند کرا سکتا ہوں؟ (تینوں پر ایک عجیب سی نظر ڈالتا ہے)

کمال: بھائی صاحب۔ ایک روایت کا توڑنا بے شک ہمت کا کام ہے لیکن بدلتے ہوئے وقت اور ضرورتوں کا تقاضا بھی تو کوئی چیز ہے

پروفیسر: اچھا! میرے یہاں کون سی نقدی اور سونے چاندی کا ڈھیر پڑا ہے جس کے لٹ جانے کا ڈر ہو؟ ۔۔۔ اور یہ مختصر فرنیچر چور کو پسند نہیں آئے گا۔

بیگم: یا اللہ توبہ! اور میرے زیور نہیں ہیں؟ ۔۔۔

پروفیسر: میں تو کب سے کہہ رہا ہوں کہ یہ بوجھ اُتار دو اپنی گردن سے۔ اس سونے چاندی کے حقدار اور لوگ ہیں۔ جن کے پیٹ کو اس دنیا کے جھوٹے "اَن داتا" "دو وقت ٹکڑا" بھی نصیب نہیں ہونے دیتے!

بیگم: (آنسو بھرے لہجے میں) بس ان سے میرے زیور بھی نہیں دیکھے جاتے! (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہائے!

کمال: اور پھر یہ چاندی کے چمچے اور پلیٹیں ہیں۔ آپ کا چاندی کا فانوس ہے! آخر یہ تو آپ کی محبوب چیزیں ہیں؟

شریف: (زور سے سر ہلا کر) جی۔ جی ہاں سرکار! ۔۔۔

پروفیسر: (سوچتے ہوئے) ہاں، بے شک [illegible]۔ لو دامیاں

موم بتی کی یہی یادگار رہ گئی ہے ۔۔۔ (ٹھنڈی سانس بھرتا ہے)

شریف: (مالک کو راستے پر آتا دیکھ کر، فاتحانہ لہجے میں) تو بلاؤں خنجر کو، سرکار ؟

پروفیسر: (اس کی بات ان سنی کر کے) لیکن چاندی سے اتنی محبت اچھی نہیں! کہیں خدا کو ناپسند نہ ہو! ۔۔۔۔

کمال: (کھسیانی ہنسی کے ساتھ) عجیب بات ہے! آپ سے زیادہ چاندی سے نفرت کرنے والا کون ہوگا ؟

پروفیسر: (فیصلہ کن انداز میں) شریف! دروازہ اسی طرح کھلا رہے گا۔ حکیم اور درویش کا دروازہ بند نہیں ہوا کرتا! ۔۔۔۔ (بیوی اور کمال کی طرف متوجہ ہو کر) ڈرتے ہو تم لوگ؟ بس ایک چور سے، ایک ڈاکو سے ڈر گئے! ڈرنا چاہیے ہمیں اپنے آپ سے یعنی "نفس" سے جو چور سے زیادہ مجرم اور بھیڑیئے سے زیادہ خون خوار ہے! چور صرف چاندی کے ٹکڑے چھینتا ہے، لیکن نفس ہماری انسانیت چھین لیتا ہے۔ ڈاکو جسم پر وار کرتا ہے۔ نفس ہماری روح پر حملہ کرتا ہے! ......

[اتنے میں دیوان خانے کے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ شدت کے ساتھ۔ تینوں چونک کر اور قدرے بے چین ہو کر دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ بیگم جلال جھپٹ کر باہر والے کمرے میں چلی جاتی ہیں]

پروفیسر: (حسب معمول، پورے اطمینان کے لہجے میں) آجاؤ!

[دروازہ زور سے کھلتا ہے اور ضمیر نمودار ہوتا ہے۔ چہرے پر خشونت۔ بیباکی بلکہ تشدد۔ ایک خستگی اور کرب لیکن اس کے باوجود ایک مستعدی اور بیباکانہ پن ساتھ میں موٹا سا بدقطع ڈنڈا۔ کندھے پر کپڑے کا بڑا سا تھیلا، بھدے اور پھٹے جوتے، گرد آلود بوٹ میلا، آستینوں پر پھٹا ہوا کوٹ، بال الجھے ہوئے، ڈاڑھی کسی حد تک بڑھی ہوئی۔ موم بتی کی روشنی میں وہ اور بھی ہولناک نظر آتا ہے]

شریف: (اس کو دیکھتے ہی بدحواس ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے!) (گھبرا کر پہلے زنان خانے کی طرف نظر ڈالتا ہے، پھر پروفیسر کے چہرے پر۔ اس کو بدستور مطمئن دیکھ کر دیوان خانے ہی میں، لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف کو جا کھڑا ہوتا ہے۔)

(کمال اسے دیکھتے ہی بے اختیار کچھ وحشت محسوس کرتا ہے اور اپنی کرسی سے اضطراری طور پر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ گویا اگر موقع خراب ہوا تو فوراً بھاگ جائے گا۔ چہرے پر خوف اور حقارت کے ملے جلے اثرات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کی طبیعت بہت پریشان ہے۔ قبل اس کے کہ پروفیسر جلال ضمیر کے استقبال کے طور پر کچھ بولیں یا کوئی استفسار کر سکیں، ضمیر اندر آتے ہی تند لہجے میں بولنا شروع کر دیتا ہے۔)

ضمیر: خبردار۔ جس طرح بیٹھے ہو وہیں بیٹھے رہو! (شریف کے چہرے پر پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ پروفیسر کچھ کہنے کے لئے لب کھولتے ہیں لیکن موقع نہیں ملتا) میں تنگ آچکا ہوں! تہیہ کر کے آیا ہوں! (اپنا ڈنڈا کسی قدر بلند کرتے ہوئے) اس کے زور سے لوں گا!! اب تک مانگ رہا تھا، اب چھینوں گا! ضمیر جب تنگ آجاتا ہے تو بڑی بڑی طاقتیں اس سے پناہ مانگتی ہیں۔ (شریف کے پاؤں اضطراری طور پر بھاگنے کے لئے اٹھتے ہیں) خبردار! کھڑے رہو وہاں! پولیس میں رپٹ لکھاؤ گے؟ لوگوں کو مدد کے لئے بلاؤ گے؟ میں ضرور جانے دوں گا تمہیں! (کمال کو گھورتے ہوئے اور پروفیسر سے مخاطب ہو کر) مجھے ایندھن چاہیئے! اتنا ایندھن جو (اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے) "اس دوزخ" کو بھر دے! ابھی! فوراً ۔۔۔۔ (خشمناک نگاہوں سے دھمکاتا ہے)

پروفیسر: (اپنی معمولی تمکنت اور نرمی سے) جانتا ہوں میرے بھائی! آؤ ۔۔۔ ادھر آگ کے قریب بیٹھ جاؤ۔ تھکے ہوئے ہو۔ سردی سے ٹھٹھر رہے ہو ۔۔۔ آؤ! میں تمہارے لئے ابھی کھانا منگاتا ہوں! شریف! میرے ساتھ ایک مہمان کے کھانے کا بھی بندوبست کرو۔ دسترخوان فوراً چن دو! ۔۔۔ (ضمیر سے جو اس کے سکون و اطمینان پر کسی قدر

حیران ہے میرے بھائی! تمہیں یہاں جیل دینے کی زحمت کیا پھر
بھی کھانا مل سکتا ہے!

ضمیر: (طنز کے ساتھ) میں زیادہ ہمدردی نہیں چاہتا مجھے ذرا کھانا چاہیئے
میری آنتیں تین دن تین رات سے اپنے آپ کو کھا رہی ہیں!——
تم "معزز مجرم" ہو گے تم بے گناہی کے ٹھیکے دار، اس قدر انصاف پسند
ہو کہ تم نے مجرم کے پیٹ کو بھی مجرم قرار دے دیا ہے - اور اب
تک اسے خالی رکھنے میں کامیاب ہی رہے ہو—— لیکن اب میں
ہر چیز کے لئے تیار ہوں! دیکھوں اب مجھے کون روک سکتا ہے! پھر
دنیا کے لئے پڑا پڑا اٹھا کر اُسے توڑتا ہے) تمہاری ہی طرح سب لوگ
پہلے باتیں بناتے ہیں کہ آؤ۔ تشریف رکھو۔ نوش فرمائیے۔ لیکن جوں ہی
انہیں معلوم ہوتا ہے کہ میں جیل سے چھوٹا ہوا ایک پرانا قیدی ہوں اُسی
وقت مجھے ذلیل کرنے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ جو کھانا میں
نوش فرمانے والا تھا وہ خود بخود غائب ہو جاتا ہے انگیٹھیوں میں
میرے لئے ایک چنگاری باقی نہیں رہتی۔ سارے دروازے مجھ پر
بند کر دیئے جاتے ہیں! (غصہ اور طنز سے ہانپتا ہے)

پروفیسر: (بولنے کا موقع پا کر) میرے بھائی! اتنا معلوم ہونے کے بعد بھی
یہ دروازہ انشاء اللہ تم پر بند نہ ہوگا! اطمینان سے بیٹھو!

ضمیر: کیا واقعی تم مجھے اپنا بھائی اور مہمان کہہ رہے ہو؟ تم مجھے دھتکارتے
کیوں نہیں؟ تم واقعی مجھے کھانا کھلانے پر تیار ہو؟—— کیا یہ گھر دوسرے
گھروں کی طرح نہیں؟

پروفیسر: نہیں!—— آرام کرو۔ یہ گھر جتنا میرا ہے، اس سے زیادہ
تمہارا ہے۔ اس کا اصل مالک وہ ہے، آسمان والا! میں نہیں——

ضمیر: (تلخ طنز یہ لہجے میں) تمہارا آسمان والا تو اتنا مشغول ہے کہ اُسے ہم
زمین کے حقیر جانوروں پر ایک نظر ڈالنے کی بھی فرصت نہیں! وہ
سب کچھ دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کرتا۔ نہیں نہیں! وہی سب کچھ کرتا
ہے!—— جب مجھے ایک بھوکی بیوہ اور اس کے یتیم بچوں
کے لئے چوری کرنے پر تین سال قید کی سزا دی گئی تو آسمان والے
کو جو پکٹ ہم آیا تھا جو آج تم اس کے نام کی رشوت دے کر
مجھے بلا رہے ہو؟—— جب میں قید تھا اور بیوہ بھی بیمار
تھی، اور اس کے سات بچے بھوک سے بلک رہے تھے تو اس
آسمان والے نے اپنے آسمان پر سے کون سے فرشتے اور کون سا
من و سلویٰ بھیج دیا تھا؟—— بہشت! کچھ نہیں! سب بکواس!
جانتے ہو، میں دہریہ ہوں! پکا دہریہ! تم لوگ جسے پوجتے
پھرتے ہو اس کا وجود ہی نہیں!—— کھانا اب تک نہیں آیا؟

پروفیسر: نہیں! کھانا وہ آگیا۔ (شریف کھانا لئے ہوئے آتا ہے اور
چننے لگتا ہے) جانتے ہو میرے بھائی، دنیا میں ساری ناانصافیاں
اس کو نہ ماننے کی وجہ سے ہو رہی ہیں!—— میرے دوست!
میں جانتا ہوں اُنیس سال قید میں رہنے کے بعد تمہارے دل کی
کیا حالت ہو چکی ہے —— انسان کے وحشیانہ مظالم نے
تم کو خدا سے بیزار کر دیا ہے —— تم بے قصور ہو لیکن تمہیں خبر
نہیں وہ ہر وقت تمہارے ساتھ ہے —— اُسی سے تم زندہ ہو!
وہ اگر توفیق دے گا تو تمہارے دل کا یہ طوفان تھم جائے گا۔
اور پھر تم حقیقت کو دیکھ سکو گے۔

ضمیر: (تلخی سے) میں اس جینے سے مر جانا بہتر سمجھتا ہوں!

پروفیسر: (کمال سے) کمال ہے تم اپنا ہرج نہ کرو۔ امتحان کی تیاری جاری رکھو
(کمال فیفت مجھے ہوئے اٹھ کر چل دیتا ہے) —— (ضمیر سے مخاطب
ہو کر) میرے بھائی! جینا ہمیشہ مرنے سے زیادہ مشکل رہا ہے!
—— جینا، مسلسل خون کے گھونٹ پینا ہے!—— لیکن آدمی ہم تم
مرد ہیں ہمیں یہ گھونٹ پینے ہی چاہئیں!

ضمیر: (درشت اور کرخت لہجے میں) یہ نصیحتیں الگ باندھ کر رکھو! مجھے
نہیں چاہئیں —— میں زندگی کو اس کی پوری بھیانک عریانی کے ساتھ
دیکھ چکا ہوں۔ اُسے اپنے الفاظ کے خوبصورت پردوں سے
ڈھکنے کی کوشش نہ کرو!——

پروفیسر: (کچھ نادم ہو کر) نہیں نہیں میرے بھائی! یہ تو ہرگز نصیحت نہیں

کر رہا! ایک بات اتفاق سے نکل گئی، مجھے معاف کر دو ـــ آؤ!
کھانا حاضر ہے! ـــ میں کبھی نصیحت نہیں کرتا۔ خود اتنا بڑا گنہگار
ہوں کہ کسی اور گنہگار کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر سکتا!

[دونوں اٹھتے ہیں۔ پروفیسر ہاتھ دھونے لگتا ہے۔ ضمیر
بغیر ہاتھ دھوئے میز کا رُخ کرتا ہے۔ لیکن کھلے ہوئے دروازے
کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے]

ضمیر: یہ دروازہ بند نہیں کیا؟۔ اگر کوئی آ جائے ـــ (بند کرنے
کے لئے چٹخنی تلاش کرتا ہے۔)

پروفیسر: وہ بند نہیں ہو سکتا ـــ (ضمیر ناپسندیدگی سے منہ بناتا ہے) ـــ اطمینان سے کھاؤ۔
یہاں کوئی یوں آئے گا جس سے تمہیں نقصان پہنچے۔ [شریف، پروفیسر کے
اشارے سے لوٹا اور طشت لے کر ضمیر کے پاس اس کے ہاتھ دھلانے کے لئے جا پہنچتا
ہے مگر ڈرتے ڈرتے۔ ضمیر بادلِ ناخواستہ ہاتھ دھوتا ہے] دیکھو شریف!
مرحوم والے چاندی کے پلیٹ اور چمچے بھی دسترخوان پر آنے چاہئیں
ـــ (ضمیر سے) لو یہ قیمہ ہے اور یہ توریاں، شاید تمہیں مرغوب
ہوں۔ (شریف دو پلیٹیں اور چمچے لے کر آتا ہے) شریف،
روٹیاں گرم کر کر کے لاتے رہو ـــ اور کھانے کے بعد مہمان کے
لئے جگ میں دودھ! (ضمیر اور شریف دونوں سے مخاطب ہو کر)
مبارک ہے یہ وقت کہ تم میرے مہمان ہوئے! (شریف تعجب میں)۔
خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اس گھر پر جہاں کسی دُکھے ہوئے دل اور
تھکے ہوئے جسم کو آرام نصیب ہوتا ہے! (شریف جاتا ہے) ـــ
کھاؤ۔ خوب سیر ہو کر کھاؤ! یہ کھانا تمہارے پیٹ میں نہیں جا رہا ہے۔
لیکن میری روح کی بھوک مٹ رہی ہے! (ضمیر بڑی سرگرمی سے
کھانے میں مشغول ہے۔ وحشیانہ ضخامت کے نوالے نگل رہا ہے۔
کبھی کبھی نظر اُٹھا کر پروفیسر کے چہرے کا جائزہ بھی لے لیتا ہے)
ـــ شریف!

شریف: (دروازے کی آتے ہوئے) جی حضور!

پروفیسر: روشنی بہت مدھم ہے۔ فانوس روشن کر دو ـــ (شریف
چاندی کا فانوس لے کر آتا ہے اور ماچس سے اُسے روشن کرتا ہے۔
ضمیر ایک لحظہ بھر کے لئے اسے بڑے غور اور دلچسپی کے ساتھ دیکھتا
ہے اور پھر کھانے لگتا ہے۔ شریف جاتا ہے) ـــ زہے نصیب!
آج ایک ایسا بھائی میرا مہمان ہے جو تہذیب اور تکلف
کی بناوٹوں سے پاک ہے۔ جو صرف انسان ہے! ـــ
(شریف دودھ کا جگ اور ایک مگ لا کر رکھتا ہے)۔
[کھانا کھا چکنے کے بعد ضمیر دودھ کو جگ سے منہ لگا کر ہی
پی جاتا ہے۔ اور اس پر سیر شکمی کا ایک ہلکا سا نشہ چھا جاتا ہے
لیکن غصے اور بھوک کی آگ بجھنے کے بعد وہ کچھ سمجھنے اور سوچنے
پر بھی مائل ہوتا ہے۔ شریف طشت لا کر ہاتھ دھلاتا ہے۔ پروفیسر
خود اٹھ کر ہاتھ دھوتا ہے۔]

پروفیسر: شریف، دیکھو! مہمان کے لئے جلد بستر بچھاؤ۔ وہ آرام کریں گے

ضمیر: (گویا ایک لخت کوئی راز معلوم ہو گیا ہو) تم کچھ عجیب
ہو! تم نے مجھے اوروں کی طرح دھتکارا نہیں۔ جیل کے سپاہیوں
کی طرح مجھے کتا کہہ کر نہیں پکارا ـــ تم نے مجھ سے بھائی بھائی
کی بات کی! (ہنستا ہے) بھائی! ہاہاہا! میں بھی کسی کا بھائی ہو
سکتا ہوں؟ ـــ کیا تم کبھی جیل میں رہے ہو، جو مجھے بھائی
کہتے ہو؟ ـــ نہیں، تم تو بڑے کمزور اور مسکین آدمی دکھائی
دیتے ہو ـــ (نفی میں سر ہلا کر) تم جیل میں نہیں رہے ہرگز
ـــ تم شاید کسی دفتر میں منشی ہو گے؟ ـــ تم کو تو
جج ہونا چاہیے تھا! ـــ

پروفیسر: نہیں۔ میں یہاں یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں!

ضمیر: (تعجب سے) اور اتنے غریب؟ ـــ

پروفیسر: ہاں اتنا غریب! ـــ اور میں اس غریبی میں مگن ہوں۔
میں اس پاک انسان کا خادم ہوں جس نے اپنا سب کچھ غریبوں
کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور خود غریبوں کی زندگی بسر
کرتا تھا ـــ

مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
(حالی)
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

جس نے ہمیں سونے چاندی کو ٹھکرانا سکھایا۔ جس کی فقیری کے سامنے بادشاہی ہیچ ہے! — (ضمیر متوجہ ہو کر عجیب کھوئے ہوئے سے انداز میں ان فقروں کو سنتا ہے۔ کچھ سمجھتا ہے اور کچھ نہیں بھی سمجھتا!)

ضمیر: (چونک کر) تم واقعی عجیب انسان ہو۔ تم نے میرا نام بھی نہیں پوچھا۔ نہ مجھ سے میری سرگزشت دریافت کی —

پروفیسر: یہ دروازہ کسی سے نام نہیں پوچھتا! — یہ صرف اتنا پوچھتا ہے کہ تمہیں کوئی غم، کوئی دکھ تو نہیں ہے؟ اگر ہے تو اندر آجاؤ — اور پھر میں تو تمہارا نام جانتا تھا!

ضمیر: (حیرت سے) تم بھی! — کیسے؟

پروفیسر: — تمہارا نام "انسان" ہے! —

ضمیر: وہ جو انسان تھا، وہ تو مر چکا — ضمیر کب کا مر چکا! میں اب فقط ایک حیوان ہوں — میں اب نمبر چار ہزار نو سو اٹھاسی (۴۹۸۸) ہوں! ضمیر مر گیا!

پروفیسر: نہیں! ضمیر کبھی نہیں مرتا — سو گیا ہے!

ضمیر: انیس برس کی نیند سے جاگنا مشکل ہے!

پروفیسر: مسلمان کے لئے کچھ مشکل نہیں — یاد رکھو!

ضمیر: مجھے تمہاری باتوں سے خدا یاد آ رہا ہے!

پروفیسر: کاش! میرے عمل سے تمہیں اس پر ایمان ہو جائے! میرے دوست! خدا کا نور عمل ہی کی دوربین سے نظر آ سکتا ہے۔ — عمل کے بغیر یہ چاشنی نہیں چکھی جا سکتی!

ضمیر: (اپنے خیال سے چونک کر) سچ! — ہاں اور تم نے اوروں کی طرح پولیس میں رپورٹ کرنے کی دھمکی بھی نہیں دی! — کیا واقعی تم انسان ہو، یا کوئی فرشتہ؟ مجھے خدا کی شان دکھانے کے لئے نازل ہوا ہے! — اچھا میں تم کو پھر آزماتا ہوں — یہ میرا پروانہ رہائی تو پڑھ کر دیکھو — اچھا میں خود پڑھتا ہوں — میں نے جیل میں پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا — سنو!

"ضمیر محمد ولد چراغ احمد ساکن موضع شیر کوٹ ضلع کانگڑہ — چار بار جیل سے فرار ہونے کے جرم میں سولہ سال قید رہا — پہلی تین سال کی سزا ملا کر کل انیس سال بعد رہا کیا جاتا ہے — نہایت خطرناک انسان ہے"! (پڑھنے کے بعد پروفیسر کی طرف دیکھتا ہے، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس پر اس "سرکاری بیان" کا کیا اثر ہوا)۔

پروفیسر: تم نے ناحق زحمت کی، اسے پڑھنے کی! مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ تم خطرناک ہو یا نہیں — یاد رکھنا، ہر شخص دوسروں سے زیادہ خود اپنے لئے خطرناک ہوتا ہے! —

ضمیر: سچ کہتے ہو — میں ہی اپنے لئے خطرناک ہوں!

پروفیسر: میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اس بے نیاز کے لئے بڑے بڑے عابد زاہد ترستے رہ جاتے ہیں اور ایک سیاہ کار جو اپنی زندگی بدلنے کا عزم کر چکا ہو، باریاب ہو جاتا ہے! — اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے!

ضمیر: (انتہائی مایوسی سے) میرے لئے زمین و آسمان میں کہیں جگہ نہیں! بس تم وہ پہلے انسان ہو جس نے مجھ سے انسان کی طرح سلوک کیا ہے۔ رحمت ہو اس نیک عورت پر جس نے مجھے تمہارا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے کہا — میں آج ۳۶ میل پیدل گھسٹا ہوں! میرے پاؤں سوج گئے! سرائے، ہوٹل، کوٹھیاں، جھونپڑے، مسجد، مندر کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں میں نے روٹی اور پڑ رہنے کے لئے پناہ نہ طلب کی ہو۔ بھیک نہیں، قیمت دے کر! لیکن ہر جگہ ایک ہی جواب تھا، جیسے کسی گنبد میں ایک ہی آواز گونج کر بار بار لوٹتی ہو — انسانوں سے بیزار ہو کر جب میں نے ایک کتے کے دربے میں پناہ لینا چاہی تو کتا بھی میرے لئے انسان بن گیا۔ شاید اس نے بھی میرا پروانہ رہائی پڑھ لیا تھا!

اس نے بھی اس توکش روئی کے ساتھ مجھ سے اپنی قیامگاہ خالی کروالی! —— آخر میں نے یہ دروازہ کھٹکھٹایا ——

انتہائی تلخ امادوں کے ساتھ اور طیش کی حالت میں! —— مجھے مدتوں سے یقین تھا کہ دنیا میں نیکی کا وجود نہیں —— یہ صرف ڈھکوسلا ہے —— لیکن آج مجھے جیسے کوئی طاقتور ہاتھ اس تاریک سمندر کے ساحل سے کھینچ کر پھر روشنی کی طرف واپس بلا رہا ہے! —— میں اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ جس وقت تم نے اپنی پاک مسکراہٹ کے ساتھ مجھے کھانے پر شریک کیا ہے تو ایک دفعہ تو میری بھوک مٹ گئی۔ اس مسکراہٹ میں نیکی۔ خدا پرستی۔ محبت۔ شرافت — اور نہ جانے کون سی چیز ہے جسے میں سمجھا نہیں سکتا، —— یہ سب بجلی کی طرح میرے سامنے چمک گئیں! پھر میرے دل میں ایک بے چینی سی چھا گئی —— ایک بار یقین ہوتا تھا تو دوسرے لمحے مجھے پھر اپنی آنکھیں دھوکا دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بدی پر جو ایمان برسوں سے اس دل میں پرورش پا رہا تھا اس کی جڑیں ایک منٹ میں ہل گئی تھیں!! ——

مجھے زندگی میں دو بار تعجب ہوا ہے: ایک جب مجھے چھوٹی سی خطا پر تین سال کے لئے قید کیا گیا —— دوسرے آج تمہارے برتاؤ پر! ——— (اچانک چونک کر) تم میرے ساتھ آخر کیوں اتنی ہمدردی سے پیش آرہے ہو؟ کہیں اس میں تمہاری کوئی غرض تو شامل نہیں؟ کوئی چال تو نہیں؟ ——

پروفیسر: (مسکرا کر) ہاں غرض شامل ہے! —— تمہارے دکھوں میں اپنا بھی حصہ لگانا چاہتا ہوں! تمہیں دوست بنانا چاہتا ہوں! ——

ضمیر: (سوچتے ہوئے) میرے دکھ؟ اب تو میں ایک پتھر کی چٹان ہوں۔ بے حس! اب مجھے دکھ نہیں ہوتا! —— میں نے انیس سال تک دنیا کے ناپاک ترین انسانوں کے جوتوں کی ٹھوکریں اور کوڑوں کی مار کھائی ہے۔ گالیاں سنی ہیں اور چیتا رہا ہوں نے مجبوروں میں کتوں اور جنگلی جانوروں کی طرح بند رہا ہوں: صبح سے شام تک چکیاں پیسی ہیں۔ بھاری پتھر ڈھوئے ہیں۔ لکڑی کے تختوں پر سوتے سوتے یہ عمر گزاری ہے! —— لیکن یہ سب کچھ نہیں! میں عادی ہو گیا —— ایک وقت وہ بھی تھا جب ضمیر انسان تھا، نمبر چار ہزار نو سو اٹھاسی نہ تھا —— جب اسے ہتھکڑیوں اور زنجیروں میں باندھ کر جیل کی بے رحم دیواروں کے سائے میں لا کر کھڑا کیا گیا تھا — اور وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا —— آہ! وہ ضمیر کتنا بھولا تھا! کتنا بے گناہ! —— نہیں ہے، اب میرے لئے زمین و آسمان میں کہیں جگہ نہیں۔

پروفیسر: تمہاری داستان سن کر دل بھر آیا —— دوست میرے! — مایوس نہ ہو! انسان کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ کیا عجب ہے کہ تمہارا درجہ عابدوں سے بھی بڑا ہو! تم سے خدا کو کوئی کام لینا مقصود ہو! اس کی قدرت عجیب ہے! —— کیا معلوم تمہاری زندگی کروٹ لے رہی ہو! ——

ضمیر: (کچھ محسوس کرتے ہوئے) کروٹ؟ ہاں کروٹ......

پروفیسر: (آہستگی سے) ایک پاک زندگی گزارنا مشکل نہیں ہے اگر کوئی چاہے! خدا کی اس بھری دنیا میں حلال روزی کمانے کے کئی راستے ہیں —— کھیتی کی جا سکتی ہے۔ گائے بھینسوں کے دودھ اور اس سے بننے والی چیزوں کا کاروبار کیا جا سکتا ہے — چھوٹے پیمانے کی تجارت ہے۔ اور بیشمار کام ہیں! (ضمیر غور سے سنتا ہے اور خاموش رہتا ہے) اوہو! بھول گیا — تمہارا بستر تو دیکھ آؤں — (جاتا ہے)

ضمیر: (آپ ہی آپ) مجھے کیا ہو گیا ہے؟ —— میرے دل میں کوئی چیز اتری چلی جا رہی ہے! — یہ آدمی نہیں — جادوگر ہے یہ! — میرا ارادہ مجھ سے چھین لیا اس نے!! وہ ارادہ جو [illegible]

کروٹ !! —— کچھ بھی مشکل نہیں ! —— ؟ —— (پروفیسر واپس آتا ہے)

پروفیسر: (خلوص اور دلجوئی کے لہجے میں) اچھا آؤ میرے بھائی — تمہارا بستر تیار ہے — اب تمہیں آرام کرنا چاہیے — مجھے افسوس ہے کہ میں نے اتنی دیر باتیں کرکے تمہاری نیند پر ڈاکہ ڈالا — امید ہے کہ معاف کر دو گے۔ (ضمیر حیرت سے اس کو دیکھتا ہے۔ اور کوشش کے باوجود کچھ کہہ نہیں پاتا — لیکن ایک لمحہ کے اندر وہ یکایک رنگ سا بدلتا ہے۔ جھلملاتی ہوئی روشنی میں اس کا چہرہ دفعتاً درشت اور بھیانک ہو جاتا ہے۔ وہ مجرم آلود آنکھوں سے پروفیسر جلال کو گھورتے ہوئے ذرا اُن کے کان کی طرف جھک کر کہتا ہے]

ضمیر: تم مجھے اپنے اس قدر نزدیک سونے کی جگہ دے رہے ہو — اچھی طرح سوچ بھی لیا ہے ؟ —— تمہیں کیا معلوم کہ میں قاتل نہیں ہوں ؟ ——

پروفیسر: (اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) میں اتنا نہیں سوچا کرتا ! —— یہ سب میں "اُس" (انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پر چھوڑتا ہوں ! —— "وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے" —— تلواریں کند اور پستول بند ہو جاتے ہیں جب وہ بچانا چاہتا ہے ! —— آؤ چلو —— [آگے پروفیسر اور اس کے پیچھے پیچھے ضمیر کسی قدر متحیر "دوسرے کمرے" کی طرف چلا جاتا ہے]

پردہ

تیسرا منظر

[پروفیسر کا کمرۂ خواب گاہ۔ اندھیرے میں ایک ہلکی سی موم بتی ٹمٹما رہی ہے جس کی مدھم روشنی میں ایک پلنگ پر پروفیسر جلال سو رہا ہے۔ اس کے برابر میں ایک چھوٹی میز رکھی ہے۔ اس سے ہٹ کر دوسرے پلنگ پر ضمیر گہری نیند سو رہا ہے۔ پروفیسر کے چہرے پر سکون ہے اور ضمیر کے چہرے پر اب بھی ایک ہلکی سی کرب کی جھلک۔ دونوں پلنگوں کے بیچ میں دیوار کے اندر لگی ہوئی الماری کا ایک پٹ کھلا ہوا ہے۔ اور الماری کے اندر رکھے ہوئے چاندی کے دو پلیٹ اور چمچے چمک رہے ہیں —— ہوا سے کواڑوں کے ہلنے کی ہلکی سی آواز آتی ہے۔ اور کبھی ہوا کے سرسرانے کی آواز۔ ایک لمحے کے بعد باہر تھوڑے فاصلے پر چوکیدار کا نعرہ "جاگتے رہو — ہوشیار" سنائی دیتا ہے —— پھر خاموشی

ضمیر ایک کروٹ لیتا ہے۔ اس کے تھکے ہوئے چہرے پر ایک تکلیف کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ آنکھیں کھول دیتا ہے۔ پھر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ کہیں دور گھنٹہ گھر تین بجاتا ہے —— ایک لمحے بعد پھر چوکیدار کی آواز —— "جاگتے رہو — ہو ہو ہو!" ضمیر اس آواز پر کسی قدر چونک اٹھتا ہے — کتے کے بھونکنے کی آواز —— پھر آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہے]

ضمیر: اُف وہ ! کتنی لمبی رات ہے ! تختوں پر انیس برس سونے کے بعد یہ نرم بستر بھی ایک عذاب ہے ! (تکان اُتارنے کے لئے جسم کو ایک انگڑائی نما جنبش دیتا ہے۔ اور آہستہ سے جمائی لے کے کراہتا ہے۔ پھر اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے — نظر پروفیسر کے پرسکون اور پُرجلال چہرے پر جم کر رہ جاتی ہے) سو رہا ہے —— پارسا انسان — کیسی معصوم، پاک نیند! —— کیا یہ انسان ہے سچ مچ ؟ (آہستہ سے گردن ہلا کر) نہیں نہیں ! اور اگر ہے —— تو میں انسان نہیں !! میں دنیا کا سب سے بڑا — سب سے خطرناک مجرم ! —— یہ میں کیا کر رہا ہوں ؟ —— کیا ضمیر پر پارسائی کا بھوت سوار ہو گیا ؟ ہا ہا ہا ! (اپنا ہاتھ اٹھا کر منہ بھینچتے ہوئے) میں اس کے نیکی اور پارسائی سے بھرے سر کو پاش پاش کر دوں تو —— (دانت پیستے ہوئے [illegible]

تیرا نورانی چہرہ میرے ان جابر ہاتھوں کو پکڑ لیتا ہے۔ میرا دل کیوں چاہتا ہے کہ تیرے ہاتھ چوم لوں؟ ــــ اور خدا! کچھ نہیں!! میں پھر بہک رہا ہوں! لعنت! ــــ یہ بھی تو ایک انسان ہے ــــ مٹی سے پیدا ہونے والا ایک کیڑا ــ اس گندی دنیا کی ذلیل پیداوار! مجھے اس نے کیا دے دیا ہے؟ (الماری میں رکھے ہوئے چاندی کے برتن دیکھتا ہے اور ذرا آگے جھک کر حریصانہ نگاہ سے ان کو گھورتا ہے ــ اٹھ کھڑا ہوتا ہے، ادھر اُدھر دیکھتا ہے ــ ایک نظر پھر پروفیسر پر ڈالتا ہے۔ دوسری برتنوں پر۔ اور بوجھل قدم اٹھا کر الماری کی طرف بڑھتا ہے) چاندی کے برتن!! وہ ہو سے کم کے ہرگز نہیں! (ہوا کا ایک غمگین سا جھونکا آتا ہے اور ضمیر کا سر بے اختیار جھک جاتا ہے) ضمیر! تو دغا دے گا ــ اس شخص کے ساتھ! (اک دم ہنس کر) واہ! پھر دماغ خراب ہونے لگا! بس اسی بل پر ارادے کئے تھے بلے چوڑے؟ ــــ انسانیت کو نقصان پہنچاؤں گا، نوعِ انسانی کو برباد کروں گا۔ . . . کہاں گئے وہ ارادے؟ بس دیکھ لی تیری گہرائی ضمیر! لعنت ہے! کیا انیس سال تک نفذ گما ں کھو دی؟ بے وقوف! ــ موقع ہے ــــ آگے بڑھ!! ــــ دو پلیٹوں کے لئے اتنا تکلف؟ (اپنا کوٹ پلنگ پر سے اٹھا کر کاندھے پر ڈالتا ہے۔ پھر تھیلا اٹھا کر مضبوط قدموں سے آگے بڑھتا ہے ــــ مگر اندھیرے میں کسی قدر بھٹکتا ہوا) یہ کون مجھے روکتا ہے بار بار؟!! ــــ نہیں! نہیں!! (زور سے نفی میں سر ہلاتا ہے) یہ چاندی میری ہو کر رہے گی! (راستے میں میز سے ٹھوکر لگتی ہے۔ رُک جاتا ہے۔ ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ پھر آگے بڑھتا ہے۔ اتنے میں باہر سے پھر چوکیدار کی آواز آتی ہے۔ "ہوشیار ــــ ہو ہو ہو!!" ــــ وہ تن کر پھر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے ــــ ایک قدم پیچھے ہٹتا ہے مگر پھر آگے بڑھتا ہے ــــ اتنے میں بڑا دروازہ ہوا سے متحرک ہو کر چرچراتا ہے اور خاصی کرخت آواز پیدا ہوتی ہے۔ ضمیر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل دھڑکنے لگتا ہے اور چہرے پر تکلیف اور جھنجلاہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے ــــ وہ جھٹ مڑ کر پروفیسر کے چہرے پر نظر ڈالتا ہے، وہ بدستور ہموار سانسیں لیتے ہوئے میٹھی نیند سو رہا ہے ــــ ضمیر مطمئن ہو جاتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ لیکن کچھ وحشت زدہ بھی ہے۔ جب وہ الماری میں سے دونوں پلیٹیں اور چمچے اٹھا کر تھیلے میں رکھنے والا ہوتا ہے اسی وقت پروفیسر کروٹ بدلتا ہے۔ اور ضمیر کا ہاتھ یکایک رُک جاتا ہے۔ وہ مڑ کر ادھر دیکھتا ہے۔ پھر اپنا کام ختم کر کے، اپنے پلنگ کی طرف واپس آتا ہے۔ اپنے جوتے بھی تھیلے میں ڈالتا ہے اور تھیلے کو بھی کاندھے پر رکھ، ڈنڈا ہاتھ میں لے کر بغلی کھڑکی سے باہر کود جاتا ہے ــ پروفیسر پھر ایک کروٹ بدلتا ہے اور لمبی سانس لیتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھ نہیں کھلتی!)

پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔

چوتھا منظر

(وقت: علی الصباح۔ پروفیسر کا مردانہ نشست کا کمرہ۔ ایک طرف میز پر چاندی کا شمعدان رکھا ہے۔ پروفیسر بیٹھا ہوا قرآن شریف پڑھ رہا ہے۔ اس کے چہرے سے رات کے واقعے کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ اتنے میں ملازم شریف گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

شریف: سرکار۔ سرکار! الماری میں سے چاندی کے برتن غائب ہیں۔ آپ کو کچھ معلوم ہے؟

پروفیسر: (اسی اطمینان کے ساتھ) میں معلوم کرنا ہی نہیں چاہتا ــــ انہیں میرے پاس جتنے دن رہنا تھا رہ لئے!

شریف: ضرور وہی کم بخت لے گیا۔ وہ ڈاکو جسے آپ نے رات اپنے کمرے میں سلایا تھا۔ اتنی میں نے آؤ بھگت کی مگر بھاگ گیا

ضمیر: او سال بھی سے گیا ـــــ بھلا جو جیل میں بھی جرم کرتا بیٹھ سکا وہ یہاں کیا ٹھہرتا.......

پروفیسر: اُسے بُرا کیوں کہتے ہو ـ ؟ کیا وہ برتن ہمارے تھے ؟ (اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز میں) نہیں! وہ غریبوں کا حصہ تھا ـ حق بحق دار رسید! مجھے کیا حق تھا کہ میں چاندی کو اس طرح اپنی الماری میں قید کرکے رکھوں ؟ (شریف سے) شریف! آج تمام چینی کی پلیٹیں بازار سے لے آنا!

شریف: بہت اچھا سرکار! ـ ـ کچھ چمچے بھی تو ـــ

پروفیسر: چمچے اور کانٹے کے بغیر بھی کھانا کھایا جا سکتا ہے! (شریف چلا جاتا ہے ـ اتنے میں بیگم جلال یہ گفتگو سنتی ہوئی منہ پھلائے داخل ہوتی ہیں)

بیگم: اور کیا! ایسے موذیوں کی آؤ بھگت کا یہی پھل ملتا ہے ـ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ آثار اچھے نہیں ـــ جو بوئے گا وہی کاٹے گا! خیریت ہوئی جو موئے نے تمہاری گردن پر ہاتھ صاف نہیں کیا ـ یہ بھی لے جاتا تو ہم کیا کر لیتے! (پروفیسر برابر مسکراتا رہتا ہے، بیگم کچھ تلاش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں ـ کمال داخل ہوتا ہے)

کمال: بھائی صاحب، ایک مشکوک قسم کے آدمی نے گھر دیکھ لیا ہے ـ آج برتن لے گیا ہے کل کسی اور چیز پر ہاتھ صاف کرے گا ـ ایسے ایسے آدمی کا آزاد پھرنا ٹھیک نہیں ـــ وہ جہاں بھی جائے گا لوگوں کو اپنا نشانہ بنائے گا ـــ میرا خیال ہے میں پولیس میں رپورٹ کر دیتا ہوں!

پروفیسر: (ایک دم سنجیدہ اور سخت ہو کر) ٹھہرو!! کوئی ضرورت نہیں! سوسائٹی کو مجرم اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا سزا دینے والے ـ کیا تم مجھے اتنا بے مغز سمجھتے ہو کہ میں جرم کے علاج کے لئے وہی بازاری طریقہ استعمال کروں گا جسے "سزا" کہتے ہیں؟ نہیں کمال! دیکھ لینا، پولیس سے زیادہ سزا اُس کو اُس کا ضمیر دے گا ـ

کمال: (دبی ہوئی جھنجھلاہٹ کے ساتھ) واقعہ یہ ہے کہ اس ظالم و گناہگار دنیا میں آپ جیسے نیک دل انسان کی جگہ نہیں ہے ـــــ تو آپ برتنوں کے لئے صبر کرکے بیٹھ جائیں گے ؟ (بیگم جاتی ہیں)

پروفیسر: ہاں! اُس نے انیس سال صبر کیا تھا! میں اُسے دوبارہ جیل کے چنگل میں نہیں پھینکنا چاہتا ـ میں اُس میں ایک نئی زندگی کے آثار دیکھ چکا ہوں ـــــ یہ کروٹ بڑا نازک موقع ہے ـــ اگر اس موقع پر طبیب کا ہاتھ بال برابر چوک گیا تو مریض کی موت یقینی ہے! اگر اس وقت وہ پھر جیل بھیجا گیا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے شیطان بن جانے سے نہ روک سکے گی ـ انسانیت کا یہ جو شرارہ کل چمکا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ جائے گا ـ اور اس کا گناہ میری اور تمہاری گردن پر ہو گا! میں اس طرح انسانیت کا گلا نہیں گھونٹوں گا! ہرگز نہیں!!

(کمال جھنجھلا کر خاموش ہو جاتا ہے اور ایک سکنڈ گزار کر واپس چلا جاتا ہے ـ اتنے میں دروازے پر زور سے دستک ہوتی ہے)

پروفیسر: آجاؤ ـ!

(تین سپاہی ضمیر کو گریبان سے اور بازوؤں سے پکڑے ہوئے داخل ہوتے ہیں ـ وہ ہانپ رہا ہے، چہرے سے شرم اور نفرت دونوں ہویدا ہیں ـ سپاہی سلام کرتے ہیں، پروفیسر آہستہ سے جواب دیتا ہے اور کچھ کہنے کے لئے منتظر ہے لیکن ہیڈ کانسٹیبل اپنی رام کہانی شروع کر دیتا ہے)

کانسٹیبل: پروفیسر صاحب! یہ آدمی رات کو آپ کی پلیٹیں چرا کر بھاگ رہا تھا ـ مردود! ہم نے اسے پکڑ لیا تو بولا یہ پلیٹیں مجھے پروفیسر صاحب نے دی ہیں ـ عیار کہیں کا! سمجھتا ہے ہم اس کی چالوں میں آجائیں گے!

پروفیسر: (سپاہیوں پر ایک کڑی نگاہ ڈال کر) نہیں! یہ میرے دوست ہیں ـ انہوں نے رات میرے ساتھ دسترخوان پر شریک ہو کر

ضمیر: بہت عزت افزائی کی ہے! — او میرے دوست! مجھے خوشی ہے کہ تم آ گئے۔ خوش آمدید۔

ایک سپاہی: (سخت حیران اور پریشان ہو کر) پروفیسر صاحب! شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے — یہ تو بلا.....

پروفیسر: ہاں غلط فہمی ہوئی ہے؟ یہ پلیٹیں میں نے ہی ان کو دی تھیں۔ (ضمیر کی طرف دیکھ کر) لیکن میرے دوست! میں نے تو تم کو یہ شمعدان بھی دیا تھا، تم اُسے کیوں نہ لے گئے۔ (ضمیر مبہوت اور ششدر پروفیسر کو دیکھتا رہ جاتا ہے۔) کوئی ڈیڑھ سو کی مالیت ہے کچھ تمہارے کام آ جاتی (اتنے میں شریف بھی آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔) (سپاہیوں سے) میرے بھائیو! ان کو چھوڑ دو۔ (سپاہی ضمیر کو چھوڑ دیتے ہیں اور ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں، شریف حیران ہے) اور اب تم جا سکتے ہو۔ تمہاری تکلیف فرمائی کا بہت بہت شکریہ! (ضمیر کانپ رہا ہے۔ سپاہی واپس مارچ کرتے ہیں۔)

پروفیسر: (ضمیر سے) شمعدان اٹھا کر دیتا ہے وہ لے لیتا ہے۔ شریف تعجب سے ہاتھ اور سر کو جنبش دیتا ہے اور افسوس میں سر ہلاتا ہے) جاؤ — خوش رہو۔ لیکن میرے بھائی اب کی دفعہ جب ادھر آؤ تو واپسی کے لئے کھڑکی کا راستہ تلاش نہ کرنا۔ (دروازے کی طرف اشارہ کر کے) یہ بڑا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے (ضمیر کی یہ کیفیت ہے گویا غش آ رہا ہو۔ پروفیسر اس کے قریب آ جاتا ہے۔ شریف آہستہ آہستہ واپس اندر چلا جاتا ہے۔ پروفیسر ضمیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے) دیکھو ضمیر! بھولنا نہیں۔ — تم نے وعدہ کیا ہے کہ اس روپے کو ایمان اور نیکی کے راستے میں خرچ کرو گے (ضمیر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے کب وعدہ کیا تھا۔ اور وہ مبہوت کھڑا اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پروفیسر پھر اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے) میرے بھائی! خدا کی رحمت ہو تم پر! آج میں تم کو کروٹ بدلتے دیکھ رہا ہوں.....

ضمیر: (آہستہ سے، کرب آمیز لہجے میں) — او خدا!

(ضمیر کے چہرے پر تکلیف کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور آنسو کا ایک قطرہ ٹپک کر شمعدان پر گرتا ہے جو اس کے ہاتھ میں ہے)

پروفیسر: (بڑی نرمی سے) یہی وہ موتی ہے جس کی مجھے تلاش تھی، انتظار تھا! یہ وہ قطرہ ہے جس میں طوفانوں کی دنیا ہے! بار الہا! عجیب ہے تیری قدرت! بڑا ہے تیرا راز! اے زمین و آسمان! گواہ رہنا، — ضمیر! میں نے تمہاری روح کو واپس لے لیا — آج شیطان کی حکومت گئی۔ — تم رحمان کے دربار میں آ گئے! اندھیری رات گذری صبح کا اجالا ہو گیا!

جھک جاؤ اُس ہستی کے سامنے جس نے انسانیت کی شمع اس زندگی کے بیابان میں روشن کی!

(ضمیر سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ پروفیسر کے چہرے پر روحانی خوشی کی رونق پھیلی ہوئی ہے۔)

— پردہ گر جاتا ہے —

غزلیں

کیفؔ جام پوری

●

کیا پوچھتے ہو اہلِ غمِ عشق کی روداد
دل محشرِ صد نالہ و لب تشنۂ فریاد

تازہ ہیں ابھی جن سے رسوماتِ تمنّا
ایسے بھی ہیں کچھ لوگ ترے شہر میں آباد

تنہائی کی راتوں پہ یہ اندوہِ جدائی
مر جانے کے سامان ہیں سب اے دلِ ناشاد

کل تک تھا جنہیں ناز تری خوئے کرم پر
ہیں آج وہی ماتمیِ حسرتِ برباد

اب یاد تجھے اہلِ وفا آئیں نہ آئیں
لیکن ہے انہیں تیری وہ "سوگندِ وفا" یاد

محروم ہیں کیوں فیضِ بہاراں سے ابھی تک
ہیں پھول چمن زاد تو کانٹے بھی چمن زاد

آزاد و بیباک مرا شوقِ فراواں
پابندِ حجابات ترا حسنِ خدا داد

اب جرم ہے بیداد کو بیداد سمجھنا
اب تاب کسے ہے جو کرے شکوۂ بیداد

رہ رہ کے دھڑک اٹھتا ہے دل اہلِ چمن کا
آتا ہے نشیمن سے نظر خانۂ صیاد

کیفیؔ ابھی ہے وہی رنگِ شب و روزِ تمنّا
بدلی نہ ابھی تک روشِ خاطرِ برباد

●

سو طرح سے ستائے جاتے ہیں
پھر بھی ہم مسکرائے جاتے ہیں

عصرِ حاضر کے آذروں کو مٹا
بُت تو یوں بھی مٹائے جاتے ہیں

کرکے تعمیرِ گلستان کی بات
نت نئے گل کھلائے جاتے ہیں

داؤں پہ اس بساطِ دنیا میں
اب تو انساں لگائے جاتے ہیں

راہِ منزل تو یوں ہی گم تھی مگر
نقشِ پا بھی مٹائے جاتے ہیں

کیا چراغِ رہِ حیات کہیں
آندھیوں سے بجھائے جاتے ہیں

جو ترا نام لے رہے ہیں وہ
دار پر آزمائے جاتے ہیں

داستانِ زیست کی طویل سہی
جستہ جستہ سنائے جاتے ہیں

آدمی تب کہیں نکھرتے ہیں،
رمزؔ، جب آزمائے جاتے ہیں

انور صدیقی

●

غمِ حیات کی ہر انجمن سے گزرے ہیں   جفا سے، قید سے، دار و رسن سے گزرے ہیں

یقیں کا نور لٹاتے چمن سے گزرے ہیں   شکستہ حال سمجھتی رہی جنہیں ـــ دنیا

رہِ وفا میں جو دیوانہ پن سے گزرے ہیں   انہیں کے نقشِ قدم سے بہارِ نو جاگی

کسی کی زلفِ شکن در شکن سے گزرے ہیں   ہم آج کاکلِ گیتی سنوارنے کے لئے

ہم اعتبارِ فریبِ کہن سے گزرے ہیں   اندھیری رات قبائے سحر میں لاکھ چھپے

ہم آج محفلِ شعر و سخن سے گزرے ہیں   ہمیں خوش آئی نہ انورؔ خزاں کی نغمہ گری

کوثرؔ نیازی

●

ملے تو ادک سے بھی شغلِ بادہ رکھتے ہیں   ترے فقیر وہ اطوارِ سادہ رکھتے ہیں
یہ ذوق و شوق، یہ وارفتگی ہر ایک کو ہے   کہ ہم ہی ان سے محبت زیادہ رکھتے ہیں
خدا ہی ہے جو پہنچ پائیں اپنی منزل تک   یہ راہ رَو کہ جو رہبر نہ جادہ رکھتے ہیں
اُدھر سے اُن کا اشارہ بھی ہے پئے الفت   اِدھر سے ہم بھی کچھ ایسا ارادہ رکھتے ہیں
ہزار چوٹ لگے، لاکھ طنز ہو کوثرؔ   جو اہلِ عشق ہیں وہ دل کشادہ رکھتے ہیں

موادِ مطالعہ

نعیم صدیقی

پاکستان بحیثیت ایک اسلامی ریاست (تفصیلی تبصرہ) (PAKISTAN AS AN ISLAMIC STATE) انگریزی زبان میں یہ کتاب امریکی پروفیسر ڈبلیو کینٹ ول اسمتھ کی لکھی ہوئی ہے جو اس سے پہلے "ماڈرن اسلام ان انڈیا" لکھ کر متعارف ہیں۔ مرکزی بحث اس ملک کے اسلامی ریاست بننے کے رجحان پر کی گئی ہے۔ پروفیسر صاحب حسبِ ذیل غیر ضروری تکرار اور کسی قدر الجھے ہوئے انداز کے ساتھ پیش فرماتے ہیں:-

—— پاکستان کو وجود میں لانے والا اصل محرک اسلامی جذبہ ہے اور اس سلسلے میں کسی مودودی اور کسی عثمانی کا فکری پارٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

—— پاکستانی باشندوں سے اگر پوچھا جائے کہ تم پاکستان کو کیسی ریاست بنانا چاہتے ہو تو ان کا متفقہ جواب ایک ہی ہوگا یعنی "اسلامی" —— "اسلامی ریاست" کی اصطلاح تقریباً سادہ سے ذہین طبقے کے لبوں پر ہے۔

—— "اسلامی ریاست" کے مفہوم کا تصور دھندلا اور مختلف نوعیتوں کا ہے۔ پوچھنے پر اکثر اوقات کوئی جواب نہیں ملا جن لوگوں سے جواب ملا ان میں تیرہ سو برس قبل کے تصور سے لے کر ایک ایسا ماڈرن تصور تک پایا گیا جو مغربی دیستوں کے تصور سے کسی درجے میں بھی مختلف نہیں ہے۔

—— اسلام محض مذہب ایک نظام ریاست اور ایک نظام تمدن ہے، چنانچہ اسلامی کیلنڈر آں حضورؐ کی پیدائش یا اسلام کی دعوت کے آغاز کے بجائے اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ مسلم سوسائٹی مدینہ آ کر برسرِ اقتدار ہو گئی۔ نیز اسلام کا قانونی پہلو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام اپنی مرکزی روح اور اپنی عملی روایات کے لحاظ سے ایک مکمل دین، ایک اجتماعی نظام اخلاقیات ہے اور جو اپنی تنظیم اور قانون کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اخلاقیات رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان یہ کہتے ہیں اسلام ایک نظامِ زندگی ہے۔

—— اسلام میں عیسائیت کے بخلاف کلیسا بحیثیت ایک منظم ادارے کے ناپید ہے۔ چنانچہ مغرب میں مذہبی گروہوں کی اعتقادی آزادی نے ریاست اور کلیسا کی علیحدگی کی جدوجہد پیدا کی، لیکن مسلمانوں میں یہی چیز ریاست کو وجود میں لانے کی محرک ہوئی۔ پھر عیسائی کلیسا اپنے نظریات کے فروغ کے لیے غیر اسلامی نظام کے نیچے رہنے کے لیے راضی ہو سکتا ہے، مگر مسلمان گروہوں کا مجرد مسلمان ہونا ان کو اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ صرف ان سے آزادی حاصل نہ کریں بلکہ اسلامی نظام کو برپا کریں۔ یہی چیز پاکستان کو وجود میں لانے کا سبب بنی۔

—— اسلامی ریاست کی تعریف محض یہ نہیں کہ اس میں مسلمان رہیں اور راج کریں، بلکہ وہ ایسی ریاست ہے جس کے اندر وہ مسلم ہونے کی حیثیت سے رہیں اور راج کریں۔

ان تصورات کے سلسلے پروفیسر صاحب اپنی کتاب کی باقی بحثیں مرتب کرنے سے پہلے ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ پیدا فرماتے ہیں کہ پاکستان کو دو حیثیتوں سے دیکھنا چاہیے جو باہم دگر متضاد نہیں ہیں۔ ایک یہ کہ پاکستان اسلامی ریاست ہے، دوسرے یہ کہ پاکستان کو اسلامی ریاست ہونا چاہیے

پہلا حیثیت عمل ہے۔ دوسری آئیڈیل! پہلی حیثیت کی رو سے اسلامی ریاست کی تعریف یہ ہوگی کہ ایک ریاست جس کے عوام ایک اسلامی ریاست کے معیار تک پہنچنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اس تعریف سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ جسے مولانا مودودی نے ۱۹۴۸ء میں ریڈیائی مکالمہ میں یوں بیان فرمایا تھا کہ ہماری حکومت کو مطلوبہ اسلامی ریاست کا معیار بننا چاہیئے۔ لیکن حیرت ہوئی کہ مصنف نے اسی تعریف کی روشنی میں خود اسی کے ہم خیال بلکہ داعی ـــــ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ـــ کو ہدفِ ملامت بنا ڈالا ہے۔ پروفیسر صاحب جب یہ بات کہتے ہیں تو مولانا مودودی کے ٹھیک دل کی بات کہتے ہیں کہ کسی ریاست کے اسلامی ہونے کا پیمانہ یہ ہے کہ اس کے باشندے کس درجے کی سرگرمی، خلوص اور ذہانت کے ساتھ اسلامی آئیڈیل کو حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ لیکن یہیں سے مولانا مودودی کے خلاف کیس پیدا کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مولانا مودودی مؤخر الذکر آئیڈیل مفہوم میں پاکستان کو اسلامی ریاست نہیں پاتے تو اس کے نتیجے میں اول الذکر یعنی عملی مفہوم میں بھی اس کے اسلامی ہونے کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں پاکستان سرے سے اسلامی ریاست نہیں ہے۔ اور اس لئے وہ اپنی فوج کے سپاہیوں تک کی اخلاقی تائید کا مستحق نہیں۔ پروفیسر صاحب کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ فرماتے ہیں کہ بر سر عام اس دعوے کی وجہ سے بغاوت (SEDITION) کے جرم کے تحت وہ جیل بھیجے گئے۔ پروفیسر صاحب مولانا کو بالآخر غداریہ توم قرار دے کر دم لیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ پاکستان اسلامی ریاست اُس دن نہیں رہے گا جب کہ اس کے باشندے اسلام کے سوا کوئی دوسرا آئیڈیل اختیار کر لیں۔ لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ پاکستان کی حیثیت کے بارے میں قرارداد مقاصد سے قبل اور اس کے بعد مولانا مودودی (لیکن بالفاظِ صحیح جماعت اسلامی) نے کیا رائے قائم کی تھی؟ قرارداد مقاصد سے قبل کا حساب یہ کہا گیا تھا (اور مجلس شوریٰ کی قرارداد کا ریکارڈ موجود ہے) کہ پاکستان کی حیثیت معلق ہے کیونکہ قوم کی طرف سے آئیڈیل کا دستوری اعلان نہیں ہوا، ایسے عالم میں نہ اسے اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے، نہ غیر اسلامی؛ لیکن قوم چونکہ اسلامی ریاست بنانے کا ارادہ رکھتی ہے لہٰذا توقع یہی ہے کہ یہ اسلامی ہوگا اور اسی وجہ سے اس کے ساتھ ہماری ساری دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ قراردادِ مقاصد کے پاس ہوتے ہی اور اسلام کے آئیڈیل ہونے کا دستوری اعلان ہوتے ہی مجلس شوریٰ نے اعلان کر دیا تھا کہ اب یہ اصولی طور پر ایک اسلامی ریاست ہے اور اس کے حقوق وہی ہیں جو اسلامی ریاست کے ہوتے ہیں۔ یہ پوزیشن ۱۹۴۹ء سے چلی آ رہی ہے اور آج پروفیسر صاحب اس کے برعکس ایک دوسری پوزیشن مولانا مودودی کے سر چپک رہے ہیں۔

رہا حلف کا معاملہ، سو اس پہلو سے بھی پروفیسر صاحب نے عجیب خلافِ واقعہ تحقیق پیش کی ہے۔ قصہ یہ تھا کہ حکومت نے ملازمین سے موجودہ دستور کی وفاداری (نہ کہ پاکستان کی وفاداری) کا حلف لینا چاہا تھا، مولانا مودودی نے حلف کی اس انوکھی قسم سے اظہارِ اختلاف کیا تھا۔ اس پوزیشن کو نہ جانے پروفیسر صاحب نے کن ذرائع سے سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کہیں سے کہیں جا پہنچے۔

دوسرے باب میں معیاری اسلامی ریاست کی ماہیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ سلسلۂ کلام میں فرماتے ہیں کہ دستوری تجاویز میں علماء کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا بلکہ "پاکستان کے حکمرانوں نے ملک کو ایک جمہوریہ بنایا ہے"۔ یہاں مولانا مودودی کی جمہوریت پسندی اور اس سلسلے میں ان کے مطالبہ و مساعی کو دور کنار رکھ کر سارا کریڈٹ "پاکستان کے حکمرانوں" کو دیا گیا ہے۔ آپ کی نگاہ میں مسلمانوں نے تھیوکریسی (یعنی مذہبی طبقہ کی حکومت) کے بجائے جمہوریت کو پسند کیا ہے اور وہ جمہوریت کے راستے اسلامی ریاست بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف نے اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت سے ممیز کرنے کے لئے اچھی گفتگو کی ہے۔

ایک بحث اسلام کے تدریجی نفاذ پر ملتی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر صاحب بڑے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعض علماء بھی اب

تدریجی طریق کار پر سوچنے لگے ہیں۔ چنانچہ مولانا مودودی کے مقالہ "اسلامی قانون" میں سے ایک عبارت درج کر دی ہے۔ فاضل مصنف کے ذہن کا انداز اسی مقام سے کیجئے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس عبارت کو پیش کر کے جماعت اسلامی یا مولانا مودودی کی فکر کو صحیح انداز سے سامنے لاتے کہ یہ لوگ صحیح انداز سے سوچ رہے ہیں، نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ یہ تو ماڈرن طبقہ سے اثر لیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ تعصب پیدا کیا گیا ہے
میں کام فرما ہے

پھر فرمایا ہے کہ بعض لوگوں کا مطلب اسلامی دستور سے اسلامی قوانین کا نفاذ ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے چار نکاتی مطالبے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ افسوس کہ مصنف کو یہ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ ہمارے ہاں کے لٹریچر اور تقاریر میں شروع سے دستور اور قانون کا فرق پیدا ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس موقع پر انتظامیہ کے ایک ممتاز رکن کا تاثر بھی غالباً طنزاً دیا گیا ہے کہ پاکستان کا قانون لازماً شریعت ہی کو ہونا ورنہ حصول پاکستان کا کوئی مدعا ہی نہیں رہتا۔ اس کے بعد اسلامی قانون کے بارے میں مختلف رجحانات کا جائزہ و تجزیہ کیا گیا ہے۔

آخری باب میں بحث کا محور مصنف کا یہ جملہ ہے کہ "ایک معیاری اسلامی ریاست وہ ہے جسے مسلمان ابھی ریاست سمجھ بس وہ مسلمانانِ پاکستان کا ذہن پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور زیادہ تر سرکاری اکابر کے اقوال بغیر نام کے درج کر کے ان پر بحث کا چلتا ہے۔ اس باب میں ہمارے حکمران طبقے کا ذہن بڑے جامعانہ انداز سے منعکس کر دیا ہے۔ ایک عنصر کا تعارف یوں کرایا ہے کچھ لوگ مسلمان ہوتے ہوئے اسلامی ریاست کے تصور سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا ارشاد یہ ہے کہ "پانچ برس میں پاکستان ترکی کی طرح ایک مغربیت زدہ، غیر مذہبی جمہوری ریاست بن جائے گا۔ مذہب زدگی کا جذبہ جس سے پاکستان بنا تھا کافور ہونے والا ہے۔ یہ صرف مذہب زدگی تھی جو ہماری زندگی کی ریڑھ کی ہڈی ہے، لیکن یہ ایک مذہبی تحریک ہرگز نہیں تھی۔ میں پسند کروں گا ایک کمال اتاترک اٹھے اور ایک جدید غیر مذہبی ریاست کی بنیاد رکھے۔ یہی بعض دوسرے لوگ بھی چاہتے ہیں۔ لیکن مشکل ہی سے یہ وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ تھیوکریسی یورپ میں تباہ کن ثابت ہوئی اور یہاں بھی وہ تباہ کن ثابت ہو کر رہے گی"۔ . . . . "میرا ذاتی رجحان یہ ہے کہ ریاست اور مذہب کا انقطاع قطعی طور پر ضروری ہے"۔ . . . . "میں حکومت کے لئے کسی مسالہ کی فراہمی کو قطعی غیر ممکن سمجھتا ہوں جس کے ذریعے ایک طرف جدید تقاضوں کو پورا کیا جا سکے اور دوسری طرف اس کو اسلامی اصولوں سے مطابقت دی جا سکے۔ لوگ مجھے یہ بات برسرِ عام نہیں کہنے دیں گے۔ وہ تو خلافت راشدہ کو نمونہ قرار دینے پر ہی زور دیتے، اور اس پر بھی زور دیں گے کہ اس عہد میں سیاسی جمہوریت بھی کارفرما تھی۔ یہ خلافت راشدہ اور جدید ریاست کے ڈھیلے ڈھالے... کا نتیجہ ہے۔ وزارت کے کچھ لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پر زبان نہ کھولو، تم اس طرح اختلاف ابھارو گے۔ بہ آہستہ ایک جمہوری حکومت بناتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ"۔

ایک اور نمایاں ہستی کے الفاظ اظہار نام کے بغیر مصنف نے نقل کئے ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ لوگوں سے بات منوانے کے دو ہیں، ایک یہ کہ حکمران حضرات طے کریں کہ کرنا کیا ہے اور پھر اسے جبراً عوام پر ٹھونس دیں۔ دوسرا یہ کہ ان پر اعتماد کا اظہار کریں خود ان کو کسی صورت کے اپنی مرضی سے قبول کرنے کا موقع دیں۔ پہلی صورت میں عوام کی رضامندی کا حصول مشکل ہے، لیکن دوسرا میں اگرچہ نتائج دیر میں نکلیں گے مگر آہستہ آہستہ لوگوں کو ڈھب پر لایا جا سکتا ہے۔ اب سنئے "قطعی اور زور دار خطرہ موجود ہے کہ جذباتی لوگوں سے بازی مار لے جائے۔ ہم یہ خطرہ (Risk) انگیز کر رہے ہیں . . . . ہم جس چیز کی توقع رکھتے تھے وہ

[illegible] کے زیر اثر جو کچھ بیان ہوا ہے اس کے زیر اثر پاکستان کے عوام رجعت پسندانہ تصور کے بجائے ترقی پسندانہ تصور کو انتخاب کریں گے ہم تیار ہیں اور اپنے مخصوص تصور کو آگے لانے کے لئے تمام ممکن اقدامات کرنا چاہتے ہیں، اور توقع رکھتے ہیں کہ یہی ہمارا تصور چھا کے رہے گا!
ایک اور قول سنیئے: "پاکستان کے پیچھے دوٹ کر ایک غیر تغیر پذیر دقیانوسی ماندہ تنگ نظر ملک بننے کے کابوس سے ہم دوچار ہیں"........
"ملاؤں کے اقتدار پر آنے کا خطرہ بڑا سنجیدہ خطرہ ہے یہ ہلاکت انگیز ہوگا" ایک اور بزرگ کا ارشاد ملاحظہ ہو! "ہم نے پاکستان میں ملا کو صریحاً رد کر دیا ہے۔ پنجاب میں ایک تحریک چلی تھی، وہ ناکام ہو کے رہ گئی۔ یہ ناکامی دھوم مچا دینے والی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ایک جامد طبقہ ہیں اور وہ بے سمجھ ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ مطابقت نہیں کر سکتے، ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ بہت ہی کم امکان اس بات کا ہے کہ آئندہ الیکشن میں مسلم لیگ علماء کو امیدوار بنا کے لائے اور مسلم لیگ کے مقابلے پر آنے والے علماء کے لئے تو سرے سے کوئی توقع ہی نہیں ہے۔"

مصنف ایک جگہ آکر اس خطرے کا اظہار کرتا ہے کہ ملک اور اسلام دونوں کے لئے بڑا خلل برپا ہو جائے گا، اگر تعلیم یافتہ لیڈروں کا کوئی معتدبہ گروہ یہ محسوس کرنے لگے کہ تجدد پسندانہ پروگرام اچھا تو ہے مگر اسلامی نہیں ہے۔ مگر مصنف کا اندازہ ہے کہ دنیا و بیت کے علمبرداروں میں سے شاید مٹھی بھر لوگ اس پوزیشن کو اختیار کریں تو کریں، کوئی عمومی اندیشہ نہیں ہے۔

ان اقتباسات اور بحثوں کے بعض اجزا کو پیش کر کے ہم نے کتاب کی نوعیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ پوری کتاب میں مصنف مذہبی عناصر کے خلاف یورپ کے تاریخی تعصب سے آلودہ ذہن سے کر سوچتا رہا ہے لیکن دوسری طرف حکمران طبقہ کے لئے وہ جگہ جگہ وکیل بن کر بولتا ہے جیسے اس طبقہ کا مفاد اور اس کا مفاد ایک ہیں۔ کتاب یہ گواہی بھی دیتی ہے کہ مصنف کی معلومات کا ذریعہ بھی خود یہی طبقہ ہے، اپنے بارے میں بھی اور دینی عناصر کے بارے میں بھی! مصنف کے ذہن کا گنجلک پن اور الجھاؤ بھی جگہ جگہ محسوس ہوتا ہے اور راست فکری کا جوہر کمزور نظر آتا ہے۔

افسوس ہے کہ اسلامی ملکوں اور اسلامی تحریکوں، خصوصاً پاکستان کو مغرب کے سامنے ایسے ایسے لوگ متعارف کرانے والے ہیں۔ یہ معاملہ اسلامی تحریکوں کے لئے بڑا قابلِ غور ہے کہ ایک طرف ملک کے انداز کا مغربی طبقہ اپنے حاکمانہ اثر اور ذرائع کے ساتھ ان کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا کرتا ہے اور دوسری طرف باہر کے مطالعہ کرنے والے مطالعہ کا واسطہ جب اس کو بناتے ہیں اور پہلا تاثر اسی کے ذریعے قبول کرتے ہیں تو وہ اپنے مغربی تعصب کا رنگ مزید شامل کر کے اسلامی رجحانات پر بالکل ہی سیاہی پھیر دیتے ہیں۔ پروپیگنڈہ کی ان دوگونہ لہروں کے بارے میں سوچنا چاہیئے کہ ان کا سدباب کیا ہے۔

یہ کتاب اشرف پبلیکیشنز لاہور نے شائع کی ہے اور اڑھائی روپے فی جلد کے حساب سے مل سکتی ہے۔

کانسٹی ٹیوشن آف دی عرب امپائر

علمی کتابوں کی صف میں یہ ایک اور اچھی معلومات افزا کتاب شامل ہوئی ہے۔ جو ہمارے اس دستوری لٹریچر میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے جو اسلامی نظریۂ ریاست کے متعلق موجودہ دستوری تعطل کے دور میں ترقی کر رہا ہے۔ اس کتاب کے مؤلف انگریزی زبان کے ایک مشتاق اہلِ قلم پروفیسر ولی، اے ایچ صدیقی ہیں جن کی متعدد کتابیں پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ کتاب کے جو حصے اب تک دیکھے جا سکے ہیں ان کے پیشِ نظر ہمارا تاثر

[illegible] فلسفہ [illegible] تحقیق سے کام لیا ہے ، موضوع [illegible] اور حاصل مطالعہ [illegible]
عمدہ مقالات ایسے بھی سامنے آئے جہاں ہمیں کھٹک ہوئی کہ پروفیسر صاحب کی نگاہ سے مسائل کے بعض پہلو اوجھل رہ گئے ہیں یا دے تاثر
کرنے میں پورا توازن قائم نہیں رہا ۔ افسوس ہے کہ تفصیلی تبصرہ کا موقع نہیں ۔ ایک کمی یہ محسوس ہوئی کہ مؤلف کی نگاہ اسلامی [illegible]
سے تعلق رکھنے والے تازہ ترین اردو لٹریچر پر نہیں ہے ، اور یہ واقعہ ہے کہ یہ موضوع ہمارے ہاں اصلاً اردو ہی کا موضوع ہے ۔ بہرحال ہماری
رائے یہ ہے کہ اس کتاب کا چھپنا اور پڑھا جانا اسلام اور پاکستان کے حق میں بڑی حد تک مفید رہے گا ۔

قیمت مجلد چھ روپے ۔ اورینٹیلیا ۸ ۔ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع ہوئی ہے ۔

جیل خانہ

سید نقی علی ہمارے محترم رفیق راہ کو قادیانی مسئلہ کا پبلشر ہونے کے جرم میں نو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی تھی جس میں ٹریبونل کے جج کی خفیہ رپورٹ پر تخفیف عمل میں آگئی ۔ اس زمانے میں سید صاحب موصوف نے جہاں بان اور سوت بٹنے کی مشقت کی ہے وہاں جیل خانہ کی پُر اسرار زندگی کے حقائق کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے ۔ ایک قیدی نے قیدیوں میں رہ کر قیدیوں کے حالات اور مسائل کا مطالعہ کیا اور اب اس کا حاصلِ مطالعہ ایک لغت کی ترتیب میں ہمارے سامنے ہے ۔ اس لغت میں حروف تہجی کی ترتیب سے جیل کی اصطلاحات درج کر کے ان کے مفہوم اور ان سے متعلقہ معلومات کو بڑی محنت سے پیش کیا ہے ۔ اس لغت کو پڑھ کر آپ آزادی کی حالت میں جیل کی چار دیواری کے اندر کی دوزخ کی سیر کر سکتے ہیں ۔

قیمت تین روپے ۔ کوچۂ ادب چوک انارکلی لاہور نے بڑے حسن طباعت سے اسے شائع کیا ہے ۔

"مکتوب بنگالہ"

(ایک اہم اعتذار)

مکتوب بنگالہ میں اسعد گیلانی صاحب نے مشرقی پاکستان کے حالات کا جو جائزہ لیا تھا وہ ایک اصلاح پسندانہ جذبہ پر مبنی تھا، البتہ یہ کمزوری ضرور رہ گئی کہ گیلانی صاحب نے ناکافی معلومات کی بنیاد پر اپنی آراء قائم کیں اور پھر خود اپنے ہی تک محدود نہ رکھیں بلکہ اشاعت کے لئے دے دیں ۔ اس کمزوری کی وجہ سے مہاجرین بالخصوص بہاریوں کو شکایت پیدا ہوئی اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ شکایت بجا ہے ۔ اس سلسلے میں اسعد صاحب سے زیادہ ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے کیونکہ مکتوب ہمارے ذریعہ شائع ہوا ۔ اس ذمہ داری کے پیش نظر ہم ان تمام لوگوں سے معذرت چاہتے ہیں جنہیں اس مکتوب کے کسی حصے سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو ۔

(ادارہ)

تحریک اسلامی کا لٹریچر جو اشاعت پذیر ہوا ہے۔ ایک ناواقف کو پوری بات مختصر سے الفاظ میں سمجھانے کے لئے اب تک کوئی ایسی گائیڈ بک نہ تھی۔ جو اس کے سامنے تھوڑے سے وقت میں تحریک کا پورا نقشہ پیش کر دے

اسعد گیلانی

نے

تحریک اسلامی کے کارکنوں کی اصلی مشکلات کو سامنے رکھ کر پورے لٹریچر کا ایک ملخص تیار کیا ہے۔ اسے پڑھ کر پوری تحریک کو جاننے اور اس کے لٹریچر کو پڑھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہوتا ہے

سمندر کوزے میں ◎ دریا حباب میں

تحریکِ اسلامی

"اپنے لٹریچر کے آئینے میں"

مرتبہ:- اسعد گیلانی

قیمت:- ایک روپیہ آٹھ آنے

--- ناشر ---

مکتبہ چراغ راہ

[illegible] —— آرام باغ کراچی

ایک ضروری گذارش

اس ماہ سے خریداروں کے خریداری نمبروں میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے خریداری نمبر
پتے کی چٹ پر نام کے ساتھ تحریر ہے۔ خریدار حضرات سے گذارش ہے کہ خط و کتابت
کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں دفتر کیلئے خریداری نمبر بہت اہمیت رکھتا ہے
بغیر خریداری نمبر کے تعمیلِ ارشاد ناممکن ہے

معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجئے
کہیں معدہ کی خرابیاں آپکو نظر انداز نہ کردیں
ہاضمی
ایک بہترین سفوف معدہ ہے جو فعل ہضم کو
قدرتی طور پر کام کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور معدہ کو ہر خرابی
سے محفوظ رکھتا ہے۔ حفظ ما تقدم علاج سے بہتر ہے۔ اسلئے
ہاضمی کا استعمال کیجئے
تاکہ آپ کا معدہ ہر خرابی سے محفوظ رہے، مرد اور عورتوں کیلئے یکساں مفید ہے۔
قیمت :۔ فی شیشی
ایک روپیہ آٹھ آنے
فیملین
نسائی خاص
یہ گولیاں عورتوں کی جملہ پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے
اکسیر ہیں۔ سیلان ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم
دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ جملہ نقائص کو دور
کرنے میں لاثانی ہیں۔
استقرار حمل کو مدد دیتی
عورتوں کے لئے جنرل ٹانک ہے جس کا متواتر
استعمال
عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے
عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہو ان
کیلئے بیحد مفید ہے
قیمت مکمل کورس چالیس گولی بڑے سائز یوم تین روپیہ چھ آنے
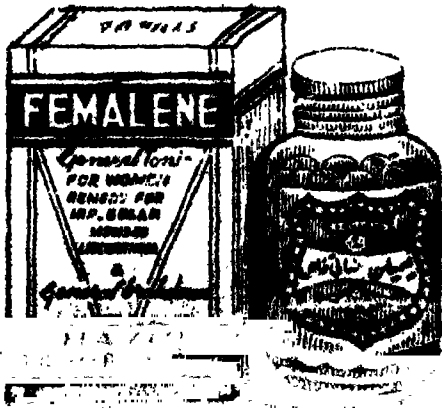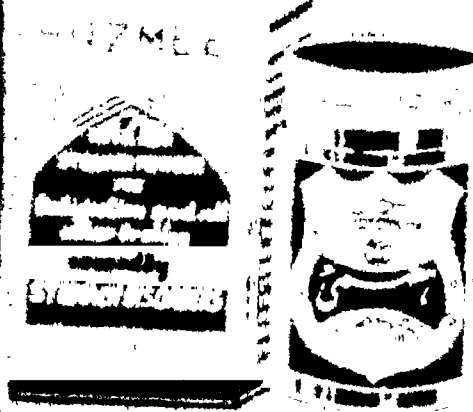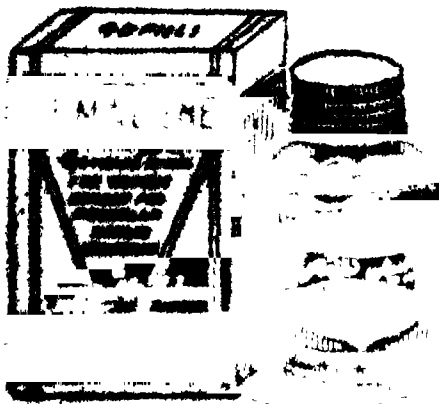
چراغِ راہ

جون ۱۹۵۵ء

مرتبہ
نعیم صدیقی

/۱

ادب میں اسلامی قدروں کا علمبردار

چراغ راہ

بہ ادارت: نعیم صدیقی
۱۲ - شاہ جمال - لاہور

جلد ۸
شمارہ ۸

فی پرچہ ۸ ر
سالانہ چندہ پانچ روپے

جون سنہ ۱۹۵۵ء

☆

مندرجات

دفتر ماہنامہ "چراغ راہ" کراچی نمبر ۱

طلع البدر علینا!

نعیم صدیقی

پچھلے مہینے (اپریل) کا سب سے بڑا اور سب سے بڑھ کر مسرت انگیز واقعہ مولینا مودودی کی رہائی ہے

مولینا مودودی کو ایک سنجیدہ انداز کا پمفلٹ لکھنے کے جرم میں پھانسی کی سزا سنانے والوں نے دراصل اپنے جس جذبے کا اظہار موصوف پر کیا وہ یہ تھا کہ ہم تجھے زندہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ پورے عالم اسلام کو لرزا دینے والے اس حادثہ پر کشمکش حق و باطل کی تاریخ گلوگیر آواز میں کہہ رہی تھی اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ — ایک شخص کو محض اس لئے دار پر کھینچتے ہو کہ وہ تمہیں یاد دلاتا ہے کہ تم مسلمان ہو، وہ تمہیں تلقین کرتا ہے کہ جب تم مسلمان ہو تو اسلام پر عملاً کاربند ہو اور تضاد اور منافقت کا رویہ چھوڑ دو، وہ تمہیں جھنجھوڑتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر نو کتاب و سنت کے اصولوں پر کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو، وہ تمہیں دعوت دیتا ہے کہ ملکی نظام کو اسلامی دستور پر استوار کرو، وہ تمہیں متنبہ کرتا ہے کہ اپنی آزادی کو عالمگیر شہنشاہی طاقتوں کے مکارانہ ہتھکنڈوں سے محفوظ رکھو، وہ تمہیں کبھی محبت بھرے انداز سے اور کبھی درشتی سے انفرادی اخلاق اور قومی کیریکٹر کو سنوارنے کی نصیحت کرتا ہے! اس نے تمہیں ایک آئیڈیالوجی دی، اس نے تمہیں ایک گراں بہا لٹریچر دیا، اس نے "تفہیم القرآن" جیسا کارنامہ تمہارے سامنے پیش کیا، اس نے تمہارے ملک کو ایک تنظیمی طاقت دی، اس نے تاریخ کو ایک اصولی تحریک سے مالا مال کیا: اب کیا اس شخص کا صلہ یہی تھا کہ ایک فوجی عدالت بٹھائی جاتی اور اندھا دھند اس عدالت کے ذریعہ موت کی سزا دی جاتی؟

مگر خیریت یہ ہوئی کہ مولینا مودودی کو موت کی سزا سنانے والی طاقت اس کائنات اور حیات انسانی کے دائرے میں آخری طاقت نہ تھی بلکہ اس سے اوپر ایک خدا — جیتا جاگتا، دیکھتا سنتا، ارادے اور فیصلے کرتا اور اپنے ارادوں اور فیصلوں کو کسی کی مزاحمت کے بغیر نافذ کرتا موجود تھا! تم نے کہا کہ مودودی کو مرنا چاہیئے، لیکن خدا نے کہا کہ نہیں وہ زندہ رہے گا اور دیکھ لو کہ وہ تمہارے سامنے زندگی کی بھیک مانگنے کے لئے رحم کی درخواست کا دامن پھیلائے بغیر زندہ رہا! اب تم نے دوسری ضد شروع کی کہ اگر مودودی کو خدا زندہ ہی رکھنا چاہتا ہے تو ہم اسے دعوت حق کا کام کرنے کے لئے آزاد بہرحال نہیں چھوڑیں گے — چودہ سال تک، اس کی پوری بقیہ عمر تک نہیں چھوڑیں گے! انصاف کے مسلمہ اصولوں نے تمہارا دامن پکڑ کر تم کو توجہ دلائی مگر تم نے دامن جھٹک دیا، جمہوری اسپرٹ نے بار بار تمہیں ٹوکا مگر تم نے اسے بھی ٹھکرا دیا، ملکی عدلیہ کے سامنے اپیل کا ایک راستہ کھلا تھا سو اس پر تم نے انڈمنٹی ایکٹ کا موٹا وزنی تالا ڈال دیا، رائے عام مطالبے اور محضرنامے لے کر تمہارے دروازے کھٹکھٹاتی رہی مگر تم نے اسے دھکے دے دے کر لوٹا دیا! — مگر پھر خدا کی کرشمہ سازیاں کام آئیں اور چودہ برس کی مدت تین برس میں بدل گئی!

ایک بار پھر یہ آواز اٹھی کہ مولینا مودودی کو رہا کر دیا جائے مگر تمہیں یہ ضد رہی کہ اب اس تین برس کی مدت کا ایک ایک دن گن کر پورا کرایا جانا ہے — اللہ تعالیٰ کی غیرت ایک بار پھر حرکت میں آئی اور تمہارے دیکھتے دیکھتے ملتان جیل کے دروازے غیر متوقع طور پر ایک

ایسی گتھی سے کھل گئے جسے نادانستہ طور پر تم خود ہی پچھلے چند ماہ میں تیار کرتے رہے تھے۔

مولانا مودودی کی رہائی پر ملتان جیل کے دروازے سے لے کر گھر کے دروازے میں قدم رکھنے تک جا بجا جس اخلاص و محبت سے مختلف عناصر نے موصوف کا استقبال کیا ہے اور خصوصاً لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر از خود جمع ہو جانے والے ہجوم نے جن جذبات کے پھول مولینا پر نچھاور کئے ہیں وہ بڑی گہری معنویت رکھتے ہیں۔ بغیر کسی تصنع کے عوام نے درحقیقت اپنے بڑوں پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ جس شخص کو تم نے پھانسی اور چودہ برس کی قید کا سزاوار گردانا تھا ہم اسے آنکھوں پر بٹھاتے اور اپنے دلوں میں جگہ دیتے ہیں! تم نے جسے مجرم گردانا وہ ہمارا محبوب ہے، تم نے جسے ملک کا دشمن قرار دیا ملک اسے اپنا محسن اور خیر خواہ سمجھتا ہے!

مولانا مودودی نے پھانسی کی کوٹھڑی اور جیل کی سلاخوں میں پچیس ماہ جس بلندیٔ کردار کا ثبوت دے کر گزارے ہیں، اس کی وجہ سے اس کی شخصیت ایک نیا وزن اور نئی قوت لے کر ان مراحلِ ابتلا سے واپس لوٹی ہے۔ ابتلا نے مودودی کو کمزور نہیں کیا، ابتلا نے اسے پہلے سے زیادہ قوی اور مضبوط کر دیا ہے۔ اس پچیس ماہ کی ایک ایک گھڑی پاکستان اور عالمِ اسلام کے کروڑوں مسلمانوں کے سینوں میں نشتر بن بن کر کھٹکتی رہی ہے اور عوام الناس کی ہمدردیاں مولینا مودودی کی مظلومانہ شان سے وابستہ رہی ہیں۔

ادھر گذشتہ چند ماہ سے جو بحرانی حالات پاکستان کو اپنی لپیٹ میں ملتے ہوئے ہیں اُن میں گھرے ہوئے عوام نے مولینا مودودی کی رہائی پر پہلی مرتبہ ایک نیا سہارا محسوس کیا ہے اور اپنے اندر نئی امیدوں کو کروٹ لیتے پایا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسلامی دستور کی تدوین، جمہوری قدروں کی بحالی اور اصلاح و تعمیر کی کسی حرکت کے ظہور کی اب سارے ملک کی ساری امیدیں صرف مودودی کی شخصیت اور تحریک سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ مختلف خوش آئند بولیاں بولنے والی جتنی طاقتیں ملک میں موجود تھیں ان کی یا تو آزمائش مکمل ہو چکی ہے اور یا وہ امتحان کے آخری مراحل سے گزر رہی ہیں اور اب ان کی بولیوں میں کسی کے لئے قوم کے دل میں حسنِ ظن یا کشش باقی نہیں ہے۔ اب ایک ہی کلمۂ حق باقی ہے جس کے گرد ملک کے مختلف عناصر جمع ہو سکتے ہیں، جو دلوں کو حرکت دلا سکتا ہے اور عمل کو بیدار کر سکتا ہے، اور وہ وہی ہے جسے گذشتہ بیس پچیس برس سے مودودی پیش کر رہا ہے۔

ہم اپنے راہنماؤں، اپنے اکابر، اپنے حکمرانوں اور اپنے ذہین لوگوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کچھ دیر کے لئے ذاتی، گروہی اور طبقاتی تعصبات کو الگ رکھ کر سوچیں کہ آیا مودودی کے دماغ، اس کے نظریات، اس کی دعوت اور اس کے کردار کا حق یہی ہے کہ آپ ساری عمر جائز و ناجائز ہر طریق سے اس پر ظلم ڈھاتے رہیں ——— اور کیا ظلم ڈھا کر کسی صاحبِ دعوت کی دعوت کا زور پہلے بھی توڑا جا سکا ہے؟ مودودی آپ کے ملک کا ایک آدمی ہے، آپ کی قوم کا ایک فرد ہے، آپ کے دین کا ایک پیرو ہے، وہ ایک علمی و فکری مقام رکھتا ہے، وہ عملی صلاحیتیں رکھتا ہے، وہ تعمیری اور تنظیمی کام کر رہا ہے۔ آخر آپ لوگوں میں اور اس میں غیریت کی سنگین دیواریں کہاں سے آکھڑی ہوئی۔ آپ قوم کے مفاد کے لئے سوچتے ہیں تو اسے بھی حق ہے کہ وہ اپنے ڈھب پر سوچے، آپ کوئی نظریہ رکھتے ہیں تو اسے بھی حق ہے کہ کوئی خاص نظریہ رکھے، آپ کسی تہذیب اور کسی کلچر کو پسند کرتے ہیں تو اسے بھی حق ہے کہ وہ کسی تہذیب اور کسی کلچر کو پسند کرے، یہ اختلافات کتنے بھی بڑے پیمانے کے ہوں ان کی وجہ سے تعصب کی سدِ سکندری فریقین کے درمیان کھڑی نہیں ہو سکتی۔ تعصب تو ذاتی و گروہی مفاد پرستی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر کیا آپ اس بلائے بے درماں سے نجات پانے کی فکر نہ کریں گے؟ —

نعیم صدیقی

خدا کرے کہ مولینا کا اپیل کامیاب رہے اور موصوف باعزت طور پر بری ہوں اور آپ کی عارضی رہائی مستقل رہائی میں بدل جائے تاکہ اس پرآشوب دور میں اپنے فکر و عمل سے آپ اپنے حصے کا تاریخی پارٹ مکمل کرا کر سکیں جس کے نتیجے میں یہاں جمہوری فضا قائم ہو اور اس میں اسلامی دستور اپنی گوناگوں برکات کے ساتھ نافذ ہو سکے!

عام لوگوں کو کیا ملا؟

پاکستانی عوام اس وقت ایک عجیب ذہنی کیفیت سے گزر رہے ہیں!

کروڑوں افراد کا یہ انبوہ کچھ مقاصد اور اجتماعی خواہش رکھتا ہے، اس کی قومی امنگیں اور اس کے کچھ ملی ولولے ہیں، اس کے اعتقاد اور اس کی تاریخ کے کچھ تقاضے ہیں، اس کی کچھ سیاسی حاجات اور اس کے کچھ معاشی مطالبات ہیں اور انہی چیزوں کے بل پر یہ کروڑوں افراد اب تک زندہ ہیں اور انہی چیزوں کی تحریک کے زیر اثر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن گذشتہ سات برس ان کی ملی خواہشات و ضروریات کے لحاظ سے ان کا کچھ بھی تو نہ بنا، ان کے پلے کچھ بھی تو نہ پڑا، ان کی حسرتوں کے کچھ بھی کانٹے تو نہ نکلے!

یہ کروڑوں کا انبوہ مبہم طور پر نہیں، صاف صاف لفظوں میں اسلامی اصولوں پر استوار ہونے والا نیا نظام مانگتا ہے، یہ عزت کی روٹی کا طلب گار ہے، یہ اپنے غریب اور کمزور طبقوں کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ظلم سے نجات دلانے کے لئے بے چین ہے، یہ ایک فرد کے پورے کے پورے شہری حقوق کا خواہاں ہے، یہ بین الاقوامی فضا میں اپنا وقار اور اپنی ساکھ کو چاہتا ہے، یہ اپنے دیس کے کٹے ہوئے ایک بازو کشمیر— کو واپس لینے کے لئے عالم اضطراب سے گزر رہا ہے، ملک کی حکمران طاقت نے، مسلم لیگ نے، کسی بڑے سے بڑے عہدے دار اور عوام کے کسی اونچے سے اونچے مددگار نے قوم کی ان امنگوں میں سے کس کس کو کس حد تک پورا کر دکھایا اور اگر ہماری اجتماعی زندگی کے قلب میں یہ سارے کے سارے کانٹے اسی طرح چبھتے رہیں اور کوئی ناخن ان میں سے کسی کو بھی نکالنے کا فرض ادا نہ کر سکے تو اور ہزار ہنگامے مچے رہیں، لاکھ جوڑ توڑ ہوتے رہیں، طرح طرح کے کارنامے انجام دیئے جاتے رہیں، بڑے بڑے مسائل طے ہو جائیں، پاکستان کے عام آدمی کو اس سے کیا دلچسپی ہوگی۔

گورنر جنرل نے ۲۴ اکتوبر کو دستوریہ توڑ دی، بہت بڑا کارنامہ تھا، لیکن اس کارنامے سے قوم کی مذکورہ بالا ضروریات میں سے کون سی پوری ہوگئی اور عام لوگ کس ایک مسئلے سے بے فکر ہو گئے کہ کم سے کم اضطراب کا ایک کانٹا تو نکلا!

وزارت بدل گئی، ایسے ایسے لوگ وزارت پر آگئے جن کے بارے میں کوئی اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا، پھر جنرل ایوب نے فوجی کمان کے ساتھ ساتھ دوسرا قدم سیاست کے دائرے میں رکھ کر برصغیر ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک نئی پوزیشن پیدا کر لی۔ کتنا یادگاری واقعہ ہے لیکن اس واقعہ نے ہماری کس بنیادی ضرورت کو پورا کر دکھایا؟

سندھ چیف کورٹ نے فیصلہ دیا کہ گورنر جنرل کو دستوریہ توڑنے کا اختیار نہیں تھا۔ فیڈرل کورٹ نے ایک نیا انقلاب انگیز نکتہ نکال دیا کہ گورنر جنرل کی منظوری دستوریہ کے ہر قانونی اور دستوری فیصلے پر ضروری ہے۔ فیڈرل کورٹ نے ایک دوسرے فیصلے میں ایک اور پہلو اجاگر کر دیا کہ گورنر جنرل کو کسی طرح کے دستوری تغیر و تبدل کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ اب آخر میں مشورے کے طور پر جواب دیتے ہوئے معاملے کا ایک تیسرا پہلو نمایاں کر دیا ہے کہ گورنر جنرل دستوریہ مقننہ کو توڑنے اور بلانے کا اختیار رکھتے ہیں۔

یہ بڑے اہم دستوری و قانونی فیصلے اور رائیں ہیں جو کہ سامنے آنے سے نہ جانے کیا کچھ اس ملک میں تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے
ہاں کر ان فیصلوں نے گورنر جنرل کی مسندِ اقتدار کو پہلے سے کئی گنا زیادہ بلند کر دیا ہے۔ تسلیم کہ اب پاکستان پوری صراحت سے برطانوی
بینین کے مرتبے پر فائز ہو گیا ہے۔ جس کے بارے میں قومی غلط فہمی یہ تھی کہ ہم اس مرتبے سے آگے نکل آئے ہیں۔ لیکن ہمیں تو یہ بتاؤ
ملتِ پاکستان کی کونسی امنگ اور کون سی ضرورت ہے کہ جو اس سارے مد و جزر سے پوری ہو گئی یا آئندہ ہو جانے والی ہے۔ اسے اسلام
ن گیا؟ اسے جمہوریت مل گئی؟ اسے معاشی خوشحالی مل گئی؟ اسے کشمیر مل گیا؟ اسے کوئی نمایاں بین الاقوامی مرتبہ حاصل ہو گیا؟ ——
بالا! بولو کیا ملا؟ —— آئندہ کیا ملنا ہے؟ —— بتاؤ، قوم کو بتاؤ کہ اسے کیا ملنے والا ہے؟ ——

"ون یونٹ" —— "ون یونٹ" —— "ون یونٹ"!

ون یونٹ بڑی اچھی چیز ہوگا۔ ون یونٹ میں بہت سے فوائد ہوں گے۔ ون یونٹ تاریخ کے بہاؤ کا رخ بدل دے گا۔ ون یونٹ
سے ایک ہمہ گیر انقلاب آ جائے گا۔ ون یونٹ کے کارنامے کو رہتی دنیا تک ہماری آئندہ نسلیں یاد کریں گی۔ ون یونٹ بنانے کے معمار
بھی ہیرو بن جائیں گے۔

یہ سب ٹھیک —— عام آدمی کو یہ بتاؤ کہ اس کی قومی امنگوں میں سے کون سی امنگ پوری ہونے والی ہے؟

عام آدمی جب یہ دیکھتا ہے کہ عہدوں کے کھلاڑی عہدوں کی بازیاں جیت رہے ہیں۔ اہلِ اختیار اپنے اختیارات کی حدود کو وسیع
کرنے کے درپے ہیں، مفاد کے بندے گُلچھرے اڑاتے ہیں اور اس کی ضروریات و خواہشات اور اس کی فلاح و بہبود سے بے نیاز ہو کر
قانون، اخلاق، نظم و نسق اور بین الاقوامی سیاست کے مختلف دائروں میں زریں تاریخی کارنامے انجام دے رہے ہیں اور ذہین عناصر
کارناموں پر قصیدہ ہائے تہنیت پڑھنے میں مصروف نظر آتے ہیں تو وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے روٹی کپڑے کے دھندے
میں غرق ہو جاتا ہے، اور پاکستان کے بھلے برے کو خدا کی تقدیر کے حوالے کر دیتا ہے۔

یاد رکھیے، ایک قوم کی قوت کو کھوکھلا کر دینے میں کوئی چیز اس سے زیادہ تشویش ناک نہیں ہو سکتی کہ اس کے عام لوگوں کے
جذبات اور ولولوں کے دیئے بجھ جائیں۔ قوم چند بڑے لوگوں کے زریں کارناموں کے بل پر نہیں، اپنے عام آدمیوں کے دل جذبوں
کے ذریعے زندہ رہتی اور ترقی کرتی ہے اور بڑے آدمیوں کے دماغی نقشے اور زریں کارنامے بھی اگر تاریخ میں جگہ پاتے ہیں تو
عام آدمیوں کے زور سے پلتے ہیں پھر کیا۔ اور بڑے لوگ عام لوگوں کو کبھی درخورِ اعتنا سمجھیں گے!

بانڈونگ کانفرنس

افریشیائی ممالک کی تنظیمی حیثیت کی جو ابتدا بانڈونگ سے ہوئی ہے وہ بین الاقوامی سیاست کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے
۔۔ن اور دھڑوں کے اس دور میں اس حقیقت کے لئے ایک جگہ خالی تھی اور وہ خالی جگہ کہہ رہی تھی کہ کسی نئی چیز کو آ بھرنا چاہئے۔ اب
وہ ابھر آئی ہے۔

اپنے زمانے کے وسیع تاریخی و فکری ماحول کو اگر ہم ذہن میں رکھیں تو وہ دنیا کے دو بڑے یعنی سرخ و سپید دھڑوں کے خلاف
۔۔ری کے جذبات سے غبار آلود ہے۔ انسانیت کے لئے نہ وجہ اطمینان سرمایہ دارانہ جمہوریت کے سایۂ دامن میں ہے اور نہ اشتراکی

آمریت ہی اس کے لئے سرمایہ تسکین ہو سکتی ہے۔ پھر ان دونوں ملکوں کا باہمی تصادم اور کھچاؤ نے دنیا کو جس طرح مہلک ترین جنگ کے خطرے کی تحریک میں مبتلا کر دیا ہے اور پروپیگنڈے اور سازشی کارروائیوں سے دنیا بھر کی سیاسی آب و ہوا کو جس طرح گندہ کر رکھا ہے، اس سے بجا طور پر کرۂ ارضی کی ساری آبادی ملول کر رہی ہے۔ لیسے میں ایک تیسری شے کی مانگ پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ وہ تیسری شے جس کا خلا دنیا کی تاریخ میں پایا جاتا ہے سوائے ایک متوازن نظریہ و نظام کے اور کچھ نہیں ہو سکتی اور جب وہ نظریہ و نظام کچھ طاقتوں کو ابھار لائے گا تو ان کے تعاون سے از خود ایک نئی بین الاقوامی حقیقت نمودار ہو کے رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ امیدیں صرف اسلامی نظریہ و نظام سے وابستہ کی جا سکتی ہیں، لیکن افسوس کہ ابھی تک کسی مسلمان قوم یا ملک کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ اسلامی نظریہ کا علمبردار بن کے اُٹھے اور عالم اسلام اور عالم مشرق میں ایک نئی روح پھونکے اور کسی تیسری بین الاقوامی طاقت کو سامنے لانے کے لئے وہ لیڈر بنے، اور زمانہ کسی کے انتظار میں کھڑا نہیں رہتا، اسے اپنے تقاضے کسی نہ کسی ممکن العمل صورت میں پورے کرنے ہوتے ہیں۔ سو اب زمانے نے افریشیائی اقوام کی تنظیمی ہیئت کی نیو ڈال دی ہے۔ مسلمان اقوام ان شاء اللہ یہاں بھی اسی طرح پیچھے پیچھے چلیں گی جیسے وہ کسی بھی دوسری بین الاقوامی تنظیم میں بھٹکتے ہوئے چلتی ہیں۔

اس کا ایک محرک یہ بھی ہوا کہ ایشیا کے کوہساروں، صحراؤں اور میدانوں میں وہ بدنصیب قومیں بستی ہیں جو قرنوں سے امپیریلزم کی چکی میں پستی رہی ہیں اور اب تک جب کہ وہ آزادی حاصل کر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوششوں میں مصروف ہیں، بڑی طاقتوں کے دو دھڑے ان قوموں کو نامی معاہدوں، امدادی سکیموں اور بین الاقوامی دھڑوں اور بلاکوں کی تنظیموں کے ذریعے آئندہ جنگ میں استعمال کرنے کے لئے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ ان حالات نے بالکل بجا طور پر یہ ردِ عمل افریشیائی اقوام میں پیدا کر دیا ہے کہ کیوں نہ وہ خود ایک آزاد اور غیر جانب دار دھڑے اور بلاک میں منظم ہو جائیں، جو نہ روس کا فدائی ہو نہ امریکہ کا شیدائی، یعنی اپنی قومی خودی اور آزادی کو دونوں بلاکوں سے بچانے کا جذبہ بھی اس کانفرنس کے محرکات میں شامل ہے۔

یہ کانفرنس حاضری، ترتیب اور کارروائی کے لحاظ سے خاصی کامیاب ثابت ہوئی ہے لیکن اگر معاملات کا گہرا تجزیہ کیا جائے تو عجیب و غریب عبرت آموز پہلو اس کی روداد میں مخفی ملتے ہیں۔

مثلاً یہ دیکھئے کہ یہ کانفرنس یا یہ بین الاقوامی ہیئت بھی یو۔ این۔ او کی طرح "امن" کے مقصد کو اپنا محور و مرکز بنا رہی ہے، لیکن یہ بھی کاغذ پر امن کے لئے خوش نما نکات اور فارمولے طے کرنے سے زیادہ اور کچھ نہ پیش کر سکی۔ خود ان افریشیائی اقوام کے مابین جتنے امن سوز وجوہ اختلاف موجود ہیں وہ اپنی جگہ جوں کے توں اٹل ہیں، کوئی اپنے مفاد کا نقصان کسی بڑے سے بڑے اصول کی خاطر گوارا کرنے پر تیار نہیں اور امن کے موضوع پر تقاریر ہوتی ہیں، نکات مرتب ہوتے ہیں، ریزولیوشن پاس ہو جاتے ہیں اور پھر یہ ساری کارروائی پریس میں خوب نمایاں ہو جاتی ہے، حالانکہ جب تک آپ انسان کو مل جل رہنے کے لئے مناسب اصول نہیں بہم پہنچاتے، سارے کرۂ ارضی کے لئے ایک دینِ خیر و فلاح نہیں مہیا کر دیتے اور جب تک اس کی طرف عمل کے ذریعے دعوت نہیں دیتے آپ کے امن کے سارے وظیفے کارِ عبث ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت محرکات جنگ کی جلتی آگ پر تیل کا کام دے جائیں۔

اس کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ خود یہ کانفرنس بھی زیر زمین کام کرنے والے روسی اور امریکی رجحانات کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔ اشتراکی اور اشتراکیوں کے ہم درد تمام تر اس تنظیم کو گہرا سرخ نہیں بلکہ متناسب سے سرخ مزاج دے دینا چاہتے تھے اور ان کی خواہش یہ تھی

نہ اس کا رُخ مغربی طاقتوں کے مخالف ہو جائے۔ لیکن مغربی طاقتیں کب صحیح ہوتی تھیں، انہوں نے اپنی ڈوریاں ہلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور ان کے حق میں خاص خاص لوگ بہترین پنڈت ادا کر گئے۔ اب نہ صرف اس کا مزاج مغربی طاقتوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان کے کچھ حق ہی میں چلا گیا ہے۔

اسی سلسلے میں اس کا ایک اور پہلو بڑا اہم اور قابل مطالعہ ہے۔ تقسیم ہند کے فوراً ہی بعد پنڈت نہرو کی یہ خواہش نمایاں ہو کر سامنے آگئی تھی کہ ایک دن بھارت کو ایشیا کی قیادت پر آنا ہے۔ اس منصوبے پر کام کرتے کرتے سات برس لگ۔ باکر بنڈونگ کانفرنس نے اس خواہش کے پورا ہونے کا پہلا زریں موقع پیدا کیا، چنانچہ پنڈت جی اس ڈرامے میں اپنی طرف سے جو پارٹ ادا کرنے کی تیاری کر کے گئے تھے اور آپنے ساری ایکٹنگ اس کے مطابق کرنے میں بڑی محنت صرف کی۔ پنڈت جی کی ایشیائی قیادت کا معاملہ کوئی چھوٹی چیز نہ تھا، یہ بھی مغربی اور اشتراکی طاقتوں کی رسہ کشی پر اثر انداز ہونے والا ایک اہم مسئلہ تھا۔ امریکہ جس نے پنڈت نہرو کی ہمیشہ ناز برداریاں کی ہیں اور ان کو ابھارنے میں خاصہ حصہ لیا ہے اور جو بھارت کو کوئی جوابی فائدہ حاصل کئے بغیر بڑی بھاری ڈالری امداد دے رہا ہے آخر یہ کیسے گوارا کر لیتا کہ دنیا کی بساط پر ایک ایسا بڑا مہرہ پیدا ہونے دے جس کے بارے یہ امکان تو یقینی ہے کہ وہ مخالف طاقت کے ہاتھوں میں کام کر جائے، ورنہ کم از کم یہ تو قطعی ہے کہ امریکہ کے کام نہ آئے۔ اصل میں پنڈت جی کی اسکیم بڑی کار ومعقول بات کا نتیجہ ہے۔ آپ تیسری طاقت کی لیڈرشپ حاصل کر کے جھگڑنے والی طاقتوں کے درمیان ایک ایسی پوزیشن اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ جس کے ذریعے دونوں طرف سے خوب خوب فائدہ اٹھائیں اور رقابتیں کسی کے بھی نہ آئیں۔ یہ بات بجائے خود قابل تعریف ہے کہ ایک آزاد سلطنت کی مخلص اور ذہین حکمران طاقت کو سوچنا اسی طرح چاہیئے۔ لیکن بہت سی خواہشیں اور اسکیمیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو زندگی میں — خصوصاً سیاسیات میں — تقدیر کی مزاحمتوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ روس بلاک پنڈت نہرو کی قیادت کو گوارا کر سکتا تھا بلکہ امریکہ افریشیائی ممالک کے اس دائرے میں ایک خود سر قیادت کا ظہور کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ جس دائرے میں اس نے ڈالروں کی فصل بو رکھی ہے اور جس میں وہ دفاعی معاہدوں کی بیلوں کے منڈھے چڑھنے کا انتظار کر رہا ہے۔ پنڈت نہرو کا یہ ایشیائی قیادت کا خواب بالکل ٹھیک یاں آتے ہیں درہم برہم ہو گیا۔ اس پر پنڈت جی کا ردِ عمل بڑا تلخ تھا۔ لیکن کوئی تلخ احساس واقعات کی رَو کو پلٹ نہیں سکتی۔

اس کانفرنس میں ایک پارٹ ہمارے وزیر اعظم کا بھی ہے۔ سنا ہے کہ یہ پارٹ بڑا اہم، بڑا نمایاں، بڑا تاریخی قسم کا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ اس کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کے حل کی نیو ڈال آئے ہیں۔ مگر ہمارے وزیر اعظم ہوں، یا ہمارے بزرگانِ ملک و ملت، آخر ان کا کون سا پارٹ اہم، غیر نمایاں یا غیر تاریخی قسم کا ہوتا ہے۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں دنیا بھر سے نرالا اور ممتاز اقدام ہی کرتے ہیں۔

لوگ اپنے اپنے مسائل اور اپنی اپنی فریادیں بھی بنڈونگ کانفرنس میں لے گئے تھے۔ مگر آہ! کون ان کو سمجھائے کہ مسائل کانفرنسوں میں فریادیں کرنے سے کبھی حل نہیں ہوا کرتے، عزم و عمل سے حل ہوتے ہیں۔ یہ کانفرنسیں درحقیقت بین الاقوامی کلب اور رقص خانے بن گئی ہیں۔

تعمیری ادب کی فکری اساس

فروغ احمد بی اے علیگ،

> ۱۹۵۰ء کا لکھا ہوا یہ مقالہ کئی بار ڈھاکہ کی ادبی نشستوں میں اور بالآخر ڈسٹرکٹ بورڈ ہال ڈھاکہ کے ایک ادبی اجتماع عام میں پڑھا گیا لیکن مسودہ صاف نہ ہوسکنے کے سبب اشاعت سے محروم رہا (ف)

فرد، گریز، ماورائیت، ترقی، رجعت، تخریب، تعمیر، عوام دوستی، عوام دشمنی، زندگی، زندگی کی قدریں، عوامی ادب، ادب برائے زندگی وغیرہ نعروں سے اُس وقت تک فریب کا بازار گرم رہے گا جب تک "زندگی" کا ایک واضح تصور ذہن نشین نہ ہو جائے۔ میرے نزدیک تو "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کا امتیاز ہی سرے سے درست نہیں "ادب برائے ادب" قطعی محال ہے۔ خواہ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، آپ کے ادبی پارے آپ کی کشت وجود کے حاصل ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک زندگی ہی کی ترجمانی کرتے ہیں ادب نہ تو خلاء میں پیدا ہوتا ہے نہ "لاشئے" کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ادب، خواہ جیسا کچھ بھی ہو، پیداوہ بہر حال زندگی ہی کی زمین سے ہوتا ہے اور اپنی مخصوص معاشرت کو نشو و نما دیتا ہے۔ ادب کی دو گونہ اقسام کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل میں زندگی کی دوگونہ انواع کے درمیان خطِ فاصل کھینچنے کی ضرورت ہے کون ادب ترقی پسند ہے اور کون نہیں؟ کس ادب کو ہم ادب برائے حیات تسلیم کریں اور کس کو نہیں؟ افادی ادب کیا ہے اور فراری ادب کیا؟ یہ مسئلہ اس وقت تک طے نہ ہو سکے گا جب تک زندگی کا کوئی واضح تصور سامنے نہ ہو۔ جب تک زندگی کی ایک واضح تعبیر پر ہمارا "اجماع" نہ ہو جائے، الفاظ اور نعروں سے مکر و فریب کا بازار گرم رہے گا۔ ہماری تعمیر دوسروں کے لئے تخریب اور دوسروں کی تعمیر ہمارے لئے تخریب ہوگی۔ تاآنکہ زندگی کے کسی ایک تصور پر سب متفق ہو جائیں۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کا صحیح تصور متعین کیسے ہو؟ اگر منطقی مغالطوں اور انشا پردازی کی بھول بھلیوں سے نکل کر فطری طرزِ فکر کے مطابق اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں تو یہ مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو سکتا ہے آپ "ادب برائے زندگی" کے اداکو تھوڑا اور آگے بڑھائیں۔ ادب زندگی کے لئے ہے۔ تو زندگی کس لئے ہے؟ اس نہج پر سوچنے سے ہم منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہو سکتے ہیں ورنہ بھٹکتے رہنے کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ اگر سفر محض برائے سفر ہو برائے منزل نہ ہو تو آوارگی کے علاوہ اور کیا ہے۔

زندگی کس لئے ہے؟ ممکن ہے اس سوال ہی کو سرے سے مابعد الطبیعاتی کہہ کر اسے نظر انداز کر دیا جائے اور پھر مادئیت پر عمل کر کے زندگی کی "ٹھوس" حقیقتوں سے غیر متعلق قرار دے دیا جائے۔ یہ سوال بہر حال ذہنوں میں موجود ہے دنیا کو عنقریب اضطراری طور پر اس سوال کے جواب کی طلب

یعنی اسلام پیچھے نہیں، آگے اور بہت آگے دکھائی دیتا ہے۔ البتہ ہم خود ابھی بہت پیچھے ہیں، اور اسلام کی طرف آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔
ہم جدلی نمایت (SERIALITIES) کے طلسم کو اس طرح توڑتے ہیں ؎

تند و سبک سیر ہے گو جوئے زمانہ کی رو
عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

یہ نہ کوئی تصوف کا نکتہ ہے نہ حرکت و سکون کی طبیعاتی اضافیت (Physical Relativity) کا مسئلہ، بلکہ خالصتہً اسلام کی اخلاقی و عمرانی فعالیت کا نکتہ ہے، جس کا ظہور ہمارے اپنے ظہور پر موقوف ہے۔

ہم بات بات پر "ترقی" کا راگ نہیں الاپتے۔ لیکن ہمارے نزدیک اسلام ترقی ہی کا مترادف ہے۔ جب ہم اسلام کو ترقی کا مترادف کہتے ہیں تو انشاپردازی سے قطع نظر پورے احساسِ ذمہ داری کے تحت ایسا کہتے ہیں۔ کیونکہ ہم تند و سبک سیر رو کے ساتھ بہنے والے علمبرداران "ترقی" کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں "ترقی پسند" ادب کی بحرانی تحریک کا جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہیں۔

جدید بحرانی ادب جدید بحرانِ فکر کی پیداوار ہے۔ اور بحرانِ فکر کی تہ میں زندگی کا حیوانی اور میکانی تصور کارفرما ہے۔ نظریۂ ارتقاء اور تاریخ کی جدلیاتی تعبیر سے زندگی کا جو تصور حاصل ہوا ہے، وہ نتیجہ ہے یورپ کے میکانی طرزِ فکر کا۔ یورپ پر یہ اس قدر حاوی ہو چکا ہے کہ اس کی میکانیت نے وہاں کے سوچنے سمجھنے والے دماغ کو بھی میکانی انداز کا خوگر بنا دیا ہے۔ زندگی اضداد و تضادات کی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے، اس طرح کہ خود اس کی اپنی کوشش کو کوئی دخل نہیں بلکہ خارجی حرکات کی اندھی میکانی جبریت اسے آگے دھکیل رہی ہے۔ یہ ہے یورپ کے تصورِ حیات اور تصورِ تاریخ کا چربہ۔ جب میں سوچتا ہوں کہ لامارک کا نظریۂ ارتقاء یورپ میں کیوں مقبول نہیں ہوا اور ڈارون کو اتنی مقبولیت کیوں نصیب ہوئی تو یورپ کی میکانی ذہنیت اس گتھی کو سلجھا دیتی ہے۔ لامارک (LAMARK) اپنے گھر میں نیم اجنبی تھا۔ کیونکہ اس کا اندازِ فکر نیم میکانی تھا۔ اس نے کوشش و سعی کا ذکر کر کے غیر شعوری طور پر خارجی حرکات کی اندھی میکانی جبریت کی تردید کر ڈالی۔ یورپ کے ذہن پر میکانیت اس قدر حاوی تھی کہ لامارک (LAMARK) کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، ڈارون اور اس کی قماش کے دیگر مفکرین یورپ کے میکانی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ شوپنہاور (SCHOPENHAUER)، نطشے (NIETZCHE)، ہیگل (HEGEL)، مارکس MARK اور برگساں (BERGSON) سبھوں کا یہی حال رہا۔ شوپنہاور، نطشے اور مارکس کے پیشروؤں نے مظاہرِ حیات کے جبری اور میکانی ارتقاء کو محض بیان کرنے ہی پر اکتفا کیا تھا۔ لیکن ان تینوں نے بزعم خود انسان کو زندگی اور تاریخ کے جبر سے نجات دلانے کی تدبیریں سوچیں۔ فلاسفۂ ارتقائیین کے نظریات کو جب عمرانی اور سیاسی مفکرین نے افادی حیثیت دی تو یہ دنیا جہنم زار بن گئی۔ میں شوپنہاور، نطشے اور مارکس کو فرنگی یاسیت کے تین مظاہر سمجھتا ہوں۔ فرنگی یاسیت فرنگی میکانیت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور شوپنہاور، نطشے اور مارکس اسی ردعمل کی پیداوار ہیں۔ ان میں صرف اول الذکر (شوپنہاور) ناکام رہا۔ لیکن اس کی کوشش کو بقیہ دو نے پورا کیا۔ یورپ شوپنہاور کی راہ سے نہیں، نطشے اور مارکس کی راہ سے خودکشی پر تلا ہوا ہے۔ شوپنہاور اس لئے ناکام رہا کہ اس کا طریقۂ نجات براہِ راست ہندوانی فراریت سے مستعار تھا۔ یورپ افیون کھا کر اونگھتا ہوا مرنے کے لئے تیار نہیں۔ اسے تو ایسی شراب تیز و تند چاہئے جس کے نشے میں وہ وحشیانہ رقص کرتے کرتے تھک جائے اور پھر گر کر جان دے دے۔ شوپنہاور کا طریقۂ "نجات" اس کے دیس والوں کے مزاج کے موافق نہ تھا۔ اس کی ناکامی کی تلافی نطشے اور مارکس نے کر دی۔ جب میں نطشے اور مارکس کو یاسیین (Pessimists) قرار دیتا ہوں تو

ممکن ہو سکتا ہے کہ جدید تجرباتی ادب احساس کی دنیا میں کلاسیکی تجربوں پر تفصیلی نگاہ ڈالیں اور اسلام کے تصورِ حیات کو اس کی فلسفیانہ
موشگافیوں سے قطع نظر سر سائنٹفک اور عقلی تعبیر کے ساتھ خوش اسلوبی سے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ادب اگر حسنِ اظہار کا دوسرا نام ہے
تو ہم بنیادی انسانی فطرت سے قطعی مایوس نہیں ہیں کہ حق کو پیش کیا جائے اور دنیا اسے نہ مانے! اگر ہمیں یقین ہے کہ انتشار اور تخریب سے
تنگ آئے ہوئے انسان کو فطری طور پر جس شے کی تلاش ہے وہ اگر بالفعل نہیں تو بالقوت ایک دائمی حقیقت کی حیثیت سے دنیا میں موجود ہے
اور ہم خود اس سے بے خبر ہیں۔ تو ہم نادان ہیں اور دنیا کو اس سے بے خبر رکھنے کے مجرم بھی!

زندگی کے اسلامی تصور میں سالمیت اور وحدتِ تعمیر کا مضمون پوشیدہ ہے۔ ہم زندگی کو ناقابلِ تقسیم وحدت سمجھتے ہیں۔ ہم بعض امور
میں "دینداری" اور بعض میں "دنیاداری" کے دو متضاد رویوں کو اختیار کر کے زندگی کو اندرونی تضاد اور تصادم کی نذر نہیں کر سکتے۔ صرف ایک
طاقت کی پابندی اور دوسری تمام طاقتوں سے کلیتہً آزاد زندگی کو ہم دائمی سلامتی کا موجب تصور کرتے ہیں۔ اندرونی تضاد اور شعبہ جاتی و
خارجی تصادم کا خاتمہ صرف اسی طرح ممکن ہے۔ صرف اسی طرح یہ ممکن ہے کہ انسانی زندگی کا نظم کائناتی نظم سے ہم آہنگ ہو سکے۔ مدبرِ کائنات
کے واضح اشارات پر چل کر ہی ہم وہ امن و سلامتی پا سکتے ہیں جو پوری کائنات کے نظم کے اندر جاری و ساری ہے۔

اب سائنسی تجربات نے انسان کو وہ شعور دے دیا ہے کہ وہ بلاچون و چرا اس حقیقت پر ایمان لے آئے کہ کائنات میں انسانیت
کے پرامن ارتقا اور دائمی فلاح کے لئے مدبرِ کائنات کے واضح اشارات، ہدایات، بینات، اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ان واضح اشارات
کے مطابق ایک مکمل اور دائمی نمونۂ عمل کا حاصل ہونا ضروری ہے۔

اس سیدھے سادے فارمولے کا تجزیہ کیا جائے تو اسے چار مستقل فارمولوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کائنات۔ زمانے کے کسی ایک نقطہ پر وجود میں آئی ہے۔ ایک آئین و تدبیر ہے۔ جو اس کے نظم و ضبط کا باعث ہے۔ یہ
اسی آئین و تدبیر کے تحت ختم ہو سکتی ہے۔ اور مشاہدات بتلاتے ہیں کہ عاقبتِ کائنات یقینی ہے۔

۲۔ مدبرِ کائنات۔ انسان کو بھی اس نے پرامن نظامِ زندگی کے لئے آئین و تدبیر کا ایک ضابطہ دیا ہے۔ جو اسے آسان ترین اور مفید
ترین واسطے سے ملا ہے۔

۳۔ نمونۂ عمل۔ نوعِ انسان کے سامنے مدبرِ کائنات کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کا عملاً مظاہرہ (demonstration) جو
انسان کے لئے محبوب ترین، آسان ترین، مفید ترین اور دائمی افادیت کا حامل ہو، اسی وقت ممکن ہے جب خود ایک انسان ہی کو
یہ منصب دیا گیا ہو۔

۴۔ شرفِ انسانیت۔ صرف اس پر موقوف ہے کہ انسان ایسی زندگی گذارے جو عاقبتِ کائنات تک اس کی فلاح کی ضامن ہو۔
اس تصور میں ہی ذمہ داری اور جوابدہی کی ضمانت ہے جس کے بغیر زندگی محض حیوانیت ہے۔

میں اپنے معروضات کو ختم کرنے سے پہلے اس بنیادی نکتہ پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ذمہ دار، محتاط اور جوابدہ زندگی کا تصور انسانیت
[illegible] سکتا ہے نہ کہ غیر ذمہ دارانہ اور غیر جوابدہ حیوانی زندگی کا "ارتقائی" یا "تبدیلی" تصور۔ کوئی بتلائے کہ بلا استثناء دنیا کی [illegible]
یقین کس کے آگے جوابدہ ہیں! دنیا کی رائے عامہ (WORLD OPINION) تو ایک فریب ہے جس کے ساتھ کسی تعزیری قوت
کا بھی عملاً ناپید ہے۔ اس صدی کی ابتداء سے اب تک کی تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں کسی بین الاقوامی تعزیری ادارہ کا قیام محال ہے کیونکہ

تیسری قسط

عالمی معاشرہ

مترجمہ:- پیامی اعظمی

اسلام غیر مذاہب والوں کے ساتھ انتہائی فراخدلی اور وسیع النظری کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس خصوصیت کی بنا پر اور پھر اس لئے بھی کہ وہ ایک عالمی نظام کا حامل ہے۔ غیر مذہب والوں سے اپنا رشتہ اس وقت تک نہیں کاٹتا جب تک کہ وہ اسلام کے ساتھ برسرپیکار نہ ہوں، دعوت و تبلیغ کی راہ میں سنگ گراں ثابت نہ ہوں، زمین کو شر و فساد کی آگ سے جلا کر خاکستر نہ کر رہے ہوں، کمزوروں اور بے کسوں پر ان کے ظلم کی چکی نہ چلتی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے حیطۂ اقتدار میں شامل ہونے والوں کا عرصۂ حیات وسیع کرتا ہے اور جو لوگ اس کے اقتدار سے باہر ہوتے ہیں ان کے ساتھ خیر و صلاح کے اندر عالمی تعاون کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اس مقام پر اسلامی معاشرے اور مذکورہ بالا دونوں قسم کے غیر اسلامی طبقوں کے درمیان پیدا ہونے والے تعلقات و روابط کی نوعیت واضح کر دیں۔

جو لوگ اسلامی اقتدار کے تحت رشتۂ اسلام سے بے تعلق ہو کر داخل ہوتے ہیں انہیں ذمی کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ان کی حمایت و نصرت کا ذمہ دار ہے، تمام خارجی حملوں سے انہیں بچائے گا۔ ان کی جان و مال اور عقیدہ و مذہب کی حفاظت کا ضامن ہوگا، ان کی عبادتگاہوں اور متبرک جگہوں کی دیکھ بھال کرے گا، اور ان حدود میں رہ کر انہیں اجتماعی اور اقتصادی ترقی کا موقع دے گا جن میں نظام معاشرہ کا کوئی حصہ فساد کا شکار نہ ہو اور نہ ہی اخلاقی قدریں مجروح ہوتی نظر آئیں۔

یہ تمام چیزیں اس جزیہ کے مقابلہ میں ہیں جو اسلامی حکومت ان سے وصول کرے گی۔

لفظ جزیہ کی تشریح بھی ضروری ہے کیوں کہ اس کی حقیقت سے ناواقفیت یا اس مادے سے اسلام پر حملے کرنے کے ناپاک منصوبے نے اس حقیقت پر غلط فہمیوں کے تو پر تو پردے ڈال رکھے ہیں

اسلام نے ہر مسلمان پر اس کی بارہ اشرفیوں کی ملکیت یا اس سے زیادہ میں زکوٰۃ فرض کر دی ہے۔ یہ اس کے مال کا ٹیکس ہے اسی طرح اس نے اسلامی فکر کی حفاظت اور ظلم و جور کو دنیا سے مٹا دینے کے لئے ہر قادر مسلمان پر فریضۂ جہاد عائد کیا ہے یہ ان کے خون کا ٹیکس ہے۔ لیکن فریضۂ زکوٰۃ و فریضۂ جہاد، مال و جان کا ٹیکس ہونے کے ساتھ دونوں اسلامی عبادت کی فہرست میں بھی شامل ہیں، اس لئے ذمیوں کو اس سے بری رکھا گیا کیونکہ ان کا عقیدہ وہ نہیں ہے جو ان عبادتوں کو ایک انسان کے اوپر فرض کرتا ہے۔ اس لئے جان و مال کے ٹیکس کے عوض ذمیوں پر جزیہ عائد کیا ۔۔۔ یہ محض ایک مالی فریضہ ہے جس کے اندر غلامی کا کوئی شائبہ تک نہیں

علاوہ بریں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ زکوٰۃ مسلمان مرد و عورت حتیٰ کہ بچوں کے مال میں بھی رکھی گئی ہے لیکن جزیہ عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر صرف مردوں ہی پر عائد کیا گیا ہے اور یہ بھی عموماً صرف تین طرح کے ہیں محدود ہے جب کہ زکوٰۃ بقدر دولت و ثروت بڑھتی جاتی ہے۔

جزیہ سال میں خوشحال طبقے سے ۴۸ درہم (۱۲ روپیہ) فی کس، ۲۴ درہم (۶ روپیہ) فی کس متوسط طبقہ سے اور ۱۲ درہم (۳ روپیہ) صنعت

حرفت کا پیشہ اختیار کرنے والوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اپاہجوں اور اندھوں پر سے جو کام نہ کر سکیں جزیہ معاف تھا۔ اسی طرح گرجاؤں کے اندر بیٹھنے والے عبادت گزار اور اہل صوامع اگر صاحب مال و جائداد نہ ہوں جزیہ سے بری رکھے گئے ہیں۔

غور کیجئے اسلامی اقتدار کے تحت رہ کر ایک ذمی نہ صرف یہ کہ خارجی اور داخلی تحفظات کا مستحق قرار پاتا ہے بلکہ اگر وہ معذور ہو تو اسلام اپنے اجتماعی نظام کفالت سے اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ خواہ یہ معذورین بچے ہوں، مریض ہوں، عاجز و درماندہ ہوں یا بوڑھے ہوں، دین و مذہب کا لحاظ کئے بغیر ہر شخص کی ضرورتوں کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ تاریخ اسلامی کے صفحات اس کے گواہ اور شاہد ہیں۔

سیدنا حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے نابینا شخص کو ایک دروازہ پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہودی ہے۔ آپ نے فرمایا بھیک کیوں مانگتا ہے؟ اس نے کہا ضرورت کو پوری کرنے کے لئے اور اس لئے کہ جزیہ کی رقم ادا کر سکوں۔ آپ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور مکان پر لے گئے اور اس وقت کچھ زرِ نقد اپنے پاس سے دے کر بیت المال کے خازن کے یہاں کہلوا بھیجا " اس کی اور اس جیسے اوروں کی رعایت کرو۔ خدا کی قسم انصاف کی بات نہیں کہ ہم اس کی جوانی کی کمائی کھائیں اور بڑھاپے میں چھوڑ دیں۔ انما الصدقات للفقراء والمساکین۔ صدقے فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں۔ یہ بوڑھا مساکین یہود کی صف میں ہے "

دمشق کے راستے میں جب آپ نے چند کوڑھ زدہ عیسائیوں کو دیکھا تو حکم نافذ فرمایا کہ صدقات کی رقم میں ان کو حقدار سمجھا جائے اور ان کا روزینہ مقرر کر دیا جائے۔ عہد فاروقی کے یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے واقعات اسلام کا لائق انسانیت کی اعلیٰ سطح پر نمایاں کرتے ہیں سوچئے اجتماعی کفالت کو ایک انسانی حق قرار دیا جاتا ہے جس کا دین و ملت اور عقیدہ و مذہب سے کوئی دور نہیں

اسی طرح کے اور بہت سے حوادث و واقعات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں اور یہ تو ایک زبردست تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے جزیہ کی رقم کو اس بنا پر اسے واپس کر دیا کہ انہوں نے حفاظت کی جس خدمت کو انجام دینے کا وعدہ کیا تھا اس کے قابل نہ رہے تھے۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے اہل شام کو ان کے جزیہ کی رقم محض اس لئے واپس کر دی تھی جب انہیں معلوم ہوا کہ رومیوں نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے صف آرائی کی ہے چنانچہ آپ نے اپنے اُن شہروں کے امراء کے یہاں لکھ بھیجا جہاں ذمیوں کے ساتھ کمل صلح و مصالحت کی بات چیت ہو گئی تھی کہ وہ جزیہ کی رقم کو واپس کر دیں اور کہیں کہ ہم تمہارا مال واپس کر رہے ہیں کیوں کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ رومیوں نے ہمارے خلاف لشکر کشی کی ٹھان رکھی ہے اور تم نے ہم سے اپنی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور ہم بروقت اس خدمت کی انجام دہی سے معذور ہیں اگر اللہ نے ہمیں فتحمند اور غالب بنایا تو ہمارے اور تمہارے درمیان کئے ہوئے صلحنامہ کی سابق شرطیں باقی رہیں گی۔ دنیا کی کوئی دوسری حکومت اس قسم کی اعلیٰ اور روشن مثال پیش نہیں کر سکتی۔

قرآن کی اس آیت کریمہ پر بھی غور کرتے چلئے جسے دشمنان اسلام، اسلام دشمنی میں اس کے خلاف دلیل و حجت قائم کرنے کے لئے بزعم خویش ایک زبردست اور بھرپور وار سمجھ رہے ہیں۔

وہ آیت یہ ہے " اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے مقاتلہ کرو جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ ہی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام تصور کرتے ہیں اور نہ ہی دین حق کو اپناتے ہیں حتیٰ کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے سر اطاعت خم کر کے جزیہ ادا کریں۔ التوبۃ ۲۹"

اصل میں یہاں جن لوگوں سے جنگ کرنے کی جا رہی ہے وہ اہل کتاب میں سے وہ لوگ ہیں جن کی روش " الذین لا یومنون باللہ و

سلہ جزیہ کی مقدار اور شکلیں منصوص نہیں۔ کلیہ صرف یہ ہے کہ اسلام سے اعتقادی اختلاف رکھنے والے لوگ بھی اسلامی ریاست کا سایۂ حفاظت حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ حکومت کے واجبات ادا کریں اور نظم کی اطاعت کریں۔ آج بھی حکومت اور رعایا کا تعلق اسی اصول پر قائم ہوتا ہے، پہلے بھی ہمیشہ اسی پر رہتا تھا جزیہ کو کوئی اہانت آمیز شے سمجھنے والے ذہن میں خود شرمندہ ہوتی ہے۔ چلبلاہ۔

بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق" کہہ کر ظاہر کی گئی ہے۔ اس اتصاف کے ساتھ ایسے لوگ یقیناً اور حتماً کافر ہیں اگرچہ انہیں بہ اعتبار ماکان اہلِ کتاب میں شمار کیا گیا ہے۔ جو شخص اللہ اور عقیدہ آخرت کو تسلیم نہیں کرتا اسے یہودی یا مسیحی یا کسی دینِ سماوی کا پیرو کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ اس طرز کے لوگوں سے جنگ و قتال کرنا درحقیقت فرین اور سرکش لوگوں سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔

پس اسلام کے دستورِ صلح و جنگ کے مطابق جب ان کی جانب سے کسی قسم کا اعتداء یا ظلم و بے انصافی کی روش محسوس کی جائے گی جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا اس کے باوجود آیت مذکورہ بالا میں جزیہ فرض کرنے کا مقصد بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ جزیہ دراصل فریق مخالف کی طرف سے صلح و مسالمت، تسلیم و رضا، ترکِ ظلم و اعتداء کا اور دعوت و اصلاح و تبلیغ کی راہ میں حائل نہ ہونے کا ایک اعلان ہے۔

یہ واضح رہے کہ جزیہ کے ٹیکس کی صورت اور نوعیت قطعاً وہ نہیں ہے۔ جسے معاندینِ اسلام اسلامی عدالت کو متہم اور بدنام کرنے کے لئے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بات بھی گوارا نہیں کہ اس ٹیکس اور اس جنگی ٹیکس کے اندر کوئی موازنہ کیا جائے جو بیسویں صدی کا غالب، فتحمند فریق شکست خوردہ فریق پر عائد کرتا ہے لہٰذا ہم اس موازنہ کو کبھی بھی جائز تصور نہیں کرتے۔ مغربی نظام ہائے فکر و عمل ہمارے لئے کوئی دلیل و حجت نہیں ہیں۔ بیسویں صدی کی اس دنیا میں جو کچھ قوانین و اصول بنتے ہیں ان سے اسلامی احکام و قوانین اور تصرفات کی معقولیت اور ان کے قابلِ عمل ہونے کا ثبوت دینا صحیح نہیں ہے ؎ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔

معاصرین میں سے جو لوگ اسلام کے بعض احکامات و تصرفات کی معقولیت کو بایں طور ثابت کرنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں کہ انہی قوانین کو موجودہ صدی میں بھی قابلِ عمل سمجھا جا رہا ہے وہ لوگ دراصل مغربی نظام ہائے زندگی کے سامنے ایک شعوری ہزیمت اور علمی شکست کا اعتراف کر رہے ہیں۔ اس کوشش کو یہ حضرات اسلام کے حق میں ایک زبردست حجت اور سند تصور کرتے ہیں حالانکہ اسلام ان دلائل سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے۔ اسلام اپنے مزاج کی رفعت اور اپنے اصول و قوانین کی بالاتری کے عقلی، تاریخی اور علمی دلائل و شواہد کے مقابلہ میں موجودہ زمانے کی ہر دلیل قاطع سے بے نیاز ہے۔ کہاں اسلام! کہاں موجودہ زمانہ کا چال چلن اور رنگ ڈھنگ! زمین آسمان کا فرق ہے۔

جس طرح اسلام ذمیوں پر جزیہ عائد کرتے ہوئے انہیں مسلمانوں کی کسی عبادت، روزہ، نماز، زکوٰۃ، جہاد وغیرہ کا مکلف نہیں ٹھہراتا۔ اسی طرح اسلامی سوسائٹی کے اندر ان کے اقتصادی و معاشی وسائل و ذرائع کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ چنانچہ ان کے لئے ان احوال اور آپس کے لین دین کو جائز ٹھہراتا ہے جو کسی وقت مسلمانوں کے لئے کسی طرح جائز اور مباح نہیں ہوتے۔ مثلاً اسلام مسلمانوں کو اس بات کی کبھی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ شراب اور خنزیر کی تجارت کریں یا کھائیں یا ملکیت میں رکھیں۔ چنانچہ اگر ایسا کوئی کرتا ہے تو اسلامی حکومت ان چیزوں کو مال تصور نہیں کرتی۔ اگر انہیں لوٹ لیا جائے یا انہیں چوری کر لیا جائے یا انہیں غصب کر لیا جائے تو اسلامی شریعت لوٹنے اور غصب کرنے کی سزا نہ دے گی، یا اگر یہ چیزیں کسی کے یہاں بطور امانت کے رکھی جائیں اور اس کے ہاتھ سے ضائع ہو جائیں تو اس پر کسی قسم کا کوئی تاوان یا جرمانہ بھی نہ لگایا جائے گا۔ لیکن ذمیوں کے لئے ان چیزوں کا کھانا ان کی تجارت اور انہیں ملکیت میں رکھنا، کھانا، پینا سب جائز ہے۔ اگر چوری ہو جائیں یا ضمانت دار کے ہاتھوں سے ہلاک ہو جائیں تو اس پر مناسب کارروائی بھی عمل لائی جائے گی۔ کیوں کہ یہ چیزیں ذمی کے یہاں مال کی حیثیت میں ہیں۔

یہ ایک ایسا شعور اور ایک ایسی فکر ہے جو ہر قسم کے تعصب حتیٰ کہ دینی عصبیت سے بھی پاک اور منزہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ افقِ اسلامی کی وہ بلندی و رفعت ہے جہاں تک کوئی فکر اور نظریۂ حیات پہنچ نہ سکا اور نہ پہنچ سکے گا۔ اس بحث کو

ایک یورپین عیسائی مصنف کی کتاب الدعوۃ الی الاسلام[1] سے چند جملوں کو پیش کر کے ہم ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ ۹۸ پر ہے:-

"۱۳ھ میں جب دمشق کے باشندوں نے عربوں کے ساتھ ایک عہد و مثال قائم کی اور انہوں نے لوٹ سے محفوظ رہنے اور مفید مطلب عہد و پیمان حاصل کئے تو شام کے اور باقی ماندہ شہروں نے اس مثال کے اتباع میں تساہل سے کام نہ لیا۔ حمص، منبج اور بعض دوسرے شہروں نے معاہدے کئے اور عربوں کی ماتحتی قبول کی۔ انہی شرائط کے ساتھ بطریق بیت المقدس نے شہر کو مسلمانوں کے حوالہ کیا۔ دین سے باغی شہنشاہ قیصر کے خوف سے کہ کہیں وہ اپنے دین کے اتباع پر مجبور نہ کرے اور مسلمانوں کے اس وعدہ کو دیکھ کر جس کی رو سے شہر کے ہر شہری کو مذہبی آزادی حاصل ہوتی تھی رومیوں نے روما کی حکومت یا کسی بھی رومی سلطنت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو غنیمت سمجھا۔ علاوہ ازیں اس وقت کی وحشت انگیزیوں کے زمانہ میں عرب فاتحین کا ضبط و تحمل اور رحم ایسا تھا جس نے لوگوں میں مسلمانوں کا وقار پیدا کر دیا۔"

"بازنطینی حکومت کے صوبہ جات میں جن کو مسلمانوں کی زبردست قوت نے جلد مسخر کر لیا تھا عیسائیوں کو اس نظر سے کہ وہ نسطوری اور یعقوبی عقائد کے پابند تھے اسلامی عہد سلطنت میں ایسی مذہبی آزادی حاصل ہوئی کہ جس کا صدیوں پہلے تجربہ نہ ہوا تھا۔ انہیں کھلے بندوں اجازت تھی کہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے دینی شعائر کو انجام دیں۔ صرف چند قیدیں ان پر ضرور لگائی گئی تھیں جن کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ متضاد مذاہب کے پیروؤں میں کسی قسم کی نزاع پیدا ہو تو اس کا جلد انسداد ہو جائے یا مذہبی نشانات کی عام نمائش سے جو اسلامی شعور کو ٹھیس پہنچاتی تھی اکوئی تعصب کا ہنگامہ نہ برپا ہو جائے۔ اور چونکہ ذمی اسلامی حکومت کا ایک شہری ہوتا ہے اس لئے حکومت پر اس کے جان و مال اور عقیدہ و خیال کی حفاظت۔ اور نگرانی کا فرض عائد ہوتا ہے۔

اسلام اہل ذمہ کے خون ہی کا فقط محافظ نہیں ہوتا جیسا کہ نص ہے: "من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة (بخاری)" یعنی جو کسی معاہد کو قتل کرے گا وہ جنت کی بو نہ پائے گا ـــــ اور نہ ہی محض ان کے اموال اور حریت کا ضامن ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد نبوت ہے "من ظلم معاهدا او كلفه فوق طاقته فانا حجيجه (الخراج)" یعنی جو کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اسے تکلیف مالایطاق دے گا تو میں اس کے خلاف حجت بنوں گا ـــــ بلکہ ان کے ساتھ کامل فراخ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ان کے لئے ایک محترم اور باعزت شہری بن کر رہنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان محبت و دوستی، الفت و انسیت اور اجتماعی تکفل و تعاون کے رشتے قائم کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام نہ تو انہیں خصوصی امور کی انجام دہی کا مکلف ٹھہراتا ہے اور نہ ہی انہیں کسی خاص محلہ میں آباد کر کے مسلمانوں کے ساتھ ان کے میل جول اور اختلاط کو ختم کر دیتا ہے جیسا کہ امریکہ اور جنوبی افریقہ میں سیاہ و سفید کے درمیان زبردست خلیج حائل کر دی گئی ہے۔

اسلامی حکومت کے اندر رہ کر ایک ذمی اپنا رشتۂ الفت قائم رکھنے کا مجاز ہوتا ہے۔ ایک خالص اور بے آمیز اجتماعی فضا کے اندر رہ کر پرامن اور پرسکون زندگی اسے میسر ہوتی ہے۔ وہ مسلمانوں کی دعوت قبول کرتے ہیں اور مسلمان ان کی دعوت کو خوشی خوشی قبول کر لیتے ہیں۔ الغرض ان کے درمیان وہ لطیف اجتماعی رشتہ قائم ہوتا ہے جس کا اس آیت کریمہ سے پتہ چلتا ہے:

آج طیبات تمہارے لئے حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے	الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لهم

---

[1] یہ یورپین عیسائی مصنف مسٹر آرنلڈ ہیں اور وہ کتاب ان کی شہرۂ آفاق تصنیف (PREACHING OF ISLAM) ہے جس کا ترجمہ ابراہیم حسن نے عربی زبان میں "الدعوۃ الی الاسلام" کے نام سے پیش کیا ہے۔

بہتر ہوگا کہ اس ضمن میں عہد رسالت کا وہ واقعہ ذکر کر دیں جو ان جذبات کا آئینہ دار ہے جو ذمیوں کے لئے مسلمانوں کے دلوں میں شعلہ زن ہوتے ہیں

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ "ہمارے پاس سے ایک جنازہ گزرا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور ہم بھی۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے؟ فرمایا کیا وہ ذی روح نہ تھا؟ جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو" (بخاری)

بےتعصبی اور مذہبی آزادی دینے کا قانون جو ساتویں صدی کی تاریخ میں نہایت واضح ہے ان معاہدوں سے پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے جن کو اہل اسلام نے مفتوحہ ملکوں کے لئے منظور کیا تھا۔ جس میں جان و مال کی حفاظت اور دینی عقائد کی مکمل آزادی، اطاعت اور جزیہ کے مقابلہ میں قبول کی۔ کتاب مذکورہ کے صفحہ ۵ میں درج ہے:۔

بعض لوگ ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کرتے ہیں کہ جزیہ عیسائیوں پر اس جرم کی سزا میں تھا کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تھا لیکن یہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ جہاں اور سارے ذمی اپنے مذہب کے باعث عسکری خدمات سے علیحدہ ہو کر جزیہ دیتے تھے اسی طرح عیسائیوں کو بھی اپنی حفاظت کے عوض میں جس کا انتظام اسلامی سپاہ کرتی تھی جزیہ دینا ضروری تھا۔ جب اہل حیرہ نے جزیہ کی مقررکی ہوئی رقم ادا کی تو انہوں نے صراحت کے ساتھ بیان دیا کہ جزیہ کی یہ رقم محض اس لئے ادا کی جا رہی ہے کہ "مسلمان اور ان کا امیر ہماری حفاظت کرے گا خواہ ہمیں پریشان کرنے والے مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔" اسی طرح جب حیرہ کے پڑوسی شہروں کے باشندوں سے حضرت خالد نے معاہدہ کیا تو لکھا "اگر ہم تمہاری حفاظت کریں تو جزیہ دینا، ورنہ نہیں۔"

حضرت ابوعبیدہؓ کا واقعہ جسے ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں، نقل کرنے کے بعد مصنف مذکور رقمطراز ہیں:۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے جزیہ کی یہ رقم قادر مردوں پر عسکری خدمات سے استثنیٰ کے عوض میں جو مسلمان ہونے کی صورت میں لازمی تھیں عاید کی گئی تھی۔ یہ تاریخی حقیقت نہایت واضح ہے کہ جب کوئی عیسائی گروہ اسلامی رجمنٹ میں داخل ہوتا تھا تو اسے جزیہ سے بری کر دیا جاتا۔ چنانچہ قبیلہ جراجمہ کے ساتھ جو عیسائی قبیلہ تھا اور انطاکیہ کے متصل آباد تھا ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ جراجمہ والوں نے مسلمانوں کی طرف صلح کے لئے ہاتھ بڑھائے اور عہد کیا کہ وہ ہمیشہ ان کے معاون رہیں گے اور اس شرط پر اسلامی معرکوں میں ان کے شریک کار رہیں گے کہ ان سے جزیہ نہ وصول کیا جائے گا اور مال غنیمت میں انہیں بھی حقدار ٹھہرایا جائے گا۔ ۲۲ھ میں جب اسلامی فتوحات کا سیلاب شمالی فارس کی طرف بڑھا تو اس قسم کا معاہدہ ان ملکوں کی سرحد پر بسنے والے ایک قبیلہ کے ساتھ بھی ہوا اور انہیں عسکری خدمات کے معاوضہ میں جزیہ سے معاف رکھا گیا۔

عیسائی مصنف گزشتہ تاریخوں میں سے اس قسم کی مثالیں پیش کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر کرتا ہے۔

"اس کے برعکس مصری کاشتکاروں کو مسلمان ہونے کے لئے باوجود جب فوجی خدمات سے بری رکھا گیا تو ان پر اسی طرح کا محصول (فوجی بدل) لگا دیا گیا جیسا کہ عیسائیوں پر لگایا گیا تھا۔"

ان واقعات و حوادث سے قطعی طور پر جزیہ کی وہ صحیح شکل سامنے آتی ہے جسے ہم اس سے قبل پیش کر چکے ہیں۔ ان شواہد سے ان تمام باطل اعتراضات کی تغلیط بھی ہو جاتی ہے جو معاندین اسلام اسلامی اقتدار کے زیر اثر بسنے والے غیر مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ اسلامی تعلقات و روابط

کے باب میں اور خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ میں پیش کرتے ہیں۔

جو لوگ اسلامی اقتدار کے زیر اثر نہ ہوں خواہ ان کا تعلق کسی مذہب سے ہو یا نہ ہو، بہرصورت اسلام ان سے جنگ و جدال، مقاتلہ، عداوت و اور مخالفانہ پالیسی کا فیصلہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ خود امن و امان کو ختم کرنے کے لئے کوئی نامناسب اقدام نہ کریں۔ خواہ یہ اقدام مسلمانوں کے خلاف ہو یا غیر مسلموں کے۔ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں اور شرائط کے مطابق بین الاقوامی تعلقات و روابط کو مضبوط کرتا ہے اور ان معاہدوں اور شرطوں کا احترام اس درجہ کرتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اور سیاسی نظاموں میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سارے معاہدے کئے اور ان معاہدوں کے اندر خود کفار ایک فریق کی حیثیت سے بھی ہے، لیکن اب تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے ان معاہدوں کے پاس و احترام کا حق ادا کیا۔ آپ نے کسی معاہدے کے توڑنے کا اعلان اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ فریق ثانی اس پر قائم رہا۔ معاہدات اور مواثیق کی انتہائی پاسداری اور ان کا احترام کرنے کے باب میں فیصلہ کن نصوص قرآنیہ وارد ہیں۔ اس مسئلہ کی اہمیت کا تقاضہ ہے کہ یہاں ہم کچھ دیر ٹھہر کر غور کرتے چلیں

بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں اسلامی قانون کیا ہے؟ حسب ذیل نص قرآن کا مطالعہ کیجئے:۔

لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون۔ (الممتحنہ ۸،۹)

دین کے بارے میں تم سے جو لوگ جنگ نہ کریں اور تم کو تمہارے گھروں سے نہ نکالیں اللہ تمہیں نہیں روکتا کہ ان کے ساتھ حسن تعلقات رکھو اور عدل و انصاف سے پیش آؤ۔ اللہ انصاف پسند کرتا ہے۔ اللہ ان لوگوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے سے نہیں روکتا ہے جو دین کے بارے میں تم سے آمادہ پیکار رہے اور تم کو گھر سے بے گھر اور تمہارے اخراج کی خاطر کوششیں کیں۔ جو ان سے دوستی کریں گے وہی لوگ ظالم ہیں۔

غیروں کے ساتھ اسی دستور و قانون کے تحت اسلام کا رویہ اور سلوک ہو گا۔

وہ مروت اور دوستی کو عداوت اور دشمنی پر بہرحال ترجیح دیتا ہے۔ خواہ کوئی کتنا ہی زبردست مخالف کیوں نہ ہوں لیکن اس کی مخالفانہ سرگرمیاں اس حد تک نہ پہنچی ہوئی ہوں جس کی آیت مذکورہ بالا میں تصریح کر دی گئی ہے۔

وہ انسانی محبت کے رشتے پر قینچی چلانا نہیں جانتا۔ اس کی خواہش ہے کہ انسانی روابط مضبوط سے مضبوط تر ہو جائیں۔ اسی آیت سے اوپر ایک آیت ہے:۔

عسی اللہ ان یجعل بینکم وبین الذین عادیتم منھم مودۃ واللہ قدیر واللہ غفور رحیم۔ (الممتحنہ ۷)

ہو سکتا ہے کہ اللہ تمہارے اور ان میں سے تمہارے دشمنوں کے درمیان مودت کا کوئی رشتہ قائم کر دے۔ اللہ قدیر ہے اللہ غفور و رحیم ہے۔

عہد و پیمان کو پورا کرنے کے بارے میں بکثرت آیتیں وارد ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ کر دینا کافی ہو گا:۔

واوفوا بعھد اللہ اذا عاھدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدھا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا ان اللہ

جب اللہ سے عہد کرو تو اسے پورا کرو اور قسموں کو پختہ ہو جانے کے بعد نہ توڑو درآں حالیکہ تم نے اپنے اوپر اللہ کو کفیل بنا لیا ہے۔

یعلم ما تفعلون ولا تکونوا کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثا تتخذون ایمانکم دخلا بینکم ان تکون امۃ ھی اربیٰ من امۃ ۔

جو تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے ۔ اس عورت کی مانند نہ ہو جاؤ جس نے اپنی رسی کو بٹ کر مضبوط کرنے کے بعد تار تار کر دیا ۔ اپنی قسموں کو اپنے اندر موجب فساد بناتے ہو محض اس بنا پر کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھ جائے ۔

یہاں ایفاء عہد کی کتنے پر زور انداز میں تعلیم دی گئی ہے ۔ دھوکہ بازی اور موجب فساد چیزوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے ۔ مصلحت حکومت کا جو عذر دور حاضر کے دھوکہ باز اور دروغ گو ارباب سیاست پیش کرتے ہیں اس کا اسلام سرے سے قائل نہیں ہے اور وہ کسی حال میں دھوکہ دہی یا عہد کے اندر فساد انگیزی یا معاہدہ شکنی کے لیے "مصلحت حکومت" کو وجہ جواز قرار نہیں دیتا ۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی ان چیزوں کو وہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جب کہ خود مظلوم مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کو مدد اور نصرت کے لیے پکاریں ۔ جب دشمنوں کی طرف سے عہد شکنی کی ابتدا ہو گی تو اس طرف سے بھی اس کا اعلان کر دیا جائے گا ۔

وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علی قوم بینکم وبینھم میثاق

اگر وہ (یعنی مسلمان) دین کے بارے میں تم سے نصرت کے طلب گار ہوں تو تم پر تعاون فرض ہے مگر ان لوگوں کے خلاف نہیں جن کے درمیان اور تمہارے درمیان عہد نامہ ہو ۔

اس جگہ ایفاء عہد کی ایک ایسی بلند تعلیم ہے جس کی تعریف اور توصیف کے لیے الفاظ کے ذخیرے ناکافی ہیں ۔ یہ مجرد اصول و مبادی اور نظریات ہی نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کی زندگی اور ان کے بین الاقوامی تعلقات کے اندر ان نظریات کی عملی شہادتیں موجود ہیں ۔ تاریخ اسلامی کے صفحات پر اس کی بکثرت مثالیں بکھری پڑی ہیں ۔ چند ملاحظہ ہوں ۔

حذیفہ بن الیمان کا بیان ہے کہ میں معرکہ بدر میں شریک نہیں ہوا اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی کہ میں اور ابو حُسَیل جب مکہ سے نکلے تو کفار قریش نے ہمیں گرفتار کر لیا اور پوچھا کیا تم محمدؐ کے یہاں جا رہے ہو؟ ہم نے کہا نہیں ہم صرف مدینہ کا قصد رکھتے ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے ہم سے عہد و پیمان لیا کہ ہم مدینہ جائیں گے اور محمد صلعم سے مل کر ان کے خلاف جنگ نہ کریں گے ۔ ہم رسول اکرمؐ کے پاس آئے اور تمام واقعہ کی خبر دی فرمایا لوٹ جاؤ ہم ان کے عہد و پیمان کا پاس کریں گے اللہ ہمارا حامی و مددگار رہے ۔"

رسول اللہ کے غلام ابو رافع فرماتے ہیں "قریش نے مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا ۔ جب میں نے آپ کو دیکھا تو میرے دل میں اسلام کی رغبت پیدا ہو گئی اور میں نے کہا یا رسول اللہ! میں اب واپس نہ جاؤں گا ۔" فرمایا " میں عہد شکنی کا جرم نہ کروں گا تم اس وقت واپس جاؤ پھر اگر تم اپنے ارادے پر جمے رہے تو واپس آجانا ۔"

سہیل بن عمرو جس وقت صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کر رہے تھے اور صلح نامہ پر دستخط ہو رہے تھے ، اسی اثنا میں ان کے لڑکے ابو جندل بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے آئے ۔ سہیل نے جب دیکھا تو اپنے لڑکے کا گریبان پکڑ کر کہا " اے محمدؐ! ہماری تمہاری شرط لازم ہو گئی یعنی اس کے آنے سے پہلے میں جو کچھ کہنا اور سننا تھا ہو گیا ۔" آپ نے فرمایا " ٹھیک ہے ۔" یہ سن کر ابو جندلؓ نے فرمایا " معشر مسلمین! کیا مشرکین کی طرف دوبارہ لوٹا دیا جاؤں گا جہاں وہ دین سے برگشتہ کرنے کے لیے مجھے ستائیں گے ؟ لیکن ابو جندل کی دلوں کو پگھلا دینے والی کسمپرسی ، بیچارگی اور عاجزی نے کچھ کام نہ دیا ۔ اور وہ قرارداد و شروط کے مطابق واپس کر دیئے گئے ۔

(باقی - باقی)

سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ اقبال مرحوم

مودودی صاحب کا ایک غیر مطبوعہ خط

سرحد کے ایک نیاز مند کے نام

محترمی و مکرمی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۳ مارچ وصول ہوا۔ عدیم الفرصتی کے سبب سے جلدی جواب نہ دے سکا

ڈاکٹر اقبال مرحوم سے میرے ذاتی تعلقات کچھ بہت زیادہ وسیع تو نہ تھے البتہ علمی حیثیت سے گہرے ضرور تھے۔

میں جب حیدر آباد سے رسالہ ترجمان القرآن نکالا کرتا تھا اس زمانہ میں مجھے خبر تک نہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے واقف ہیں، مگر بعد میں معلوم ہوا۔ کہ وہ برابر اس رسالہ کو منگوا کر میرے مضامین دلچسپی کے ساتھ پڑھوا کر سنتے رہتے تھے مجھے پہلی مرتبہ ان کی دلچسپی کا علم اس وقت ہوا جب ۱۹۳۷ء کے آغاز میں ان کا عنایت نامہ مجھے ملا جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ میں حیدر آباد چھوڑ کر پنجاب چلا آؤں اور لاہور میں رہ کر فقہ اسلامی کی تدوین جدید میں ان کے ساتھ تعاون کروں۔ اس کے بعد کچھ مراسلات شروع ہوئی اور ۱۹۳۷ء کے آخر میں میں لاہور آکر دو تین مرتبہ ان سے ملا۔ ان ملاقاتوں میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میری اور ان کی بہت پرانی واقفیت ہے اور ہم ایک دوسرے کے دل سے بہت قریب ہیں یہاں میرے اور ان کے درمیان یہ بات طے ہوگئی کہ میں پنجاب منتقل ہو جاؤں اور پٹھان کوٹ کے قریب اس وقف کی عمارات میں، جس کا نام ہم نے بالاتفاق "دارالاسلام" تجویز کیا تھا، ایک ادارہ قائم کروں جہاں دینی تحقیقات اور تربیت کا کام کیا جائے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ میرے وہاں منتقل ہو جانے کے بعد وہ بھی ہر سال چند مہینے وہاں آکر قیام فرمایا کریں گے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق میں نے حیدر آباد جا کر ہجرت کی تیاریاں شروع کر دیں اور مارچ ۱۹۳۸ء میں نقل مقام کر کے دارالاسلام پہنچ گیا۔ مگر افسوس کہ وہ مرحوم کی زندگی کے آخری ایام تھے۔ دوسرے ہی مہینہ ان کا انتقال ہو گیا اور میں اس کام کے لئے تنہا رہ گیا جسے ان کے ساتھ مل کر کرنا چاہتا تھا۔

بس یہ میرے اور ان کے تعلقات کی مختصر داستان ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ

خاکسار ابوالاعلیٰ

۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء

(بشکریہ "رہبر" پشاور)

ایشیا لاہور

اکھونی اُٹھے بے چان

قیصر قصری

چودھری کی پشکرینی میں کنول کا صرف ایک پھول سر اٹھائے کھڑا تھا۔ ماجد نے اپنی جوتی اتار کر وہیں کنارے پر ڈال دی اور شلوار کچھ اوپر چڑھا کر پانی میں اتر گیا —— پشکرینی میں پانی کم تھا اور کیچڑ زیادہ تھی۔ اس کیچڑ میں قدم جماتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیر مچھلیوں کے کسی غول پر پڑ گئے ہیں اور ہر قدم پر سڑی ہوئی مچھلیوں کی بو کا ایک بھبکا بھی پانی کی سطح سے اُٹھ کر اوپر آ جاتا تھا —— لیکن ماجد کو اس بو میں کوئی بیگانہ پن محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اور تہہ کی چکنی سطح پر وہ اتنی بار پھسل چکا تھا کہ اب اس کیچڑ پر بھاگتے وقت بھی اپنا توازن قائم رکھتے تھے۔

بھاگتا ہوا وہ کنول کے قریب پہنچ گیا۔ پانی صرف اس کی کمر تک آ رہا تھا اس کے قدموں نے پانی میں جو لہریں پیدا کی تھیں وہ پھول کو آہستہ آہستہ ہلکورے دے رہی تھیں۔ ماجد نے اپنا ہاتھ ہلا کر اور زیادہ لہریں پیدا کر دیں کنول کا پھول ایک بار پانی میں ڈوبا اور پھر باہر نکل آیا۔ ماجد کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے اپنا منہ کسی قدر شریر سا کرتے ہوئے کہا۔ "تم بھی یہاں اکیلے تھے۔ ہے نا؟"

ایک بھنورا کسی طرف سے بھن بھن کرتا ہوا آیا اور پھول سے دور دور ہوا میں چکر لگانے لگا ماجد نے اسے دیکھا اور کنول کو چھوڑ کر اس کی طرف دوڑا۔ بھنورا ایک ہی پرواز میں اس سے کافی دور چلا گیا، اور محسلے کی ایک بیل سے ذرا اوپر ہوا میں ایک جگہ قائم ہو گیا۔ لیکن اس کے پروں کی آواز اب بھی ماجد کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ماجد پھول کی طرف واپس مڑا اور اس سے بولا۔ "اپنے دوست کا گیت سن رہے ہو؟"

پھول نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پانی کی لہریں اب اسے ہلکورے بھی نہیں دے رہی تھیں۔

اچانک ماجد نے گھوم کر اپنی پشت کی طرف دیکھا۔ بھنورے کی بھن بھن سے پرے ایک دوسرا گیت بھی اُسے سنائی دے گیا تھا۔ بے اختیار وہ پشکرینی کے دوسرے کنارے کی طرف بڑھا۔ دوسرے کنارے پر چودھری کا لڑکا رحمان بظاہر کسی اور چیز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور کسی اور طرف جا رہا تھا اس نے ماجد کی طرف نہیں دیکھا۔ نہ ہی کچھ کہا۔ لیکن اس کے گیت کی زبان کو ماجد اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ گیت رحمان کے دل سے نکل رہا ہے اس کی نظریں کسی اور طرف ہی کیوں نہ لگی ہوں۔ [illegible] —— وہ یقیناً اسے اپنے پاس بلانا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔

دونوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ کی ضرورت تھی۔

ماجد تالاب سے نکلا اور رحمان کے سامنے جا کھڑا ہوا لیکن اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکل سکی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے "ماجد" رحمان نے کہا۔ اور پھر فوراً ہی ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پشکرینی کے اس طرف صرف اس کا اپنا لکڑی کا ایک مکان تھا۔ اور اس کا دروازہ بھی اس وقت بند تھا لیکن پشکرینی کے اس پار پورا گاؤں آباد تھا۔ اگرچہ اس کی گلیاں بھی سنسان پڑی تھیں۔ ٹین کی چھتوں والی دکانوں کے سامنے بھی کوئی گاہک کھڑا نظر نہیں آ رہا تھا۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ [illegible] کے جلسے میں گئے ہوئے تھے۔ بس دو چار آدمی مسجد کے حجروں میں موجود تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی ایک بار پھر رحمان نے ماجد کی طرف دیکھا۔ ماجد کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکل کر آہستہ

یہ تصویریں ہیں تیری !

ادارہ

آج گلبرگ کالونی (لاہور) میں کینیرڈ کالج کی طالبات کے انتہائی بے باکانہ اور ننگ نسوانیت مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ غروب آفتاب کے بعد اس کالج کی چالیس پچاس طالبات گلبرگ کالونی میں سیر کی غرض سے آئیں۔ ان کے ساتھ کالج کی طرف سے تین مرد بھی تھے۔ ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اور باقی شاید رہنمائی کا کام کرتے تھے۔ لڑکیاں تمام راستے فلموں کے انتہائی مخش گانے گاتی رہیں۔ اور ساتھ ساتھ سازوں کی کمی پورا کرنے کے لئے تالیاں بجاتی اور طرح طرح کی آوازیں نکالتی رہیں ... فارغ عام پر جو مذاق مرد نہیں کرسکتے۔ اس سے بھی گندے مذاق یہ لڑکیاں ایک دوسرے سے کر رہی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسری کو لپٹ جاتیں اور پنجابی ایک گانے کا ابیات مصرعہ پڑھ کر) ایک دوسری کو چوم لیتیں۔ ان لڑکیوں کے ساتھ کینیرڈ کالج ہوسٹل کی نگران انگریز خاتون بھی تھیں۔ اور یہ تمام حرکتیں ان کی موجودگی میں ہو رہی تھیں۔

(ایک اخباری رپورٹ)

قند و نمک

ادارہ

کچھ معلوم ہے آپ کو کہ عہدِ حاضر کے نوجوان طبقہ کے دلوں میں جس مقابل روح کی بیداری کے آثار دکھائی دے رہے ہیں اس کے بال و پر کی بالیدگی میں نمایاں حصہ "کس مجددِ دوراں کا ہے؟

وہ جس کا ایک منصب "مفسرِ قرآن" کا ہے جسے وہ خود تو اپنے لئے خاص سمجھتا ہے البتہ خدا کے رسول کو اس کے قریب بھی بھٹکنے دینے کا روادار نہیں! جو کہتا ہے کہ رسولؐ سے تو صرف قرآن کے لو اور کہہ دو کہ بس اور ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔ رہی قرآن کی تفسیر تو وہ سیدھے آکر میرے ہاں سے لو پورا سیٹ صرف ساٹھ ستر روپے میں!

وہ جس کا دوسرا منصب "ترجمانِ اقبال" کا ہے یہ ترجمان صاحب نہ پیدا ہوئے ہوتے تو یہاں کوئی اقبال صاحب کے خیالات کی بو بھی نہ پا سکتا۔

وہ جو صاحب "فکرِ عمیق" ہے، "صاحب نظر" ہے۔

وہ جو "ملت کی متاعِ گم گشتہ کی بازیابی کی راہ بتاتا ہے"۔

ایک اشتہار میں استعمال شدہ القاب و آداب اور پرشکوہ تعارفی کلمات کے اس پہاڑ کو فرہاد بن کر کھود دیتے اور کھود کر دیکھئے تو سہی کہ کیا نکلتا ہے۔

جیلہ پرویزی

ایک بزرگ نے علم و ادب میں پہلی مرتبہ ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے۔ ایک شخص کی مختلف تحریریں سامنے رکھیں ان کے جستہ جستہ فقروں پر نشان کئے، ان فقروں کا اصل سلسلۂ کلام سے کاٹ کر الگ کیا، پھر اپنی مرضی کی ترتیب سے ان کو جوڑا اور ایک نیا مضمون اس شخص کے نام سے مرتب کر دیا۔ جس میں الفاظ سب کے سب اسی کے ہیں اور مطالب اپنے پیدا کر دیئے۔ اس اسلوب سے کئی کام لئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہت سا نیا لٹریچر اس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے جس میں یہ آسانی ہوگی کہ وہ جرائد کے صفحات آسانی سے بھر سکیں، ایسے مضامین کے مجموعے شائع کر کے اشاعتی کاروبار بھی مصنفین کی ناز برداری کے بغیر چلائے جا سکتے ہیں۔ کسی بھی دعویٰ پر دنیا کے ہر شخص کی تحریروں سے شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔ (افسوس کہ قادیانی ذہن اس معاملے میں پیچھے رہ گیا) سیاسی و مذہبی سارے اختلافات رفع کر کے وحدت کاملہ پیدا کی جا سکتی

آؤ کچھ سوچیں

ادارہ

تم مسلمان ہو یا اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو!

تم اگر اہلِ حدیث ہو تو کہتے ہو کہ قرآن کے رسول اللہ کی حدیث سے براہِ راست رہنمائی لینے والا ہی سچا مسلمان ہوتا ہے۔

تم اگر حنفی ہو تو کہتے ہو کہ امام ابو حنیفہ کے سرمایۂ فکر و تحقیق سے استفادہ کئے بغیر اسلامی زندگی نہیں بنتی

تم اگر بریلوی ہو تو کہتے ہو کہ اقطاب و اولیا اور بزرگوں کا دامن تھامنے سے ہی رضائے الٰہی حاصل ہو سکتی ہے۔

تم اگر تصوف پسند ہو تو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ کسی پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دینا اور طریقت پر چل کر اپنا باطن سنوارنا اصل مطلوبِ دینداری ہے!

تم اگر شیعہ ہو تو کہتے ہو کہ اہلِ بیت کی محبت و اطاعت ہی اصل دین ہے۔

تم اگر نیم روشن خیال ہو تو کہتے ہو کہ جب تک احادیثِ رسالت سے قطعِ نظر کر کے صرف قرآن ہی قرآن پر دار و مدار نہ رکھا جائے تو نہ زندگی سنورتی ہے، نہ ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔

تم اگر پکے ماڈرن ہو تو یہ رائے ظاہر کرتے ہو کہ موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی جدید ترین تعبیر کر کے ہی بگڑی بنائی جا سکتی ہے

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ ——

تم دنیا بھر میں ساٹھ ستر کروڑ کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہو اور پاکستان کی آزاد سلطنت میں تمہاری تعداد سات آٹھ کروڑ ہے۔

تم سوچ سمجھ کر یہ بتاؤ کہ عملاً تمہارے اندر کیا چیزیں مشترک ہیں!

بہ حیثیت مسلمان تمہارے اندر کون سے نظریات و تصورات کارفرما ہیں!

تمہارے کیرکٹر کے کون سے اجزا ایسے ہیں جو تمہارے مسلمان ہونے کی علامت کی حیثیت رکھتے ہوں!

وہ کونسی چیزیں ہیں کہ جن کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہو کہ کوئی مسلمان ان کو ترک نہیں کرتا

وہ کونسی چیزیں ہیں کہ جن کے بارے میں یہ معلوم عام ہو کہ کوئی مسلمان ان کو اختیار نہیں کرتا!

معاشرت، کاروبار، رہن سہن، میل جول، کھان پان کے اندر کوئی چیز ایسی بتا سکتے ہو کہ جسے دنیا بھر میں تم خالص اپنی کہہ کر پیش کر سکو!

ایسی کوئی تعریف دنیا کو بتا سکتے ہو کہ اس تعریف سے مسلمان کو جانا اور پہچانا جا سکتا ہے!

اپنی کوئی مستقل روایات اور اخلاقی قدریں دوسروں کے سامنے رکھ سکتے ہو!

انسانیت کے لئے کوئی پیغام تمہارے پاس ایسا ہے جسے پیش کرنے کو تم اپنا جہانی نصب العین بنا سکو!

کوئی خوبی کسی معاملے میں زمانے کو دے سکتے ہو اور زندگی کے کسی پہلو میں کوئی ایسی مثال سامنے لا سکتے ہو!

کوئی شعبہ ہے جس میں تم کسی دوسرے کے آگے ہو کر چلنے کا حق پا سکو!

استفسارات

فہیم صدیقی

س: اسلامی لٹریچر پڑھ کر اسلام کے بہت قریب آچکا ہوں مگر ایک چیز جو بار بار میرے کھٹکتی ہے اور مجھے قرآن کے خدائی کلام ہونے میں شک میں ڈالتی ہے۔ وہ جادو ہے۔ جو رسیوں کو سانپ بنا دیتا ہے اور کبھی بچھڑے کو نطق عطا کر دیتا ہے اگر جادو واقعی کوئی چیز ہوتی۔ تو اس فن کی تعلیم کتابوں میں ضرور ملتی۔ جیسے دوسرے فنون کی تعلیم کا کتابوں میں بہت چرچا ہے۔ جادو جیسا کہ مسلمانوں میں عام مشہور ہے۔ جادو برحق کہنے والا کافر۔ لیکن کفار ضرور اس سے فائدہ اٹھاتے۔ خواہ یہ کتنی ہی بری چیز کیوں نہ ہو۔ ان کے سکولوں کالجوں میں سائنس کی طرح اس کا خوب تذکرہ ہوتا۔ جنگ میں بموں۔ ہوائی جہازوں وغیرہ کی طرح ہر قوم اپنا جادو دوسری قوم کے خلاف استعمال کرتی۔ اور آپ حضرات کے مقابلے میں بھی جادوگر ضرور آتے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں آئے۔ پھر آپ قرآنی آیات یا کرامتوں سے ان کو زیر کرتے۔ حل تو چاہتا ہے ....

ج: مکرمی و محترمی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ گرامی نامہ ملا۔

آپ کو نہ جانے زندگی کے بے شمار پیچ در پیچ عملی مسائل اور خیر و شر کی کشمکش کو درکنار رکھ کر کیسے جادو کے مسئلے پر اتنا گہرا غور و فکر کرنے کا موقع ملا۔ آج ہم اقتدار کے جادو، سرمایہ کے جادو، پروپیگنڈے کے جادو اور ادب و شعر کے جس جادو سے دوچار ہیں وہی اپنے اندر اتنے اسرار پنہاں رکھتا ہے کہ جادو کی کسی اور قسم پر غور کرنا نصیب ہی نہیں رہا۔ تاہم جب اس مسئلے میں ایک خلش آپ محسوس کر رہے ہیں تو کچھ نہ کچھ عرض کرنا ناگزیر ہے۔

جادو کا ذکر قرآن اور دینی لٹریچر میں آتا ہے اور لوگ بالعموم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی منجملہ ان امور کے ہے جن پر ایمان رکھنا ضروریات دین میں سے ہے۔ چنانچہ پھر اس کی حقیقت و ماہیت کی کرید میں پڑتے ہیں، پھر ان کے سامنے کچھ کہانیاں اور افسانے آتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری معلومات بھی دینی ہیں اور ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ عقل ان کہانیوں پر مطمئن نہیں ہوتی۔ اس لئے ایک ذہنی کشمکش نمودار ہوتی ہے۔

قرآن میں جادو کا ذکر دو بڑے مواقع پر نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ہاروت و ماروت کے بیان کے سلسلے میں، جہاں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "ما یفرقون به بین المرء وزوجه" دوسرا مقام سامری کے قصے کا ہے کہ اس کا بنایا ہوا بچھڑا بولتا تھا۔ اس دوسرے موقع کے متعلق تو صورت معاملہ بعض مفسرین نے خود ہی واضح کر دی ہے کہ بچھڑے کی ساخت اس نوعیت کی تھی اور وہ ایسے رخ پر کھڑا کیا گیا تھا کہ جب ہوا کا اس میں سے گزر ہوتا تھا تو بھاں بھاں کی ایک آواز آتی تھی۔ اس موقع پر چونکہ سامری کا اپنا بیان یہ نقل کیا گیا ہے کہ میں نے فرشتے کے مقام گزر سے اس کے نقش پا کی مٹی لیکر اس میں ڈالی تھی اور یہ سارا کرشمہ اسی کا ہے۔ اس سے بعض لوگوں کا ذہن ادھر گیا کہ بچھڑے کی آواز سامری کے قول کے مطابق اس مٹی ہی کی کرامت کا نتیجہ تھی حالانکہ سامری کا یہ سارا عمل تو ایک نفسیاتی حربہ تھا جس سے اس نے بنی اسرائیل کو مبہوت و مسحور کر لیا۔ وہ دھوکے میں پڑ گئے کہ یہ کوئی خدائی کرامات ہے

اور اس پچھڑے میں کوئی آسمانی تقدس موجود ہے۔ رہا "ما فوق الفطرت" وہ جو بیان المشہورِ حیثیت کا مفہوم، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی نفسیات کے عالم میں اثر و تاثر کی ایسی ایسی عجیب و غریب صورتیں پائی جاتی ہیں جن کی کنہ دریافت کرنے کے درپے ماہرینِ نفسیات کئی سال سے ہیں اور ابھی کوئی قطعی بات قرار نہیں پا سکی۔ اس سلسلے میں آگے چند اشارات آ رہے ہیں۔ مجملاً مراد یہ ہے نفسیاتی توجہ اور ہپنا ٹزم وغیرہ کے کرشمے ہیں جن سے دو دلوں میں بگاڑ، منافرت، جدائی پیدا کی جاتی ہے، جن سے ایک جوڑے کے ایک فرد کو رجھایا جاتا ہے، جن سے کسی فریق کو رفع کیا جاتا ہے۔ دم درود، تعویذ، گنڈے بھی ان تدبیروں کے ساتھ گھلے ملے ہوتے ہیں۔ یہ سب "ما فوق الفطرت" کے "ما" میں داخل ہو سکتے ہیں۔

میرا ذاتی تصور یہ ہے کہ ہم ہر اس عمل اور اثر پر "جادو" کے لفظ کا اطلاق کر سکتے ہیں جس کے سبب اور نتیجہ کے درمیان کسی زمانے اور کسی دور کے وہم کوئی طبعی جوڑ نہ لگا سکیں۔ چاہے یہ عمل طبیعاتی ہو یا نفسیاتی! انسان آہستہ آہستہ اسباب و نتائج کے درمیان جوڑ دریافت کر رہا ہے۔ جس دائرے میں اس کی یہ دریافتیں ایک نتیجہ تک پہنچ چکی ہیں وہ اب "سائنس" کے نام سے معروف ہے اور جس دائرے میں وہ ابھی تک جستجو کی تلاش میں کرتا ہے وہ قیاسات اور اوہام کی جولانگاہ ہے اور جادو کی نگری بھی اسی میں واقع ہے۔ طبیعیات میں تو تحقیق در تحقیق کرتے کرتے اب سمجھا جانے لگا ہے کہ جو عمل آج غیر واضح ہیں وہ کبھی نہ کبھی منکشف ہو جائیں گے، البتہ نفسیات اور روحانیات اور امورِ غیب کے متعلق انسان آج بھی بڑی حد تک مبتدی ہے۔ اس عالمِ اسرار کے بارے میں دو چیزیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ آیا حسی و مادی مخلوق کے علاوہ کوئی اور مخلوق بھی موجود ہے و کسی نہ کسی صورت میں عالمِ حادثات میں مداخلت کر سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ آیا ہماری نفسیاتی قوتوں میں کچھ ایسی قوتیں بھی شامل ہیں جن کی ماہیت اور جن کے طرزِ عمل اور جن کے اصولِ اثر و تاثر کو ہم نہیں جانتے۔ جادو اگر کوئی چیز ہے تو اس کا تعلق انہی دو سوالات سے ہو سکتا ہے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم انسان چونکہ صرف حسی موجودات کے لئے ذرائعِ علم رکھتے ہیں اس لئے اگر غیر حسی مخلوق کے موجود ہونے کو نہیں جان سکتے تو اس کے ساتھ ساتھ ہم اس کی نفی کرنے کا حق بھی نہیں رکھتے۔ ہم بجائے خود نفی و اثبات دونوں سے خالی الذہن ہو سکتے ہیں۔ ایسے عالم میں اگر انبیا اپنے "فوق البشری ذرائع" سے ہمیں یہ بتائیں کہ غیر حسی مخلوق بھی کوئی ہے تو ہمارے پاس کوئی دلیلِ تردید ہرگز نہیں ہو سکتی۔

اب لیجئے دوسرا سوال! اس سلسلے میں اگر دورِ حاضر کے اونچے علمائے نفسیات میں سے کسی کے سرمایۂ فکر و تحقیق کو آپ سامنے رکھیں تو آپ اپنی ذہنی دنیا کے عجائب و غرائب کا حال جان کر حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ ہمارے اندر کیسی کیسی قوتوں کے طوفان سوئے پڑے ہیں، بلکہ ان کی لہریں کتنی قیامت مچائے ہوئے ہیں اور علمائے نفسیات کا حال یہ ہے کہ وہ ان قوتوں اور ان کے کرشموں کے بارے میں ابھی تک قطعیت سے کوئی بات نہیں کر سکتے اور ان کے بارے کوئی سائنٹیفک رائے نہیں دے سکتے۔ ہماری نفسیاتی قوتیں ہمیں دن رات ہماری بہت ساری حرکات کی سزائیں دیتی ہیں، وہ ہمیں کسی ظاہری سبب کے نہ ہوتے ہوئے پریشانی اور اضمحلال میں ڈال دیتی ہیں، وہ جسمانی وجوہ کے بغیر ہمیں بیماری میں مبتلا کر دیتی ہیں، وہ ہماری قوتِ ارادی کو کبھی کبھی اس طرح لگام دے لیتی ہیں کہ ہم بالکل کٹھ پتلی بنے ان کے اشاروں پر مجہول طریق سے ناچتے ہیں اور ان کے تسلط سے نکلنے کی خواہش کرنے کے باوجود نہیں نکل پاتے۔ ایسی قوتوں کے ہوتے ہوئے جن کے بارے میں ہمارا علم عالمِ حیات کے مقابلے میں ابھی بے حد کم ہے ہم کیسے پُر اسرار احوال و کوائف اور عجائب و اثرات کا انکار کر سکتے ہیں اور کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جادو کوئی چیز نہیں!

"جادو" کے مفہوم پر غور کرتے ہوئے مادیوں کے شعبدوں سے بالاتر ہو کر سوچئے تو آپ یہ معلوم کر کے حیران رہ جائیں گے کہ دورِ حاضر کے اونچے سائنٹیفک مادہ پرست ذہن بھی اس کی قطعی نفی نہیں کر سکے بلکہ اس سلسلے میں تحقیق و تفحص کا سلسلہ جاری ہے۔ ابھی میں نے EVERYMAN'S ENCYCLOPAEDIA کو نکال کر دیکھا تو اس میں یہ اعتراف موجود پایا کہ جادو کا نام ہے جو غیر معمولی حرکات اور فریب کارانہ شعبدے پائے جاتے

ذہنی قوتوں کو اعصاب پر اتنی گرفت حاصل ہے کہ وہ شدید تغیر پیدا کر سکتی ہیں، لیکن شعوری طور پر اس حیثیت سے نفسیاتی اثر کے تحت ہم جس نظام سے واقف ہو
چکے ہیں اس کی ماہیت، اس کی حدود، اس کے طریق کار کا تعین ہمیں کچھ زیادہ علم حاصل نہیں ہے۔ بہر حال ذہنی قوت کے جسم پر اثر انداز ہو کر بیماری کو
اچھا کر دینے اور دوسرے شخص کی مضرت کو دور کر دینے کا اعتراف مدت ہوئی کہ ڈاکٹر بھی کرتے ہی کر چکے ہیں۔

ذہنی قوتوں کا خود بخود ایک جسم پر اثر انداز ہونا اور شے ہے، لیکن کسی دوسرے کا بالارادہ ان کو کنٹرول کرنا اور ان سے نتائج پیدا کرنا دوسری چیز ہے یہی
وہ چیز ہے جو ہمیں جادو کی ماہیت کے قریب لے جاتی ہے۔ سوال اس رابطہ کا ہے جو ایسے کسی پراسرار عمل میں عامل اور معمول کے درمیان ہوتا ہے۔ چنانچہ
اب اتفاق اس پر ہے کہ یہ ذریعہ نفسیاتی اثر اندازی کا ——— ——— ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ اثر اندازی معمول میں کیا تبدیلی پیدا کرتی ہے۔
اس کے جواب میں اختلاف بھی ہے، مگر زیادہ تر یہ بات قبول کی جا رہی ہے کہ معمول کی شخصیت بکھر یوں کہئے کہ اس کا شعور پھٹ کر دو بلکہ زیادہ
حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ وہ ہوتا ہے جو اس کے اپنے اختیار میں رہ جاتا ہے اور دوسرا عامل کی کمانڈ کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ دونوں ہی
عمل کے درمیان میں کشمکش ہوتی ہے اور معمول بے چینی محسوس کرتا ہے۔ یہ بے چینی اسی وقت رفع ہوتی ہے جب کہ اس کا اختیاری حصہ شخصیت غیر اختیاری
کی تکمیل کر دیتا ہے۔

یہ اتنی لمبی کہانی میں نے اس لئے بیان کی کہ انسانی زندگی کے اندر کام کرنے والے بے شمار پراسرار عوامل ایسے موجود ہیں جن کے بارے میں ہمارا علم ابھی
ناقص اور محدود ہے اور ہم ان کی عقلی توجیہہ پر قادر نہیں ہیں۔ جادو جو کچھ بھی ہے، انہی عوامل سے تعلق رکھتا ہے۔ اب آپ خود سوچ لیں کہ اگر قرآن میں
جادو کا ذکر آیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ آپ اس لفظ کو دیکھ کر شرمندہ ہوں۔

آپ کا یہ سوال کہ اگر یہ کوئی علم ہوتا تو اس کی تعلیم کتابوں میں محفوظ ہوتی اور یونیورسٹیوں کے ذریعہ اسے ترقی دی جاتی۔ میرا خیال ہے کہ اس کا جواب
تو آپ کو مل گیا کہ بے شمار جدید ترین علماء کی کاوشیں اس میدان میں ہمارے سامنے موجود ہیں اور کتابوں میں بہت سا ذخیرۂ معلومات پیش کیا
جا رہا ہے، بلکہ عملاً پراسرار قوتوں سے حیرت انگیز کام لئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس میدان میں رفتار ترقی سست اس وجہ سے ہے کہ آدمی کو
جن مرئی اور محسوس طبعی قوتوں کے ہجوم سے بالواسطہ سابقہ درپیش رہا ہے انہوں نے اسے بہت کم فرصت دی ہے کہ وہ اپنے اندر کی دنیا کا
بھی جائزہ لے سکے۔ دوسرے یہ بھی کہ چونکہ انسانی ذہن کا علم کی مادی توجیہات کے لئے زیادہ سازگار ہے اس لئے وہ غیر مرئی عوامل کی ماہیت اور راہ
کے اصول و ضوابط کو آسانی سے پا نہیں سکتا۔ تیسرے یہ کہ ان قوتوں سے استفادہ کرنا ویسا آسان اور عام نہیں ہو سکتا جیسا کہ طبعی قوتوں سے! پھر ان
قوتوں سے کام لینے کے لئے جتنی محنت کرنی پڑتی ہے وہ نتائج میں اتنا منافع پیش نہیں کرتی کہ اس طرح کی سرگرمیاں عام ہو جائیں۔ لیکن کچھ بعید
نہیں کہ آگے چل کر کچھ ایسے انکشافات ہو جائیں جن کی روشنی میں انسان اپنے داخلی امکانات کے کھوج میں بہت آگے جا سکے اور پتھر، دھات، بھاپ، بجلی
اور ایٹم کے زمانے کے بعد کوئی ایسا دور نمودار ہو جائے جس میں مادی اسباب و ذرائع کے بجائے انسان کی کمانڈ میں ایسی مادی اور ذہنی اور روحانی
قوتیں آ جائیں جن کے ذریعہ وہ ہوا میں اڑتا اور سمندر میں چلتا پھرے اور پہاڑوں کو اپنی جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ اس طرح رکھ دے جس طرح
آج ہم ایک پنسل کو میز کے ایک کونے سے اٹھا کر دوسرے کونے پر رکھ دیتے ہیں۔

"لاٹھیوں کو سانپ" بنا دینے کو بھی آپ نے جادو کی تعریف میں داخل کر دیا ہے حالانکہ یہ معجزہ کی قسم ہے اور معجزہ کی تعریف دوسری ہے
معجزہ در حقیقت منکرین پر خدا کے وجود اور اس کے اختیارات کو ثابت کرنے اور اپنے من جانب اللہ ہونے کو واضح کرنے کے لئے ایک پیغمبر

(باقی بر صفحہ ۴۱)

پیام

آباد شاہ پوری

قلبِ مضطر پھر ہوا آمادۂ آہ و فغاں
مطلعِ دل پر لگی ہیں پھر چمکنے بجلیاں
چشمِ عالم سے ہوا پھر اشک کا دریا رواں
سینۂ ہستی سے اٹھا گرم آہوں کا دھواں
کیوں نہ ہو اب گھل رہی ہے اس کی نفیرِ حیات
جس کے نعروں سے لرزتی تھی یہ ساری کائنات

وہ رسولِ ہاشمی وہ زینتِ ہر دو سرا
جس سے عالم کو ملا کامل سبق توحید کا
بول بالا جس کے دم کا سارے عالم میں ہوا
غازۂ رخسارِ عالم جس کے دامن سے ہوا
آج اسی کی قوم کو پھر کچھ سنانا ہے مجھے
صور کہ نالوں سے سوتوں کو جگانا ہے مجھے

جب طلوعِ دینِ قیّم کوہِ فاراں سے ہوا
معجزۂ شق القمر کا شاہِ دوراں سے ہوا
بحرِ گیتی میں تلاطم ماہِ تاباں سے ہوا
نغمۂ گیتی میں اک تغیر حرفِ قرآں سے ہوا
عارضِ ہستی پہ اک دلکش ملاحت آگئی
چہرۂ گردوں پہ اک رنگیں صباحت آگئی

اک گھٹا توحید کی صحرائے بطحا سے اٹھی
جو مثالِ ابرِ باراں سارے عالم پر اڑی
کشتِ ویراں بعد مدت پھر ہوئی جس سے ہری
گلشنِ ہستی میں جس سے آگئی پھر تازگی
عنصرِ کہنہ شعلۂ تجدید سے جلنے لگا!
سارا عالم اک نئے سانچے میں پھر ڈھلنے لگا

تارِ ہستی مضطرب پھر ہو گیا مضراب سے
خفتۂ عالم جاگ اٹھا پھر مدتوں کی خواب سے
رمزِ مضمر وا ہوئی پھر منبر و محراب سے
سیلِ ضو بہنے لگا پھر سینۂ مہتاب سے
برقِ ظلمت پاش سے بیڑیاں سب چھٹ گئیں
ضربِ مومن سے غلامی کی سلاسل کٹ گئیں

قیدِ باطل سے رہا آبادیِ انساں ہوئی
شمعِ فاراں سے فروزاں ظلمتِ زنداں ہوئی
درسِ قرآں سے سبک رو غیرتِ ناداں ہوئی
وقفِ عہدِ جاوداں ہر شاخِ پژمرداں ہوئی
اک نیا انداز کلیوں کے تبسم میں ہوا
رنگ توحید عنادل کے ترنم میں ہوا

تابشِ ایماں سے روشن چار دو ملیدا ہوئی
صاحبِ دیہیم قومِ بادیہ پیما ہوئی
غرقِ سیلابِ مسلماں دولتِ ردما ہوئی
انقلابِ نو سے برہم محفلِ کسریٰ ہوئی
سوزِ آتش مٹ گیا آتشکدے ویراں ہوئے
جو کہ منکر تھے خدا کے قائلِ یزداں ہوئے

فخرِ اقوامِ جہاں وہ امتِ خیرالامیں
ساقیِ صہبا نے صافیِ عاشقِ دینِ مبیں
جسکے سجدوں سے ہوئی روشن زمانے کی جبیں
قدسیوں نے بھی سنی جس کی اذانِ دل نشیں
حلقۂ آفاق میں اک تند دھارا بن گئی
خاکِ یثرب سے اٹھی گردوں کا تارا بن گئی

اس مبارک عہد کی ہے یہ مبارک داستاں
عصرِ حاضر کے لئے جس کا تصور ہے گراں!
عالمِ افرنگ جس کا کر نہیں سکتا گماں
اڑ کے جا سکتا نہیں اس کا تخیل بھی جہاں
تو بھی جس سے بے خبر لے مسلمِ ناکام ہے
تیری آنکھوں سے بھی مخفی جسکی صبح و شام ہے

آہ کتنا فرح بخش و کیف پرور تھا سماں
ملتِ بیضا کا جب تھا چار سو سکہ رواں
گونجتی تھی جب فضائے دشت و دریا میں اذاں
صورتِ سیمابِ لرزاں جب تھا باطل کا جہاں
مثلِ برقِ شعلہ افشاں جب تھی مومن کی نگاہ
خندہ زن تھی کفر پہ جب اس کی تیغِ لا الٰہ

حاملِ سوز و اثر تھا جب مسلماں کا جگر
جب فلک کی رفعتوں پہ اس کی جاتی تھی نظر
اس کی آنکھوں سے نہ تھی جب رمزِ ہستی مستتر
حشر کی خلاق تھی جب اس کی تکبیرِ سحر
مضطرب جب دل تھا اس کا طورِ سینا کی مثال
اور نفس تھا جب مثالِ تیغِ ربِّ ذوالجلال

کاشفِ رمزِ نہاں جب مسلمِ دیوانہ تھا
شمعِ فاراں پر فدا جب صورتِ پروانہ تھا
اس کی تکبیروں سے جب آباد ہر ویرانہ تھا
بحر و بر دشت و جبل پر اسکا جب کاشانہ تھا
کوکبِ قسمت تھا اس کا جب سرِ چرخِ کبود
بہرِ ہستی باعثِ توقیر تھا اس کا وجود

بوئے گل سے جب معطر تھی فضائے گلستان
صحنِ گلشن سے عیاں تھا لالہ و گل کا سماں
فصلِ گل جب ہر طرف تھی دور تھی بادِ خزاں
تھا عنادل کو نہ جب اندیشۂ برقِ تپاں
جب چمن میں چار سو پھیلے ہوئے سے تھے چہچہے
محفلِ ملت میں ہر سو گونجتے تھے زمزمے

آج بھی گو وہ زمیں ہے اور وہی ہے آسماں
کوہ و صحرا کا وہی ہے آج بھی دلکش سماں
آج بھی بے چین ہیں گو آسماں پہ بجلیاں
چہرۂ گردوں کی زینت آج بھی ہے کہکشاں
مثلِ ماضی آج بھی ہے گردشِ لیل و نہار
گرمِ رو شام و سحر ہے جس سے بزمِ روزگار

باغِ ملت میں نہیں لیکن وہ بوئے دلنوازہ
اور عنادل کے ترنم میں نہیں سوز و گداز
ٹہنیاں اشجار کی ہیں برگ و بر سے بے نیاز
اہلِ گلشن سے ہے مخفی جادوئے نرگس کا راز

اب نہیں دورِ صبا وہ اور نہیں دورِ نسیم
روح کو فرحت ہو جس سے وہ نہیں بادِ شمیم

سبزۂ و گل میں نہیں ہے وہ بہارِ رنگ و بو
اور رگِ لالہ میں پہلا سا نہیں جاری لہو
آہ پودوں میں نہیں اب وہ اندازِ نمو
اور کلیوں کو نہیں ہے کھلنے کی وہ آرزو

نالۂ قمری میں ملتے وہ نہیں دردو اثر
سن کے جس سے چاک ہوں گلہائے گلشن کے جگر

تجھ میں مسلم وہ سلف کی سی مسلمانی نہیں
تیری نظروں میں وہ پہلی شعلہ سامانی نہیں
یاد تجھ کو اب وہ اندازِ خیابانی نہیں
کیا تغافل یہ ترا وجہِ پشیمانی نہیں

نخلِ ملت ہو ہوائے مغربی سے پائمال
اور ناداں ہو نہ تجھ کو مطلقاً اس کا خیال

چھا گیا تیری خرد پہ آہ مغرب کا فسوں
ملتِ بیضا ہوئی غفلت سے تیری سرنگوں
خودشناسی کا نہیں ہے تجھ میں جذبِ اندروں
قلب میں تیرے رہا باقی نہ وہ احساس کیوں

سینکڑوں صدیوں سے تو ناواقفِ انجام ہے
خود فراموشی یہ تیری مرگ کا پیغام ہے

(۲)

اے مسلماں سطوتِ فاروقِ اعظمؓ کے جلال
میں نے مانا ہو گیا ہے بد سے بدتر تیرا حال
کیوں نظر آتا ہے لیکن تجھ کو جینا بھی محال
کچھ حباب آسا نہیں ہے تیری ہستی کا مآل

تو نہ ہو تو یہ جہاں بے سود ہے بیکار ہے
تیری ہستی اس زمیں پہ حاملِ اسرار ہے

عالمِ مشرق کا تو ہی خالقِ تقدیر ہے
بندۂ محکوم کے خوابوں کی تو تعبیر ہے
روحِ ہستی جس پہ نازاں ہے وہ تو تحریر ہے
جس سے عالم کا ہے رشتہ تو وہ اک زنجیر ہے

ظلمتیں تابندہ جس سے ہوں وہ ہے مہتاب تو
سازِ عالم زندہ جس سے ہے، وہ ہے مضراب تو

تیرے سینے میں ہے مخفی سوزِ عشقِ کائنات
پیکرِ ہستی میں تیرے دم سے ہے باقی حیات
تیرے نغموں سے میسر نظمِ عالم کو ثبات
مفتخر ہے زندگی جس سے فقط ہے تیری ذات

جس سے باطل جل اٹھے وہ ایک چنگاری ہے تو
جس سے لرزاں ہو جہاں وہ ضربتِ کاری ہے تو

دیکھ دنیا میں ہیں اب آثارِ بربادی عیاں
اٹھ رہا ہے آتشِ تہذیبِ حاضر سے دھواں
شعلہ زن ہے روحِ استبداد پہ برقِ تپاں
سن کہہ دیتا ہے تجھے آوازۂ آسماں

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے"

غزل

کوثر نیازی

سپہرِ حسن کے تارے بھی ساتھ چھوڑ گئے
تری نظر کے شرارے بھی ساتھ چھوڑ گئے

چمک چمک کے دکھایا تمام رات مگر
سحر ہوئی تو ستارے بھی ساتھ چھوڑ گئے

شعور ہو تو تلاطم بھی ایک ساحل ہے
غمیں نہ ہو جو کنارے بھی ساتھ چھوڑ گئے

تمہارے ساتھ ہی یہ حادثہ نہیں گذرا
سُنو کہ دوست ہمارے بھی ساتھ چھوڑ گئے

بہارِ زیست تو حُسنِ نظر سے قائم تھی!
نظر گئی تو نظارے بھی ساتھ چھوڑ گئے

مجالِ دید رہی اور نہ تابِ گویائی!
حضورِ دوست سہارے بھی ساتھ چھوڑ گئے

رہِ نیاز میں کوثر مقام وہ آیا
فسونِ ناز کے مارے بھی ساتھ چھوڑ گئے

غزل

زکی زاکانی

ہو گا علاجِ درد بڑی پیش و پس کے بعد
منزل اک اور ہے ابھی دام و قفس کے بعد

ہر چشمِ منتظر کو رہا اُس کا انتظار
یہ راز اب کھلا ہے ہزاروں برس کے بعد

کیا آئیں راس گلشنِ ہستی کی تابشیں
اک برقِ ناگہاں ہے فروغِ ہوس کے بعد

اجڑی ہے بزمِ شوق تو اے دل! غمیں نہ ہو
بدلے گا رنگ یہ بھی نفس دو نفس کے بعد

اک دعوتِ سفر ہے یہ آوازِ بازگشت
منزل پکارتی ہے صدائے جرس کے بعد

وقفہ یہ دم کی آمد و شُد میں نہیں فضول
بلاتا ہے لطفِ مرگ مجھے ہر نفس کے بعد

تسخیرِ خاکداں ہی نہیں ہے کمالِ زیست
آگے قدم اِس عالمِ مور و مگس کے بعد

ہر شے ہے ایک حسن جو دل میں ہو دردِ عشق
ہر شے ہے اِک فریب، فریبِ ہوس کے بعد

کیا چیز تھا یہ شعلۂ تجدید اے زکی
گلشن تمام جل اُٹھا خاشاک و خس کے بعد

مری کے پہاڑوں اور وادیوں میں

محمد محسن ٹونکی

طائرانِ چمن سینۂ سحر کے خیر مقدم کے خیال سے اپنے شیریں نغمات میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ مؤذن کی شعلہ نوائی وادی کے پہاڑوں میں ایک عجیب کیف پیدا کر رہی ہے اور الصلوٰۃ خیر من النوم کا نعرۂ جانفزا نیند کے متوالوں کو ہوش میں لا رہا ہے۔ آقا اپنے غلاموں سے بہت قریب ہے۔ رحمت کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ انعامات کی بارش ہو رہی ہے۔ دل بحرِ سرمدی میں غوّاصی کرنے کے لئے بیقرار اور روح منبع انوار کے حضور سربسجود ہونے کے لئے مضطرب ہے۔ وادی کے سحر خیز، سادہ لوح باشندے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے خالق سے لو لگا کر بشاشت و اطمینان کی دولت سمیٹ رہے ہیں۔

سفری خیمہ کے باہر پربتوں کے کناروں پر افسردگی طاری ہے۔ طشتِ گردوں شفق کے خونِ ناب سے چھلک رہا ہے۔ صنوبر اور شمشاد کے طویل القامت درخت ابھی نیند کے پالنے میں جھول رہے ہیں۔ تر و تازہ پتوں پر شبنم کے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ شاخوں کے حریری پردوں میں چمن زادیاں شعرِ موسیقی پیدا کر رہی ہیں۔ بڑھتے ہوئے اجالے میں سبزہ و گل نمایاں اور واضح تر ہوتے جا رہے ہیں۔ غرض صبح طلوع ہو رہی ہے۔ شب کا سفینہ طوفانِ انوار میں غرق ہو رہا ہے۔

(۲)

سورج تھکے ماندے راہی کی طرح اپنا سفر ختم کرنے والا ہے۔ رعب آفریں و لرزہ خیز چٹانیں وادی کے منظر کو پُرہول بنا رہی ہیں۔ فطرت کے نوا سنج سبزہ پسندوں پر شام کی نوبت بجا رہے ہیں۔ نرگسِ شہلا کی ہم نشین، لالہ و گل کی آئینہ دار دوشیزائیں پیچ دار پگڈنڈیوں پر چہلیں کرتی ہوئی گھروں کو لوٹ رہی ہیں۔ بہار در آغوش کنجوں اور فردوس منظر باغیچوں پر ظلمات کی بلاؤں کا نزول ہو رہا ہے۔ ستارۂ شام نمودار ہو چکا ہے۔ چمگادڑیں وحشت فزا درختوں سے اُڑ اُڑ کر فضا میں منڈلانے لگی ہیں۔ پہاڑی ڈھلانوں پر مکانات کی چمنیوں سے دھوئیں کے بادل اٹھے، ہر طرف پھیلے اور رفتہ رفتہ رات کی نقاب بن گئے۔ یہی فطرت کا وہ آئینہ محل جو دن کے وقت شوریدہ سروں کی سیرگاہ بنا ہوا تھا، اب مکمل طور پر رات کی ساحرہ کے تصرف میں آگیا ہے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ ہوا کی سائیں سائیں اور پتوں کی سرسراہٹ ہی سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ اس شامِ فراق میں کوئی مونس نہیں۔ اس تلخابۂ حیات میں کوئی شیرینی نہیں۔ ہاں ایک رات کی رانی ہے جو اپنی بھینی بھینی خوشبو سے مشامِ جاں کو معطر کر رہی ہے۔

شبِ تار کی کٹھن، سنگین اور جاں گداز لمحے پیہم اضطراب کے ساتھ گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ ملکۂ شب کا نورفگن آئینہ گوشۂ آسمان پر پوری تابانی سے چمکنے لگا۔ ظلمات کی بلائیں غولِ بیابانی کی طرح وادی کے چپے چپے سے روپوش ہو گئیں۔ چاندنی میں نہائی ہوئی۔

کائنات، سیلِ نور میں ڈھلی ہوئی وادی، بجائے خود اک پرجوش شبابِ حسین معلوم ہو رہی ہے۔ فطرت کا یہ جلوہ زار اس قدر کیف آفریں اور نشہ آور ہے کہ یہاں نہ تو کسی کے رُخِ تابندہ کی بہار درکار ہے اور نہ آنکھوں کے ساغر۔ ہر طرف سرود و مستی کا اک دریائے بے پایاں امنڈ رہا ہے۔ ایک سرشارِ محبت اس طوفانِ حُسن میں ایک پلیٹ فارم پر بیٹھا ہوا فضا میں نغمے بکھیر رہا ہے۔ رباب کے تاروں پر اس کی انگلیاں اس قدر تیزی سے حرکت کر رہی ہیں گویا وہ موسیقی کی دیوی کو مسخر کر سکے۔ میں پر بلا لینا چاہتا ہے۔ میں اس جلوہ زار میں حیران ہوں۔ نہ آنکھیں قابو میں ہیں اور نہ دل اختیار میں۔

(۳)

صبح کاذب ہی سے آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج پہاڑی سلسلوں میں گونج کر کانوں کے پردے پھاڑ رہی ہے۔

تُند اور بپھری ہوئی ہواؤں کا تموّج تناور درختوں کے قدم اکھاڑ رہا ہے۔ سیاحوں کے سفری خیمے پتنگوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ اس پرشش طوفان میں بجلی کے گرنے سے صنوبر کے گھنے جنگلوں میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔ یہ آگ ہے یا پہاڑوں پر پھیلی ہوئی شفقِ رنگیں یا ان کے سینہ سے سوزِ پنہانی کی نمود۔ کسی ناکامِ الفت کی چتا جل رہی ہے۔ یا پہاڑوں کو طور کی ہمسری کا سودا ہوا ہے۔ گلنار کا تبسم فشاں چمن ہے یا نجیبِ مدحوں کا جشنِ آتش فشاں۔ سارا کوہستانی سلسلہ رُود کشِ بزمِ چراغاں بنا ہوا ہے۔ پہلے پہل مینہ ترشح کی صورت برسا۔ پھر تیز ہو گیا۔ اتنا تیز کہ جل تھل بھر گئے۔ دریا بہ نکلے۔ آئینہ ساماں جھرنے آب و تاب دکھانے لگے۔ پھر یکایک موسم بدل گیا۔ بادل چھٹ گیا۔ اُفقِ مشرق نور سے لبریز ہو گیا۔ شاخیں گل بکف ہوئیں۔ عنادل غزل سرا ہوئے۔ روح پرور ہوائیں چلیں۔ پتہ پتہ چمکا۔ ورق بن گیا۔ شعر و موسیقی کی لہر دوڑی۔ تماشائیوں کا جلوسِ نرم گام زرق برق ملبوس میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ رہا ہے۔ پہاڑی ہوٹلوں کا منظر بھی کچھ کم دلفریب نہیں۔ رنگ رنگ کے سہنوا کرسیوں پر میز کے گرد دائروں کی شکل میں بیٹھے ہیں۔ الوانِ نعمت ان کے سامنے ہیں نُقل ہیں۔ رس گلے ہیں "تازہ تازہ فواکہ" ڈمپیر، گرم گرم کبابِ گوسفند ہیں شرابی بنا دینے والی چشمِ پُرخون کی گلابیاں ہیں۔ ہر جرعہ نوشِ صہبائے جمال کے اثر سے سراپا بدمست ہے۔

(۴)

اے سادہ لوح مسلم سیّاحو! تم ان حور وش۔ گل بدناں وادیوں کی سیر کے لئے کیوں آئے ہو۔ اگر تمہارا دریائے دل ان نیرنگیوں کی کشش سے موجزن ہے تو یہ نیرنگیاں تو خود تمہاری طبیعت میں موجود ہیں۔ تم کہیں گلوں کی لطافت ہو۔ کہیں عنادل کا شور، کہیں شوقِ آزادی ہو۔ کہیں طوقِ گلوفشار۔ کہیں لیلائے محمل ہو کہیں محملِ لیلا۔ ان نیرنگیوں سے گذر کر اس وادئ غیر ذی زرع کا بھی تصور کرو جس کی زمین سنگلاخ ہے۔ ہوائیں آتش فشاں ہیں۔ جہاں ٹیلے ہیں۔ ریگزار ہیں۔ سراب ہیں۔ خارِ مغیلاں ہیں۔ بادِ صرصر کے طوفان ہیں۔ ان روح فرسا مناظر کے باوجود اسی خاکِ دل نشیں پر توحید کا پھولا پھلا گلشن بھی ہے جو فضائے زمین کے تمام گلزاروں سے زیادہ حسین اور زیادہ نظر کش ہے۔ تم اس چمنستان کا میر، ساقئ کوثر کی محفل کا رنگ دیکھو۔ دل کے ٹوٹے ہوئے خالی ساغر میں اسی میخانۂ یقین سے ایمان کی صہبائے آتشیں بھر کر لاؤ۔ خود بھی پیو اور مجھے بھی پلاؤ۔

موادِ مطالعہ

☆ ادارہ

اسلام کا فلسفۂ تاریخ

ہمارے دوست پروفیسر عبدالحمید صدیقی (ایم اے) صاحبِ مطالعہ و فکر تو تھے ہی اب وہ "صاحبِ کتاب" کی حیثیت سے سامنے آچکے ہیں۔ آپ کی کتاب "اسلام کا فلسفۂ تاریخ" ہمارے سامنے ہے۔ اتنے وسیع اور اونچے موضوع پر سوا سو کے لگ بھگ صفحات کی کتاب سے بظاہر اتنی امیدیں قائم نہیں ہوتیں جتنا کچھ کہ ان صفحات کو پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ دراصل ایک مقالہ ہے جسے کتابی شکل میں مکتبۂ چراغ راہ نے پیش کر دیا ہے۔

فلسفۂ تاریخ کا منتہا درحقیقت ان قوانین و نوامیس کی کھوج لگانا ہے جن کے تحت انسانی معاشروں اور اقوام کا عروج و زوال ہوتا ہے اور ایک نظامِ تمدن کی اٹھان، اس کے پھیلاؤ اور پھر اس کے سقوط کا باعث ہوتے ہیں۔ ان قوانین کو سمجھنے کے لئے جو کاوشیں اب تک انسانی دماغ نے کی ہیں ان کے نتیجے میں دو بڑے نظریہ ہائے تاریخ پیدا ہوتے ہیں۔ ایک حیاتی نظریہ ہے جو کسی اجتماعی نظام، کسی قومی ہیئت اور کسی تمدن و تہذیب کو اجسامِ نامیہ پر قیاس کر کے اس کی تاریخ کو ظہور، عروج، کمال، انحطاط اور خاتمے کے ابواب میں تقسیم کرتا ہے اور کسی قوم یا تمدن کی نشاۃ ثانیہ کے دوبارہ ظہور پذیر ہونے کے امکان کی قطعی نفی کرتا ہے۔ اس نظریے کا ایک پرجوش علمبردار اسپنگلر ہے۔ دوسرا نظریہ تاریخ کی مادی تعبیر کا ہے جسے مارکس نے پیش کیا ہے یعنی پیداآوری قوتیں ایک تمدن اور قومی زندگی کی ہیئت کی تشکیل کرتی ہیں، پھر ان پیداواری اور اس اجتماعی ہیئت میں کشمکش رونما ہوتی ہے پھر نئی پیداواری قوتیں ابھرتی ہیں، ان کے زیرِ اثر ہیئتِ اجتماعی میں پھر انقلاب آتا ہے اور اسی طرح یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے معاشی نظام ہی قوموں اور تمدنوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ ان نظریوں سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ اسلام کے سراسر خلاف پڑتا ہے۔ اسی لئے آپ نے اسلام کے تجدید و احیاء کی تاریخ بیان کر کے اس کے بار بار نمودار ہونے کی صلاحیت واضح کی ہے۔ یہ نظریات اس کی نفی اور تردید ہیں۔ ان دونوں نظریوں پر پروفیسر صاحب نے تنقیدی بحث کرنے کے بعد قرآن کے فلسفۂ تاریخ کا تعارف کرایا ہے۔ قرآنی فلسفۂ تاریخ اخلاقی اصولوں اور قدروں اور حق و باطل کی متضاد اصولی طاقتوں کو تمدنی کشاکش کے مستقل عامل بنا کر ہمارے سامنے لاتا ہے اور تاریخ میں تجدید و احیاء اور تمام نئے اصولوں کو کارفرما دکھاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ فلسفہ مسلمانوں میں حیاتِ نو حاصل کرنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ مصنف کی رائے کے مطابق اس اسلامی نقطۂ نظر کو "تاریخ کی اخلاقی تعبیر" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسلامی فلسفۂ تاریخ پر یہ گفتگو ابھی بالکل ابتدائی درجے کی ہے، لیکن ہے دلچسپ اور معلومات افزا۔ بعض مقامات پر یوں محسوس ہوتا ہے مؤلف لکھتے لکھتے ضمناً کسی بات کا تذکرہ کرتے ہیں تو پھر بات اس طرح طول کھینچتی ہے جیسے یہی اصل موضوعِ بحث ہو۔ چنانچہ بسا اوقات صفحے کے صفحے جملہ معترضہ یا کسی ضمنی موضوعِ سخن یا ایک اجمال کی شرح میں کھپ گئے ہیں۔ یہ چیز توازن کے خلاف ہے۔ عبارت کو ترتیب دیتے ہوئے پروفیسر صاحب کو اہتمام کرنا چاہیئے کہ جو چیزیں جس انداز میں لٹریچر میں پہلے آچکی ہیں ان کی تکرار نہ ہونے پائے اور اسلوبِ بیان میں اپنا انفرادی رنگ پیدا کرنے پر ساری توجہ صرف کرنی چاہیئے ورنہ نہ تو پڑھنے والا پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے اور نہ وہ کسی فکر و نظریہ سے اثر لیتا ہے ——— نفیس پیرایۂ طباعت کے ساتھ قیمت فی جلد (مجلد) ایک روپیہ بارہ آنے ہے!

اسلام اور تھیاکریسی

یہ پروفیسر صاحب کی دوسری دلچسپ اور پیش قیمت کتاب ہے جو وقت کے ایک اہم موضوع پر لکھی گئی ہے۔ یہ بھی ایک مقالہ ہے جو کتابی شکل میں پہلے انگریزی اور اب اردو میں شائع ہوا ہے۔ اس کے انگریزی ایڈیشن پر ہم جو اظہار رائے پہلے کر چکے ہیں اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اتنا یاد دلا دینا کافی ہے کہ اسلام اور تھیاکریسی کا تقابل بڑے عالمانہ تجزیہ کے ساتھ کیا گیا ہے اور مغالطوں کے وہ کانٹے چن چن کر نکال دیئے گئے ہیں جو اسلام کے بارے میں جدید ذہن میں ہمیشہ کھٹکتے رہتے ہیں۔ یہ کتاب بھی مکتبہ چراغ راہ نے اعلیٰ معیار طباعت کے ساتھ شائع کی ہے۔ قیمت فی جلد (مجلد) دو روپے

اردو عربی ڈکشنری

عربی زبان کے بارے میں یوں بھی کوئی بڑا علمی سرمایہ اردو کے دامن میں نہیں ہے، لیکن اردو سے عربی ترجمہ کرنے کے لئے کتب لغت کی کمی نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے زیادہ سے زیادہ دو ایک کتابیں اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں مگر وہ ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے جناب مولینا ابوالفضل عبدالحفیظ صاحب (بلیاوی) نے یہ نیا لغت مرتب کر دیا ہے۔ موصوف کا دل چسپی رکھنے والے حلقوں میں تعارف آپ کی پہلی کاوش مصباح اللغات کرا چکی ہے، اسی کی روشنی میں اس دوسری کوشش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لغت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے تسلسل سے پڑھ کر رائے قائم کی جا سکے، اور نہ راقم الحروف کا یہ مقام ہی ہے کہ وہ اردو عربی لغت کے بارے میں ذمہ داری سے نقد و تبصرہ کر سکے، سرسری طور پر بعض مقامات کو دیکھا اور ترتیب کو سمجھنے کی کوشش کی، لیکن لغت سے جب تک کچھ عرصہ کام نہ لیا جائے اس کی جامعیت یا کوتاہیوں کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ پیش لفظ میں جناب سید ابوالحسن علی (ندوی) نے لغت اور صاحب لغت کا جو مختصر سا تعارف کرا دیا ہے اس کے پیش نظر ہم بھی پورے اعتماد کے ساتھ موصوف کے الفاظ دہراتے ہیں کہ "قوی امید ہے کہ اس کتاب سے طالب علموں کی تمام ضرورتیں بڑی حد تک پوری ہو جائیں گی اور ان کو، نیز معلمین مدارس کو اس سے قیمتی مدد ملے گی۔" صفیر احمد محسن اختر، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے قیمت مجلد چھ روپے

کاروانِ حجاز

ہمارے محترم و فاضل دوست ماہر القادری گزشتہ سال زیارت حرمین کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ حج کا روح پرور اور جذبہ انگیز سفر ہو اور ماہر القادری جیسا بیکبیر شاعر اس سفر کا مسافر ہو تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسا مسافر ایسے سفر میں کن کیفیتوں سے دوچار ہوگا! "کاروانِ حجاز" درحقیقت انہی کیفیتوں اور تجربوں کا بیان ہے۔ کاروانِ حجاز میں آپ کو ایک قلب حساس کے نازک [illegible] احساسات، ایک شاعر کا تخیل، ایک ادیب کا حسن بیان، ایک مسلمان کا ایمان اور ایک سپاہی کا ولولہ یہ سب چیزیں یکجا ملیں گی۔ اس کے علاوہ بہت سی ملاقاتوں کی روداویں اور دنیائے عرب کے متعلق معلومات، انسانی مطالعات اور شخصی تعارفات شامل ہیں [illegible] نے یہ کتاب اچھے طباعتی معیار کے ساتھ شائع کی ہے، گرد پوش کو گنبدِ خضرا کا سا رنگ دیا گیا ہے۔

قیمت چار روپے۔

صرف بیمار، کمزور، نحیف بچوں کیلئے

اکسیر ثابت نہیں ہوا

بلکہ

ایسن گلوکوز واٹر

تندرست بچوں کو بھی موٹا تازہ بنانے میں

سب سے بہتر ثابت ہوا ہے

ہر اچھے انگریزی دوافروش سے

ایک روپیہ چار آنے میں خریدیے